پہلا لفظ

○

۱ء قبل مسیح

اور تب سیاہ فام شخص نے اس سے پوچھا، "کیا تم خداؤں میں یقین رکھتے ہو؟"
"نہیں۔"
"کیا تم یقین رکھتے ہو کہ یہاں ہماری موت کے بعد (ہمارے لیے) کوئی اور دوسری جگہ بھی ہے؟"
"نہیں۔"
"تب تم کس میں یقین رکھتے ہو، اسپارٹکس؟" سیاہ فام شخص نے پوچھا۔
"میں تم میں یقین رکھتا ہوں اور میں خود میں یقین رکھتا ہوں۔"

○

کیپلر (۱۵۷۱ء —— ۱۶۳۰ء):
جرمن ماہر فلکیات جس نے سیاروں کی حرکت و عمل کے اصول دریافت کیے۔
—— اور اس دریافت نے مذہبی نظریۂ کائنات کو شدید چوٹ پہنچائی۔

○

تمہارے محبوب ہیرو؟
(کارل مارکس نے جواب دیا): اسپارٹکس، کیپلر۔

●

[illegible] اردو

قیمت: پچیس روپے

تقسیم کار:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،
[illegible]

انجمن ترقی اُردو (ہند)
«اُردو گھر» راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲

شعور
مارچ ۱۹۷۹ء
نئی دلی

: چار

ترتیب :

بلراج مین را : شرد دت

پانچ

چھ

مدیر : امرت کھرانہ
ناشر و طابع : امرت کھرانہ
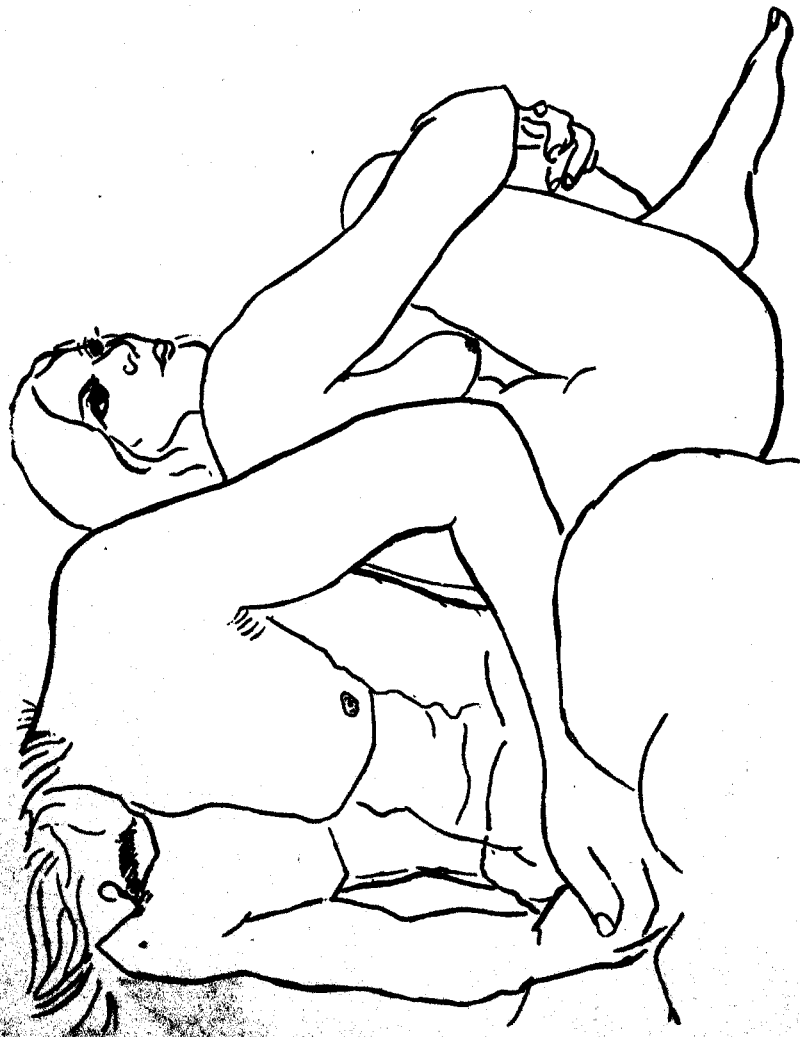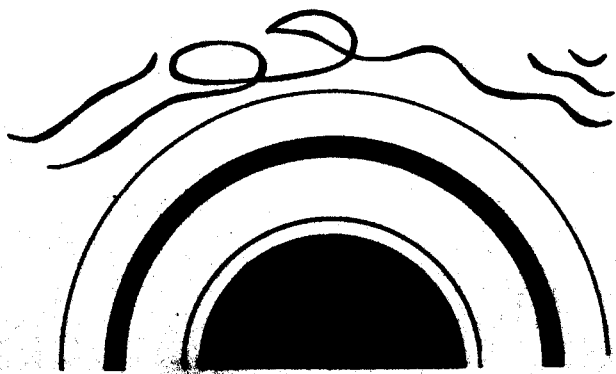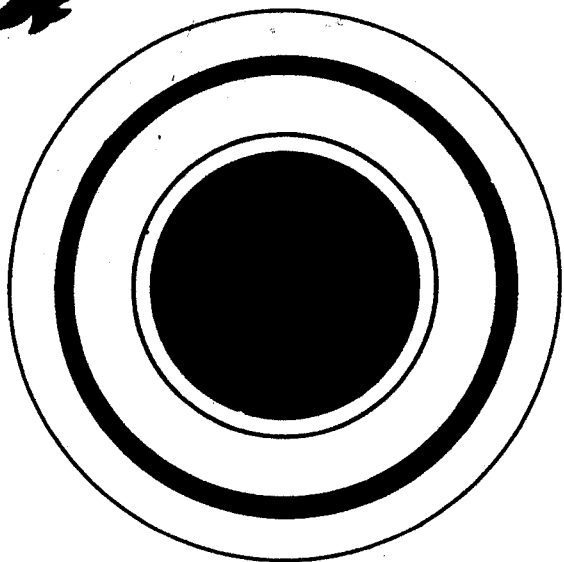
خطاط : جمال گیاوی

طباعت (آفسیٹ) لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی۔
طباعت (سرورق اور بلاک) فوشیر (الیکٹرک) پریس، لکھمی رائے اسٹریٹ، دریا گنج، دہلی۔

جلد ساز : محمد یوسف بک بائنڈنگ کمپنی، کوچہ ناہر خان، دریا گنج، دلی۔

۵۶/۹، راجندر نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۶۰

تصویر : آٹھ

ترتیب

ایک مکمل ناولٹ

●

اُردو میں پہلی بار

●

نیلی نوٹ بُک : عمانوئیل کزاکیوِچ

●

۲۳ ——————— ۱۰۰

●

ترجمہ : انور سجاد

●

ڈرائنگ : انور سجاد : ۲۳

افکار، سلسلہ ۲

●

ایک مکمل تعارف

●

انتونیو گرامچی : اقبال اختر

●

۱۰۱ ——————— ۱۸۴

●

اقبال اختر

●

انتونیو گرامچی

●

ایک مکمل کتاب

●

اُردو میں پہلی بار

●

بریخت : انور عظیم

●

۱۸۵ —————— ۳۳۶

●

●

رنگ منچ

زوال کا عروج : بریخت

ترجمہ : انور عظیم

۲۲۱ —————— ۳۱۶

●

گیارہ نظمیں : بریخت

۳۱۷ —————— ۳۳۵

ترجمہ : بلراج کومل، منیر الدین احمد

●

ڈرائنگ : انور سجاد : ۱۸۵، ۲۱۷، ۲۳۸، ۲۵۸، ۳۱۳، ۳۳۶

ڈرائنگ : آصف خاں : ۲۲۱

ڈرائنگ : صادق : ۲۲۲

شہر : سلسلہ ۲

●

ایک اور مکمل کتاب

●

اردو میں پہلی بار

●

کلکتہ : شمیم حنفی

●

۳۳۷ ——— ۴۳۶

●

●

۳۴ نظمیں

ترجمہ : شمیم حنفی

۳۶۱ — ۴۳۴

●

بنگلہ : ستیزہ

حصہ : پندرہ

ایک اہم دستاویز

●

اردو میں پہلی بار

●

تیسری دنیا : سلسلہ ۲

●

ایران : بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی

●

اے ارضِ فارس

(ایک کمپوزیشن)

●

ترجمہ، ترتیب

شمیم حنفی

●

●

آٹھ نظمیں : رضا براہینی

●

ڈرائنگ : آصف خاں : ۴۳۷، ۴۸۰

ڈرائنگ : سونیا روپ : ۴۳۸، ۴۵۹

ایک اور اہم دستاویز

●

اردو میں پہلی بار

●

زوال پرستی کے سوال پر ایک مذاکرہ

●

۴۸۱ —————— ۴۹۳

●

شرکا

ژاں پال سارتر

ارنسٹ فشر

ایڈورڈ گولڈ اسٹکر

ملان کندیرا

●

ترجمہ

شمیم حنفی

●●●

اُفُق

تاریخ کے ہر عہد کا اپنا مزاج اور ضمیر ہوتا ہے!

مزاج اور ضمیر؟ مطلب؟

بجا سوال ہے۔ مزاج اور ضمیر تو دو لفظ ہیں۔ لفظ تو بہت ہیں۔ ان گنت۔ کوئی بھی دو، دس، بیس لفظ لے لیجیے۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ مگر جب لفظ زبان یا قلم سے ادا ہوں، اس طرح کہ ان کا مطلب بھی ساتھ ہی سننے یا پڑھنے والے تک پہونچ جائے تو ترسیل کا حق ادا ہوتا ہے۔ تب الفاظ زبان بن جاتے ہیں۔ زبان مہذب انسان کی پہچان ہے۔ کسی سے اس کی زبان چھین لیجیے، وہ گونگا ہو جائے گا۔ یہ "کسی" فرد بھی ہو سکتا ہے اور گروہ بھی۔ ایک خاص تہذیب ایک خاص گروہ میں پروان چڑھتی ہے اور اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ اس اجتماعی پہچان میں اس خاص گروہ کے فرد کی پہچان بھی شامل ہوتی ہے۔ جب اس "پہچان" سے کسی فرد کو پہچانا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کے وسیلے سے وہ گروہ بھی پہچانا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ فرد اس خاص گروہ کا حصہ ہے جس طرح اس خاص فرد کی تہذیب اس خاص اجتماعی تہذیب کا حصہ ہے۔ اسی جزو کل کے باہمی رشتے کا اظہار انسان کی روحانی شخصیت کے خط و خال متعین کرتا ہے۔ تہذیب سے انسان شروع نہیں ہوتا بلکہ انسان سے تہذیب شروع ہوتی ہے۔ تہذیب ہی نہیں، تاریخ بھی۔ تہذیب بھی تاریخ کی دین ہے۔ تاریخ ہے کیا اگر یہ انسان کی سماجی ارتقائی دستاویز نہیں؟ تہذیب ہے کیا اگر یہ انسان کے روحانی ارتفاع کا مظہر نہیں؟ اس مظہر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ صرف فکر و فلسفہ؟ صرف دانشوری و شاعری؟ صرف رقص و موسیقی؟ یا اور بھی کچھ؟ ان تمام سوالوں میں لفظ "صرف" باطل ہے کیونکہ تہذیب ایک سماجی کل کے حرکت و عمل کا بالیدہ تر اظہار ہے جن میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جو انسان کی تخلیقیت کی ضمانت ہیں۔ یہ تخلیقیت روزمرہ کے پیداواری عمل میں بھی ڈھل جاتی ہے اور جب روحانی

ارتقاء کی طرف رخ کرتی ہے تو سنگیت، شاعری، مصوری اور رقص میں نمو کی قوت بن کر سمٹ جاتی ہے اور ان تمام عوامل کے امتزاج باہم سے، اس تلاش و جستجو کا سراغ ملتا ہے جو انسان کو انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر، ایک منزل سے دوسری منزل تک (جو ہمیشہ اگلی منزل ہوتی ہے) ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک (جو ہمیشہ الامتناہی ہوتا ہے) لے جاتی ہے۔ اس کے قوانین جو سماجی قوانین ہیں، عہد کے ایک خاص مرحلے کے مزاج کو اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ یہی ایک خاص عہد کا مزاج کہلاتا ہے۔ ہر عہد کی قدر مشترک ہے آزادی کی تلاش جو انبساط کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ انسانی تمدن کے حرکت و عروج کی تاریخ کی تہہ میں یہی ناگزیر قانون کام کر رہا ہے۔ یہ کائنات میں "بیکراں" ہو جانے کی خواہش کی تہہ میں کام کرنے والا قانون ہے۔ انسان سماجی جانور ہے، اس لیے اس کی "بیکرانی" کی خواہش ان حدوں سے ٹکراتی ہے جو پیداواری رشتوں کی تابع ہیں اور جن کا اظہار سیاسی تحریکات میں اور ان تحریکات کی منظم پناہ گاہوں میں (جن کو سیاسی اداروں اور ان کی ماتحت ایجنسیوں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) ہوتا ہے۔ اب اگر ہمارے عہد کے مزاج کی شناخت ہوگی تو انہی اداروں کے تجزیاتی پس منظر میں ہوگی اور اسی دائرے میں اس بات کا بھی تعین ہوگا کہ جب ہم اس عہد کے ضمیر کی ڈھالی دیتے ہیں تو اس سے، خواہ وہ انفرادی ضمیر کی بات ہو یا اجتماعی ضمیر کی، ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟

ہر عہد کے مزاج کا تعین اس غالب تحریک سے ہوتا ہے جو بنیادی طور پر سماجی تبدیلی کی تحریک ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں، ہر شعبے کی خصوصیات کے مطابق، اس تحریک کے مظاہر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلی اپنی نوعیت میں صرف ارتقائی نہیں بلکہ انقلابی بھی ہوتی ہے۔ زمان و مکان کی حدود کے اندر دو انقلابی نقطوں کے درمیان، تاریخ کا ارتقائی سلسلہ، اپنے فکر و عمل میں، اپنی خصوصیات کے سبب سے، اس دور کا مزاج کہلاتا ہے۔ اور اس خاص دور میں سماجی تبدیلی کی غالب تحریک سے وابستگی، عملی یا فکری وابستگی، بلکہ عملی اور فکری وابستگی، اس دور کا انفرادی اور اجتماعی ضمیر بن جاتی ہے۔ تاریخی شعور، فکری بصیرت اور نظریاتی وابستگی کے بغیر ضمیر کی ڈھالی کے معنی ہیں، جبلی انسان کی اندھی قوت شناخت پر اعتماد! لیکن کیا یہ کافی ہے؟ مہذب انسان کے ضمیر اور نیوکلائی اور خلائی دور کے سماجی انسان کے ضمیر میں کوئی ارتقائی فرق ہے یا آج بھی دشت و صحرا کے قدیم انسان کی روشن ضمیری سے کام چل سکتا ہے؟ کیا خیر و شر یا سود و زیاں کا تصور مابعد الطبیعاتی تصور ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ خیر و شر یا سود و زیاں کا تصور زمانی اور مکانی تصور ہے

جن کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک سماجی تصور ہے اگرچہ بعض اخلاقیات اس کو مابعد الطبیعیاتی سند حدوں کا اسیر بنا دیتی ہیں۔ ہم ارضی لوگ ہیں اور ہم اس وقت ان ہی حدود کے اندر رہ کر بات کر رہے ہیں۔

اس گفتگو کی عصری معنویت صرف اس وقت آشکار ہو سکتی ہے جب ہم اس تصور کو اپنے وقت اور حالات کی سان پر رکھ کر دیکھیں۔ لوہے کو پہلے آگ میں تپانا پڑتا ہے، پھر اس پر ہتھوڑے سے چوٹیں لگائی جاتی ہیں۔ بہت چنگاریاں اڑتی ہیں، تب جا کر کہیں لوہا فولاد بنتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے (اور سنا بھی گیا ہے) کہ جب ادیبوں اور فنکاروں کی بحث ہوتی ہے تو کوئی جغادری یا غیر جغادری "فنکار" (اگر وہ کسی جلسے میں ہے تو مائک میں منہ گھسا کر، اور اگر اپنے یا کسی اور کے ڈرائنگ روم میں ہے تو چھلکتے ہوئے گلاس میں منہ چھپا کر) بحث کے دوران یکایک اعلان کرتا ہے: "میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میرا ضمیر صاف ہے!" ضمیر تو صاف ہوگا۔ اب کر لیجیے آپ جو کچھ کر سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ژاں پال سارتر کا بیان کیا ہوا واقعہ یاد آتا ہے۔ (یہ واقعہ "ادب کیا ہے" میں نظر آ جائے گا)۔ سارتر کا ایک ہمعصر ادیب تھا، فرانسیسی! بڑی انقلابی اور طوفانی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک وقت آیا جب فیشن کا یہ ابال جاتا رہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس کا باپ اچانک مر گیا جو فرانسیسی صنعت کار تھا۔ بیٹے نے پہلی فرصت میں باپ کا کاروبار سنبھال لیا اور ڈھرے پر لگ گیا، اسی جوش و خروش سے۔ پھر اس نے پیرس کی ایک خوش حال "سوشیلائٹ" سے شادی کر لی جس کا مجد و وقار شوہر بننے میں اسے زندگی کا لطف آ گیا، "ہاں کبھی دوسرے شہر جا کر اس سے تھوڑی سی بے وفائی ہو جاتی" ہو تو بات دوسری ہے۔ بورژوا اخلاقیات میں اس کی گنجائش ہے۔ جب اس کی دانش ورانہ سرکشی گھس پٹ کر برابر ہو گئی تو اس نے کچھ عرصے بعد سارتر کو بھی "زمانہ سازی" کے گر سکھانے کی کوشش کی، اس لیے کہ اس وقت تک اس کو اپنے فن پر پورا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ایسے استاد کی کسی بھی دیار سماج میں کمی نہیں ہے۔ آخر ش کچھ اور کر شوت کچھ! جزئیات میں فرق ہو سکتا ہے، مثلاً ممکن ہے وہ دانش ور صنعت کار کا بیٹا نہ ہو، کسی کوتوال کا بیٹا ہو، اور شادی اس نے کسی صنعت کار کی بیٹی سے نہ کی ہو بلکہ بفیض شادی خود صنعت کار بن گیا ہو۔ اس قسم کی جزئیاتی تبدیلیاں تو ہو سکتی ہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے بلکہ وہ بات ہے جو سارتر نے یہ واقعہ بیان کر کے آخر میں کہی ہے: "آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس قسم کے رویے کے بارے میں کیا سوچتا ہوں ــــــــ یہ مبتذل اور رکیک قسم کی بے ایمانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

یہ "مبتذل اشتراکیت قسم کی سیاسیات" "ہندوستوں کی "فنکاری" کا
سرچشمہ ہے جو ایک قسم کی "حرام کاری" ہے۔

یہ توضیحی باتیں ہیں جن سے مسئلے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مرکزی نکتہ
اس بحث کا یہ ہے کہ ہر عہد میں، اور اس عہد کی بنیادی آویزش میں، "ضمیر" افراد
کی بنیادی وابستگیوں اور متضاد ارادوں کی وجہ سے بیچ سے کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے
——— ایک سچ کا ضمیر اور ایک جھوٹ کا ضمیر۔ ایک حق کا ضمیر اور ایک باطل کا ضمیر
——— اس کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ژاں پال سارتر کی پیش کی ہوئی
مثال پیش نظر رکھیں۔ یعنی ایک ضمیر ژاں پال سارتر کا ہے اور دوسرا اس "دانش ور" کا جو
صنعت کار ہے۔ دونوں کی وابستگیاں مختلف ہیں، اخلاقیات مختلف۔ قدریں مختلف، آدرش
مختلف اور آدرشوں کو حقیقت بنانے کے رویے مختلف۔ یہ ذہنی رویہ بھی ہے اور عملی
رویہ بھی۔ ایک "موجود حالات" کا رویہ ہے (یعنی جو کچھ ہے، جیسا بھی ہے، اسے برقرار
رکھا جائے) اور دوسرا رویہ ہے تبدیلی اور انقلاب کا۔ یہ فرق محض ذات کا نہیں،
محض دو شخصیتوں کا نہیں بلکہ ایک خاص سماجی نظام سے وابستگی، جبر و ستم کے نظام سے
وابستگی اور اس کو بدل کر عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے والی قوتوں سے وابستگی کے فرق کا
ہے۔ ان دو وابستگیوں کے فرق کے اظہار میں ہی ضمیر کا سچا امتحان ہوتا ہے اور اس کی
اصلیت کی پہچان بھی ——— کچھ ہی عرصہ پہلے جب ہماری قوم کو پچھلی
بار ایمرجنسی کے ہنگامی حالات کا تجربہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اجتماعی معنوں میں
ضمیر کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے اور اس کو انفرادی ضمیر فروشی سے، جس کے اظہار میں
ہمارے دانش ور، ادیب اور شاعر بھی پیش پیش تھے، کتنا سہارا ملتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو اپنے
ذاتی مفاد کی بقا اور توسیع کے لیے گناہ کرتے ہیں، دوسرے وہ بھی ہیں جو گمراہ کن
معنوں اور ... تاویلوں سے اس گناہ کا جواز پیش کرتے ہیں۔ بیچنے والے اور خریدنے والے
... اور خریدنے والے۔ کیا دونوں کا ضمیر ایک ہے؟ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد
... سماجی دور ... صورت حال کا شدید اور نمایاں اظہار ہوتا ہے یعنی
... کی علامت ہے ... نہیں۔ جس طرح خون فاسد پھوڑوں کی شکل میں
جسم پر نمایاں ہوتا ہے، اسی طرح سماجی امراض قوم کے جسم پر سیاسی آتشک کی
شکل میں پھوٹ نکلتے ہیں لیکن عذاب کا یہ سلسلہ یہیں شروع نہیں ہوتا، نہ
یہیں ختم ہوتا ہے۔ جس طرح کہتے ہیں "جنگ سیاست کی توسیع ہے، جو مختلف وسائل
کے ذریعے جاری رکھی جاتی ہے"، اسی طرح ایمرجنسی یا مارشل لا طبقاتی تضادات
کی بحرانی سیاست کا اظہار ہے۔ طاعون کے چوہوں کی طرح سماجی عذاب کے یہ
عناصر گوشوں اور جیبوں میں چھپے رہتے ہیں اور اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اس استعارے

ے ایتھر حسّی اداس سے نچلے اور بعد کے حالات کے صحیح ادراک میں مدد ملتی ہے)۔

—— یہ فرق اس وقت شروع ہوا جب اسپارٹکس نے پہلی بار اپنے وجود کو پہچانا اور اس کی آزادی کے خواب دیکھے۔ اسپارٹکس نے آزادی کے جو خواب دیکھے تھے، وہ اس کے ضمیر کا اعلان تھے۔ ایک ضمیر زارشاہی کا تھا اور دوسرا "پوتیومکن" کے معمولی جہازیوں کا جنھوں نے اپنے خون سے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی تاریخ لکھی۔ ایک ضمیر لینن کا تھا اور دوسرا وہائٹ گارڈ کے انقلاب دشمن قزاقوں کا۔ ایک ضمیر بھگت سنگھ کا تھا اور دوسرا جنرل ڈائر کا —— ہمارے دور میں، ضمیر کا یہ اعلان گرامچی کی نظریاتی آویزشوں میں ہی نہیں بلکہ مسولینی کے فاشزم سے اس کے تصادم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک ضمیر ان کا تھا جنھوں نے ریشتاغ میں آگ لگائی اور دوسرا بریخت کا جس نے "آرتورو اوئی"، جیسا ڈراما لکھا اور زندگی کے بہترین ماہ و سال جلاوطنی میں کاٹ دیے اور جس نے اپنی جلاوطنی کو اپنے تخلیقی عمل سے تھیٹر کے عہد آفرین فن میں ڈھال دیا۔ ایک ضمیر ہٹلر کا تھا اور دوسرا ان گنت بے نام اور بے چہرہ یہودیوں کا جو نیشنل سوشلزم کے جہنم میں جل کر راکھ ہو گئے۔ ایک ہی عہد میں دریائے یانگ سی کے ایک طرف چیانگ کائی شیک کا ضمیر تھا اور دوسری طرف چینی انقلابیوں کا۔ ایک ہی عہد میں ایک طرف ہوچی منہ کا ضمیر تھا اور دوسری طرف ہزاروں میل دور وہائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے جمہوری صدر کا جس کے حکم سے ویت نام کی سرزمین پر نیپام بموں کی بارش ہو رہی تھی —— ان میں سے سچا ضمیر کون تھا؟ وہ جو اپنے وقت کے تاریخی مزاج کا نقیب تھا یا وہ جو اس نقیب کو خون میں ڈبو دینے کے وحشیانہ جتن کر رہا تھا؟

یہ مثالیں بڑے بڑے تاریخی تصادموں کا نشان بن گئی ہیں، اس لیے تعالی کے پیچھے چھپے ہوئے تضادات اور خود فریبی کی شناخت میں ان تاریخی مثالوں سے مدد ملتی ہے۔ زندگی کے مسخ آئینہ خانے میں مسخ نقوش کو پہچاننے کے لیے عرشِ بریں کے خداؤں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی زمین پر ہوتا ہے۔

صورتِ حال کیا ہے؟

صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر تہذیبی اور ادبی حلقوں میں سچے فنی اظہار کی کاوش اور تلاش کی جگہ خود ستائی اور خود فریبی کے بت کدوں نے لے لی ہے۔ اچھے افسانے، اچھی شاعری اور اچھی تنقید کی جگہ سائیکوفینسی نے لے لی ہے۔ خود ہی آئینہ اور خود ہی عکس کا اصول ادبی احتساب کا کلیہ بن چکا ہے۔ یہ بڑا بے درد گورکھ دھندا ہے۔ اس دھندے کو چلانے کے لیے سرکاری سرپرستی اور حلقہ بندی کے ادارے ہیں۔ ان کی فصیلیں بہت اونچی ہیں۔ ان فصیلوں کے اندر کھوٹے سکے چلتے ہیں۔ دوسرے

تنقیدوں میں اس کو میڈیوکریٹی کا مزاج کہتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس مزاج شناسی کا حسن ہے ان کے ارد گرد مصاحبوں کے گروہ ہیں جو حالات کے مطابق چولے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ سیمینار کرتے ہیں، مشاعرے کرتے ہیں، پارٹیاں دیتے ہیں، خود شعر و شاعری بانٹتے پھرتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخباروں میں ان کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ پبلسٹی یا میڈیوکریٹی اور فن سخن کاری کی کمین گاہیں ہیں۔ انھوں نے مفاد پرستی کے بت سے پنجرے بنا رکھے ہیں جو کھلی ہوا میں غیر مرئی تاروں سے لٹکے رہتے ہیں۔ پنجرے بھی غیر مرئی ہیں۔ ان پنجروں میں ہیولوں کے طوطے بہت شور مچاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ طوطے جدید ادب کی بات کرتے ہیں، کچھ ترقی پسند ادب کی۔ کبھی کبھی وہی جو جدید ادب کی بات کرتے ہیں، ترقی پسند ادب کی بات کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ فنکاری تمغوں کی مدد سے اس عہد کے مزاج اور اپنے ضمیر کی بات کرتے ہیں ——— تماشا بڑا پر فریب ہے۔

اس عہد کا مزاج کیا ہے؟

ہر زمانے میں جبر و استحصال کے خلاف ابتدائی اور علامتی سرکشی سے لے کر خوں آشام بغاوتوں اور مسلح بغاوت تک کا سلسلہ رہا ہے۔ اس بغاوت کو سب سے پہلے اسپارٹیکس نے اپنے خون کی زبان دی تھی۔ اس زبان کو ہر زمانے نے اپنا پرچم بنایا جو شکاگو تک پہنچتے پہنچتے لہو کی قندیلوں میں بدل گیا۔ آج کے زمانے کا باغی ان قندیلوں کی روشنی میں اپنی منزل کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ روشنی طبقاتی جد و جہد میں نئے راستے بھی دکھاتی ہے اور فنی اظہار کے بھی کیونکہ یہ رویہ صرف پرچم بردار کا نہیں بلکہ تخلیقی فکر و فن کا بھی ہے، اس لیے آج بھی فیصلہ انھی قندیلوں کی روشنی میں ہوگا۔ اسی روشنی میں نقابیں تار تار ہوں گی اور مسخ چہرے پہچانے جائیں گے۔ اس روشنی سے صرف وہ خوف زدہ ہوں گے جو اصطلاحوں کو، خواہ وہ "جدید" ہوں یا "انقلابی" جیبی کترنوں کی طرح استعمال کرتے ہیں اور جن میں وہ اپنی عیاری اور ریاکاری کو محفوظ سمجھتے ہیں ——— وقت کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط ہیں۔ الفاظ کے چیتھڑے تو کیا وہ خود غرضی کے نہ دیکھے تر بھی تار تار کر سکتے ہیں۔ یہی ہاتھ اس عہد کے مزاج داں ہیں۔ اور جو اس مزاج کا نقیب ہے، وہی اس عہد کے فن کار کا ضمیر ہے۔ وقت کا ضمیر خود غرضی اور چالاکی کے طمع میں نہ کبھی دبائے دبا ہے، نہ اب دبائے دبے گا۔

اسی یقین سے اس عہد کی تلاش اور فنکاری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہی ہمارے عہد کی جمالیات کا سرچشمہ ہے ——— جو تاریخی شعور بھی ہے اور تخلیقی وابستگی بھی۔

عمانوئیل کزاکیویچ

ولادیمیر ایلیچ لینن اور انقلاب روس!

ایک عہد ساز شخصیت اور ایک تاریخ ساز واقعہ، جو اس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو گئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ اور علیحدہ کرنا ممکن نہیں —— ایک شخصیت جو انقلاب میں ڈھل گئی تھی اور ایک انقلاب، جو ایک شخصیت میں ڈھل گیا تھا۔ تاریخ میں صدیوں بعد ایسا حیرت انگیز اتصال وقوع پذیر ہوتا ہے، جس کے اثرات آنے والی کئی صدیوں پر محیط ہوتے ہیں اور تاریخ کے رُخ اور سمت کا تعین کرتے ہیں۔ شخصیت اور عہد ساز انقلاب کا یہ اتصال اتنی گہری اہمیت و معنویت کا حامل ہوتا ہے کہ اس کے بغیر تاریخ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا لینن اور انقلاب روس کے بغیر حال ہی کی تاریخ کو تصور کی آنکھ سے دیکھیے تو آپ کے پردۂ ذہن پر ایک ایسی دُنیا کا بھیانک نقشہ ابھرے گا، جو نور و ظلمت اور خیر و شر کی آویزش کو جھیلتی اور ابھی غارت گری کے خدشے میں اُکھڑی سانسیں لیتی ہوئی ہماری موجودہ دُنیا سے کہیں زیادہ بھیانک دنیا ہوگی —— تاریکی، دبیز اور محض تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی دُنیا، جس میں ظلمت ہی ظلمت ہوگی اور شر ہی شر۔

لینن اور انقلاب روس کے فکری عوامل خصوصاً تیسری دُنیا کے باشعور ذہنوں کو آج بھی انگیز کر رہے ہیں اور تیسری دنیا میں ہی نور و ظلمت اور خیر و شر کی ابدی (اور شاید ازلی؟) آویزش اپنی تمام تر خوں آشامی کے ساتھ جاری ہے۔ تیسری دُنیا میں ظلمت پسند طاقتیں، جن کے پیچھے صدیوں پرانے بوسیدہ افکار کارفرما ہیں اور جو سامراج کے فراہم کردہ جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں، نور و خیر کی طاقتوں کو زیر کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جو نہتی ہیں اور محض نئے افکار کے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔

تیسری دُنیا کا زندہ اور باشعور ذہن کیسی صورت حال سے دوچار ہے، اس کا احساس اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ خیر و شر اور نور و ظلمت کی اس لڑائی میں تیسری دُنیا کا یہ نوجوان ذہن بظاہر ترقی پسند قوتوں کو ظلمت پرست طاقتوں کی پشت پناہی کرتے ہوئے بھی دیکھتا ہے اور ترقی پسند طاقتوں کو انھیں آنکھوں سے دست بگریباں بھی دیکھ رہا ہے۔

اس صورتِ حال سے آنکھیں دوچار کرنے کے لیے ہیرے کی آنکھ اور پتھر کا جگر چاہیے۔ تیسری دُنیا کا زندہ اور باشعور ذہن اس حالت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا ہے اور اس اندھیری بھول بھلیاں سے باہر نکلنے کی راہ تلاش کر رہا ہے۔ اس راہ میں ہزار دام، ہزار خطرات و آفات پوشیدہ ہیں، جن کا تیسری دُنیا کا باشعور ذہن بخوبی احساس رکھتا ہے۔

خطرات و آفات کے اس نرغے میں اس کا سینہ اس یقین کی روشنی سے معمور ہے کہ سچائی ہزار خطرات و آفات اور پے در پے شکستوں کے باوجود، فتحیاب ہوئی ہے اور فتحیاب ہوگی۔

ان زندہ و جاوید ذہنوں کے لیے اگلے صفحات میں لینن کی زندگی کے چند ولولہ انگیز اوراق شائع کیے جا رہے ہیں، جو "نیسلی نوٹ بک" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ ان کا ترجمہ مصنف مانو نیل کرکیچ کے وارثوں اور اس کے ناشروں سے جملہ حقوق حاصل کیے بغیر شائع کیا جا رہا ہے کہ تیسری دُنیا کے باسیوں کی اکثریت ابھی زندگی کے جملہ حقوق محفوظ کرنے کی جدوجہد میں سرگرداں ہے۔ ■

بہت سے فنکاروں اور ادیبوں نے اپنے ہم عصروں کے لیے اور آیندہ نسلوں کے لیے لینن کی زندگی کی تصویر کشی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور مشہور سوویت ادیب عمانوئیل کزاکیویچ (۱۹۶۲-۱۹۱۳ء) کی "نیلی نوٹ بک" اس سلسلے میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

نیلی جلد والی نوٹ بک واقعی تھی، جس میں لینن نے اپنی مشہور تصنیف "ریاست اور انقلاب" کے لیے نوٹس لکھے تھے۔ "ریاست اور انقلاب" لینن نے اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب سے پہلے کے دشوار دنوں میں لکھی تھی جب وہ رازلف میں روپوش تھا اور جہاں سے وہ مسلح انقلاب کی تیاری کے لیے ہدایات جاری کیا کرتا تھا۔

سوویت ڈرامہ نویس اور لینن انعام یافتہ، نکولائی پوگودن، جس نے لینن پر کئی مشہور عالم کھیل لکھے، "نیلی نوٹ بک" کے بارے میں کہتا ہے: "ایک باصلاحیت قلم نے ہمیں ایک سچا ادبی شاہکار دیا ہے، جس میں لینن کا عظیم دل زندہ ہے، پھڑکتا ہے، دھڑکتا ہے۔"

عمانوئیل کزاکیویچ ۱۹۱۳ء میں یوکرین میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسکول میں پڑھاتا تھا۔ کزاکیویچ کی پہلی کتاب، اس کی نظموں کا مجموعہ تھی جو ۱۹۳۲ء میں چھپی۔ نثر کی پہلی کتاب، ناول "ستارہ" تھی جو کہ جنگ کے بارے میں ایک بڑی نازک، حساس لیکن تلخ کہانی تھی۔ "ستارہ" نے اسے تمام دنیا میں متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد "اودر کی بہار"، "دل دوست"، "اسٹیپ میں"، "چوک میں ایک گھر" اور "دن کی روشنی میں" شایع ہوئیں ——— "نیلی نوٹ بک" اس کی آخری تصنیف تھی۔

کزاکیویچ کا دوست اور ہم عصر ادیب الیکسانڈر تواردوفسکی کہتا ہے: "عمانوئیل کزاکیویچ ایک زبردست سیاح، شکاری اور نشانہ باز تھا۔ پارٹی کا روح رواں۔ فقرے چست کرنا اور ہنسی مذاح اس کی فطرت تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک بہت ہی جرأت مند بہادر سپاہی تھا۔"

کزاکیویچ دوسری جنگ عظیم میں ایک پلاٹون کا کمانڈر تھا۔ پھر اسے بریگیڈ کے اخبار کے عملے میں شامل کر لیا گیا۔ بعد میں اسے پھر محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ وہ اکثر کہا کرتا: "محاذ جنگ میرے لیے محض اس واسطے اہم نہیں کہ میں محب وطن ہوں، بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ میں ایک ادیب ہوں۔"

اس ترجمے کی کہانی

. . . تو پہلے " بلیونوٹ بک " کے اس ترجمے کی کہانی سن لیجیے۔

مہینہ ستمبر کا اور سن ۱۹۷۰ء تھا کہ پاک ٹی ہاؤس میں ایک صبح زاہد ڈار نے مجھے عمانوئیل کراکیو تیج کی " بلیونوٹ بک " دی اور کہا: " ڈاکٹر یہ بہت اچھا، سوہنا، چھوٹا سا ناول ہے۔ اسے پڑھو ——— زاہد مجھے اکثر بہت اچھی اور سوہنی چیزیں پڑھاتا رہتا ہے۔ انگریزی ترجمے کے ایک سو ساڑھے چار صفحات کا ناول میں نے رات بھر میں پڑھ ڈالا اور اگلی صبح زاہد سے کہا کہ " بلیونوٹ بک " واقعی ایک بہت اچھا، سوہنا اور چھوٹا سا ناول ہے۔ زاہد نے کہا کہ اس کا ترجمہ اردو میں ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ زاہد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور کہا: " اس کا ترجمہ تم کرو! " میں نے اپنی مصروفیات کے حوالے سے کہا: " چونکہ اس کا ترجمہ فوراً ہونا چاہیے اس لیے احمد مشتاق سے کیوں نہ کہیں؟ وہ بہت اچھا ترجمہ بھی کر لیتا ہے۔ . . " زاہد ڈار نے کہا: " نہیں۔ اس کا ترجمہ تم کرو۔ " میں نے صرف اتنا کہا: " اچھا! " زاہد نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا، اور بس۔

عصری سیاست کے سیاق و سباق میں زاہد ڈار کا کہنا بالکل بجا تھا کہ " بلیونوٹ بک " کا ترجمہ فوراً ہونا چاہیے ——— میری مصیبت یہ ہے کہ دنیا میں چوبیس گھنٹوں میں بٹے دن رات اگر بہتر گھنٹے کے ہوتے تو میں " بلیونوٹ بک " کو ترجمے کے لیے فوراً اپنے قلم کی زد میں لے آتا۔ پھر بھی ہر رات سونے سے پہلے میں " بلیونوٹ بک " کو پڑھتا ضرور تھا ——— کراکیو تیج کے اسلوب، نثر کے اختصار، خوبصورتی اور نغمگی کو خوب خوب ذہن میں سمیٹتا۔ ایک سو ساڑھے چار صفحات مجھے کئی ساڑھے چار ہزار صفحات والے ناولوں پر بھاری لگتے اور میرا یقین پختہ ہو جاتا کہ یکسوئی اور کافی وقت نہ ہونے کے باعث میں " بلیونوٹ بک " کا ترجمہ کبھی نہ کر سکوں گا۔

تب حکومت پنجاب کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے یہ مسئلہ حل کر دیا ——— نقص امن عامہ کے کسی سیکشن نمبر ۳ اور اس کے دیگر لوازمات کے حوالے سے مجھے ایک خطرناک شخص گردان کر، کہ جس کے ہاتھ سے عوام کے جان و مال کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، حکومت پنجاب کی طرف سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب بہادر لاہور نے اپنے ایک حکم سے مجھے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو میرے کلینک سے گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل میں نظر بند کر دیا۔ جیل مینوئل (جیل کے اصولوں کا

ٹ : وائی ایم سی اے بلڈنگ، دی مال، لاہور۔

ٹ : یعنی غزلیں تو اچھی لکھتا ہی ہے۔

ایک دھندلا سا ٹائپ شدہ کتابچہ) کے مطابق ہم ایسے قیدی 'با مشقت' نہیں ہوتے۔ جیل کی زبان میں مشقت کے لیے قیدیوں کے جانے کو 'پنجے' پر جانا کہتے ہیں۔ جیل مینوئل کے (غالباً) انھوں کے مطابق قیدیوں کو پانچ پانچ کی ٹکڑیوں پر لگایا جانا چاہیے۔ پر جیل کا حاکم، جسے عرفِ عام میں جیل سپرنٹنڈنٹ کہتے ہیں، بہت کرشمہ ساز ہوتا ہے۔ وہ جو چاہے، اپنی حسین کرشمہ سازی کے بل بوتے پر کر سکتا ہے۔ یعنی جب چاہے جیل مینوئل کو ابوجہل مینوئل بھی بنا سکتا ہے۔ لہٰذا جب ایک قیدی مشقت کر رہا ہے تو بھی وہ 'پنجا' ہوگا اور اگر سو قیدی ایک وقت میں ایک جگہ مشقت پر لگے ہیں تو وہ بھی 'پنجے' پر لگے ہوں گے (ہو سکتا ہے، یہ 'پنجا' وہ نہ ہو جو میں پانچ کے حوالے سے سمجھا ہوں، بلکہ وہ پنجہ ہو، خونیں پنجہ وغیرہ والا)۔ بہرحال، اس پنجے کو اس کام سے موسوم کرتے ہیں جو قیدی کی مشقت ہوتی ہے۔ یعنی اگر کسی قیدی کی مشقت گھاس کاٹنے کی ہے تو وہ 'بوٹی پنجا' کر رہا ہوگا۔ پہلوان مارکہ قیدیوں کی مشقت اگر کوڑے لگنے کی ریہرسل کرنا ہے تو وہ 'ہنٹر پنجا' کر رہے ہوں گے، وغیرہ۔ میں چونکہ "بلیو نوٹ بک" اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وافر وقت کے باعث اس کے ترجمے میں لگا رہتا تھا (کہ خدا نے زاہد ڈار کی سن لی تھی اور مجھے اب فرصت ہی فرصت تھی)، اس لیے جہانگیر بدر کو جب یہ پتا چلا کہ میں لینن کے بارے میں ایک ناول کا ترجمہ کر رہا ہوں اور اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تو اس نے میری اس رضا کارانہ مشقت کو 'لینن پنجے' کا نام دیا۔ دوسرے تمام ساتھی اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے اور بعض اوقات ناراض بھی ہوتے کہ میں تھوڑی سی چہل قدمی اور طعام کے علاوہ "بلیو نوٹ بک" سے کیوں چمٹا رہتا ہوں۔ ایک یہاں احسان الحق (لاہور والے) ہی تھے جو اس سلسلے میں میرے لیے کافی، چائے، سگریٹوں اور بسکٹوں کی سپلائی لائن ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔ دوسرے خان عبدالرؤف خان جو اپنی ذیابیطس کے باعث کمزوری کے باوجود کھلنڈرے دوستوں کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور میرے ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ یعقوب جو اپنی کمر کی ہڈی کی شدید تکلیف کی وجہ سے تخت کے بستر پہ لیٹے لیٹے ہر نماز کے بعد (کہ خان رؤف کے علاوہ یہ بھی الحاج ہیں)، میری صحت کے لیے دعا کرتے کہ قریباً انیس بیس گھنٹے روزانہ "بلیو نوٹ بک" کی رفاقت میں کہیں میں ہی نیلا نہ پڑ جاؤں۔ البتہ سردار مظہر علی خاں وقتاً فوقتاً بے صبری کا مظاہرہ کرتے رہتے کہ ترجمہ جلدی ختم کرو (جیسے ابھی چھاپ دیں گے)۔

میں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۷ء کی شام میں پہلا مسودہ ختم کر کے، ۱۹۷۸ء کے پہلے لمحے پر یہ مسودہ دوستوں کو نئے سال کے تحفے کے طور پر پیش کیا۔ پھر دو روز بعد ایس۔ ایم۔ مسعود، اسلم گورداسپوری اور شمیم احمد خان بھی ہم سے جیل میں آن ملے۔ اور چند ہی روز میں ان احباب کے پلنگوں پر میں نے دوسرا ڈرافٹ بھی تیار کر لیا ——— پھر رہائی ہو گئی اور معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا اور آخری مسودہ تیار نہ ہو سکا۔

دو ماہ بعد ربّ العزت نے زاہد ڈار کی پھر سن لی۔ حکومتِ پنجاب کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ان ہی خدشات اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کے حکم کے ان ہی لوازمات کے ساتھ میں ایک بار پھر ۹ مارچ ۱۹۷۸ء کو جیل میں تھا۔ جہاں اس مرتبہ ساتھیوں کی تعداد ماشاء اللہ دوگنی بلکہ تگنی تھی جن میں ملک معراج خالد اور شیخ رفیق بھی تھے۔ "نیلی نوٹ بک" اور اس کا دوسرا ڈرافٹ میں نے گھر سے منگوا بھیجا۔ اب کی بار تو ملک معراج خالد کی سرپرستی، شفقت اور حوصلہ افزائی بھی تھی۔ تو یوں (اب تک آخری) نظربندی کے دوران میری 'لینن پنجے' کی مشقت کا اختتام ہوا۔

۲۰ اپریل کو اپنی رہائی کے بعد میں نے زاہد ڈار کو خوشخبری سنائی کہ "بلیو نوٹ بک" کے ترجمے کا آخری مسودہ تیار ہے۔ اب مجھے تم پھر کوئی بہت اچھا، سوہنا، چھوٹا سا ناول نہ دے دینا۔ جیل میں گرمیاں عذاب در عذاب ہوتی ہیں ———
وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر مسکرا دیا۔ پھر میں نے کہا: "چونکہ ترجمے کے لیے تم نے مجھ سے کہا تھا، اس لیے اب تم اس کی

نظر ثانی کر لو۔" زاہد نے بڑے اطمینان سے کہا: "میں نے تم سے کب کہا تھا؟" جب میں نے انتظار حسین، احمد مشتاق، شہرت بخاری اور شاہد حمید کی گواہیاں پیش کیں تو اس نے کہا: "میں ویلا بندہ نہیں ہوں، معروف آدمی ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہارے مسودے کو پڑھتا پھروں۔" اب میری مصیبت یہ ہے کہ میں زاہد کی رائے کو بہت اہمیت دیتا ہوں لیکن وہ ویلا بندہ نہیں، بہت معروف آدمی ہے۔ اس سے ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب چمٹی رہتی ہے۔ ٹی ہاؤس میں بھی جانا ہوتا ہے۔ ٹی ہاؤس سے باہر کسی کھمبے کے ساتھ لگ کر اس کے ساتھ لگے مرکری بلب کو روشن بھی کرنا ہوتا ہے۔ پیدل گھر آنا جانا بھی ہوتا ہے۔ اپنے عشق میں جلنا مرنا بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ نظم بھی لکھنی ہوتی ہے، سو وہ تو بہت معروف آدمی ہے...

سو یہ نظر ثانی والا کام میں نے پروفیسر سہیل احمد خان سے کرایا ہے کہ یہ شخص بھی معتبر مانا جاتا ہے اور اتنا معروف بندہ بھی نہیں ہے۔ اس ترجمے کے جتنے محاسن ہیں، ان کی تمام تر ذمے داری میں قبول کرتا ہوں اور اگر آپ کو اس ترجمے میں عیوب بھی نظر آجائیں تو اس کی ساری ذمہ داری سہیل احمد خان پر عائد ہوتی ہے کہ اس ترجمے کو اسی نے او۔ کے کا سگنل دیا ہے۔

میں نے یہ ترجمہ کیسا کیا ہے؟ اچھا کیا ہے؟ یہ آپ جانیں...

مجھے یہ ترجمہ پسند ہے۔ میں ترجمے کے لوازمات، باریکیات، تکنیکیات، جمالیات، باقیات، الصالحات اور وغیرہ وغیرہ یات پر کوئی عالمانہ اور محققانہ مقالے کو احاطۂ تحریر میں لانا نہیں چاہتا کہ میں پیشہ ور مترجم ہوں نہ عالم اور نہ ہی محقق۔ میں نے آج تک چند کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے جو میرے دل کو لگی تھیں۔ یہ پہلا ناول ہے، جو میرے لیے ایک تجربہ، ایک واردات بنا۔ لہٰذا اس پر میں نے "قلم درازی" کی۔ کرداکیوچ کے اسلوب نثر کے اختصار، خوبصورتی اور نغمگی کو میں نے اردو انے میں بڑی محنت کی ہے۔ اگر میں اس ترجمے میں "انور سجادیت" سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تو اسے میری شخصیت کی خامی جانیے، ترجمے کی کمزوری نہیں۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ "بلیو نوٹ بک" کا ترجمہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں ہی کہیں چھپ جانا چاہیے تھا۔ پھر سوچتا ہوں کہ تیسری دنیا کے ہمارے ایسے حالات والے ممالک میں ایسی کتابوں کے ترجمے جب بھی شایع ہو جائیں، تو سمجھو وقت پر ہی شایع ہوئے ہیں۔

"بلیو نوٹ بک" کا انگریزی ترجمہ رالف پارکر اور والنتینا سکاٹ نے بہت غضب کا کیا ہے۔ ظاہر ہے، میں نے یہ ترجمہ انگریزی کے غضب کے ترجمے سے کیا ہے۔

جانے روسی میں اس ناول نے کیا غضب ڈھایا ہوگا۔

اردو میں یہ ترجمہ کیا غضب ڈھائے گا!

کیا غضب ڈھائے گا؟

میرا ملک تیسری دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے، جہاں ادب تو کیا، کوئی چیز بھی غضب نہیں ڈھاتی۔ سوائے غضب والے غضب کے...

——— انور سجاد

نیلی نوٹ بک

مدھم چاندنی، زرد رو شمالی آسمان میں پھیل رہی تھی۔
اور جھیل کی پُرسکون سطح پر تیرتی دو کشتیاں۔
لینن، اگلی کشتی کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں دُور، ساحل کی دودھیا دُھندلاہٹ میں گڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا ——— اگر جھیل کے پار، وہاں سبزہ زاروں میں خاموشی اور سکون ہوا اور اس نے خود کو دشمن کی نظروں سے محفوظ سمجھا تو وہ اپنی نیلی نوٹ بک منگوا بھیجے گا اور اپنے ایک نہایت اہم پمفلٹ کو مکمل کرلے گا جو ایک عرصے سے اس کے ذہن میں تھا۔

اس نے ایک بار پھر دودھیا فاصلے کو بڑے غور سے دیکھا اور سوچا ——— کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے آنکھیں موند لو ——— پہلے کبھی اس نے یوں نہیں سوچا تھا۔ اب وہ آنکھیں موندے کشتی کے کنڈوں میں گھومتے چپوؤں کی صرف آوازیں سُن سکتا تھا۔ اسے اب احساس ہُوا تھا کہ وہ کشتی میں سوار ہے اور اس کے سر پر پھیلے آسمان کی لامحدود وسعتوں میں، دُھند میں لپٹا چاند دھیرے دھیرے بائیں جانب رینگ رہا ہے۔

ایک عرصے کے بعد اسے گہرا سکون محسوس ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھاگتا رہا ہے، دوڑتا رہا ہے۔ مہینوں، کہیں بھی رُکے بغیر۔ مکان، گلیاں، بازار، شہر قریب سے گزرتے رہے۔ لوگ، ان گنت لوگ۔ ان گنت لفظوں کے شوریدہ ریلے، مختلف آوازوں سے بہتے ہوئے، اور اُبلتی، چبھتی سرگوشیاں۔ روسی لفظ، غیر زبانوں کے لفظ، سادہ لفظ، سائنسی لفظ، ظالم لفظ، کومل لفظ۔ لفظ کہ جو انتہائی قیمتی تھے۔ لفظ کہ جو قابلِ نفرت تھے۔ لفظوں کا دباؤ اس کے چاروں اور، اس کو کھلبلاتے ہوئے لفظ، جو اس کی یوں مدارات کرتے تھے جیسے ہوائیں، دوڑ لگانے والے کھلاڑی کی کرتی ہیں۔ اب وہ بھاگتا بھاگتا یکدم رُک گیا تھا اور اس لمحے اس نے اپنے آپ کو زرد رُو آسمان تلے، گہرے پانیوں پر دھیرے دھیرے چلتی کشتی میں پایا تھا۔ لفظوں کے وار رولے اور اڑتے ہوئے چہرے یکدم ساکت ہو گئے تھے اور ذہن پر پڑتے، کٹھن مسائل کے ہتھوڑے یک لخت فضا میں جامد ہو گئے تھے۔ اب کشتی کے کنڈے چپوؤں کی گردش سے ہولے ہولے چرچرا رہے تھے۔ کشتی کے ساتھ لپٹتا پانی خمار میں غرغرا رہا تھا۔

ساحل قریب آرہا تھا۔ اگر کہیں سے کشتی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جاتی تو یہ غیر متوقع نہ ہوتی کہ لینن کا اتہ پتہ جاننے والوں کی زبان سے ایک لفظ یا رازداری کے اصولوں میں ذرا سی بے قاعدگی بھی ساحل پر ایک ایک درخت کے پیچھے ایک ایک کارک سا فوجی کیڈٹ کو لا چھپاتی۔ لینن کی آنکھوں میں اس کارک کا چہرہ گھوم گیا جو اسے پچھلے اتوار کو توریدا محل کے قریب نظر آیا تھا۔ یہ

ایک گونگا، اندھا چہرہ تھا، اس کی بناوٹ پر گھنی دھاریوں کی طرح سُرخ ——— ہو سکتا ہے وہی کاؤنٹ اس وقت ساحل پر کسی درخت کے پیچھے چھپا ہو۔ لینن نے سوچا ——— چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چہرے پر نہ ہونے کے برابر، جو اپنے نشانے کے سوا اور کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہیں۔

لینن کو کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ دراصل الیانوف کی زندگی اسے پیاری نہیں۔ الیانوف جو سینتالیس برس پہلے سمبرسک میں پیدا ہوا تھا جس نے ڈھیروں کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور جس نے پہاڑوں کے پہاڑ کاغذ لکھ ڈالے تھے، اب بہت تھک گیا تھا۔ دردِ سر اور بے خوابی نے اسے آن گھیرا تھا۔ وہ اچانک، بلا تکلیف موت سے خوف زدہ نہیں تھا کہ وہ بچپن ہی سے جانتا تھا، خوب جانتا تھا کہ وہ غیر فانی فطرت کا ایک فانی ذرہ ہے لیکن لینن کی زندگی کو ہر صورت بچانا ہوگا کہ وہ روس کی سب سے عظیم انقلابی جماعت کا دماغ ہے۔

انقلاب کو بہر صورت اس کی زندگی کی ضرورت تھی جبکہ دشمن ہر صورت اس کی موت چاہتے تھے۔ قدرتی طور پر اتنے برسوں میں اس نے انقلاب کی تیاری کے ساتھ ساتھ خود کو بھی سختیوں سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس نے یورپ کے شہروں کی کئی گلیوں، کئی پہاڑی راستوں کو پیدل طے کیا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے یورپ کے دریاؤں، جھیلوں میں تیرا تھا۔ میل ہا میل سائیکل سواری اور سکی اینگ۔ انقلاب کی خاطر کہ خود کو جسمانی طور پر اتنا مضبوط بنا لے کہ جب انقلابی کارروائی کا وقت آئے تو جسم اذیتوں کے سامنے جھک نہ جائے۔ پہلے کبھی اس نے اپنی ذات، اپنے وجود کی اہمیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ پر اب سے صرف تین ماہ پہلے جب وہ دس برس کی ہجرت کے بعد پیٹروگراڈ واپس آیا تھا، تب اسے مکمل طور پر احساس ہوا تھا کہ متقاضی حالات میں اس کا کردار کیا ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے فن لینڈ سے واپسی کے سفر کو یاد کیا، کچھ ایسی بے یقینی سے جیسے زمانہ قبل از تاریخ کے کسی واقعے کو یاد کر رہا ہو۔ وہ ایک سنسنی خیز، جرأت مند سفر تھا۔ ریل گاڑی میں بیٹھے وہ اور اس کی بیوی فکر مند ہو گئے تھے کہ ان حالات میں رات کے وقت جب گاڑی پیٹروگراڈ پہنچے گی تو وہ شیروکایا اسٹریٹ میں آنا ایلیچینینا کے گھر کیسے جائیں گے؟ انھیں ایسٹر کی رات میں اسٹیشن سے سواری مل جائے گی؟ جب اسے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کا سیلاب نظر آیا اور اس نے ملاحوں کے دستوں کو اسے گارڈ آف آنر پیش کرنے کی خاطر قطار در قطار دیکھا اور پھر اسٹیشن کے شاہی دروازے پر کھڑی بکتر بند گاڑیوں اور فوجی سرچ لائٹوں سے منور چوک میں لہراتے سُرخ پھریروں اور "لینن، خوش آمدید" والے کتبوں کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ جلا وطنی میں، انقلاب کے بارے میں اس کے اندازے غلط تھے۔ اس کی غیر حاضری میں تو بہت کچھ ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں تو اسے یوں لگتا تھا کہ محض معمول کی کارروائی ہے جس کے اثرات بیرونی ملکوں پر بالکل صفر ہیں۔ تھکا دینے والی، بے ثمر کارروائی جس کی حیثیت شہنشاہیت کے جسم پر مچھر کے کاٹنے سے زیادہ نہیں۔ وہ خاموش، معمول کی کارروائی اب پیٹروگراڈ کے کارکن شگورین کے دم سے کتنی روشن تھی۔ شگورین، جس پر اسٹیشن کے ہجوم میں اس کی نظر پڑ گئی تھی اور جس نے پیرس کے نزدیک لان ژومیو کے پارٹی اسکول میں تربیت حاصل کی تھی۔

بکتر بند گاڑی پر چڑھ کر لینن نے چاروں اور دیکھا۔ اسے ٹوپیوں کا سمندر پھیلا نظر آیا۔ اسے اپنے غیر ملکی سیاہ بولر ہیٹ پر خفت سی محسوس ہوئی کہ انقلابیوں میں گھرے، بکتر بند گاڑی پر کھڑے اس شخص کی ٹوپی اور ان کی ٹوپیوں میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ اس نے اپنا بولر ہیٹ آتارا، ہمیشہ کے لیے اور اپنی مٹھی کی اوٹ میں کر لیا۔ بعد میں اس نے یہ ہیٹ بکتر بند گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ والی جگہ پر رکھ دیا۔ یہ ڈرائیور بکتر بند دستے کا سپاہی تھا۔

جب اس کی بکتر بند گاڑی ہزارہا لوگوں میں گھری پیٹروگراڈ کی سڑکوں سے گزر رہی تھی تو لینن کو یاد آیا کہ وہ ریل گاڑی میں، اسٹیشن سے سواری لینے کے سلسلے میں کتنا پریشان تھا۔ پھر اس خیال کے آتے ہی وہ یکدم اداس ہو گیا کہ اب وہ شاید کبھی یوں ریل گاڑیوں، عام سواریوں میں سفر نہیں کر سکے گا۔ اب شاید اس کی زندگی اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہے گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ یا تو اسے انقلابی روس کی قیادت کرنا ہو گی یا مر جانا ہو گا۔

ایسے سمے اسے اودیسی کی عمیق رمزیت بھی یاد آتی کہ اپنی نصف زندگی، اپنی جنم بھومی ایتھاکا کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد اودیسس جب اپنے شہر کے ساحل پر پہنچا ہے تو اپنی جنم بھومی کو پہچان نہیں پاتا، اور اس نے، لینن نے اپنے ایتھاکا کو فوراً پہچان لیا تھا، لیکن اسے فوراً ہی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کا اودیسس بھی ہے۔

ان ہی دنوں اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ انقلاب کا ایک غیر معمولی نبض شناس ہے۔ انقلاب کا جوار بھاٹا، اس کا بہاؤ، اس کی زیریں لہریں۔ پہلے کبھی اس کی نظریں اتنی گہرائی میں نہیں اُتری تھیں۔ پہلے کبھی اس نے ان اندرونی جھرنوں کو شناخت نہیں کیا تھا جو لوگوں کے اکٹھ اور تنظیموں کا منبع تھے۔ پہلے وہ کبھی اتنی آسانی سے زیادہ اور کم اہم معاملات میں تخصیص نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوران میں اس نے اپنے پارٹی ساتھیوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ ان کے تجربے، انقلابی گرمجوشی، تقریری، تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں کی منصفانہ جانچ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ خود اگر ان میں موجود نہ بھی ہو تو ساتھیوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اس کی جگہ لے سکتے ہیں۔ روسی انقلاب کا دار و مدار ایک ہی شخص نہیں تھا۔ لیکن بہر حال اس انقلاب نے اس کے اپنے وجود میں ایک ایسے شخص کو لا کھڑا کیا تھا جو اسے شفاف ترین شکل اور مسلسل ترین لہجہ دے سکتا تھا۔

لینن آنکھیں موندے، کشتی میں ساکت بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو سکون کے حوالے کر دینے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ یہ سکون ایک خواب ہے۔ کسی بھی لمحے دن بھر کے مسائل اس کے سامنے عفریت کی طرح سر اُٹھالیں گے اور اسی لمحے اس کی نبض شناسی کے حوالے سے اس کے حالیہ تجربات اور آگاہیاں اس کے دل تک پہنچیں گی۔

اسے بے حد گہری تشویش تھی، اپنی بیوی نادیژدا کونستانتینووا اور اپنی بہنوں کی خوشحالی کے لیے، اور اپنے پارٹی ساتھیوں کے لیے بھی، جن کے ساتھ ذرا سنکرپچ ہونے کے باوجود اسے اتنا ہی لگاؤ تھا۔ اور پھر پارٹی کے مرد، عورتیں جن میں سے کئی زندگی سے بھرپور تھے، کئی صوفی منش تھے، کئی شعلہ وجود اور کئی کم گو، لیکن سب کی ایک ہی لگن، ایک ہی مقصد کے لیے متحد، اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے لیے تیار۔ ان کارکنوں، سپاہیوں، ملاحوں کی زندگیوں، ان کے خوابوں کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری اس کے کاندھوں پر تھی، جن کے چہرے اس کی آنکھوں میں لشک لشک جاتے تھے۔ اس نے بڑی نرمی سے پلٹتے ہوئے مشکل تصورات اور پیچیدہ سیاسی مسائل کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی کہ یہاں اسے ان سب خیالات سے دور رہنا تھا کہ اسے اب زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ جب وہ ان خیالات سے پیچھا نہ چھڑا سکا تو اس نے آنکھیں کھول دیں کہ وہ ان سے بھی اسی طرح نپٹ لے جیسے تیراک لہروں کو اپنے سینے پر لیتا ہے۔

جب لینن نے آنکھیں کھولیں تو جھاڑیاں اسے بالکل قریب نظر آئیں۔ چھوٹے چھوٹے درختوں، جھاڑیوں کی دیوار سی کنارے تک آن پہنچی تھی اور لہریں کنارے سے پلٹ کر کشتی سے ٹکرا رہی تھیں۔ دو ایک لمحے کشتی کنارے پر پہنچ گئی۔

■■ □□

یمیلیانوف نے چپو رکھ کر بیٹھے ہی بیٹھے لمحہ بھر کے لیے غور سے سننے کی کوشش کی، کنارے پر کوئی آہٹ، سرسراہٹ۔ پھر وہ اٹھا، کشتی سے کنارے پر اترا اور کشتی کو کنارے پر کھینچ لیا۔ کولیا کشتی سے کود کر کنارے پر آ گیا۔ دوسری کشتی بھی آ کے اس کشتی کے ساتھ لگ گئی۔ کشتیوں کے مسافروں میں ہلکی سی کھلبلاہٹ، مختصر سی سرگوشیاں ہوئیں۔ قریب ہی ایک بگلا بالکل انسانی آواز میں چیخا۔

لینن نے جھک کر اپنے پیروں میں پڑے، کاغذوں سے بھرے آتشی کیس کو اٹھایا اور بغل میں دبا کے کنارے پر اتر آیا۔ یمیلیانوف نے کنارے، کشتیوں اور لوگوں پر یوں اچٹتی سی نگاہ ڈالی جیسے وہ یہاں کا مالک ہو۔ اس نے لینن سے کہا: "آیئے چلیں . . ."

وہ آگے آگے چل پڑا، اس کے پیچھے لینن۔ زینوویف اور یمیلیانوف کے چار بیٹے ——— کولیا، ساشا، کوندراتی اور سرجی ایک قطار میں لینن کے پیچھے ہو لیے۔ شروع میں زمین نرم تھی جس پر قدم پڑنے سے کچھ چوسنے کی آوازیں نکلتی تھیں۔ جونہی وہ آگے بڑھتے گئے زمین سخت ہوتی گئی۔ فضا میں دلدل اور سبزہ زاروں کی گھاس کی خوشبو معلق تھی۔

یمیلیانوف راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ لینن کو یہاں لانے سے پہلے اس نے اس علاقے کو اچھی طرح کھنگال لیا تھا۔ ایک مرتبہ تو وہ رات میں بھی یہاں آ کر سب دیکھ گیا تھا۔ سو وہ بڑے یقین کے ساتھ ذرا مٹک کر چل رہا تھا اور جی میں خوش تھا کہ اس نے ہر شے کی معمولی سے معمولی جزئیات پر بھی غور کر لیا ہے۔ تب وہ لینن کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اسے امید تھی کہ لینن اس بات کو ضرور محسوس کرے گا۔ اس کا دایاں کندھا سامان رسد سے بھری بوری کی وجہ سے جھک سا گیا تھا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ راستے میں کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوگی ——— پھر بھی جب لینن نے اسے کسی بھی قسم کے ہتھیار ساتھ رکھنے سے منع کیا تھا تو اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے پاس تین رائفلیں تھیں جنھیں اس نے تیل دے کر کئی درجن گولیوں کے ساتھ بڑی محفوظ جگہ پر چھپا رکھا تھا۔ اس نے لینن کو قائل کرنا چاہا تھا لیکن لینن نے اس کی سنی ان سنی کر دی تھی۔ اس نے ہنس کے فضا میں ہاتھ لہرا کے کہا تھا:

" . . . رائفلوں کو استعمال کرنے کا وقت بھی ضرور آئے گا۔ تب تک ان کی حفاظت کرو۔ تم نے بتایا نا کہ تم نے انھیں خوب تیل دے رکھا ہے . . . بہت اچھا کیا . . . جب ضرورت پڑے گی تو صرف تین نہیں بلکہ تین لاکھ رائفلوں سے کم پر نہیں مانوں گا۔ تین رائفلیں ہمیں بچا نہیں سکیں گی بلکہ گڑبڑ کی صورت میں ہم مذاق بن جائیں گے۔ مضحکہ خیز لوگ یا لاشیں۔ آج میں اور تم سیاست دان ہیں، سپاہی نہیں . . . !"

یمیلیانوف پارٹی کا پرانا محارب تھا۔ ۱۹۰۵ء اور اس کے بعد سے اس کے ہاتھوں سے کئی رائفلیں گزری تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہتھیار رکھنے سے بڑی سہولت رہتی ہے۔ جیب میں ریوالور، کندھے پر رائفل ڈال کے وہ اور زیادہ پُراعتماد ہو جاتا تھا۔ یمیلیانوف نے بڑبڑا کے لینن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

لینن نے جھونپڑی کی برساتی میں اس کے کنبے کے ساتھ کئی دن گزارے تھے۔ آلوؤں کا شوربا، باجرے کا دلیا اور مچھلی اُس کی غذا تھی۔ وہ یمیلیانوف کی بیوی نادیژدا اور اس کے بچوں کے ساتھ گھل کر باتیں کرتا، بعض دفعہ کپڑوں کی دُھلائی میں نادیژدا کا ہاتھ بٹاتا۔ وہ اس کنبے کی زندگی میں ہر طرح سے شریک تھا۔ یمیلیانوف کو اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جو اس کے پیچھے آ رہا ہے، لینن ہے۔ سارے روس کی زبان پر ایک لفظ تھا، لینن۔ ایک وقت تھا کہ اس نام سے صرف ایک محدود حلقہ واقف تھا۔ بالشویک پارٹی کے سربراہ، انتہائی ترقی پسند محنت کش اور بالشویکوں کے متحرک دشمن۔ لیکن اب کوئی بھی مضافاتی ریل گاڑی ایسی نہ تھی جس میں سفر کے دوران لینن کا نام سننے میں نہ آتا ہو۔ پیٹروگراد میں اس کی آمد پر ایک نئی آواز سنائی دی۔ حیرانا کن طور پر پوری

اور بلند آواز جو مضطرب، بےقرار روس کے بے ہنگم شوریدہ سروں سے ابھری اس نے دیکھتے دیکھتے دوسری تمام آوازوں کو ڈبو دیا، جیسے چیختی سیٹیوں، بے سُرے چلاتے ساؤنڈ آرگنوں اور جھنجھناتے بالالیکاؤں میں چیلنج کی نفیری پھونک دی گئی ہو۔ یہ نہیں کہ محنت کشوں، کارکنوں، خاص طور پر بالشویکوں کو اپریل سے پہلے اپنے طبقاتی مفادات کا پتہ نہیں تھا۔ وہ تو اس غیر مانوس سی نجات پر اُبل اُبل رہے تھے۔ ان کا اکثر وقت وفود سے ملنے، اجلاس کرنے، جاسوسوں کو پکڑنے اور ان گنت انتخابات میں گزرتا تھا۔ یمیلیانوف سیلیسترو رتسکس کے اسلحہ خانے میں ملازم تھا۔ وہاں کے مزدور کارکنوں نے اسلحہ خانے پر قبضہ کر کے میجر جنرل جابر اور اس کے نائب میجر جنرل دمیتریوفسکی کو معطل کر دیا تھا۔ توپ خانے کی مرکزی نظامت کو مجبوراً کارکنوں کے اس فیصلے پر تصدیق کی مہر ثبت کرنا پڑی تھی۔ کارکن بے حد خوش اور مطمئن تھے اور فخر سے سر اونچا کر کے چلتے تھے ــــــ اکیس مارچ کو کارکنوں نے جلسۂ عام میں پیٹروگراڈ کے بالشویکوں کے نمائندے کی تقریر کے بعد ایک قرارداد پیش کی کہ پرانی حکومت کے تمام نقوش مٹانے اور عوام کی فتح کو استحکام اور وسعت دینے کے لیے عبوری حکومت کے تمام اقدامات کے واسطے تمام محنت کشوں اور کارکنوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ پندرہ دن کے بعد اس قسم کی کسی بھی قرارداد کو پیش کرنا ناممکن ہوتا۔

لینن کی واپسی سے پہلے یمیلیانوف اور دوسرے بالشویکوں کے بھی کم و بیش وہی خیالات تھے جو لینن کے تھے لیکن یہ خیالات صرف گفتگو تک ہی محدود تھے۔ ان خیالات کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی، پختہ علم کا فقدان تھا اور یقینِ کامل کی کمی تھی۔ لیکن اس روز جب چیلنج کی نفیری بجی تھی، ہر کوئی دوسرے کو مبارکباد دینا چاہتا تھا، ایک دوسرے پر اعتماد کی خواہش رکھتا تھا، خاص طور پر وہ لوگ جن کے سینوں پر سُرخ فیتے سجے تھے۔

چاند بادل کے ٹکڑے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ یمیلیانوف کے کانوں میں اپنے پیچھے آتے لینن کے تیز قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا کہ وہ لینن کو تمام دشمنوں کی نظر سے اوجھل، جھاڑیوں کے دبیز پردے کے پیچھے چھپا رہا ہے۔ کیرنسکی، پوپوتسیف، ریبوت، لائیڈ جارج، کازکوں کی بارہ کوروں، روسی پولیس اور اتحادیوں کی تمام خفیہ پولیس کی نظر سے اوجھل۔ خوشی کی دھن میں یوں ہی چلتے چلتے اسے حیرت سی ہوئی کہ چیلنج کی نفیری بجا نکلنے والا چند ہی قدم اس کے پیچھے، سرمئی الیوٹینیف کا اُترے رنگ کا بھورا کوٹ اوڑھے، سر پر ڈھیلی سی ٹوپی پہنے اور بغل میں آماشی کیس دبائے چلا آ رہا ہے۔

درختوں میں گھری صاف جگہ نظر آئی تو یمیلیانوف نے کہا: "... ہم پہنچ گئے!"

لینن نے رُک کر چاروں اور دیکھا۔ سامنے سوکھی گھاس کے ڈھیر کے ساتھ لکڑی سے بنی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس نے اپنا آماشی کیس زمین پر رکھا اور چند قدم بڑھ کر جھونپڑی کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتا اس انداز سے واپس آیا جیسے ابھی گھاس کاٹنے کا کام شروع کر دے گا ــــــ اس نے پوچھا: "تمہارے پاس گھاس کاٹنے کے لیے ہنسیا اور پانچا ہیں؟"

"جی!" یمیلیانوف نے کہا: "... صبح مل جائیں گے..."

"ہمارے پاس یہ سب کچھ ہونا چاہیے کہ ہم بالکل پیشہ ور گھسیارے نظر آئیں۔"

"جی، بالکل۔ آگ جلاؤں؟"

"اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا؟"

"جی نہیں۔ دُور دُور تک کوئی ذی روح نہیں۔"

چند لمحے سوچ کر لینن نے کہا: "پھر بھی...؟ آج رات ضرورت نہیں۔ آج ہم آگ کے بغیر سوئیں گے۔ کل ہم اسے

علاقے کا جائزہ لیں گے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق منظم کریں گے . . . !"

مجھے مارشک، ساشا، کولیا، کونداتی اور سری آس پاس کے علاقوں کا جائزہ لینے چلے گئے۔ سب سے چھوٹا لڑکا تیرہ سالہ کولیا دور ہی رک گیا۔ وہ ایسے بڑھوں میں رہنا پسند کرتا تھا۔ زینودیف وہیں گھاس پر بیٹھ کر اپنے جوتے اُتارنے لگا۔ اس نے اپنے بائیں پیر کے گرد غلط طریقے سے پٹیاں لپیٹی تھیں جس کے باعث چھالے پڑ گئے تھے۔

لینن نے جھونپڑی کے دروازے پر جا کے اندر جھانکا، پھر اندر چلا گیا۔

". . . واہ!" وہ اندر سے چلایا: "بہترین گھر ہے۔ نرم، گرم اور خوشبودار!" اس نے سوکھی گھاس پر لیٹ کر خود کو پھیلا دیا اور دل ہی دل میں مسکرایا۔ پھر بولا: "اس گھاس میں وائرلیس کو بخوبی چھپایا جا سکتا ہے۔ اس وائرلیس سے پیٹروگراڈ سے رابطہ ہوگا۔ مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے نکولائی الیکساندرووچ۔ اور ہاں اخبار مجھے وقت پر ملنے چاہئیں . . . !"

"یقیناً ملیں گے۔" یمیلیانوف نے تاریکی میں برتنوں کو جھنجھناتے ہوئے کہا: "لو جی، یہ کام تو ہوا ختم۔ چلو بھئی لڑکو۔" اور وہ جھونپڑی سے باہر آ گئے: "راستہ یاد رکھنا، تاکہ یہاں کسی وقت بھی آسکو۔ میں تمھیں کشتیوں تک لیے چلتا ہوں۔ اور ہاں ساشا! کل تمھاری باری ہے اخبار لانے کی . . ."

لینن نے جھونپڑی سے کہا: "جھیل کے کنارے پر جا کر بلند آواز میں باتیں کرنا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں سے آواز کتنی صاف سُنائی دیتی ہے . . . کولیا! اندر آؤ!"

کولیا رینگتا ہوا جھونپڑی میں چلا گیا اور لینن کے پاس چوکڑی مار کے بیٹھ گیا۔ یمیلیانوف اپنے بڑے لڑکوں کے ساتھ چلا گیا۔ ان کے گھاس پر پڑتے قدموں کی سرسراہٹ جلد ہی معدوم ہو گئی۔ لینن نے کولیا کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے کہا: ". . . سنو!"

پندرہ منٹ گزر گئے پر کوئی آواز نہ آئی، بولنے کی یکشتی کر چپوؤں کی۔ لینن نے اطمینان سے سر ہلایا اور زینودیف سے پوچھا: ". . . اب سوئیں، گریگیری؟"

"تمھارا مطلب ہے کہ تم سو سکتے ہو! ولادیمیر ایلیچ!"

". . . ہاں!" لینن نے جواب دیا۔ پر وہ جانتا تھا کہ نیند اس سے کوسوں دُور ہے۔

"میں تو نہیں سو سکتا . . ."

". . . اوہو۔ اچھا! ہم وہ دو جانور ہیں جن کا پیچھا شکاری کر رہے ہیں۔ ہمیں اب جلد سو جانا چاہیے۔ لیکن کان جاگتے رہیں۔ اور تمھارے پیر کو کیا ہوا؟"

زینودیف نے بڑی سادگی سے اپنی بلند آواز میں کہا: "کچھ نہیں۔ یہ پٹیاں میں نے بڑی بے احتیاطی سے باندھی تھیں پیر کے گرد، اور اب چھالے پڑ گئے ہیں۔"

"اپنی بدبختیوں کو بھی فلسفیانہ انداز میں لینا چاہیے۔ ڈھلتے چاند کی رات فلسفے کو تاب دیتی ہے۔ اس برگزیدہ چاند نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جو کہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے شاید ایسے دانشوروں کو پہلی مرتبہ نہیں دیکھا جو پولیس سے چھپتے پھر رہے ہیں اور جنھیں یہ پتہ نہیں کہ پیروں پر پٹیوں کو کیسے لپیٹا جاتا ہے . . ."

"تمھیں تو ہمیشہ مذاق سوجھتا ہے۔"

انھیں قدموں کی چاپ سُنائی دی۔

"میں ہوں!" یسیلیانوف نے باہر تاریکی میں سے کہا۔

لینن اور کولیا جھونپڑی سے باہر آ گئے اور دروازے کے قریب گھاس پر بیٹھ گئے۔ یسیلیانوف بھی پاس بیٹھ گیا۔ لینن نے پوچھا، "تم نے کنارے پر باتیں کی تھیں؟"

"جی!"

"بلند آواز سے؟"

"جی!"

"کیا کہا تھا تم نے؟"

یسیلیانوف نے ہنس کر کہا: "۔ ۔ ۔ میں نے کہا تھا۔ ۔ فنستانی[1] سو گئے ہوں گے۔ کل علی الصبح اٹھیں گے اور کام میں جُت جائیں گے۔ برے لوگ نہیں۔ اچھے گھاس کاٹنے والے ہیں۔ اور ساشا نے جواب دیا تھا۔ ۔ 'بیچارے ہماری زبان نہیں سمجھتے۔ ۔ ' بس ایسی ہی باتیں۔"

"بہت خوب۔ بس، رازداری، اول۔ تو کنارے سے آواز یہاں نہیں پہنچی! یہ اچھا ہے۔"

زینوویئف کمبل لے کر جھونپڑی میں چلا گیا اور بستروں کا بندوبست کرنے لگا۔

"کل صبح ہم آگ جلائیں گے، آبا؟" کولیا نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو آگ میں جلاؤں گا۔ ہیں۔ ۔ ۔؟"

"اچھا۔ اب جاؤ سو جاؤ، شاباش بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"میں تھوڑی دیر اور نہیں بیٹھ سکتا؟"

"تم تو بس یہی چاہتے ہو کہ یہاں بیٹھے رہو، اور۔ ۔ ۔"

جھونپڑی کے اندر سے زینوویئف کے بستر لگانے کی چند آوازیں آئیں، پھر سکوت چھا گیا۔

"اس جگہ ایک گڑبڑ ہے۔" لینن نے دبی آواز میں کہا۔

"مچھر؟" یسیلیانوف نے خفت سے کندھے جھٹکائے: "جی، یہاں مچھر بہت ہے۔ خاص طور پر رات۔ ۔ ۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہاں رات میں بالکل کام نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔" یسیلیانوف نے کہا: "آپ آرام تو کر سکیں گے؟"

"تمباکو پینے والے خوش قسمت ہیں۔" لینن نے ذرا توقف سے کہا: "ایسی تاریک رات میں باہر بیٹھ کر پائپ پینا کتنا بھلا لگتا ہے۔ آدمی مصروف تو رہتا ہے۔"

"آپ کو پائپ چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا ہے کیا؟"

"میں نے کبھی تمباکو نوشی نہیں کی۔ میرے پاس اس عیاشی کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اور پھر پیسے بھی تو ضائع ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ہماری زندگی بڑی عسرت کی زندگی تھی۔ ایک ایک کوپک گن گن کر گزارا کیا کرتے تھے۔ ۔ ۔ اور پھر تمباکو نوشی تو جلا ہی برباد

---

[1] فن لینڈ کے باشندے۔

کرتی ہے۔ نیٹ، تم نہیں پیا؟ اچھا تو بُری سے۔ تمباکو سے تو آدمی بیکار۔ ۔ جلاوطنی یا روپوشی میں تمباکو اکثر نہیں ملتا۔ سو میں نے بہت بے کیف زندگی بسر کی ہے۔ میں نے کبھی تمباکو نہیں پیا، کبھی شراب نہیں پی، اور لڑکیوں کے ساتھ میرا کبھی اس قسم کا تعلق نہیں رہا۔ ۔ ۔" وہ ہنسا: " ۔ ۔ ۔ بہرحال یہ زندگی بھی دلچسپ نہیں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟ ہوں؟ اب یہ ہم جولی کی کوئی کہانی لگتی ہے! جھیل سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک جھونپڑی، خطرناک سازشی، فنستانی گھسیاروں کے بھیس میں! سو رہے ہو گریگوری؟ سو گیا ہے، تھک گیا ہے بیچارہ۔ اسے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ ۔ ۔"

لیکن زینوویف نہیں سو سکا تھا۔ اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کشتی میں اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اگلی کشتی جس میں لینن بیٹھا بمشکل نظر آتا تھا، اس سے آگے اسے سرمئی سا غار نظر آیا تھا اور زینوویف کو یکلخت یوں لگا تھا جیسے اگلی کشتی اس اندھے غار کے تاریک دہانے کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی اپنی کشتی بھی لینن کی کشتی کے ساتھ بندھی غیر ارادی طور پر اسی طرف رواں ہے۔ اس نے چیخنا چاہا تھا: رک جاؤ، نہ جاؤ، رکو۔ ۔ ۔

جولائی کے مظاہروں کی ناکامی کے بعد زینوویف نے ان حالات کا تجزیہ کیا تھا جن کے باعث یہ مظاہرے کچل دیے گئے تھے۔ اس کے ذہن میں کئی خامیاں، کئی شکوک ابھر آئے تھے۔ آج بھی اس کومل، خنک رات میں دھندلی جھیل کے کنارے ایک مرتبہ پھر شکوک و شبہات نے اسے گھیر لیا تھا ——— کیا ہمارے سفر کی سمت درست ہے؟ ہم اس دھند میں کھو تو نہیں جائیں گے؟ کیا لینن کی جرأت، پختہ دلی اور اٹل ارادوں میں فرقہ پرستی کو تو کوئی دخل نہیں؟ یا خود کو قربان کر دینے کی خواہش تو نہیں ہے؟ خواہشِ مرگ؟ اسے لگتا تھا کہ لینن انتہا پسند ہے۔ وہ ہر شے کو اس کی انتہا تک لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اتنا دانا نہیں۔ اس میں مناسب سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ وہ عوام کی تلون مزاجی پر نظر نہیں رکھتا ———" جو بھی ہو۔ ۔"
زینوویف نے بستر میں لیٹے، سردی سے کپکپاتے سوچا: "۔ ۔ یہ مٹھی بھر دانشور ہیں اور ان کے گرد پھیلا بے کراں روس جس میں لالچی کسان، دکاندار، شرابی مزدور اور گرجا گھروں میں جانے والے بے مراد۔ بہت سے آئیوان آئیوانووچ[1] اور آئیوان نکیفورووچ۔ جھوٹی کراماتوں والے پادری، سنتوں صوفیوں کی شبیہیں، زندگی دینے والی صلیبیں۔ ۔ ۔"

یہ روس تھا، ادھ موا، اور کوئی امید نہیں تھی کہ اس کے بارے میں کوئی کچھ کر سکے۔ عوام ان پڑھ تھے اور انتشار کی طرف راغب بھی، جیسے انھوں نے تین اور چار جولائی کو ثابت بھی کیا تھا۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آزادی نما چیز پا لینے کے بعد اب وہ پومیالووسکی مدرسوں کے طلبا کی طرح ہر چیز کا شیرازہ بکھیرنے، اسے تہس نہس کرنے پر آمادہ تھے۔ ذرا سی بھی مزاحمت انھیں مایوسیوں میں دھکیل دیتی تھی۔ باغی رجمنٹوں کے کئی نمائندوں نے خود کو کیرنسکی کے حوالے کر دیا تھا۔ بالٹک بحری بیڑے کے بعض جہازوں نے بالشویکوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ قیصر ولہیم کے گماشتے ہیں۔ کرانسٹاٹ نے 'انتہا پسندوں' کو ترک کر دیا تھا۔ کامی نیف، کولونتائی، راسکولنیکوف، روشال، سامویلز اور بہت سے دوسرے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ پراودا[2] اور سولداتسکایا پراودا[2] پر پابندی

۱: گوگول کے احمق، قصباتی کردار؛ ۲: بالشویک اخبار۔

لگادی گئی تھی۔

اور جھونپڑی سے باہر لینن میٹھالیوں باتیں کر رہا تھا جیسے چھٹی کا دن گزارنے آیا ہے۔ وہ یمیلیانوف سے پوچھ رہا تھا کہ ایک محنت کش کنبہ اپنے باغیچے میں اگائی سبزیوں سے گزارہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ وہ بازار میں سبزیوں کے بھاؤ جاننا چاہتا تھا اور یہ بھی پتہ کرنا چاہتا تھا کہ سیسترورتسک میں کس قسم کی مچھلی ہوتی ہے کہ مچھلی کا شوربہ اگر روز یا کم از کم ہر پیچ سے نہ بنا ہو تو بیکار ہوتا ہے۔

زینوویئیف نے صبح کے اخبار پڑھنے کے بعد کچھ تلخی سے کہا تھا: ”لوگ طاقت کے سامنے کتنی جلد جھک جاتے ہیں!“

لینن نے اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے کہا تھا: ”لوگ طاقت کے سامنے اس وقت تک جھکتے رہیں گے، جب تک وہ خود طاقت نہیں بن جاتے۔ ۔ ۔“ لینن نے مڑ کر اخبار پر نظر دوڑائی جسے زینوویئیف پڑھ رہا تھا: ”۔ ۔ ۔ عوام عملی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بلاوجہ پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں نہیں ڈالا کرتے۔ وہ انفرادیت پسند دانشوروں کی طرح نہیں ہوتے۔ ڈرامائی انداز اور مسجع مکالمے کا انھیں ذوق نہیں ہوتا۔ ایسی ڈرامائیت وہ قدامت پسند درس گاہوں سے نکلے کیرنسکیوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جو بڈھے پلوٹارک کے مرید ہیں جس نے طلبا کا دماغ خراب کیا ہے۔ عوام کی سمجھ میں آجائے گا کہ وہ اس لیے ناکام ہوئے کہ منظم نہ تھے۔ اگلی مرتبہ وہ اس امر پر توجہ دیں گے۔ ۔ ۔“

زینوویئیف کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے سوچا: ”موجودہ حالات میں 'اگلی مرتبہ' کے بارے میں سوچنا سراب ہے۔“

اسے احساس ہوا کہ اسے اپنا مافی الضمیر صاف صاف لینن کے سامنے بیان کر دینا چاہیے لیکن وہ اس خوف کے مارے چپ رہا کہ اگر اس نے اپنے خیالات کو زبان دے دی تو لینن اسے کہیں کردار کی کمزوری اور اس میں قوتِ فیصلہ میں کمی کے مترادف نہ سمجھ لے۔ ایسی کمزوریاں لینن کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں، اور پارٹی ساتھیوں کے لیے بھی کہ زینوویئیف ان کے سامنے لینن کے اقوال نہایت عقیدت سے مسلسل دہرایا کرتا تھا۔ ساتھی اس کے بارے میں کیا سوچتے، وہ تو اسے نہ دبنے والا مستقل مزاج شخص جانتے تھے۔ وہ لینن سے بھی کبھی اختلاف بھی کرتا تو یہ اختلاف کبھی ٹکراؤ کی صورت میں اختیار نہ کرتا تھا۔ اگر اس نے اپنی کمزوریوں کا اظہار اس نازک صورتِ حال میں کر دیا تو اسے ہمیشہ کے لیے لینن سے علیحدگی اختیار کرنا ہوگی۔ اس صورت میں روپوش رہنے سے فائدہ؟ وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ خود کو لینن کے قریب ترین ساتھیوں میں شمار کر سکے۔ پھر وہ یمیلیانوف کی روٹی اور دلیے سے بھی لطف اندوز ہو سکے گا۔ وہ خود بالکل صفر ہو کر رہ جائے گا۔ کیا یہ اس کے لیے قابلِ قبول ہے؟ ہرگز نہیں۔

وہ لینن کے ساتھ بالکل عورتوں والا عشق کرتا تھا۔ بیک وقت حاسدانہ، بے قابو اور پھر جانچ تول بھی۔ ایسا عشق، جو لینن انجانے میں لوگوں میں جگادیا کرتا تھا۔ لینن سمجھتا تھا کہ لوگوں کی اس کے ساتھ والہانہ محبت، عقیدت مندی در اصل اس کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ پارٹی اصولوں کے ساتھ ان کی وابستگی کی مظہر ہے۔

لینن کی جرأت، زینوویئیف میں خلجان بھی پیدا کرتی تھی اور رشک بھی۔ لیکن پچھلے دو دنوں سے، جھیل کے پار گھاس کے ان کھیتوں میں آنے سے پہلے، ان متضاد احساسات پر ایک اور احساس حاوی ہو گیا تھا جو پہلوں سے کہیں پیچیدہ تھا۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے لینن محض بن رہا ہو کہ وہ دلیر ہے، رجائی ہے اور در اصل وہ سمجھتا ہو کہ انقلاب ناکام ہو گیا ہے۔ ان کی بدقسمتی پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔ عبوری حکومت کے قصاب، روسی انقلاب کے ناکام ہدیب پیرا اس کے ساتھیوں کو تختہ دار پر کھینچنے والے ہیں۔ آج کے پانشلوں، یلنیانوفوں، پیوترسوفوں اور پونوفوں نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ زینوویئیف کے لیے عجیب سی کیفیت کا لمحہ ہوتا

تھا جب لینن سوچ کی حالت میں ہوتا ۔ تو آس پاس کا سب کچھ بھول جاتا تھا اور اس کے چہرے پر سختی کا پردہ چھا جاتا تھا۔ اس لمحے اس کی اداس تیکھی نگاہیں زینوویف کو مستقبل کے بارے میں دہشت زدہ کر دیتیں، لیکن ساتھ ہی اس سے عجیب سا اطمینان بھی ہوتا تھا۔ سے ناگوار محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص جس کا نام زینوویف تھا، اتنا برا نہیں تھا۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ اس کی اپنی پریشان خیالی اس کی اپنی کم مائیگی اور کمزوری کی دلیل نہیں تھی۔

لینن کو جب یہ محسوس ہوتا کہ وہ چپ چاپ سا ہو گیا ہے اور اس کے گرد بیٹھے لوگ بھی چپ ہیں تو وہ فوراً خود پر قابو پا کے حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے لگتا۔ انقلاب میں نئی تبدیلیوں کے امکانات کو بیان کرتا۔ سوشلسٹ انقلابیوں اور منشویک راہنماؤں کا مذاق اڑاتا۔ روپوشوں کی سرگرمیوں کی مشکلات کے بارے میں لطیفے سناتا۔ لیکن چاہنے کے باوجود زینوویف کا دل لینن کی اس شگفتگی کو قبول نہیں کرتا تھا۔

یکایک، چاندنی کی چاندی جھونپڑی کے تکونے دروازے میں بہہ نکلی۔ دور، درخت، دلکش شمعیں دکھائی دیتے تھے۔ زینوویف کو وہ انجیلی تصویر یاد آ گئی جو اس نے ویانا کے عجائب گھر میں دیکھی تھی۔ اپنی اس ذہنی حالت کے باعث وہ یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اگر یسوع مسیح مذہبی شخصیت کے بجائے تاریخ ساز شخصیت کے طور پر پالے جاتے تو وہ بھی اپنی حراست سے پیشتر اپنا چہرہ مسرتوں سے سجا لیتے، مسکراتے ہوئے مذاق کرتے ہوئے، گریہ وزاری کرتے ہوئے حزنیہ صورت نہیں، جیسے کہ نئے عہدنامے کے مصنفوں نے ان کی تصویر کشی کی تھی۔

عین اس لمحے لینن ہنسا۔

”۔ ۔ ۔ دیکھو چاند نکل آیا ہے ۔ ۔ ۔“ اس نے کہا: ”۔ ۔ ۔ اور دیکھو نکولائی الیکساندروویچ! یہ بائیں جانب کو سفر کر رہا ہے، بالکل جیسے مستقبل میں روس کرے گا ہوں، تو گریگوری سو گیا ہے۔ کولیا اونگھ رہا ہے۔ کیا خیال ہے کولیا؟ اب سو یا نہ جائے؟ نکولائی الیکساندروویچ! جب ہم انقلاب لائیں گے تو تمہیں اپنا نام بدلنا پڑے گا۔ تمہارا نام بہت شاہانہ ہے۔“

یمیلیانوف ہنسا: ”ولادیمیر ایلیچ ۔ ۔ ۔“ اس نے پوچھا: ”۔ ۔ ۔ ہم انقلاب جلد ہی لے آئیں گے؟“

زینوویف کی نظروں میں لینن کا چہرہ گھوم گیا۔ سوچ میں کھنچی بھنویں، آنکھوں میں سچائی، اور چہرے پر سمٹی توجہ۔

”۔ ۔ ۔ بہت جلد! بات یہ ہے، انقلاب لانے کی وجوہ پر کسی نے توجہ دی ہے نہ مسائل کا حل پیش کر کے انقلاب کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھئی، اگر بورژوازی جنگِ عظیم سے فوراً ہاتھ کھینچ لے، کسانوں کو فوراً زمین دے دے، مزدوروں سے صرف آٹھ گھنٹے کام لینے کا اعلان فوراً کر دے، پیداوار کو مزدوروں کے اختیار میں دے دے، سرمایہ داروں اور قومی منافع خوروں کا منافع فوراً محدود کر دے تو انقلاب کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر بورژوازی یہ قدم اٹھا لے تو وہ بورژوازی کہاں رہے گا۔ تب تو ریابوشنسکی اور سلیکوف ہماری پارٹی میں شامل ہو جائیں ۔ ۔ ۔ ! جلد، بہت ہی جلد انقلاب لائیں گے، نکولائی الیکساندروویچ! پھر ہمیں تمہاری تینوں رائفلوں کی ضرورت پڑے گی ۔ ۔ ۔“

ا ؎ ۔ نکولس دوئم کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

جب زینوویف اگلی صبح بیدار ہوا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کہاں ہے۔ حواس باختہ، حیران و پریشان، اس نے دروازے سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ جھونپڑی کی بائیں جانب ذرا ہٹ کر، کٹے درخت کے ٹھنٹھ کو کرسی بنائے، لینن بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کی گیلی مینڈھی پڑی تھی جس پر جھکا وہ بہت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ صبح کے سورج کی کرنیں اس کے سر کو روشن کر رہی تھیں۔ اس کے گرد سبز اور چمکیلے ہوائی جہازی بھنبھٹ اُڑ رہے تھے جنھیں وہ گاہے گاہے نظریں اُٹھا کر، ہاتھ لہرا کے خود سے پرے رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کی نظریں کاغذ پر پلٹنے سے پہلے بے توجہی سے دُور تک ان کا پیچھا کرتیں۔ ایک کیڑا رینگتا ہوا کاغذ پر آ گیا تو اس نے کاغذ سے نظریں اٹھائے بغیر بے دھیانی میں اُٹھا کر نیچے گھاس میں پھینک دیا۔ وہ ماحول میں فوراً ہی رچ بس گیا تھا اور زینوویف کو اس کی اس خوبی پر بہت رشک آتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح لینن کے چہرے پر اب بھی وہی انہماک تھا جو لکھتے وقت اس کے چہرے پر چھایا کرتا تھا۔ اس نے اسی کیفیت میں، زینوویف کی طرف نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔

"جاگ گئے گریگوری؟ تم بالکل شہریوں کی طرح سوتے ہو۔ تم بھول گئے کہ تم فنستانی گھسیارے ہو اور اس وقت تمھیں اپنے کام میں جتا ہونا چاہیے کہ سردیوں کے لیے بندوبست کر سکو، بال بچوں کے رزق کے لیے۔ دیکھو، میں نے ایک مضمون مکمل کر لیا ہے، اور یہ ابھی آدھا ہوا ہے۔ میں اپنا قلم درانتی کی طرح استعمال کر رہا ہوں۔ نہالو، پھر آ کے پڑھ لو . . ."

یمیلیانوف سلاخ سے لٹکتے ڈول کے نیچے آگ جلانے میں مصروف تھا۔ ڈول میں پانی اُبل رہا تھا۔ کولیا وہاں نہیں تھا لیکن چند لمحوں بعد وہ پرندوں ایسی سیٹی بجاتا ہوا درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

"سب ٹھیک ہے" اس نے اعلان کیا: "کوئی کشتی نظر نہیں آئی"

"شی، شور نہ مچاؤ"، یمیلیانوف نے لینن کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا پر کولیا بے صبر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ مدھم کر لیا: "میں نے ایک خارپشت دیکھا، اپنے بچوں کے ساتھ"

"کیا خیال ہے، وہ خارپشت قابلِ اعتبار ہے؟ وہ ہمارا راز تو افشا نہیں کر دے گا؟" لینن نے اس سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کی نگاہیں اسی طرح کاغذ پر جھکی تھیں جس پر وہ بڑی تیزی سے لکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کولیا کو اپنی کنپٹی سے دیکھ رہا ہے جس پر مسکراہٹ شکنوں میں چھپی گئی تھی۔

"وہ ہماری طرف ہے۔" کولیا نے بے طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو بھاگو" یمیلیانوف نے سخت لہجے میں سنجیدگی سے ڈانٹا اور پانی سے بھری بالٹی اٹھا کر زینوویف کے پاس چلا گیا: "یہاں نہاؤ گے یا جھیل پر؟"

"پتہ نہیں۔" زینوویف نے تذبذب سے کہا: "شاید یہاں۔ تم تکلف نہ کرو، میں انتظام کر لوں گا۔"

"میں تم پر پانی ڈالوں گا، اس طرح سہولت رہے گی۔"

زینوویف نے اپنے سوٹ کیس سے صابن اور دانتوں کا برش نکالا لیکن اسے وہاں دانت صاف کرنے کا پاؤڈر نہ ملا۔ وہ اور یمیلیانوف سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، پر لینن تک ان کی آواز پہنچ ہی گئی۔ اس نے اسی طرح اپنے کام سے توجہ ہٹائے بغیر کہا۔

"میرا پاؤڈر لے لو۔ میرے تکیے کے پاس تولیے میں لپٹا رکھا ہے۔"

ڈول میں تھوڑے ابل رہے تھے۔ بیلیانوف نے کانٹا چبھو کر دیکھا اور کہا کہ پک گئے ہیں۔

”انھیں بلا لو،“ اس نے زینوویف کے کان میں سرگوشی کی، ”یا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ان کے کام میں خلل انداز نہ ہوں؟“

”ناشتہ تیار ہے ولادیمیر ایلیچ۔“

”آیا۔ ابھی آیا،“ لینن نے انھیں دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا، پر فوراً اٹھ کر نہیں آیا۔ کچھ دیر وہیں بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ ایسی اداسی جو زینوویف کے دل میں ملے جلے جذبات ابھار دیا کرتی تھی۔

داڑھی مونچھ منڈوانے کے بعد لینن کا چہرہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ بیک وقت سادہ، درشت اور سنجیدہ۔ داڑھی اور مونچھوں نے اس کے ہونٹوں کے گرد کے اٹل اور اولوالعزم خطوط چھپا رکھے تھے۔ اب پختہ عزم کا عکس لیے اس کا دہن بڑا اور صاف دکھائی دیتا تھا۔ صرف جب وہ مسکراتا تو پتہ چلتا کہ یہ وہی لینن ہے، گالوں کی اونچی ہڈیوں پر تنی ہوئی جلد، چھوٹی آنکھیں اور شرارتی سی نیک فطرتی کی شکنیں آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں پر مسکراہٹ کی صورت۔

چند لمحے ساکت بیٹھنے کے بعد لینن اٹھ کر آگ کے پاس اپنے ساتھیوں میں آگیا۔ اس نے چپ چاپ، جلدی سے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران کبھی کبھار پوچھ لیتا: ”ساشا اخبار لے کر نہیں آیا؟“

”ابھی بہت سویرا ہے،“ بیلیانوف اپنی بڑی سی چاندی کی جیبی گھڑی نکال کے وقت دیکھ کر کہتا: ”اخبار آٹھ بجے بٹتے ہیں۔ اخبار خرید کر لوٹنے اور کشتی میں یہاں تک پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔“

لینن نے اخباروں کے لیے اپنی بے صبری چھپانے کی بہت کوشش کی۔ وہ اپنے گھٹنوں کو انگلیوں سے بجاتے بار بار جھیل کی اور جاتے راستے کو دیکھتا۔ اس کے دھیان میں یہ بالکل نہیں تھا کہ اس کے پاس کون بیٹھا ہے، آگ کی تپش خوشگوار ہے یا وہ کھا کیا رہا ہے۔

”جب اخبار آجائیں گے،“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ”تو گریگوری تین جولائی کے واقعات پر اپنا مقالہ مکمل کر لینا۔“

”بہتر،“ زینوویف نے کہا، پھر مایوسی میں اپنے کندھے جھٹک دیے: ”پر یہ چھپے گا کہاں؟ ہمارے تمام اخباروں پر تو پابندی لگا دی گئی ہے۔“

”ہمارے ساتھی کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ ہم اسے کرانشٹاٹ سے چھپوا لیں گے۔ ہو سکتا ہے وہاں ساتھیوں نے جولوس پراودی کو بچا لیا ہو۔ وہ بہت اٹل ارادوں کے لوگ ہیں۔ اور مواقع بھی بہتر ہیں وہاں۔ ۔ ۔“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا،“ زینوویف بڑبڑایا: ”ایسے حالات میں اخبار کا جاری رکھنا ۔ ۔ ۔ ؟ ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔!“

لینن اپنی مایوسی کو چھپا کر اٹھا اور اس نے بڑی بشاشت سے کہا: ”انسانوں کو لکھتے رہنا چاہیے۔ لکھو، لکھو، لکھو۔“

”دس بج گئے ہیں ۔ ۔ ۔“ بیلیانوف نے اپنی چاندی کی گھڑی دیکھ کر کہا: ”۔ ۔ ۔ ساشا، بس آتا ہی ہوگا۔“

لینن اور زینوویف اس جا آکر بیٹھ گئے جو بیلیانوف نے درختوں کے درمیان پودے صاف کر کے بنائی تھی۔ وہ کچھ عرصہ اپنے اپنے مضمونوں پر جھکے خاموشی سے لکھتے رہے۔ سورج آسمان میں اور بھی بلند ہو گیا تھا اور دھوپ میں کافی حدت آگئی تھی۔ لینن بہت تیزی سے لکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ اٹھ کر ٹہلتے ہوئے اپنے مضمون کے جملوں کو زیر لب دہرانے لگتا، پھر آ کے بیٹھ جاتا۔ اس کی نظریں زینوویف کی طرف اٹھ گئیں جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ لینن مسکرا دیا۔

”لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا؟“ اس نے پوچھا: ”نہیں؟ تو لو، یہ مضمون پڑھ لو۔“

اس نے مضمون والے کاغذ لپیٹے اور گیلی کی بنی میز پر جھک کر دوسری طرف زینوویف کو تھما دیے۔ مضمون ابھی نامکمل

تھا۔ عنوان تھا ——— نعروں کے بارے میں، ——— زینوویئف گماس میں لیٹ کر مضمون پڑھنے لگا۔ وہ مضمون کی سادگی، گمبھیرتا اور قوت سے بہت متاثر ہوا: "اس مضمون کی حیثیت کارل مارکس کے بہترین مقالوں سے کم نہیں" اس نے دل ہی دل میں مضمون کی تعریف کی ——— نیو رائنیشے زائتنگ کے زمانے کا کارل مارکس، جب وہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں گھرا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ انقلاب کامیاب ہو کر رہے گا ——— پھر زینوویئف کے نرم، ہلکے پھلکے چہرے پر درشتی چھانے لگی۔ جوں جوں وہ مضمون پڑھتا جاتا تھا اس کے چہرے کی درشتی بڑھتی جاتی۔ اس نے سرہانے کے کاغذوں کا پلندہ میز پر رکھ دیا اور سوچ میں گم، مضمون کو ترتیب وار لگانے لگا۔

"ہوں؟ پسند نہیں آیا؟" لینن کا بایاں ابرو سوالیہ نشان میں اٹھ گیا۔

"بہت زبردست مضمون ہے، لیکن۔ ۔ ۔"

"لیکن کیا؟"

"یہ انتہائی مراجعت ہے۔ تم اس دور کے سب سے مقبول نعرے "تمام قوت سوویتوں کے لیے" کو واپس لے رہے ہو، اور وہ بھی ان حالات میں؟ یہ تمھارا ہی تو نعرہ تھا لینن! نعرہ۔ ۔ ۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، گھبرایا ہوا، تقریباً خوف زدہ: "یہ نعرہ تو تمھیں بہت پسند تھا۔ اب تم اس نعرے کو اتنے اطمینان سے کیسے ترک کر سکتے ہو؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت بڑی بات ہے، اور میرے نزدیک ناقابلِ عمل بھی۔ عوام اس نعرے سے بہت مانوس ہو گئے ہیں۔ ۔ ۔ بالکل، یہ بات تو ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ۔ ۔"

لینن مسکرا دیا: "تو گویا تم نے مضمون کو قبول کر لیا ہے، پر اس کے مندرجات سے تمھیں اختلاف ہے۔"

زینوویئف نے فوراً کہا: "نہیں، یہ بات نہیں۔ میں تمھارے دلائل کے حوالے سے تمھارے مضمون کی روح سے بالکل متفق ہوں لیکن مجھے اس کی افادیت پر شبہ ہے۔ میں نے تمھارے مضمون کی تعریف اس لیے کی ہے کہ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ کہ یہ ایک بالشویکی تحریر کا بہترین نمونہ تو ہے پر اس کی عملی افادیت کوئی نہیں۔ ہے نا؟"

"ایک منٹ۔ مجھے بات تو مکمل کر لینے دو۔ شاید یہ نظریہ سازی کا مسئلہ ہے اور اسے ذرا دبا کر لکھنا چاہیے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ مرکزی کمیٹی کے سوشلسٹ انقلابی اور منشویک اپنے رویوں کی خامیوں کو سمجھنے لگے ہیں کہ بالشویکیوں کو اذیت دینے میں انھیں کتنے بڑے خطرے کا سامنا ہے۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر بورژوازی کو ایک انچ بھی جگہ دی گئی تو وہ ساری جگہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اس صورتِ حال میں اس بات کے معنی یہ بنتے ہیں کہ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ میں تمھاری بات سمجھ گیا۔ تم چاہتے ہو کہ پیٹی بورژوازی کو اپنی غلطیاں درست کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ تم اب بھی نہیں بھولے کہ منشویک اور سوشلسٹ انقلابی اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے ہیں۔ یہ تمھاری بچکانہ معصومیت ہے یا سیدھی سادہ حماقت کہ تم سیاست میں بورژوا اخلاقیات کو لا رہے ہو۔ آج کی سوویتیں براہِ راست انقلاب دشمن طاقتوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ انھوں نے ہمیں ترک کر دیا ہے، ہمیں دغا دی ہے۔ وہ خود ہی انقلاب دشمن گڑھے میں پھسل گئے ہیں۔ وہ ان بھیڑوں سے مختلف نہیں جنھیں ذبح خانے میں لا کر ان کی گردنوں پر چھری رکھ دی گئی ہے اور اب وہ رحم طلب انداز میں ممیا رہی ہیں اور بلیکوف تک یہ سب جانتے ہیں۔ تیوریاں چڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں گریگوری! بعض وقت دشمن صورتِ حال کو زیادہ واضح طور پر دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ دشمن سے سبق سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ اس چیتھڑے ذیوائی سلوو نے آج کی سوویتوں کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ وہ گاتم کے نقش منعوں کی طرح ہیں جو دورانِ سفر دن کی روشنی میں گمراہ ہو گئے تھے۔ اچانک کسی نے کہا: کارکنوں کو

ہمارے لیے ضروری ہے۔ سوویتیں نے اطمینان کا سانس لیا اور کارکنوں کو پکار بلایا۔ تو یہ ہیں تمھاری آج کی سوویتیں۔ ۔ ۔"

"میری سوویتیں!" زینوویف نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے جولائی کے واقعات کے نتائج نے بڑی سیدھی سادی بات سمجھائی ہے۔ طاقت کی تسخیر کے لیے پرولتاریوں کو جداگانہ، خود مختار جدوجہد کرنا ہوگی۔ اصل سوویتیں پھر ہوں گی۔ آج کل کی سوویتوں کی طرح نہیں جنھوں نے انقلاب کے ساتھ دغا کی ہے۔ نئی سوویتیں، مسلح جدوجہد کے تجربے سے نکل کر کندن بنیں۔ ۔ ۔"

"یہ تو درست ہے۔ لیکن کیا اس کا فائدہ ہوگا کہ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ کیا اس کا فائدہ ہوگا کہ عوام کو سچائی سے آگاہ کیا جائے؟ یقیناً ہوگا۔ عوام کے ساتھ سچ بولنا بہت ضروری ہے۔ فریب کاری سے زیادہ خطرناک کوئی شے نہیں۔ ۔ ۔"

"اصولوں کے حوالے سے بالکل ٹھیک، لیکن۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ اچھا۔ اگر یہ اصولی طور پر صحیح ہے تو یہ بہر طور صحیح ہوگا، ہمیشہ ٹھیک ہوگا۔ ہمیشہ سچ ہوگا۔"

"ولادیمیر اِلیچ! تم میرے ساتھ ابتذال میں بات کیوں کرتے ہو۔ میں بھی عوام سے اتنا ہی واقف ہوں جتنے تم ہو۔ تم عمومی حوالوں سے بات کر رہے ہو اور میں فنِ صف آرائی کی بات کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب! صف آرائی کا فن ہمارے لیے یہ ہے کہ عوام کے ساتھ سچ بولا جائے۔ سچ ہمیشہ بولنا چاہیے، چاہے یہ ہمارے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ عوام صرف اسی صورت میں ہم پر اعتماد کریں گے۔ ہم ناقابلِ تسخیر ہوں گے، اگر ہم سچ بولیں گے، تاریخ کے ہر پیچیدہ راستے پر۔ ہم فنِ صف آرائی کے بہانے سے بھی جھوٹ نہیں بولیں گے کہ داؤ پیچ میں اور فنِ صف آرائی میں اتنا فرق نہیں جتنا کچھ ساتھی سمجھتے ہیں۔ ۔ ۔ اوہ! میں اتنی بلند آواز سے بول رہا ہوں۔ بھول ہی گیا تھا کہ ہم یہاں خفیہ پناہ لیے ہیں۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ بالکل، تم بھول گئے ہو۔" زینوویف نے کہا: "ہم چھپے ہوئے ہیں، خفیہ پناہ گاہ میں۔ اسی لیے مجھے اس وقت جداگانہ خود مختار پرولتاری انقلاب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے کی باتیں غلط لگتی ہیں۔ اس مسئلے کو اس انداز میں پیش کر کے ہم علیحدہ، غیر آہنگ اور بے رابطہ جدوجہد کے حوالے سے انقلاب دشمن طاقتوں کی مزید مدد کریں گے۔ تجربے میں تو یہی آیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ حالیہ واقعات سے کارکنوں نے یہ سبق سیکھ لیا ہے کہ کسی کے اکسانے میں نہ آئیں۔ تم یقیناً جانتے ہو کہ انقلاب کی پُرسکون ترویج کے دن تو اب ہمیشہ کے لیے گئے۔ اب تحریک نے ایسا رُخ اختیار کر لیا ہے کہ اب تمام امور کا فیصلہ ہتھیاروں کی قوت سے ہوگا۔ حیرت ہے، تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے تو یہ صاف نظر آ رہا ہے۔ ۔ ۔ اور میں یہ سب کچھ تحریر میں بھی لاؤں گا۔"

زینوویف نے خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ٹھنٹھ پر بیٹھے، اس نے لینن کے مضمون کی پھر ورق گردانی کی اور کہا: "پھر بھی تم اپنی نظریہ سازی پر نظرِ ثانی کرو۔ میں سمجھتا ہوں، یہ مضمون بڑی خلجانی کیفیت میں لکھا گیا ہے۔ ڈان اور تسیرتیلی واقعی اس کیفیت کا جواز بنتے تو ہیں، لیکن خلجان، کوئی اچھا مشیر نہیں ہوتا۔ ۔ ۔"

"بالکل۔ خلجان اتنا ہی بُرا مشیر ہے جتنا کہ خوف۔ آئینی جمہوریت والوں کا اخبار، ریچ ہیں واسکا البلائیف قسم کا بہادر گردانتا ہے۔ ٹھیک ہے، اگر سائنس کی مدد سے علم کے ہتھیار اور معاشرتی نشوونما کے عمل کی سوجھ بوجھ ہو تو واسکا البلائیف قسم کے ملک بدترین ردی نہیں بنتے۔ جرأت، دلیری، بہادری۔ ۔ ۔ اور یہ واسکا البلائیف کے لفظ نہیں بلکہ دانتن کے ہیں جو فرانسیسی تاریخ میں سب سے عظیم داؤ پیچ کا ماہر انقلابی تھا۔"

بحث کے دوران ان دونوں کی آوازیں کبھی کبھی اتنی بلند ہو جاتیں کہ یمیلیانوف کو خطرہ ہو جاتا کہیں کوئی سُن نہ لے۔ اُس نے کولیا کو بائیں اور دائیں طرف جنگل کی گشت کے لیے بھیج دیا اور خود گھریلو کام کاج میں مصروف ان کے دلائل سنتا رہا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے لینن کی طرف تھا۔ پارٹی کا پرانا ممبر ہونے کے باعث وہ ہمیشہ سے مسلح جدوجہد کا حامی تھا۔

لینن اپنے ساتھی کو خوب لتاڑ رہا ہے۔ اس خیال سے یمیلیانوف کی باچھیں کھل گئیں لیکن اس خیال سے کہ اسے یوں مسکراتا دیکھ کر زینوویف کہیں برا نہ مان جائے، اس نے اپنی مونچھیں درست کرنے کے بہانے انگلیوں سے اپنے ہونٹوں کو چھپا لیا۔

لینن کو اس انداز میں دیکھ کے اسے اپنی فیکٹری کی دیوار میں لگا وہ ڈائنمو یاد آگیا جو کہ جب چلتا تھا تو اپنی مخفی قوت کے ہیجان سے دیوار میں ایسی تھرتھراہٹ پیدا کر دیتا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے یہ خود کو دیوار سے چھڑا کے دوڑنے لگے گا، آگے کی طرف، آگے ہی آگے۔

تاہم زینوویف، جو کہ لینن کو بہت قریب سے جانتا تھا، اس وقت لینن کو غلط نہیں سمجھا تھا۔ لینن تلخی، جبر اور تنہائی کو واقعی بہت شدت سے محسوس کرتا تھا۔ وہ دل کہ جو لوگوں کے لیے ہر وقت وا رہتا تھا اس میں کبھی کبھی یہ احساس بھی در آتے تھے —— تنہائی، تلخی، جبر —— شاید مہینوں کی تھکاوٹ، جلسوں اجلاسوں میں ان گنت تقریروں اور اندرونی طوفانوں کے باوجود بیرونی طور پر سکون کے اظہار کی کوششوں کے باعث اس کا مسلسل ایک سا طنزیہ اور اکھڑ رویّہ۔ ذاتی حملوں اور کردار کشی کے خلاف اس کے اس اکھڑ اور طنزیہ رویّے سے تو اس کے ساتھی بھی حیران رہ گئے تھے لیکن یہ نتیجہ تھا زندگی بھر اپنے ذاتی احساس کو اپنے عمل کی خاطر قربان کر دینے کا، اگرچہ اب بھی اسے یہ انداز اختیار کرنے میں خاصی دقت پیش آتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ ایک انتہائی معمولی واقعے نے لینن کو ہلا کر رکھ دیا جسے اس نے شروع میں کوئی اہمیت نہ دی تھی۔

تین دن پیشتر، جب وہ رازلف میں یمیلیانوف کے گھر روپوش تھا، اس نے یمیلیانوف سے کہا کہ اسے سیستروریتسک کی فیکٹری سے ایک بہت ہوشیار، پھرتیلا بالشویک کارکن چاہیے جو پیغام رسانی کا کام کر سکے۔ اس کے لیے پختہ کردار اور خود پر قابو رکھنے کی صلاحیت کا ہونا بہت ضروری تھا۔ مرکزی کمیٹی سے ایک پیغام رساں آیا تو کرتا تھا لیکن لینن کا خیال تھا کہ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو بوقتِ ضرورت یہاں سے دارالحکومت کو بھیجا جا سکے تو بہت مناسب رہے گا۔

یمیلیانوف نے وعدہ کر لیا کہ کل رازلف سے واپسی پر وہ کسی مناسب شخص کا بندوبست کرتا آئے گا۔ لینن نے کچھ سوچ کر طے کیا کہ پہلے اس شخص کا امتحان لیا جائے گا اور وہ یوں کہ لینن جھونپڑی میں چھپ کر یمیلیانوف سے اس کی گفتگو سُنے گا اور اندازہ لگائے گا کہ یہ شخص مناسب رہے گا یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہوا تو لینن اس سے مل لے گا۔

اگلے روز یمیلیانوف ایک نوجوان کو ساتھ لے کر آیا۔ لینن کی آنکھ جھونپڑی کے ایک روزن سے جمی تھی۔ ابھی تک اس نے ان دونوں کو جھونپڑی سے باہر چہل قدمی کرتے دیکھا۔ پھر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کے قریب آگئے۔ لینن کو وہ نوجوان شکل و صورت سے خاصا پسند آیا، دلکش ناک نقشے کا سنہرے بالوں والا مسکراتا ہوا طاقتور نوجوان۔ یمیلیانوف اور اس کی بیوی، جو اس سے ملنے گھر سے باہر آئی تھی، کے ساتھ اس کا رویّہ خاصا مؤدبانہ تھا۔ یمیلیانوف کی بیوی اس سے مل کر واپس گھر کے اندر جا کے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

یمیلیانوف اس نوجوان کو جھونپڑی کے اندر لے آیا۔ دونوں میز کے قریب بیٹھ گئے۔ لینن، اندر کی کوٹھری میں سوکھی گھاس پر لیٹ کر پردے کے پیچھے سے ان کی باتیں سننے لگا۔

یمیلیانوف نے کھنکار کے اپنا گلا صاف کیا اور نوجوان سے پوچھا۔

"ہاں تو الیکسی، فیکٹری میں کیا صورتِ حال ہے ؟"

"صورتِ حال ؟" الیکسی نے جواب دیا: "بہت بری ہے۔ انھوں نے ہمیں بالکل نکرے لگا دیا ہے۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ بہتر یہی لگتا ہے کہ بھاگ جائیں کہیں بھی۔"

"لیکن کیوں ؟"

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں ؟ وہ شکاری کتوں کی طرح خون کے پیاسے ہمارے تعاقب میں ہیں۔ . . 'جرمن جاسوس' ، 'ولہم کے گماشتے' ! . . . سب کچھ بھاڑ میں گیا . . ."

"یہ تو قدرتی امر ہے۔" یمیلیانوف نے بولا کر پہلو بدلا: "پرولتاریہ کے دشمنوں سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے ؟"

"دشمن ؟ کاش یہ بات دشمنوں تک محدود ہوتی۔ اب تو یہ بات سب میں پھیل چکی ہے کہ بھاگ جاؤ، فرار ہو جاؤ۔"

"بھاگ جاؤ، فرار ہو جاؤ، محض اس لیے کہ گلیوں میں لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ہوں، تو تم ہمت ہار گئے !"

"آپ جانتے ہیں، وہ لینن کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟ گلیوں کے لوگ تو ایک طرف رہے، اپنے دیرینہ انقلابی ساتھی بھی ؟ یہ لوگ تو بکواس نہیں کر سکتے نا ؟"

"اور تم یہ سب خرافات مانتے ہو، احمق ؟ بس بس، اتنا ہی کافی ہے، آؤ چلیں !"

"میں یہ نہیں کہ مجھے ان لوگوں نے قائل کر لیا ہے، لیکن آپ نے اور میں نے لینن کے دل میں تو اتر کے نہیں دیکھا نا ! اسے کون جانتا ہے ! ہم کمین لوگ، چھوٹے درجے کے کارکن، اور وہ ساری عمر بیرونِ ملک رہا ہے۔ آپ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں ؟ آپ جانتے ہیں، آسیف اور مالینوفسکی پر بھی تو لوگ ایمان لائے تھے ——— مالینوفسکی تو بالشویک تھا، اور مرکزی کمیٹی کا ممبر بھی۔ کیا بتاؤں، پوتشکیک نے تو میری نیندیں حرام کر دی ہیں۔ اور لینن ؟ کہاں ہے وہ ؟ چھپتا پھر رہا ہے۔ اگر وہ پیش ہو کر مقدمہ چلنے دے اور اپنا دفاع کرے تو صورتِ حال بدل جائے۔ پر سنا ہے وہ تو جرمنی بھاگ گیا ہے . . ."

یمیلیانوف کے چہرے پر مایوسیاں چھا گئیں۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ وہ لینن کی طرف سے آتی کسی بھی آواز کے لیے ہمہ تن گوش تھا۔ اس نے الیکسی کی باتیں کچھ سنیں، کچھ نہ سنیں۔ باہر مرغ نے اذانیں دینا شروع کیا تو کتا بھی بھونکنے لگا۔ یمیلیانوف دعائیں مانگنے لگا کہ کتا مسلسل بھونکتا رہے اور مرغ زور زور سے اذانیں دیتا رہے تاکہ الیکسی کی باتیں بھساتی تک نہ پہنچ سکیں۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے دانت بھینچ کر کہا: "میرا خیال تھا کہ تم مرد ہو لیکن . . . چھوڑو دفع کرو . . . آؤ چلیں !"

"آپ ناراض نہ ہوں نکولائی الیکساندروویچ !" الیکسی نے کہا: "ناراضگی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو اپنا ساتھی جان کر آپ کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ چلو۔"

الیکسی خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے پلٹ کر پوچھا: "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ؟"

"ہاں ! چلو . . ."

وہ جھونپڑی سے باہر چلے گئے۔ الیکسی نے بہت بے ڈھنگے پن سے سر ہلایا اور چلا گیا۔ یمیلیانوف چند لمحوں کے لیے ساکت کھڑا رہا پھر دبے پاؤں آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھونپڑی کے پاس جاکے رکا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ کوئی آواز نہیں! اس کا جسم سنسنا گیا۔ اس نے اپنی قمیض کو نیچے کھینچ کر درست کیا اور برساتی کو جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لینن میز کے سامنے بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا۔ جب یمیلیانوف کا سر، فرش میں بنے دروازے سے ابھرا تو لینن نے چند لمحے، تیز چبھتی نظروں سے دیکھا، پھر یک لخت شگفتگی سے کہا۔

"تو میرے بزرگ، تم نے پیغام بری کے لیے اچھا انتخاب کیا۔ واقعی! پر کوئی بات نہیں۔ خوش قسمتی سے محنت کشوں کے طبقے میں سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ . . ." وہ آہستہ آہستہ چلتا فرشی دروازے کے پاس آکر پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے یمیلیانوف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا: "فکر کی کوئی بات نہیں۔"

یمیلیانوف پر روشنی چھا گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور لمحہ بھر بعد احساسِ ندامت سے کہا: "لگتا ہے میں مردم شناس نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں"، لینن نے بڑی شفقت سے کہا اور دوسرے ہی لمحے اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

اسی شام جب وہ گھر کے احاطے کے قریب چھوٹی سی جھیل کے کنارے بنی یمیلیانوف کی غسل گاہ میں بیٹھا، اپنے مضمون "سیاسی صورت حال" پر کام کر رہا تھا، اسے دن کا یہ واقعہ خواہ مخواہ یاد آگیا تو وہ خود بھی اداس ہوگیا۔ وہ نوجوان اتنا پُرخلوص اور شائستہ تھا! وہ پڑھا لکھا جان پڑتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ پیٹروگراڈ کے بہترین کارکنوں میں سے ہے ——— جب وہ وہاں سے گیا تھا، لینن کو اس کی چال ڈھال پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے کندھے جھکے جھکے تھے اور اس کی پیٹھ گوشت سے بھری بھری تھی۔ پھر لینن کو احساس ہوا کہ دراصل ناپسندیدگی کی وجہ اس کی چال ڈھال نہیں بلکہ اس کی گفتگو ہے جو اس نے جھونپڑی میں بیٹھے سُنی تھی۔

غسل گاہ صاف ستھری اور ٹھنڈی ٹھنڈی تھی۔ وہاں شام کے دھندلکے میں بیٹھا لینن بہت اُداس ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھے اپنے ہاتھ اُٹھائے، پھر ان سے ماتھا تھام لیا۔ اس کی یہ کیفیت غیر معمولی تھی۔ پہلے صرف دو بار اس کے اعصاب اتنے ہی بوجھل ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ سوئٹزرلینڈ میں تھا اور دوسری مرتبہ جب وہ کراکاؤ کے قریب جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ تب اُسے اپنا کام چھوڑ کر پہاڑوں پر جانا پڑا تھا کہ اس کی اعصابی تھکن جسمانی تھکاوٹ میں چُور چُور ہوسکے۔ اب یہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ یہاں وہ غسل گاہ یا جھونپڑی کی برساتی سے بندھا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہاں بیٹھا وہ، پیٹروگراڈ کے واقعات اور اخباروں کے کالموں سے بندھا تھا جو اس کی کردار کشی کے واسطے سے محنت کشوں اور فوج کے جوانوں کے ذہنوں میں انتشار پھیلاتے تھے اور یوں بالشویک پارٹی کو ان کی نظروں میں گرانے کی کوشش کرتے تھے۔

لینن نے اپنا سر اُٹھایا۔ اس کے سامنے میز پر اخبار پھیلے تھے۔ ہر لفظ زہریلا نشتر۔ آئینی جمہوری پارٹی کا اخبار "ریچ"! آئینی جمہوری پارٹی مطالبہ کرتی ہے کہ آزادی اور روس کے تحفظ کی خاطر لینن اور اس کے ساتھیوں کو فوراً گرفتار کیا جائے تاکہ ملک کو بچایا جاسکے۔

——— یہ لوگ صرف شر پسند نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہیں۔ ان کی تخریب کاریوں نے انہیں رضاکارانہ یا غیر رضاکارانہ طور پر قیصر ولہیم دوئم کا آلۂ کار بنا دیا ہے۔ عوام، حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ روسی جمہوریت کا تحفظ کرے اور لینن کی مصروفیات کی تفتیش کرے۔ ہم بالشویکوں کی تخریب کاریوں کے بارے میں اپنے قارئین کو آگاہ کرتے رہیں گے

مالنوسکی نے تحریر کیا تھا۔

———— حضرات! جب ہم ان لوگوں کی آوازیں سنتے ہیں جو جرمنی کے توسط سے آئے ہیں، اور ان کی تحریریں سرگوشیوں پھوں کرتے ہیں تو یہ حقیقت مضبوطی سے واضح ہو جاتی ہے کہ اولیں تحت سے ان لوگوں کا رابطہ جرمنی کے ساتھ ہے۔

یہ کام ہو رہا ہے اس میں کوئی بات مشکل نہیں ———— یہ مارچ کی تقریر تھی۔

بل کی اخبار کی تقریر ———— لینن کے نام کے ساتھ جتنے بھی مقدمے وابستہ ہیں، ان کے سلسلے میں مجھے صرف یہ کہنا ہے اسے گرفتار کرو، اسے گرفتار کرو، اسے گرفتار کرو ————

———— فرسٹ کیڈٹ شکول کے ہال میں، داخلہ گرجے کی طرف سے: جناب ایس۔ اے۔ کیرنسکی (ایکسیکیوٹو ممبر، کمیٹی سوویت ونوجی اداکین) خطاب فرمائیں گے۔ موضوع ہے: انقلابی، یا انقلاب دشمن؟ ———— لینن پر کڑی تنقید ———— شرح داخلہ: ۳ کوپک۔

———— پی۔ ا۔ بو، کیبرے: ۱۹، اطالوی اسٹریٹ: آج رات ساڑھے دس بجے، دعوتِ طعام: کنواروں کی تنہائیوں کا علاج: لینن کے بارے میں ایک گیت: ساحل کا ایک منظر: بالشویکوں اور منشویکوں پر ایک گیت: بوڑھے اور شلغم کی حکایت: سرمایہ کاری میں آدمی کے علاوہ آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے اور بہت کچھ ———— ٹکٹ: دس روبل ————

———— اسٹیپ کے لامحدود میدانوں کے بیٹو، کزاک بھائیو! روس کی دھرتی ماں تمھاری طرف بازو پھیلائے رو رو کر تمھیں پکار رہی ہے۔ اپنی صفوں میں کوئی پر مالک، کوئی منن تلاش کرو۔ شہری کیرنسکی کو پوز ہارسکی کی صورت دیکھو اور روس کو بچا لو۔ بہت ظلم ہو چکا۔ بہت انتشار پھیل چکا لینن کا وجود باعثِ شرم ہے۔ کہو: دور ہٹو۔ اور اپنی تلواروں کی نوک پر اسے لاؤ، دنیا تمھاری شناخت کی صورت تمھیں انعام دے گی ————

لینن کی آنکھیں نفرت سے سکڑ گئیں۔ دنیا میں ایسی کوئی برائی نہیں جس کے جلو میں اچھائی نہ ہو۔ اس نے غسل گاہ کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر سرمئی جھیل پر نظریں جمالیں۔ نام نہاد آئینی جمہوریت پسند اور کیرنسکی جامے سے باہر ہو رہے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے بورژوا اخباروں کے ذریعے بالشویکوں کو ہر طرح سے بدنام کیا جا رہا تھا جس سے رائے عامہ متاثر ہو رہی تھی۔ اگر عوام کسی طرح اس الجھاؤ کی تہہ میں کہیں سچائی تک پہنچ جائیں تو آئینی جمہوریت پسندوں اور کیرنسکی کا بستر گول ہو جائے۔ سوشلسٹ انقلابی اور منشویک اپنے پیٹی بورژوا فطری کردار کے مطابق گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے۔ کبھی لینن کی کردار کشی کے خلاف، لینن کی حمایت میں بیان دیتے ———— لینن نظریاتی اصولوں کی بنیاد پر، پراپیگنڈے کے ذریعے انتہائی شاندار کام سرانجام دے رہا ہے، تسرتیلی خود اپنی زبان سے کہتا۔ اس پر لینن کیس، کے لیے تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کر دی جاتی۔ اور دوسرے ہی روز اس کمیٹی کو خود ہی توڑ کر لینن کی کردار کشی کی مہم کی حمایت کرنے لگتے۔ لینن کو گرفتار کر کے بورژوا عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کرتے۔

بعض کارکنوں سے وہ بڑا دکھی تھا۔ خاص طور پر جھکے کاندھوں اور بھری پیٹھ والے الیکسی پر اسے ترس بھی آیا جو دشمن کے پراپیگنڈے سے گمراہ ہو گیا تھا، جو اب بھی پرانے انقلابیوں، پر ایقان رکھتا تھا، جو آج کی سمتیوں اور بورژوا عدالتوں پر اعتماد کرتا تھا اور جس کی پیٹھ گوشت سے بھری بھری تھی ———— اوہ! لعنت ہے اس کی پیٹھ پر ... پھر وہی ... "

الیکسی نے غیر ارادی طور پر مالینوفسکی کا ذکر کر کے لینن کے دل کا زخم ہرا کر دیا تھا۔ رومان واتسلاووچ مالینوفسکی، جسے ۱۹۱۲ء میں پارٹی مرکزی کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا جو چوتھی ریاستی دوما میں بالشویک دھڑے کا قائد تھا وہ مالینوفسکی ایک

تخریب کار ایجنٹ نکلا، جسے خفیہ پولیس سے چار سو روبل ماہانہ ملتے تھے۔ خفیہ پولیس سے کسی بھی تخریب کار کو زیادہ سے زیادہ تنخواہ اتنی ہی ملتی تھی۔ فروری کے انقلاب کے بعد بورژوازی پریس نے انتہائی بے شرمی اور کمینگی سے مالینوفسکی کے سلسلے میں یہ کہہ کر بالشویکوں کی تذلیل کرنا شروع کر دی کہ مالینوفسکی کو لینن کا تحفظ حاصل ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ لینن کو یقین ہی نہیں آیا تھا کہ مالینوفسکی غدار ہے۔ حال ہی میں جب پولیس کے ریکارڈ سے اس کے بارے میں تفصیلی اور ناقابلِ تردید شہادتیں اخباروں میں شائع ہوئیں تو اسے یقین آیا۔ اگرچہ اس سے پہلے ہی اس کے ساتھیوں نے مالینوفسکی کے بارے میں اسے خبردار کر دیا تھا، اگرچہ نادیژدا کانستانتینوونا، اپنی چھٹی حس کے باعث کہ جس سے وہ لوگوں کی اصلیت فوراً جان جاتی تھی، مالینوفسکی کو بہت ناپسند کرتی تھی، اگرچہ مالینوفسکی خود کبھی کبھی مشکوک رویہ اختیار کر لیتا تھا مثلاً وہ ریاستی دوما سے یکدم استعفیٰ دے کر بیرون ملک چلا گیا تھا، پھر بھی لینن کو یقین نہیں آتا تھا، یا وہ اس حقیقت کو قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ مالینوفسکی ایک محنت کش تھا؟ فرد تھا؟ محنت کش طبقہ، اجتماعی حیثیت سے بلکہ فرداً فرداً بھی، ہر محنت کش چاہے وہ سیاسی شعور سے لیس تھا یا نہیں، لینن کی خاص کمزوری بن گیا تھا۔ وہ پلاخانوف جیسے سوشلسٹوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جو پرولتاریہ کی پرستش کرتا تھا، پرولتاریہ کی قسمیں کھاتا تھا لیکن جس کے دل میں واینا، فیدیا، میتیا، آئیوان آئیوانووچ یا پلیجیا پروفنا کے لیے کوئی حدت نہ تھی، کوئی تکریم نہ تھی، جسے ان محنت کشوں کے فہم و ادراک پر اعتبار نہیں تھا اور جن کی اسے رتی بھر پروا نہیں تھی۔ ایسے سوشلسٹوں کے لیے پرولتاریہ رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھی اور اس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ یہ ایک ایسا فارمولا بن گیا تھا جو مجرد طرح خشک اور دیوتاؤں کے بتوں کی طرح کھوکھلا تھا۔

بالکل۔ لینن، مالینوفسکی کی عالمانہ تقریروں پر فخر کرتا تھا۔ اس کی علمیت اور کہانی بیان کرنے کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اسے امید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ مالینوفسکی ایک بہترین کارکن راہنما ثابت ہو گا۔ "روسی باغی"۔ مالینوفسکی کی بیوی کی خودکشی کی کوشش کی خبر سن کر لینن حیران ہوا تھا کہ آخر کیوں؟ اب یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کی بیوی کو اپنے خاوند کی غداری کا پتہ چل گیا تھا۔ بعد میں جب مالینوفسکی خوف زدہ، لرزتا ہوا رونیتو آیا تھا تب بھی لینن نے اس کی غداری کے امکان کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے اس کی ہر گھبراہٹ کو اس کی اعصابی کیفیت پر محمول کیا تھا۔ مالینوفسکی، کارکن راہنما، جس کے نام سے دوما کا صدر اور نائب صدر کانپتے تھے، جس نے دوما میں لینن کی لکھی ہوئی شعلہ فشاں تقریریں پڑھی تھیں، وہ ان تقریروں کی نقلیں محکمہ پولیس کے ڈائریکٹر بیلیٹسکی کو قبل از وقت ہی فراہم کر دیتا تھا۔

"سو میرے محترم دوست الیکسی!" لینن نے بلند آواز سے کہا: "یہاں ایک سے ایک بڑھ کر کارکن پڑا ہے۔"

لینن نے تاسف اور پشیمانی سے سوچا کہ الیکسی اور اس ایسے پریشان خیال لوگوں کی طوفانی حمایت حاصل کرنا کتنا آسان ہو گا۔ خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے اب بھی وقت ہے۔ لیکن ان الیکسیوں کو یہ پتا نہیں کہ مقدمہ چلے گا ہی نہیں۔ کم سے کم اسے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا جائے گا تاکہ اس کا رابطہ لوگوں سے ٹوٹ جائے اور وہ حالات پر اثر انداز نہ ہو سکے، یا پھر زیادہ سے زیادہ اسے گرفتار کر کے جیل جاتے ہوئے راستے ہی میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے امکانات بہت قوی تھے (اور الیکسی کے لیے، سیلیانوف کے کاندھے پر سر رکھ کر کھیتاوے میں گریہ کرنے کا یہ بہترین جواز تھا) اگر لینن یہ قدم اٹھاتا تو یہ بھی بورژوا کی جعل سازیوں کے سامنے جھک جانا ہوتا، جو پرولتاری انقلابیوں کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا۔

تاہم، انسانی فطرت اتنی ناتواں ہوتی ہے کہ اگرچہ لینن کے سامنے ہر معاملہ صاف تھا، پھر بھی وہ اپنے ذہن میں اس تقریر کی تیاری کیے بغیر نہ رہ سکا جو، اگر وہ بورژوا عدالت کے سامنے ہوتا، تو کرتا۔ وہ اپنے تصور میں سرکاری وکیل کی تقریر سن

باقاعدہ بالشویک تحریک کی پندرہ سالہ تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد اور نظریات کے حوالے سے خود ہی ان کا جواب بھی دے رہا تھا۔
جہاں تک جاسوسی کے الزام کا تعلق ہے، اس کا کھوکھلا پن اور مضحکہ خیزی استغاثے پر بھی عیاں ہے۔ یہ الزام صرف ادھ پکے جرمن جاسوس بنام کارپورل یرمولینکو کی گواہی پر مبنی ہے جسے روسی محکمۂ جاسوسی نے گرفتار کیا ہے۔ یرمولینکو نے کہا ہے ——— جرمن جنرل شٹاف نے جس نے اسے جاسوسی کی یہ ذمہ داری عنایت کی ہے، یہ بھی بتایا تھا کہ لینن اور اس کے ساتھی بھی جرمنی کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں ——— اس احمقانہ بات پر یقین کرنے والا بہت ہی احمق ہوگا کہ جرمن آرمی اسٹاف کے افسران ایک کارپورل کے منصب کے آدمی کو بھی اپنے رازوں سے آگاہ کردیتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام حلفیہ بیانات روسی فوج کے محکمۂ جاسوسی نے اپنے سربراہ جنرل ونیکین کی نگرانی میں پچھلی جولائی میں خود تیار کیے اور اس وقت اس لیے منظرِ عام پر نہ لائے گئے کہ یہ بہت ہی مضحکہ خیز الزامات تھے۔ لیکن پاس جولائی میں انقلابیوں کی مسلح جدوجہد سے خوفزدہ ہوکر وزیرِ انصاف پیرے ویرزیف نے اس مکروہ الزام کو اخبار بھگوڑے الیکنسکی کی مدد سے شائع کروا دیا تاکہ فوجیوں کی نظروں میں بالشویکوں کو ذلیل کیا جاسکے۔

مقدمے کے دوران ان حلفیہ بیانوں کو بڑی آسانی سے رد کیا جاسکتا تھا۔ اپنے ذہن کی آنکھ سے لینن نے گواہوں کی صورتوں کو دیکھا ——— گریگوری الیکنسکی جو ہوسِ اقتدار کی بھٹی میں تپ رہا تھا اور تمام غداروں کی طرح پھسل جانے والا تھا، جس سے گھن آتی تھی۔ اس نے برتسیف کا میکری سے بھرا کوٹ دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو انقلابی دہشت پسند کہتا تھا، اگرچہ اس نے کبھی گولی نہیں چلائی تھی، بھیگی آنکھوں اور کرم خوردہ داڑھی والا۔ اس نے نراجی بانکے بورس ساونکوف کو دیکھا، جو مغرور تھا، تصنع کا مارا ہوا۔ پھر اس نے سابق مارکسی پوترلیسوف کو دیکھا اور سابق بالشویک منیشکوفسکی کو بھی۔ اس کے سامنے ایک ایک کرکے تمام "سابق" آئے، سب اپنے پچکے ہوئے گالوں اور پشیمہ ور داڑھیوں کے۔ اس نے ان کے نفرت سے بھرپور خوف زدہ لفظ سنے اور ان سب کو ایک ایک کرکے منہ توڑ جواب دیا۔ ان کی دروغ گوئی، کم علمی، انقلاب سے نفرت، عوام کے خوف، روسی محنت کش طبقے سے تنفر اور پرولتاری جمہوریت کے خلاف بغض کو عیاں کیا۔ یورپی قسم کی بورژوا جمہوریت کی شان میں مل کر گائے گئے قصیدوں، نام نہاد انجمنوں اور ان کے مارکسی شراب خانوں، کو سب کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ وہ عدالتوں میں، چوراہوں میں، کہیں بھی ان سب کے روبرو ان سے نفرت کے اظہار کے لیے تیار تھا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو شاید یہ تھی کہ کہیں پلیخانوف سے اس کا سامنا ہو جائے، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے، اس کے ساتھ پنجہ آزمائی کرے۔ پلیخانوف، لینن کے ساتھ ہی انقلاب میں پلا بڑھا تھا۔ بین الاقوامی جمہوریت کے سب سے بڑے مبلغ پلیخانوف کی زبان میں قبیح، شیطانی تبدیلی اور انقلابی پلیخانوف کا ایک منتشر الذہن آزاد خیال شخص میں ڈھل جانا، لینن کے لیے ماضی قریب کے تلخ تجربات کے باوجود ابھی تک ایک مایوس کن معمہ تھا۔ ——— تاریخ ایک پیچیدہ شے ہے۔ ہوسکتا ہے والتیئر اور روسو بھی اگر زندہ رہتے تو اپنے ہی دیے ہوئے انقلابی نظریات کے باوجود عظیم فرانسیسی انقلاب کے مخالفوں میں شامل ہو جاتے۔ وقت پر مر جانا بھی کتنی بڑی خوش قسمتی ہے۔ پلیخانوف اس معاملے میں انتہائی بدقسمت نکلا ہے۔

لینن اپنے خیالات میں ڈوبا، عدالت میں اپنی تقریر بلکہ تقریروں کو بُنتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں للکار کی لشک تھی اور ہونٹ مسکراہٹ میں خمیدہ تھے۔ پیٹی بورژوازی کیمپ سے اپنے مخالفوں کے لیے نفرت کا اظہار اس کے لیے محض پراپیگنڈے کا ایک وسیلہ نہیں تھا بلکہ اسے واقعی ان کے مقالوں، تقریروں، ان کی عادات و اطوار، لیس دار فقروں اور اس بلند بانگ دعوؤں سے شدید نفرت تھی۔ بعض اوقات تو اسے دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے سلسلے میں ان کی ناقص عقل اور مکمل کم فہمی پر کافی تعجب ہوتا تھا۔ کیرنسکی خاص طور سے محض ایک کُند ذہن شوریدہ نوجوان تھا، ایک ناپختہ شخص۔ ڈان اور تسیرتیلی شیطان لونڈے تھے۔ مارتوف بچگانہ طور

بیکراں اور ناشاد۔ اور زینوویف خوف کا مارا گندہ بچہ۔ یہ سب لینن کو روسی انقلاب کی اہمیت کے سامنے اتنے کمینے اور بونے نظر آتے تھے کہ اب وہ خود حیران تھا کہ اس نے انھیں سنجیدگی سے کیسے درخورِ اعتنا سمجھا۔

بہرحال وہ سب روسی مکاریت کے نمونے تھے۔ بے ربط فطرت کے مظہر جو اسی مبہم زبان میں گفتگو کرتے تھے جن کے دورے اور بول، مکارانہ جہتوں کو بھی دھندلا دیتے تھے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ ان کے اثر کو بالکل صفر کر دیا جائے۔ ورنہ اصلی دشمن طاقت اور بعض شعاری اور آشکارا نیم آشکارا انقلاب دشمنوں یعنی ملیوکوف اور ماکلاکوف، ریابوشنسکی اور تیریشچینکو کے ساتھ معرکہ کیسے لڑا جا سکتا۔ وہ لوگ جانتے تھے انھیں کیا چاہیے۔ وہ عمل کے لوگ تھے، جن کے ذہن انتہائی کاروباری تھے۔ وہ سیاست بھی شدید کاروباری حساب کتاب سے برتتے تھے۔ انھیں لفظوں پر قطعی اعتماد نہیں تھا اور وہ جانتے تھے کہ بیل کو سینگوں سے کیسے قابو کیا جاتا ہے۔ دراصل پردہ ان سے تھا کیونکہ یہی وہ لوگ تھے، جو جولائی کے بعد سے ریاستی اقتدار پر قابض تھے۔ عدالتِ عظمیٰ پر بھی ان کا اثر و نفوذ تھا۔ وہ [illegible] الیکسی چاہتا تھا کہ لینن ایسی عدالت میں پیش ہو۔

لہٰذا یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کارکنوں کے سامنے موجودہ سوداگروں کی سمجھوتے بازی کے نقصانات کو واضح کر دیا جائے اور ان پر پیٹی بورژوؤں کے انصاف کی اصلی نوعیت کو افشا کیا جائے۔

اس شام، اس چھوٹی سی خنک غسل گاہ میں لینن کے ذہن میں دو مضمونوں کے نقوش ابھرے، جنھیں اس نے بعد میں نعروں کے بارے میں اور آئینی سرابوں کے بارے میں عنوان دیے۔

لینن اپنی جھونپڑی کے قریب گھاس پھونس میں ادھ کچی لکڑی سے بنائی میز کے سامنے بیٹھا اپنے پہلے مضمون کا اختتامیہ لکھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں خطرے کی سیٹی کی آواز آئی۔ اس کے مشورے سے یہ طے پایا تھا کہ جھیل سے، یا کسی اور طرف سے بھی کسی کی آمد کا اعلان ایسی ہی خطرے کی سیٹی بجا کر کیا جایا کرے گا۔ لینن نے نظریں اٹھا کر دیکھا، یمیلیانوف کا سترہ سالہ بیٹا ساشا سبزہ زار پار کر کے آ رہا تھا۔ لینن بھاگ کر اس کے پاس گیا اور اس کی بغل میں دبا اخباروں کا بھاری پلندہ اس سے لے لیا۔ کچھ کہے سنے بغیر وہ یمیلیانوف، اور زینوویف کے ساتھ سلگتی آگ کے قریب بیٹھ گیا اور اخباروں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کبھی کبھی اس کی زبان پر بڑے معنی خیز انداز میں یہ لفظ آ جاتے ——— "اچھا، اچھا" یا "آہا" یا پھر "ہوں، ہوں" ——— یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کے ساتھ بہت گرمجوشی سے، لیکن خاموش بحث کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں پلک جھپکتے میں ایک نئے احساس کا تاثر دیتی تھیں۔ نفرت، مایوسی، جذباتیت اطمینان، للکار۔

"تو وہ دوبارہ سزائے موت کو نافذ کرنا چاہتے ہیں" بالآخر اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا" . . . یہ دیکھو، کورنیلوف کی طرف سے تار چھپا ہے۔ بالکل الٹی میٹم معلوم ہوتا ہے۔ . . دیوانے اور جاہل لوگوں کی فوج جسے بداعمال، بدنیت اور بے ہمت ہونے سے کوئی کام بھی نہیں بچا سکے؛ انسانی عظمت کو ذلت کے گڑھوں میں گرانے کے بعد پسپا ہو رہی ہے۔ اس کی پسپائی کو یہ انقلابی حکومت روک سکتی ہے، ذلت اور رسوائی کے گڑھے سے نکل سکتی ہے۔ اور اگر یہ ناممکن ہوا تو تاریخ کا [illegible] رُخ اس اور ہو جائے گا جہاں وہ اس ذلت کو مٹانے کے امکان کے ساتھ انقلاب کے کارہائے نمایاں کو بھی برباد کر دیں گے اور ملک پر ناخوشی مسلط کر دیں گے۔ . . تم اس

سب پہ دولس کو کچھ ہو کر گریگوری، پری! یہ ہم بڑی عجیب بات ہے۔ ۔ سنو! اس کا عہدہ اور بھی ہو جیسے پنڈ پچ کے کہتا ہے: 'میں جنرل کورنیلوف جس نے شعوری یا نکتہ جھکنے سے آج تک اپنی ساری زندگی اپنے ملک کی بے لوث خدمت میں گزاری ہے، اعلان کرتا ہوں کہ مادرِ وطن جان لیوا خطرات میں گھر گئی ہے، اس لیے ماورائی اقدام کے طور پر ضروری ہے۔ ۔ ۔' ماورائی اقدام؟ ہنہ! اس میں حقیقت بیان کرنے کی جرأت نہیں۔ اس بے لوث ملک کا بے لوث خدمت گار یہاں گول مول بات کر کے ابہام پیدا کرتا ہے۔ ۔ ۔ 'اس لیے ماورائی اقدام کے طور پر یہ ضروری ہے کہ اس بالائی کی صورتِ حال میں سزائے موت کو فوراً نافذ کر دیا جائے اور سرسری فوجی عدالتوں یا سمری کورٹ مارشل کو پھر سے جاری کیا جائے۔ ۔ ۔' ہوں، اس میں تو کوئی ابہام نہیں یا زیادہ ابہام نہیں۔ یہ بات اس نے سنجیدگی سے کہی ہے۔ اور یہ دیکھو حکومت کی طرف سے سزائے موت کا حکم نامہ جس پر کیرنسکی، سیفرنوف اور لیفتولوویچ کے دستخط ہیں۔ ۔ تو الٹی میٹم پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ کیرنسکی کی طرف سے ذرا سی ترمیم جو اس بڑبولے کا خاصہ ہے۔ سرسری فوجی عدالتیں نہیں بلکہ انقلابی فوجی عدالتیں۔ یوں عوام کو بہتر طور پر بیچ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس اقدام کو ایک انقلابی اقدام سمجھیں۔ ۔ ۔ لو، کورنیلوف کو ایک اور خوفناک انقلابی کی حمایت حاصل ہو گئی! بورس سوونکوف: ناول نویس، دہشت پسند کہتا ہے۔ ۔ ۔ 'اس کے لیے سزائے موت جو اپنی زمین، اپنے ملک، اپنی آزادی کی خاطر جان قربان کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ۔ ۔' ہنہ، جملوں کی انتہائی انقلابی بندشیں، پر اندر سے کھوکھلی کیونکہ اب تو زمین ہے نہ آزادی۔ اور دیکھیں، اس دوران سوویتوں کی مرکزی مجلسِ عاملہ کیا کر رہی ہے؟ اور ہمارے سوشلسٹوں کا رویّہ کیا ہے؟ آہا۔ ۔ ۔ یہ رہے، روسی جمہوریت کے مشاورتی ادارے کے راہنما، محنت کشوں کی سوویتوں اور فوجی سپاہیوں اور کسانوں کی مجالسِ عاملہ کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس کی کارروائی۔ حضرت کیرنسکی کی تقریر: 'حکومت مادرِ وطن روس کا تحفظ کرے گی۔ اگر شعور، عزتِ نفس اور ضمیر کے دلائل ناکافی ثابت ہوتے ہیں تو گولی اور خون کے ذریعے قومی اتحاد کو معرضِ وجود میں لا کر پختہ کیا جائے گا۔ ۔ ۔'
یہ ہماری طرف اشارہ ہے۔ یعنی گرفتاریوں، قتل اور کردار کشی کو شعور، عزتِ نفس اور ضمیر کے دلائل بنا کر سمجھایا جا رہا ہے۔ نکولائی سمیانووچ چخیدزے نے بنفسِ نفیس جوابی تقریر میں حکومت کو مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ خوب، خوب۔ ۔ تو کیرنسکی چخیدزے کے ساتھ بغلگیر ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں یعنی روس کے تاریخی ملفوظات میں یہ ضرور لکھا جانا چاہیے کہ سزائے موت کے دوبارہ نفاذ پر روسی پیٹی بورژوازی نے ایک دوسرے کا بوسہ لینا پسند فرمایا ہے۔ ہوں، تو جناب فیودور دان ایک قرارداد پیش فرماتے ہیں۔ سزائے موت کے نفاذ کے محرکات کے مطابق ہمیں مطابق مطالبہ فرماتے ہیں کہ تمہیں، گریگوری کو اور مجھے عدالت میں پیش کر کے معدوم کیا جائے۔ ۔ تمہیں یاد ہے؟ یہ وہی حضرت ہیں جو پندرہ برس پہلے میونخ سے بالمونتوک تشریف لاتے ہوئے اپنے سوٹ کیس کے پیندے میں میری کتاب 'اب کیا کرنا چاہیے' چھپا کر لائے تھے۔ اس کتاب کی تعریف میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتا تھا کمبخت۔ میں نے اس کتاب میں اس وقت بھی سوشلسٹ انقلاب کے بارے میں اپنے عزائم کا برملا اظہار کیا تھا اور وہ ہے تاریخ کے پیچیدہ راستے! تو خیر سنو۔ بالشویکوں کو کچلنے کے لیے حکومت نے پیٹروگراڈ میں فوج بلائی ہے۔ ایک سو سترویں ازبورسکی رجمنٹ، دینوفسکی رجمنٹ مشین گنوں کے ساتھ، کولٹسک نوویں رجمنٹ اور تیسرا نان کمیشنڈ افسر سکول، سب پہنچ چکے ہیں۔ چودھویں ہتافسکی رجمنٹ نے محل چوک میں پریڈ کی اور۔ ۔ ہاہاہا! سلامی کس نے لی؟ سوشلسٹ انقلابی راہنما اور بورژوا حکومت کے وزیر وکتور چرنوف کے سوا اور کون سلامی لے سکتا ہے! حالات، بونا پارٹ آمریت کی طرف دھکیل رہے ہیں اور یہ سوشلسٹ فنڈا اس کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ پیٹروگراڈ فوجی افسروں کا ہنگامی اجلاس۔ ۔ ہوں! یہ صورتِ حال کو سالانکوف سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ کپتان زورا فلیوف کہتا ہے۔ ۔ ۔ 'سوویتوں کی قسم کی پیشہ ورانہ تنظیمیں حکومتی کاروبار میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ۔ ۔' کپتان مائیلوغانوف نے مشورہ دیا ہے کہ سزائے موت کا اطلاق فوجیوں کے علاوہ دوسرے

شہریوں پر بھی ہونا چاہیے کہ کرنل لیفٹیننٹ خوتوتوف نے تو اپنے خیالات کا اظہار اور بھی اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ ۔ 'ٹھیک سرجی چاہیے، سرجی۔ ۔ ۔' دانشوری آمریت۔ اور یہ ایک مختصری تحریر ہے کسی آئی۔ چُیف کی۔ نظاہر ہے، یہ نام فرضی ہے، پولس سے کسی آئینی جمہوریت پسند کی ہوتی ہے۔ گرچہ اس تحریر کا عنوان انتہائی مختصر ہے پر ہے بہت بامعنی '۔ ۔ ۔ وہ' اس چھوٹے سے فنائی مضمون کا پس منظر صاف طور پر سیاسی ہے۔ ۔ ۔ 'پچھلے ماہ کے دوران۔ ۔ ۔' یہ آئینی جمہوریت پسند لکھتا ہے، 'ابھی انھیں یقیناً آئینی جمہوریت پسند ہے، ہاں تو لکھتا ہے '۔ ۔ ۔ میں نے اس کے بارے میں اکثر سوچا ہے۔ میں نے تصور میں اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اسے راہ چلتے لوگوں میں شناخت کرنے کی سعی کی ہے۔ میں نے شہر روزنامہ اخباروں میں چھپنے والے ان گنت ناموں میں اس کے نام کا اندازہ لگانے کی بھی کوشش کی ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ظہور ہوگا۔ وہ کون ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ فوجی ہے۔ فوجی افسر۔ اس لمحے منصب کی کوئی اہمیت نہیں۔ خداداد صلاحیتوں کے لیے راستے کھلے ہیں۔ وہ انتہائی تلخ خود سر اور خواہش پرست ہوگا لیکن اسے اپنی ان خصوصیتوں کو چھپانے کا ملکہ بھی ہوگا۔ وہ بہت ٹھنڈے دل کا ہے۔ سرابوں سے پاک، سنجیدہ۔ تلوار ایسا لچکیلا اور کٹیلا۔ مادرِ وطن، حریت، پرولتاریہ، مساوات، جمہوریت، سوشلزم اور عالمی مسرت ایسے الفاظ اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ دیکھتا ہے، انتظار کرتا ہے پھر جا پہنچتا ہے۔ تین جولائی کو سو دو دیا پر گولی چلنے کے بعد لحہ بھر کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کی جھلک دیکھی ہے۔ مضطرب ہجوم ایک بہتا ہوا سمندر تھا۔ پھر وہ لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کے آیا جیسے لہروں پہ بہہ رہا ہو۔ اس فوجی افسر نے چمڑے کا کوٹ پہنا تھا جس کی آستینوں کے گرد تین دھاریاں تھیں۔ اس کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی جو اس نے چند لمحے پہلے ایک ریڈ گارڈ سے چھینی تھی۔ وہ دراز قد نہیں تھا۔ باوقار اور لچیلا، سیاہ روشن آنکھیں، تیکھی چبھتی نظریں، مستعد۔ ایک رُخ سے دیکھنے پر وہ مجھے نپولین ہونے کا تاثر دیتا تھا۔ پیارے قارئین کیا آپ اس کے دور سے آتے قدموں کی چاپ نہیں سُن رہے؟ پیٹرگراڈ کی نیلگوں جھلملاتی راتوں میں کیا آپ نے اس رجلِ عظیم کا ہیولا زمین سے لے کر آسمان تک پھیلتا نہیں دیکھا۔ ۔ '۔ تو جناب یہ ہیں، بورژوازی کے خواب! بورژوا کو صاف نظر آتا ہے کہ پیٹروگراڈ کی نیلگوں، جھلملاتی، سرد راتوں میں زمین سے آسمان تک دیو قامت فاتح پرولتاریہ کا سایہ چھا رہا ہے۔ وہ اس سائے کو دیکھتا ہے اور خوف سے کانپ کانپ جاتا ہے اور اس سائے کو اپنے تصوراتی، روسی بونا پارٹ کے پردے سے ڈھانپ دینا چاہتا ہے جو ریڈ گارڈ سے چھینی رائفل کندھے سے لٹکائے ہے۔ اپنے محبوب آمر کا سایہ، ایک ایسا ترش رو جس کے لیے مادرِ وطن، حریت، پرولتاریہ، سوشلزم اور عالمی مسرت ایسے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک اس شخص کے مرتبے منصب کا تعلق ہے، انہیں دراصل کسی جرنیل کی تلاش ہے کسی ماتحت قسم کے شخص کی نہیں۔ اور یہ جرنیل شاید وہی ہوگا، جس کی تمام زندگی اپنے ملک کی بے لوث خدمت میں گزری ہے، اور جس نے عارضی اقدام کے طور پر سزائے موت دوبارہ نافذ کر دی ہے۔ پروفیسر اور وکیل اب بھی عوام کو بلوائیوں کے ہجوم کی صورت دیکھتے ہیں۔ ہنہ، کمبخت تاریخ کے کوڑا کرکٹ ہیں۔ انہیں اب بھی یقین ہے کہ وہ علاقی سازشوں اور فداری کی گٹھ جوڑ سے اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ ۔ ۔ اور یہ سنو ایک نظم:

۔ ۔ ۔ اور میں نے باورچی خانے میں خانساماں کے ساتھ
دو ایک شہوانی گیت گائے۔
اے روس! کہیں بالشویکوں کے کھودے گڑھے میں نہ گر جانا!
میں منافقت میں پابند نہیں رہ سکتا
اور لوگ سکھاتے ہیں مجھ سے سرد مہری برتتے ہیں،

سہانے عورتوں والے دلفریب اپنے پاس رکھو،

اور مجھے بتاؤ کہ لینن کس گڑھے میں پھنسا ہے؟

ہوں، ہوں - اب ایک بُری خبر سُن لو - ریول میں ہمارے بالشویک اخبار کیراوا اور تروپراودی بند کر دیے گئے ہیں - ہیلسنگفورس والا اور کرانشٹات میں جو لوس پراودی پر پابندی عائد کر دی گئی ہے ۔ ۔ ۔ گریگوری! تم نے اپنا مضمون مکمل کر لیا ہے؟ ابھی نہیں؟ بہرحال اسے مکمل کر لو - میں اپنے مضمون کا اختتامیہ لکھ رہا ہوں - فکر نہ کرو - ان کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے گا - تم پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو ساشا؟ یار، ڈرو نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا - اخبار لانے کا بیحد شکریہ، اگرچہ تم ان میں بری خبریں بھی ساتھ لائے ہو پر کوئی بات نہیں - بری خبریں انسان کے کردار کو بنانے میں بڑی مدد دیتی ہیں - جا رہے ہو ساشا؟ اپنی والدہ سے میرا سلام کہنا - اچھا - الوداع ساشا - کل کون اخبار لائے گا؟"

دوپہر تک گرمی بہت بڑھ گئی تھی - گھاس پر دھوپ کسی ٹھوس وزنی شے کی طرح پڑی تھی - سایہ گھنا تھا پر اس دھوپ سے کسی صورت بہتر نہیں تھا کہ اس کی ہوا بھی اتنی ہی گرم تھی - چھپکلیاں، اژدر مکھیاں اور مچھروں کے بادل خواہ مخواہ اس سائے میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔

لینن اپنا کام روک کر بار بار یمیلیانوف کی طرف دیکھتا جو پیٹ تک برہنہ ہو کر گھاس سمیٹ رہا تھا - یمیلیانوف صرف لوگوں کے شبہے سے دور رہنے کے لیے گھاس کاٹتا تھا کہ گھاس کا ڈھیر اتنا ہو جائے کہ وہ آدمی کسی پیشہ ور کا کام دکھائی دے - وہ بڑی مہارت اور دلجمعی سے کام کرتا تھا - وہ واقعی ہر فن مولا تھا - اس جگہ گھاس کاٹنا بہت مشکل تھا لینن نے بھی دو ایک مرتبہ کوشش کی تھی اور ہنسیا ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی کیونکہ گھاس میں چھوٹے چھوٹے درختوں کی بہت سی ٹھڈیاں چھپی تھیں - برساتی میں گزارے دنوں کے دوران لینن روزنوں سے یمیلیانوف کو کبھی کھدائی کرتے اور کبھی بڑھئی کا کام کرتے دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوا کرتا تھا - یمیلیانوف کی بیوی، دو سالہ گوشا کو گود میں اٹھائے، احاطے میں شام کا کھانا تیار کرتی، اسے بہت بھلی لگتی تھی - اس کے ملائم ہاتھ، پسینے کے قطرے اور چہرے پر خون کا دوران تیز، بہت جاذب نظر تھا - لینن پر منکشف ہوا کہ یہ محنت کش صحیح انقلابی تھے جن کی جانیں بھی اپنے طبقے کے لیے حاضر تھیں - شدید جانی خطرے کے باوجود انھوں نے لینن کو اپنے ہاں چھپانے میں پس و پیش نہیں کی تھی - اپنے حشر سے بے پروا، وہ اپنے گھریلو کام کاج پوری تندہی سے انجام دیتے تھے - سبزیوں کو پانی دینا، کھانا پکانا، جلانے کی لکڑی کے گودام کی مرمت کرنا اور پھر سات بچوں کی پرورش - وہ اپنے بچوں کی ایسی تربیت کر رہے تھے کہ وہ اچھے اور دیانت دار انسان بن سکیں - بلند بانگ دعووں کے بغیر اپنی دیانت سے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی نمونہ بن کر ہمیشہ مسلسل سچائی کے ساتھ کام کر کے وہ اپنے بچوں کے لیے مثال بنتے تھے۔

پچھلے چند برسوں میں محنت کشوں کا یہ پہلا کنبہ تھا، لینن جس کے اتنا قریب ہوا تھا - بچوں کی زبان سے روسی سننا اسے بہت پسند تھا - اس نے بچوں کے ساتھ کبھی اتنا وقت بسر نہیں کیا تھا - جن بچوں سے وہ ملا بھی تھا، وہ جرمن یا فرانسیسی مہاجر تھے - صبح کے وقت وہ بے خوابی کا مارا اپنی برساتی سے نکلتا اور دبے پاؤں، گھاس پر سوئے بچوں کے قریب سے گزرتا - بازو پھیلائے، لال لال گال، نیند میں مُندی آنکھیں، مدھم سانس اور ہلکے ہلکے خراٹے اس کے دل میں اتھاہ پیار جگا دیتے - اس

سوچا کرتا تھا کہ اس کی بیوی بھی ان بچوں کو ساتھ دیکھے۔ ایسے سمے اسے یمیلیانوف کی خوشیوں بھری گھریلو زندگی پر بہت رشک آتا کہ ایک پیشہ ور انقلابی ہونے کی حیثیت میں وہ اس خوشی سے محروم رہا تھا اور شاید ہمیشہ رہے گا۔

نیند سے بیدار ہونے پر کنبے کا ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اپنے گھر اور سب کی بہتری کے لیے کام کاج میں مصروف ہو جاتا۔ لینن کو یہ مست رو انسانی کارروائی بہت پسند تھی۔ وہ انھیں اپنے اپنے کام میں مصروف دیکھتا، جیسے کہ اب یمیلیانوف کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا بھی جی چاہتا کہ کھدائی کرے، لکڑی پر رندہ لگائے، رسّی اُٹھائے، فرشوں پر تیڑی پھیرے۔ پھر وہ جلد ہی اس خواہش کو بھول جاتا اور اپنے مضامین اور اخباروں کی طرف لوٹ جاتا اور ایک بار پھر اس کے دل میں دو کر جذبے موجزن ہو جاتے، عوام کی امیدیں امنگیں، اذیتیں اور دوسری جماعتوں کی ماہرانہ سازشیں۔

جب کولیا جھیل کے کنارے سے گشت کر کے واپس آیا تو لینن پھر اپنے کام کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ کولیا جھونپڑی کے قریب بیٹھ گیا اور دیر تک لینن کو کام کرتے دیکھتا رہا کہ وہ کیسے لکھتا ہے، کیسے سوچتا ہے، اُٹھتا ہے، سوچ میں گم چند قدم ٹہلتا ہے۔ اتنی خوفناک گرمی کا اسے کوئی احساس نہیں۔ کولیا کا جی چاہتا تھا کہ لینن کو جھیل میں تیرنے کی دعوت دے لیکن اسے اس کے کام میں دخل انداز ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر وہ یہ جرأت کر لیتا تو اس کے ابا اس سے بہت ناراض ہوتے۔

کچھ دیر بعد کولیا جھیل کو لوٹ گیا۔ اس نے ایک خفیہ جگہ مچھلی پکڑنے کا سامان رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے اس جگہ سے سامان نکالا اور کنڈی جھیل میں ڈال کر بیٹھ گیا پر کوئی مچھلی نہ لگی۔ دوپہر شدید گرم تھی۔ اس نے بالآخر مچھلی پکڑنے کا سامان سمیٹ کر واپس اسی خفیہ جگہ پر رکھ دیا، وہیں سے اپنا تیر کمان نکال لیا اور نشانہ بازی کرنے لگا ——— تمام صبح وہ جھونپڑی کے گرد چکر لگاتا رہا تھا اور تندہی سے گشت کے فرائض سر انجام دیتا رہا تھا ——— وہ راستوں پر دبے پاؤں چلتا، بڑی احتیاط سے درختوں کی جھکی شاخوں کو راستے سے ہٹاتا کہ آواز نہ ہو اور چلتے میں جب جنگل کی مبہم آوازیں یا مچھروں کی بھن بھن سنتا تو وہیں جم کر کھڑا ہو جاتا۔

جب وہ گھنی جھاڑیوں میں پہنچا تھا تو گھاس میں چلتی ہنسیا کی سرسراہٹ سن کر بہت احتیاط سے چلتا ہوا جنگل کے بیچ سبزہ زار تک گیا جہاں راسولوف کی گھاس کاٹنے کی الاٹمنٹ تھی۔ راسولوف سیستروریتسک کا ایک محنت کش تھا اور رازلف میں یمیلیانوف کے گھر سے نزدیک ہی رہتا تھا۔

کولیا پیٹ کے بل لیٹ کر رینگنے لگا تھا اور کچھ دور جا کر ایک درخت کے پیچھے ساکت ہو گیا تھا۔ راسولوف گھاس کاٹ رہا تھا ——— جب اس کی ہنسیا کسی مٹی سے ٹکراتی تو وہ زیر لب کوسنے دیتا اور رک کر ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگتا ——— کولیا کی بھنویں لینن کے انداز میں تن گئیں۔ اگرچہ وہ راسولوف اور اس کے بیٹے وتیا کو اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی اس نے ڈرامے کی خاطر لمحہ بھر کے لیے یہ تصور کیا کہ وہ راسولوف کو نہیں بلکہ عبوری حکومت کے جاسوس کو دیکھ رہا ہے، جو لینن کی ٹوہ لے رہا ہے۔ اس نے مٹھی بند کر کے شہادت کی انگلی کھڑی کر کے پستول بنا لیا، پہلے اس کے ماتھے پر تانا، پھر یہ فیصلہ کر کے کہ گولی ایسی جگہ ماری جائے کہ وہ چوہا فوراً ختم ہو جائے اور جوابی فائر نہ کر سکے، اس نے اس کے سینے کو نشانہ بنا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کے جوابی فائر سے درختوں کے پیچھے چھپے دوسرے جاسوسوں کے کان کھڑے ہو جائیں۔

اس دوران راسولوف نے اپنا کام ختم کر کے مٹھی بھر گھاس سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ہنسیا کو جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ ٹکا کے وہ ایک بار بڑبڑایا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلے سے ڈبل روٹی کا ٹکڑا، سورج مکھی کے بیجوں کے تیل کی شیشی، پیاز اور کھیرے نکالے۔ وہ ہنسیا کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کولیا نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی اسے گولی نہیں مارے گا۔ اس

وقت ضائع کرنا بے سود اور اوکھٹ ہوگا۔ وہ اُلٹے پیر رینگتا پھر جنگل میں چلا گیا اور اٹھ کر اپنے مخصوص محتاط طریقے سے کسی بھی آواز پر کتا کاتا بائیں جانب کو چلنے لگا۔ وہ راستے میں ایک بہت بڑے چیونٹیوں کے ٹیلے کے پاس رک گیا اور سانس روک کر چیونٹیوں کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ بھی جاسوس ہوں۔ چیونٹیاں، ادپر نیچے، ادھر اُدھر ایک دوسرے کے پرے سے گزرتی بھاگ رہی تھیں اور جیسے کوئی کی وہاں موجودگی سے پوری طرح باخبر تھیں، جبھی تو وہ اتنی مصروف نظر آرہی تھیں۔ وہ ادھر سے اُدھر یوں تیزی سے پھر رہی تھیں جیسے انقلاب کی تیاری کررہی ہوں۔ شاید ان میں بھی کوئی کیرنسکی ہو۔ ایک چیونٹی، چھوٹا سا، سُرخ تنکا گھسیٹے جا رہی تھی، شاید یہ بالشویک ہو۔ ایک خاص کام جو وہ نہیں کر رہی تھیں، وہ احتجاج تھا۔ وہ سب کچھ چپ چاپ کر رہی تھیں نیفسکی پر فوجی سپاہیوں کی طرح۔

کوبیا چیونٹیوں کے ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ہر اور جاسوسوں اور کازکوں کا تصور کر کے چھپنے، کان زمین سے لگانے اور بے آواز و بے ساکت ہونے کی کارروائی کی وجہ سے کچھ تھک سا گیا تھا۔ لیکن جب وہ جھیل پر پہنچا تو وہ یکایک پھر زمین پر لیٹ گیا۔ ایک کشتی کنارے کی طرف آرہی تھی۔ اس کا دل اُچھل کر مُنہ میں آگیا۔ وہ پلٹ کے گھر کو بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے رک کر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد اسے کشتی میں دو شخص نظر آئے۔ اس نے چشم زدن میں اپنے بھائی کوندراتی کو پہچان لیا۔ کوندراتی کشتی چلا رہا تھا۔ کوبیا مسکرا دیا لیکن جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا نہیں۔ وہ اپنے بھائی کو نظر انداز کر کے بڑی سنجیدگی سے کشتی کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیونٹیوں کا ٹیلا نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی ——— "یہ تو اسی طرف آرہے ہیں"، کوبیا تشویش میں بُڑبُڑایا۔ کشتی کے پچھلے حصے میں چمڑے کا کوٹ پہنے کوئی شخص بیٹھا تھا۔ "اس شدت کی گرمی میں چمڑے کا کوٹ!" کوبیا متفکر ہوگیا۔ کشتی، جھیل کے کنارے آگے سرکنڈوں میں آکے رُک گئی۔ کوبیا نے چمڑے کے کوٹ والے کو شناخت کر لیا۔ وہ سیسترورتسک کے کارخانے کا مزدور کارکن دائیلا چسلاف آئیوانووچ زوف تھا جو پہلے بھی کئی بار لینن سے ملنے آیا تھا۔

نوواردوں کے سامنے آئے بغیر پودوں میں کھسکنے کے بعد کوبیا جھونپڑی کی طرف بھاگ گیا۔ اس کا باپ گھاس کاٹنے کے بعد آگ جلا رہا تھا۔ خوشگوار دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لینن اور زینوویف پودوں کے دبیز پردے کے پیچھے نظر نہیں آتے تھے۔ کوبیا نے پرندے کی مخصوص سیٹی بجائی اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوگیا، سبزہ زار میں نہ آیا کہ اس کی کارروائی پوشیدہ رہ سکے۔

چند منٹوں میں زوف اور کوندراتی دھوپ میں نہائے ہوئے سبزہ زار میں پہنچ گئے۔ لینن ان سے ملنے کے لیے تیزی سے بڑھا، پھر راستے میں رُک گیا اور سر کو جھاڑیوں کی اور جھکا کے تمسخر سے مُسکرا کے آنکھ مارتے ہوئے اس نے کہا۔

"تو یہ ہے وہ شخص، چمڑے کے کوٹ والا، باوقار اور رچیلا! تیکھی آنکھیں سیاہ۔" وہ ہنسا اور زوف کی طرف بڑھا۔ زوف یہ سُن کر حیران و پریشان خفت زدہ ہوگیا: "انھوں نے تمھیں بتایا نہیں کہ تم بالکل نوجوان نیپولین کی طرح لگتے ہو، نہیں؟ تو خدا کا شکر ادا کرو، کامریڈ زوف۔ اسے یہ کوٹ اُتار دو ورنہ بھن جاؤ گے۔ . . ."

"جی میں نے یہ کوٹ اس کے استر کی وجہ سے پہنا تھا۔" زوف نے شرمیلی مسکراہٹ سے کہا۔

اس نے اپنا کوٹ اُتار لیا اور اس کا استر پھاڑ کر اس میں سے کاغذوں کا پلندہ نکالا۔ ہوا کے یک لخت تیز جھونکے نے اس کے ہاتھوں سے کاغذ اُڑا دیے۔ لینن ان کو پکڑنے کے لیے جھپٹا اور زوف بھی۔ لینن ہنسا اور زوف بے یقینی سے اس کی ہنسی کی بازگشت بن گیا۔ وہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اس کی بے اختیاری اور خود پر قابو رکھنے کی خاصیت پر ششدر تھا۔ لیکن کاغذ سمیٹنے کے بعد لینن کے ماتھے پر تفکر سمٹ آیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"سو ہمارے تمام اخبارات پر پابندی لگادی گئی ہے کہ ذف ٹاٹ کا بھی اس پر اودی بھی؟ کراف ٹاٹ کے ساتھیوں نے یہ کیوں ہونے دیا؟"

"اس کی جگہ پرولتار سکائے وائلو شایع ہو رہا ہے۔ نیا اخبار جولوس پراودی کی پابندی سے دوسرے ہی دن شایع ہو گیا تھا۔ یہ دولا نکولائیفنا شال کی ادارت میں۔"

"واہ، بہت خوب" لینن نے کہا اور زینووئیف کی طرف مڑا: "تو میرے اور تمہارے خیال کے مطابق کرانشاٹ کے ساتھیوں نے ہمیں دغا نہیں دی" وہ جھاڑیوں کے پیچھے اپنی کارگاہ میں چلا گیا اور چند لمحوں بعد اپنا مسودہ لے کر پلٹ آیا: "بیٹھو کامریڈ زوف . . . میں تمہیں سب سمجھا دیتا ہوں۔ یہ دو مضامین میں نے ابھی لکھے ہیں، 'سیاسی صورتِ حال' اور 'شہزادہ لغوف کے لیے ہمارا شکر' اور یہ مضمون میں نے بہت پہلے پیٹروگراڈ میں لکھا تھا، 'آئینی جمہوریت پسندوں کے بارے میں جو وزارتیں چھوڑ رہے ہیں۔' یہ مضامین پرولتار سکائے کو دے دو۔ میں نے ہر جگہ 'مسلح بغاوت' کے بجائے 'فیصلہ کن جدوجہد' استعمال کیا ہے تاکہ انتظامیہ کہیں اس اخبار پر بھی پابندی نہ لگا دے۔ ایک ہی تو رہ گیا ہے ہمارا ترجمان اخبار۔ مجھے اُمید ہے کارکن اس کا مطلب سمجھ جائیں گے۔ اس کی اشاعت کتنی ہے؟"

"پتہ نہیں۔ ابھی تک ایک ہی شمارہ نکلا ہے۔ اگلی مرتبہ آپ کو صحیح تعداد بتاؤں گا۔ نادشہدا کونستانتینووناّ اور کامریڈ للینا ٹھیک ٹھاک ہیں اور تو کارپو کے ہاتھ کھانے کی چیزیں اور کپڑے وغیرہ بھیج رہی ہیں۔"

"بہت خوب۔ میں اس کے ہاتھ ایک اور مضمون بھیج دوں گا۔ آج اسے مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہت اہم مضمون ہے۔ میں ابھی تمہیں پرولتار سکائے کے نام رقعہ لکھ کر دیتا ہوں۔ اپنے اور گریگوری کے دستخطوں کے ساتھ۔ صرف کرانشٹاٹ میں ہی نہیں بلکہ پیٹروگراڈ میں بھی لوگوں کو پتہ چلنا چاہیے کہ ہم زندہ ہیں، کام کر رہے ہیں اور تمام الزامات کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔"

لینن اسی وقت خط لکھنے بیٹھ گیا۔ زوف اسے مکمل توجہ اور تیزی سے لکھتا دیکھ کر حیران ہوا۔ ٹڈے اس کے گرد پھدک رہے تھے۔ اُڑتی مکھیاں اس سے ٹکرا ٹکرا جاتی تھیں جنھیں وہ بے توجہی سے اپنے بائیں ہاتھ سے ہٹا دیتا۔

"پیٹروگراڈ میں کیا ہو رہا ہے؟" زینووئیف نے پوچھا: "انقلابی دستوں سے اسلحہ چھین تو نہیں لیا گیا؟"
زوف نے لینن سے نظریں ہٹا کر کہا۔

"ہاں . . . میں آج صبح محل چوک میں تھا جب انھوں نے پہلی مشین گن رجمنٹ سے ہتھیار چھینے۔ فوج نے چوک کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ سرما محل کے ساتھ کزاک اور رسالے کے یونٹ تھے۔ جنرل اسٹاف کی عمارت کے ساتھ سائیکل سوار وزارتِ خزانہ کے اکواڑے اور وزارتِ خارجہ کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ پہلی گارڈ ڈویژن کے یونٹ۔ الیگزانڈر مینار کے گرد جیگر اور سیمیونوفسکی رجمنٹوں کی بٹالینیں اور وہ انقلاب دشمن جتھے جو محاذ سے پلٹ کر آئے تھے۔ ہمارے مشین گنوں والے علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں آگے بڑھتے تھے اور چوک کے وسط میں اپنے ہتھیار پھینک دیتے تھے۔ ہمارے تمام سپاہیوں کو نہتا کرنے کے بعد انھیں نگرانی میں سولیا نائے گورودوک روانہ کر دیا گیا . . ."

زینووئیف نے سر جھٹکاتے ہوئے پوچھا: "ان کا کیا حشر کریں گے؟"

"شاید انھیں محاذِ جنگ پر بھیج دیں۔ سزا یافتہ بٹالینوں میں . . ."

"یہ بتاؤ، انھوں نے اپنے تمام ہتھیار دے دیے تھے؟" لینن نے دیں سے اپنے کاغذوں سے سر اُٹھا کر پوچھا:

"یہ تو انھوں نے نہیں کیا ہوگا؟"

"جب ہتھیار اسلحہ خانے میں جمع کرانے کے لیے لے جائے گئے تو گنتی پر بہت سی مشین گنیں غائب نکلیں۔ اس پر بہت ہنگامہ ہوا۔ لیفٹیننٹ کوزمین نے آگ بھبوکا ہو کر چلانا شروع کر دیا۔ . . ."

"۔ . . تو انھوں نے اپنے ہتھیار چھپا دیے! ظاہر ہے، کارکنوں کو دے دیے ہوں گے۔ جبھی بہت اچھے لوگ ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں پتہ کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بے حد اہم۔ ورنہ، سپاہیوں کا موڈ بہت خراب ہو گیا ہوگا؟ تم نے بات کی تھی کسی سے؟ یقیناً کی ہوگی . . .!"

"میں نے بورلیسوف سے بات کی تھی۔ وہ سب وحشیانہ موڈ میں تھے غصّے میں اور تنک مزاج۔ بورلیسوف، ولادیمیر گرینا کا زبردست سیاسی شعور رکھنے والا کسان ہے۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر اس نے جوش میں مکا لہراتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے کمبخت ہمیں بے شک محاذ پر بھیج دیں، ہم وہاں بھی اپنا کام جاری رکھیں گے، تب یہ اپنی اس حرکت پر پچھتائیں گے . . .!"

"بورلیسوف؟" لینن نے سوچتے ہوئے کہا: "بورلیسوف کون ہے؟ میں اسے جانتا ہوں؟"

"شاید۔"

لینن کا چہرہ دمک اٹھا: "شاید . . ." اس نے کہا: "یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جیسے اور بھی کئی ہوں گے . . .!" وہ کاغذ پر جھک گیا اور تیزی سے لکھنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خط زینوویئف کو تھما دیا۔ زینوویئف خط پڑھنے لگا۔ لینن، زوف کے پاس چلا گیا: "تمھارے لیے ایک اور بہت اہم مشن ہے، انتہائی اہم۔ سٹاک ہوم میں۔ نادیژدا کونستانتینوونا کو پتہ ہے، میں ایک جگہ اپنی نوٹ بکیں چھوڑ آیا تھا۔ ان میں ایک نیلی نوٹ بک ہے، سخت جلد میں۔ جلد پر عنوان لکھا ہے: 'مارکس ریاست کے بارے میں' یہ نوٹ بک جلد از جلد مجھے مل جانی چاہیے۔ یاد رہے، نیلی نوٹ بک۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔ تمھیں یاد رہے گا نا؟"

"جی۔ بالکل۔"

"تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟"

"وائبورگ۔ نادیژدا کونستانتینوونا کو یہ مضامین دینے جاؤں گا۔ وہاں یہ ٹائپ کیے جائیں گے اور کل صبح تک کرانشٹاٹ میں کامریڈ سٹال کے ہاتھوں میں ہوں گے۔"

"بہت خوب۔ نادیژدا کونستانتینوونا سے کہنا یہاں ہرگز نہ آئے۔ اس کے پیچھے یقیناً جاسوس ہوں گے۔ نیلی نوٹ بک کے بارے میں بھولنا نہیں . . ."

خطرے میں مکمل طور پر ڈوبنے کے باوجود زینوویئف نیلی نوٹ بک کے لیے لینن کے اصرار پر حیران تھا۔ وہ اس نوٹ بک سے بخوبی واقف تھا۔ پہلے زیورخ اور پھر جنیوا میں لینن نے اس نوٹ بک میں مارکس اور اینگلز کی تمام تحریروں کے نوٹس لکھ رکھے تھے جو انھوں نے ریاست کے بارے میں لکھی تھیں۔ نیلی نوٹ بک کے بارے میں گفتگو پر زینوویئف اتنا ہی حیران ہوا تھا جتنا اس کی یمیلیانوف سے گوبھی کی قیمت، مچھلی کی یخنی کی لذت کے بارے میں گفتگو سن کر۔ جولائی کے واقعات اور بالشویک رجمنٹوں کے ہتھیار چھن جانے کے بعد اس خالصتاً علمی اور نظریاتی تجزیے کی تک اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ یہ تو نہیں تھا کہ لینن دنیا پر اپنے کان اس لیے بند کر لینا چاہتا تھا کہ وہ جدلیات کے باریک مسائل سے خود کو مصروف رکھنا چاہتا تھا؟ یا اسے یقین تھا کہ اس نیلی نوٹ بک

کے حوالے سے لکھا گیا کتابچہ اس صورتِ حال میں کوئی اہم کردار ادا کرے گا؟ بشرطیکہ یہ کتابچہ جھیل کے اس پار گمنام گوشے سے نکل کر عوام تک پہنچ سکے! تب ایک مرتبہ پھر زینوویئف کو محسوس ہوا کہ لینن کی یہ چلبلاہٹ، خوش طبعی مصنوعی سی ہے کہ وہ زوف اور یمیلیانوف کے سامنے خواہ مخواہ ہنستا ہے، اور میرے سامنے بھی!

اس نے خط پر دستخط کر کے زوف کو تھما دیا اور آنکھ کے کونے سے لینن کو دیکھا۔ لینن، ننگے پاؤں گھاس میں کھڑا تھا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے تھے اور اس کی آنکھوں میں شرارے چمک رہے تھے۔ لینن کی یہ کیفیت اس وقت ہوا کرتی تھی جب وہ بہت مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ وہ زوف کو وداع کرنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ زینوویئف نے اسے لینن کو یہ بتاتے ہوئے سنا کہ کرائیلینکو، میخانوشیں اور تاریونتانتس کو گرفتار کر لیا گیا ہے، پر جیسے لینن نے یہ خبر جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی رَو میں کہہ رہا تھا۔

"نیلی نوٹ بک کے مندرجات بہت تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور جن کی تدوین بھی میں کر چکا ہوں۔ بہت تنگ لکھا ہے لیکن اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ اس میں پرولتاری آمریت کے بارے میں تمام موجود مسائل پر بحث کی گئی ہے۔۔۔"

اور اس کی آواز فاصلے میں معدوم ہو گئی۔

"اب مجھے خود پر قابو پا لینا چاہیے" اس نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا: "ہو سکتا ہے میں کمزور آدمی ہوں۔ اپنی شکست کے باعث پریشان ہو گیا ہوں۔ حوصلہ ہار گیا ہوں۔ لیکن وہ؟ وہ کیا ہے؟ ہیگل کی مجسم روحِ عصر؟"

جب لینن زوف کو وداع کر کے واپس آیا تو اس نے کہا۔

"شدید گرمی ہے۔ کام کرنا ناممکن ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں ذرا لیٹ کر آرام نہ کر لوں؟"

وہ جھونپڑی میں چلا گیا اور سکوت چھا گیا۔

"روحِ عصر جھونپڑی میں سونے کے لیے چلی گئی ہے۔" زینوویئف نے ہیگل کے مقولے کی تشریح کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ پھر وہ یمیلیانوف سے گویا ہوا: "ہمیں کچھ عرصے کے لیے پریشانیوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے نکولائی الیگزانڈرووچ۔ چلو، جھیل میں ڈبکی لگا آئیں؟"

وہ کولیا کو جھونپڑی کے قریب پہرے پر چھوڑ کر جھیل کو چلے گئے۔ کولیا درخت کے اس ٹھنٹھ پر بیٹھ گیا جس پر اکثر لینن بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ اسے جلد ہی اونگھ آنے لگی۔ وہ نیند سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اپنے امّی آبا کا حکم دہرانے لگا ——— ہمیشہ ہوشیار رہو ——— اسے یکدم اپنی امّی یاد آ گئی اور وہ روہانسا ہو گیا ——— نہیں ایک ذمہ داری آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ یوں اپنی ماں کو یاد کرے ——— اس نے فوراً اپنے آپ سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لینن کی طرح ادھر ادھر، اُدھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

اس تمام عرصے کے دوران، یمیلیانوف کی بیوی ایک عجیب سرود اور سربلندی کی کیفیت میں رہتی تھی۔ چاہے وہ کچھ بھی کر رہی ہوتی، کھانا پکاتے، برتن مانجھتے، کپڑے دھوتے، جرابیں رفو کرتے، سبزیوں والے باغیچے کو پانی دیتے یا بچوں کو سلاتے وقت وہ

ہمیشہ اپنے تصور میں اپنے گھر کی مدیر کھڑی ہوتی، جہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جسے ایک چھوٹا سا راجباہ، سیسترورتسک کی راز لف جھیل سے ملاتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک ہی انداز میں دیکھتی ——— جھیل کی طرف پیٹھ کر کے، بازوؤں پھیلائے جیسے اپنے گھر کو، جھیل کو اور اس کے پار مرغزار کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر انہیں وحشی دنیا سے محفوظ کر رہی ہے۔

اس کی آنکھیں اور کان بہت حساس ہو گئے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنے گرد و پیش کی ہر شے کا بغور جائزہ لیتی رہتی ہے۔ وہ چیزیں بھی اس کے احاطۂ نظر میں آ گئی تھیں جنھیں عمومی حالات میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ بارکی دوسری طرف قدموں کی چاپ سے پہچان لیتی تھی کہ عورت جا رہی ہے یا مرد۔ آس پاس، ہمسایوں کی طرف سے آتی آوازیں اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں، جنھیں وہ بغور سنا کرتی تھی۔

اس پر منکشف ہوا کہ وہ اب اپنے خاوند اور بچوں کے بارے میں اتنی متفکر نہیں تھی کہ اگر لینن کی پناہ گاہ کا دشمن کو پتہ چل گیا تو ان کا کیا بنے گا۔ اس کے ذہن میں صرف لینن تھا جس کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر اور اس کے کنبے پر تھی۔

ایسے ہی مبہم لیکن شدید احساسات اس کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ وہ ان محسوسات کو زبان تو نہیں دے سکتی تھی لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ کسی بہت عظیم شے کے مدار میں کھڑی ہے۔ ایک ماں، ایک عورت کی چھٹی حس کے باعث وہ اپنے خاوند سے بہتر جانتی تھی کہ لینن کی شخصیت کی اہمیت کیا ہے۔ یمیلیانوف اچھی طرح جانتا تھا کہ لینن، پارٹی کے لیے کیا معنی رکھتا ہے اور وہ اسے اسی حیثیت سے لیتا تھا جیسے پارٹی کا رکن اپنے راہبر کو لیتا ہے یا سپاہی اپنے کمانڈر کو۔ وہ مؤقف کو فرد پر ترجیح دیتا تھا۔

لینن سے ملنے سے پہلے یمیلیانوف کی بیوی کا رویہ بھی یہی تھا۔ اس نے بغیر کسی جذباتیت کے پارٹی لیڈر کو چھپانے کے لیے ہدایات وصول کی تھیں۔ وہ فوراً یہ سوچنے میں عملی طور پر معروف ہو گئی تھی کہ اسے کہاں رکھا جائے، اس کے کھانے، بستر وغیرہ کا انتظام کیا ہو۔ اس نے ہمسایوں کے سیاسی نظریات وغیرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کیا تھا کہ اس کے لیے گلی کے ساتھ والا چھپّر قطعی مناسب نہیں ہو گا۔ مختصراً اس نے اس ضرورت کو مدِ نظر رکھا جس سے وہ ایک بالشویک اور پارٹی محارب کی بیوی کی حیثیت سے شناسا تھی، جس نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں ہر قسم کے ہتھیار اور غیر قانونی مواد چھپا کے رکھا تھا۔ جس کے گھر کی تلاشی پولیس اکثر لیا کرتی تھی اور ہراساں کیا کرتی تھی اور اسے گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ وہ اپنی حیثیت کے ساتھ وابستہ ہر بدقسمتی اور ناخوشگواری کے لیے تیار رہتی تھی۔

اس کا سرد اور عمل پسند رویہ، لینن کی آمد کے بعد بالکل بدل گیا۔ وہ اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ اس کی سادگی، پرکاری اور زندگی سے بھرپور ملنسار فطرت اس کے لیے حیران کن تھی۔ ظاہر ہے، اسے امید نہیں تھی کہ اتنا مشہور شخص اتنا کھرا، سادہ اور بغیر کسی ہیر پھیر کے ہو گا۔ وہ لینن کی اس شدید دلچسپی پر بھی حیران تھی جو وہ اس میں، اس کے خاوند میں، اس کے بچوں میں اور اس کے روز مرہ کے کاموں میں لیتا تھا۔ بیک وقت یہ دلچسپی سادہ اور عمومی تھی اور نہیں بھی تھی۔ بظاہر تو لگتا تھا کہ اس کی دلچسپی کولیا، ساشا، کوندراتی، سریوژا، گوشا، لایودا اور طولیا میں محض اس لیے ہے کہ وہ یمیلیانوف کے بچے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی جان پڑتا تھا کہ اس کی یہ دلچسپی، شفقت اور محبت اس جذبے سے بھی سرشار ہے جو اس کے دل میں محنت کشوں کے لیے عمومی طور پر موجزن ہے۔ جب یمیلیانوفوں میں سے کوئی بھی اس سے بات کر رہا ہوتا تو وہ بہت غور سے سنتا اور ساتھ ساتھ موقع کی مناسبت سے کہتا رہتا: "۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ ! اچھا ۔ ۔ ۔ بڑی دلچسپ بات ہے ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ یہ بہت اہم ہے ۔ ۔ ۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے ۔ ۔ ۔ "

وغیرہ ——— وغیرہ۔

یہ بات عیاں تھی کہ وہ عام لوگوں کی زندگیوں، ان کی ضرورتوں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے مشاہدات کو بھی ذہن کے خاص ترازو

میں ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی وہ سنتا، دیکھتا، کوئی بھی اس سے ملتا، وہ اسے بہت بڑے پیمانے پر ناپتا تھا۔ وہ جن لوگوں کے درمیان ہوتا تھا تہہ دل سے ہوتا تھا، لیکن اسی لمحے وہ ان میں نہیں بھی ہوتا تھا بلکہ لوگوں کے ہجوم میں ہوتا تھا جنھیں وہ ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک مصوّر کی طرح تھا جو کسی منظر کو دیکھتا تو عام آدمی کی طرح ہے، پر ساتھ ہی اس کے برعکس، منظر کو دیکھتے ہوئے وہ یہ بھی تصوّر کرتا ہے کہ وہ اس منظر کی تصویر کشی کس انداز سے کرے گا، اس کے خطوط کیوں بنائے گا یا وہ خاص خیال اس مصوّر کے لیے سودمند ہو سکتا ہے۔

نادیژدا کو، بائیں گود میں گوشا کو اٹھائے، صرف دائیں ہاتھ سے گھر کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر لینن نے اس کے قریب گزرتے ہوئے سر کو جھکا کر کہا۔

"ہم بچوں کے لیے ضرور نرسریاں بنائیں گے تاکہ ماؤں کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو۔ . . ."

دن میں کئی بار اسے برتن دھونے پڑتے تھے۔ وہ گھر کا کام کاج اکثر مشینی انداز میں کیا کرتی تھی۔ وہ بہت حیران ہوئی، جب لینن نے ایک دن اس سے اچانک کہا تھا۔

"ہم جگہ جگہ سستی کینٹینیں کھولیں گے تاکہ خواتین چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھنے کے بجائے بڑے بڑے کام انجام دے سکیں۔ . . ."

اگرچہ اسے پتہ تھا کہ لینن ایسی باتیں صرف اس کے لیے نہیں کرتا، پھر بھی وہ لینن کے ایسے خیال انگیز ارادوں سے خود کو بہت اہم محسوس کرتی تھی۔

ایک روز لینن کی ایک بات پر وہ اتنی حیران ہوئی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

"ایک انقلاب صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے اگر اسے خواتین کی حمایت حاصل ہو یعنی اگر وہ پوری طرح اس میں حصّہ لیں۔ . . ."

سارا دن کام میں مصروف رہنے کے بعد وہ شام کے وقت اپنی برساتی کی سیڑھیوں سے اترتا۔ سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آواز سنتے ہی سارے کنبے کے چہروں پر مسرّت کی لہر دوڑ جاتی۔ بچوں کی آنکھیں دلچسپ اور زندگی سے بھرپور باتیں سننے کی آس میں چمکنے لگتیں۔

نادیژدا جرابیں رفو کرتی، فرش پر جھاڑو دیتی یا کبھی چائے بناتی اس کی باتیں سنتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ لینن کے ساتھ باتیں کر کر کے اس کے بچے بھی فراخ دل اور ہوشیار ہو جائیں گے۔ وہ انھیں سائبیریا میں اپنی جلاوطنی کے قصّے سناتا، مغربی ملکوں کے دارالخلافوں کے بارے میں بتاتا، سوئٹزرلینڈ کے برف پوش پہاڑوں اور نیلی جھیلوں کی کہانیاں سناتا اور مختلف ملکوں کے باسیوں کے بارے میں ان کی معلومات وسیع کرتا۔

لڑکے بالکل مبہوت بیٹھے اس کی باتیں سنتے اور جب کسی بات پر قہقہے پھوٹ پڑتے تو وہ بھی زیرِ لب مسکرا دیتی۔

ایک شام لینن نے اپنے بچپن کی کہانی سنائی اور اپنے بڑے بھائی کے بارے میں بتایا جسے تیس برس پہلے جابروں نے شلوسل برگ کے قلعے میں پھانسی دے دی تھی۔ لڑکے بحد سنجیدہ ہو گئے اور کونے میں بیٹھی جرابیں رفو کرتی نادیژدا کی آنکھوں میں خاموشی سے آنسو جھلملانے لگے تھے۔

ایک بار اس نے ہنسی ہنسی میں لڑکوں کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی۔ کوندراتی، جسے کچھ عرصہ پہلے نباتیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور نباتیوں کے کلبوں میں جایا کرتا تھا، اس کے بارے میں لینن نے پیش گوئی کی کہ وہ مستقبل کی پیداواری نوع میں ماہرِ نیل

ہوگا ہو یا . . . اس سے بھی بہتر یہ کہ تم انقلابی بحریہ کے ایڈمرل ہوگے۔ سمندر قریب ہے۔ تمھارے آبا بھی تو ملاح ہیں۔ یہ فن لینڈ کی خلیج کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ بالکل۔ تم ایڈمرل بنو گے . . . ‘‘ الیکسانڈر، جو ایک ذہین لڑکا تھا اور اپنی ماں کا دستِ راست تھا، لینن نے اسے انجینئر یا (کیوں نہیں؟ محنت کش کارکن بھی تو ناظم بن سکتے ہیں) زرعی آلات بنانے کے ایک بہت بڑے کارخانے کے ناظم کے طور پر دیکھا: ’’یہ کارخانے ہم یقیناً تعمیر کریں گے۔ ہم ان میں آہنی ہل اور ٹریکٹر بنائیں گے۔ (جانتے ہو یہ کیا ہوتے ہیں؟ یہ ہر کی مشینیں ہیں جن سے زمین پر بڑی تیزی اور آسانی سے کام کیا جاتا ہے) ہم تمام روسی زمینوں پر ان سے ہل چلائیں گے پھر تمام سرحدوں والی لکیریں مٹ جائیں گی۔‘‘ ——— ’’کولیا اپنی سوچ میں ڈوبی پُرسکون آنکھوں کی وجہ سے سائنسدان بنے گا جو چاند پر پہنچنے کے لیے جہاز ایجاد کرے گا، جسے خود اُڑا کر وہاں پہنچنے والا وہ پہلا انسان ہوگا۔‘‘ باتیں کرتے ہوئے لینن، نادیژدا سے مخاطب ہوا اور اسے یقین دلایا۔ ’’پرولتاریہ کے بچوں کے لیے تعلیم مفت ہوگی: . . . لہٰذا . . . ‘‘ اس نے ہنس کر کہا: تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، نادیژدا کونڈراتیفنا! تمھاری ایک پائی بھی صرف نہیں ہوگی . . . ‘‘

’’میں کیا بنوں گا؟‘‘ دس سالہ طولیا نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

’’اور میں؟‘‘ چھ سالہ لایو دلنے پوچھا۔

’’پتہ نہیں‘‘ لینن نے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ پھیلا کر کہا: ’’بھئی تم لوگ اپنے بارے میں خود فیصلہ کر لو۔‘‘

اس نے یہ بات ازراہِ مذاق کہی تھی لیکن اس کا سنجیدہ مفہوم اتنا مبہم نہیں تھا۔ اسے اور بچوں کو دیکھ کر نادیژدا کی آنکھیں محبت کی کوملتا سے گیلی ہوگئیں۔ وہ اُس رب سے، یہ دعا کرنے کو بھی تیار تھی، جس رب میں اسے ایمان نہیں تھا، کہ وہ لینن کا حافظ و ناصر رہے اور اس کے ساتھ اس کے بچوں کا بھی جو اسے گھیرے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔

بعض دفعہ لینن خیالات میں کھو جاتا۔ تب وہ خاموشی میں اُتر جاتا۔ اس کے دہانے کے خطوط سختی اختیار کر لیتے اور اس کا چہرہ پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ایسے موقعے پر سب چپ ہو جاتے، سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے، اخباروں یا کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتے یا باہر آنگن میں چلے جاتے ——— اور یہ جیسے کسی خفیہ معاہدے کے تحت ہوتا۔

زینوویئف بھی کافی پڑھا لکھا اور شائستہ گفتگو کرنے میں طاق تھا لیکن وہ کچھ بے توجہ اور غیر حاضر دماغ قسم کا انسان تھا۔ بعض اوقات وہ دوسروں کی موجودگی میں لینن کے ساتھ جرمن کے فرانسیسی زبان میں گفتگو کرنے لگتا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہ سکیں۔ لینن اس کی اس حرکت پر بہت ناراض ہوتا اور اسے ہمیشہ روسی میں جواب دیتا۔

لینن کو اتنا قریب سے جاننے کے بعد (وہ اتنا شگفتہ مزاج، زندگی سے بھرپور اور رحم دل تھا)، نادیژدا کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مفرور ہے، ہزاروں لوگ اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور اس کی حفاظت اس جھونپڑی کی کمزور دیواریں کر رہی ہیں۔ جب بھی وہ کسی اخبار میں لینن پر لگائی ہوئی وحشیانہ تنقید پڑھتی یا کسی دکان میں اس کے خلاف باتیں سنتی تو وہ اپنی کوتاہیوں کے امکانات سے خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ بچوں کو ایک کونے میں اکٹھا کر لیتی اور سرگوشیوں میں انھیں سختی سے یاد دلاتی کہ اپنا منہ بند رکھنا اور کسی اشارے، کسی نقطے سے اپنے درمیان اجنبی کی موجودگی کو افشا نہیں کرنا۔ وہ بھول جائیں کہ برساتی میں کوئی رہتا ہے۔ وہ خاص طور پر کونڈراتی پہ کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ اگرچہ پہلے اس نے کبھی توجہ نہیں کی تھی، پر اب وہ اس کی کراہیت کی طرف جھکاؤ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ کونڈراتی اس کی تشکیک بھری نگاہوں کی تاب نہ لا کر ندامت سے نظریں جھکا لیتا اور گڑبڑاہٹ میں مسکرا دیتا۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ وہ فطرتاً دیانت دار ہے، اپنے شبہے پر خود ہی شرمندہ سی ہو کر پیار سے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے مسکرا دیتی۔ وہ اپنے ساتوں بچوں کو اپنے دل میں سمیٹ لینا چاہتی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ کیسے اپنے

بچوں کو ان تمام ذمہ داریوں اور خطرات سے آگاہ کرے، جو اس کے وجود میں سمٹ آئے تھے۔

اگلی صبح نادیژدا نے حسبِ معمول اپنے بڑے بچوں کو لینن کے لیے اخبار لینے بھیج دیا۔ رازداری کی خاطر وہ مختلف جگہوں سے اخبار خریدتے تھے۔ سیستروریتسک کے اسٹیشن سے، طارخووکا سے، رازدلنایا سے۔ ہر لڑکے کے پاس باقاعدہ فہرست ہوتی تھی۔ ساشا کے ذمے سوشلسٹ انقلابی اور منیشوک اخبار خریدنا تھے۔ کوندراتی کو بالشویک اخبار اور رسالے خریدنا ہوتے تھے، بورژوا رسالے سیرفیدیا، سیاہ صد اور پیلی صحافت بھی وہی لاتا تھا۔ بعض اوقات نادیژدا خود بھی رازلف اسٹیشن سے اخبار خرید لایا کرتی تھی۔

آج اس کا ارادہ خرید و فروخت کے لیے بازار جانے کا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ساتھ ہی وہ اپنے حصے کے اخبار بھی لیتی آئے گی۔

جب بڑے لڑکے اپنی اپنی سمتوں میں روانہ ہو گئے تو اس نے اپنے سر پر ماں سے ورثے میں ملا ہیٹ پہنا اور طولیا کو گوشا اور لائیوشا کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر گاؤں میں چلی گئی۔ دکاندار پرانا جاننے والا تھا، اس لیے اس نے سب سے پہلے اسے فارغ کیا۔ پھر وہ جلدی جلدی اسٹیشن کے بک سٹال پر چلی گئی۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، مبادا پیٹرو گراڈ سے کوئی آ جائے۔ بہرحال، اسے یہ تشویش بھی تھی کہ وہ تالاب کنارے اپنی چوکی خالی چھوڑ آئی ہے۔ تاہم جلدی کے باوجود اسٹیشن سے باہر اپنے رشتے دار فادی کزیچ کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ کزیچ سیستروریتسک میں پرچون کی دکان کرتا تھا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ اس کی ٹوپی سر سے پیچھے کھسکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی سرخی مائل مونچھوں کو بل دے رکھے تھے۔ اسے سیاسی گفتگو کرنے کا جنون تھا۔ جنوری ۱۹۰۵ء تک وہ ایک لہکایا ہوا شہنشاہیت پسند تھا۔ پھر پیٹرو گراڈ میں مزدوروں پر گولی چلنے کے بعد اسے زار سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب وہ اتنا ہی لہکایا ہوا ری پبلکن ہو گیا تھا۔ وہ کیرنسکی کی پوجا کرتا تھا۔ ہر وقت اسی کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتا تھا۔

"آہ! نادیژدا، زمانہ ہو گیا تم سے ملے۔" اس نے ٹوپی اٹھا کر اسے آداب کہا: "دعائے صحت، صبح بخیر۔" پھر اس کے تھیلے سے جھانکتے اخباروں کے پلندے کو دیکھ کر اس کے ہونٹ زہریلی مسکراہٹ میں پھیل گئے: "... تو برخوردار نکولائی الیگزاندرووچ کو مطالعے کا شوق ہو گیا ہے..." اس نے تھیلے سے اخبار اچکتے ہوئے حیرت زدہ خمار آلود آواز میں کہا: "آہا، تو تمہارا گھر والا کچھ عقل سیکھ رہا ہے۔ آج کل وہ یہ پڑھ رہا ہے۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ بالشویکوں کا تو بیڑہ غرق ہو گیا۔ ہمارے عظیم رہنما الیگزاندر کیرنسکی نے انھیں کچل کے رکھ دیا ہے..."

نادیژدا نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اپنے راستے پر ہو لی۔ پر وہ جیسے اس کے ساتھ چپک گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بڑبڑ کرتا چلا گیا۔ وہ اس دوران حیرت میں ڈوبی سوچتی رہی کہ چند روز پیشتر وہ اسے ایک ذہین اور دلچسپ شخص سمجھتی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک انتہائی بکواسی، شیخی خورہ، لاف زن، احمق اور مکروہ شخص ہے۔ درحقیقت وہ اس کی بک بک سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اس نے تصور میں ہمیشہ کی طرح خود کو جھیل کی طرف بیٹھے، بانسوں کے پیچھے تالاب کے کنارے کھڑا دیکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فادی کزیچ جلد از جلد اس کا پیچھا چھوڑ کر دفع ہو جائے تاکہ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ سکے، جیسے اس کی غیر موجودگی میں جنگل کی جھونپڑی والے شخص کی حفاظت میں کوئی کسر رہ جائے گی۔ وہ کسی غیر کی موجودگی پر اپنے دل

میں ابھی لینن کا نام نہیں لیتی تھی بلکہ اسے جھونپڑی والے شخص کے طور پر اپنے ذہن میں لاتی تھی۔ وہ لینن کے نام کو اپنے ذہن سے حذف کر دینا چاہتی تھی مبادا کوئی اس کے چہرے سے یہ نام پڑھ لے۔ جب کزیچ کی زبان پر لینن کا لفظ آیا تو وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

”سنا تم نے لینن کے بارے میں؟ یہ پتہ چل گیا ہے وہ کہاں ہے؟ پکڑا گیا بے شریف آدمی۔ ۔ ۔!“

وہ لمحہ بھر کے لیے رک گئی۔ فادی کزیچ اس کے ساتھ آملا اور اپنی بے ہودہ مونچھوں والا چہرہ اس کے سامنے کر دیا۔

”سویڈن میں۔ ۔ ۔“ اس نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور وہ پھر پیچھے رہ گیا۔

جونہی وہ اپنے گھر کے، سوکھی لکڑیوں سے بنے دروازے کے قریب پہنچی، اس کی رفتار مدھم ہو گئی کہ شاید اب وہ اس کا پیچھا چھوڑ جائے، پر نہیں۔ شاید اسے امید تھی کہ اسے شراب کا ایک گلاس تو پیش کر ہی دیا جائے گا۔ یا پھر وہ محض باتیں کرنے کے لیے کسی کا ساتھ چاہتا تھا۔ وہ احاطے میں آ گئے۔ اس دوران میں اس نے اپنی تشویش پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے نحیف آواز میں پوچھا: ”سویڈن میں۔ ۔ ۔؟ تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”سب جانتے ہیں۔ ۔ ۔! وہ آب دوز کشتی میں فرار ہو رہا تھا۔ ۔ ۔“

وہ گھر کی ڈیوڑھی میں دھرنا مار کے بیٹھ گیا اور اس نے جیب سے اسر، سگریٹوں کی خوشنما رنگوں والی ڈبیا سے پتلا سا سگریٹ، جو ڈبیا سے لمبائی میں چھوٹا تھا، نکال کے ہونٹوں میں لگا لیا۔ نادشردا نے محسوس کیا کہ اس سے پہلے اس میں اتنی تفصیل سے مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

کزیچ کی ادھر اُدھر کی بکواس کے دوران وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ ہیٹ اتار کے آلوؤں سے بھرا پیالہ لے کر باہر آ گئی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر آلو چھیلنے لگی۔ چھوٹے لڑکے شاید ہمسائیوں کے ہاں چلے گئے تھے۔ آلو چھیلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ بڑے لڑکوں کو خبردار کرنا پڑے گا کہ ادھر نہ آئیں ——— اتنے اخبار! اور وہ بھی مختلف مکاتیبِ فکر کے! کہیں فادی کزیچ شبہے میں مبتلا نہ ہو جائے ——— وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی دروازے تک گئی۔ جہاں تک کراسٹیشن کو جاتی سڑک پر نظریں دوڑائیں۔ سڑک ویران تھی۔ وہ پلٹ آئی۔

”نکولائی کہاں ہے؟“ فادی کزیچ نے پوچھا: ”فیکٹری گیا ہے؟“

”چھٹی پر ہے! اس نے گھاس کاٹنے کی ایک الاٹمنٹ ٹھیکے پر لے رکھی ہے۔ ۔ ۔“

”واقعی! ؟ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اسے یہی گھاس کھانے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ جرمن جاسوس اور کس کو اس حالت پر پہنچا کر دم لیں گے۔ ۔ ۔“

”ہم گھوڑے خرید رہے ہیں۔ ۔ ۔!“

”واہ۔ بہت اچھی بات ہے۔ یہ ہوئی نا کام کی بات! اور تم یہ گھر کو بند کر کے چھپر میں کیوں رہ رہی ہو؟ اس مرتبہ لوگ یہاں چھٹیاں گزارنے نہیں آئے؟“

”ہم جگہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ ۔ ۔“

”خود کر رہے ہو یا مزدور لگا رکھے ہیں؟“

”ہم خود کر رہے ہیں!“ نادشردا پھر دروازے تک جا کر پلٹ آئی: ”تم جیل پر جا کے نکولائی سے کیوں نہیں مل

لیتے ہم نے اپنی کشتی بھی بنا رکھی ہے . . ."
وہ جانتی تھی کہ جھیل کے ذکر سے فادی کرزیم کی حالت مرنے والی ہو جاتی ہے۔ اس نے کبھی جھیل کے کنارے پر بھی نہانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا: "کشتی میں چپو بھی ہیں . . ."
"نہیں، نہیں! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے . . ."
وہ بڑے کاروباری انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مطمئن سی ہو گئی کہ اب اس سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ عین اس لمحے یمیلیانوف آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے کندھے پر آلوؤں کی بوری ڈالے تالاب کی جانب سے آرہا تھا۔ وہ ڈیوڑھی میں کسی کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ الٹے پاؤں لوٹنے ہی والا تھا کہ فادی کرزیم کی نظر اس پر پڑ گئی۔
"آہ! ایک مدت سے تمہارے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی" اس نے بلند آواز سے کہا: "سنا ہے، گھاس کاٹ رہے ہو؟"
"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے . . ."
"خوب خوب۔ تو جناب! لینن پکڑا گیا ہے . . ."
یمیلیانوف گم سم ہو کر رہ گیا۔ اس نے بوری زمین پر رکھتے ہوئے پوچھا: "کون لینن؟"
"کون لینن؟ بھئی وہی، تمہارے والا . . .! سویڈن میں دھر لیا گیا . . ."
"نادیا! منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی لانا . . ."
"وہاں ریستورانوں میں ہر کسی کو مدعو کر لیتا تھا، شیخی باز۔ آگ دکھانے کے لیے اس کے پاس کافی نوٹ تھے . . ."
"نادیا! تولیہ دینا . . . تو وہ بہت امیر آدمی ہے؟"
"تم کیا جانو؟ وہ تو پیٹروگراڈ میں ہی گلچھرے اڑاتا تھا . . ."
"نادیا! یہ کھیرے کافی بڑے ہو گئے ہیں، انہیں توڑ لو . . . تو وہ سویڈن میں ہے! ہے نا؟ میں نے تو سنا ہے وہ جہاز میں سوئٹزرلینڈ کو فرار ہو گیا ہے . . ."
"نہیں جی، آپ کیا بات کر رہے ہیں جناب! وہ آب دوز کشتی میں سویڈن گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے۔ سٹاک ہوم کے بازاروں میں چاندی کی مٹھی والی چھڑی لیے گھومتا تھا۔ اس چھڑی کے اندر تلوار چھپا رکھی تھی اس نے۔ فرانسیسی کونیاک مارٹل کے علاوہ کسی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا . . ."
"حیرت ہے۔ نادیا! مہربانی سے ایک صاف قمیض تو لا دو . . ."
". . . اور وہ صرف مہنگے سگریٹ پیتا ہے، سات روبل کے سو والے بوگدانوف سگریٹ، جو صرف گاہک کے کہنے پر بنائے جاتے ہیں . . ."
"صرف بوگدانوف سگریٹ؟"
"ہاں! پر تم اس کے ساتھیوں میں نہیں تھے . . .؟ تو تم نے اسے چھوڑ دینا ہی بہتر جانا . . ."
"تم کیسی باتیں کر رہے ہو جی؟ میں تو صرف اپنے لیے ہوں . . ."
"چھوڑو، میں سب جانتا ہوں . . ."
"میری اور بھی پریشانیاں ہیں بھائی صاحب . . . میں گائے خرید رہا ہوں!"

"ہاں! مجھے ابھی بتایا تمھاری بیوی نے۔ بہت اچھا خیال ہے۔ موقع بھی اچھا ہے۔ تارخونکا میں میرا دوست ہے۔ اس کے پاس ایک بہت تندرست اور خوبصورت گائے ہے۔ میرے ساتھ چلو، میں سودا کرا دیتا ہوں۔ میری کمیشن؟ صرف ایک بوتل شراب۔ منظور؟ اچھا تمھاری خاطر آدھی بوتل۔ ہیں؟"

"میرا سودا ہو چکا ہے۔ میں ابھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ سو، اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔"

"میں بھی چلوں تمھارے ساتھ؟ میں بہت اچھا سودا کر لیتا ہوں۔ تم سے بہتر۔ آخر میں کاروباری آدمی ہوں۔ تمھارے 'دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ' والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اس سے پچاس فیصد تو چھڑا ہی لوں گا۔ قسم لے لو۔ اور بیچنے والا ہمیں گھر کی بنی شراب بھی پلائے گا۔۔۔"

"نہیں، میں معذرت چاہتا ہوں۔ آؤ، چلو نادیا!"

"جیسی تمھاری مرضی۔۔۔"

فادی کزمچ نے مایوسی سے اپنا سگریٹ کا ٹکڑا پھینک دیا اور آخر کار چلا گیا۔

لڑکوں کے انتظار میں دروازے پر کھڑی نادیژدا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے حقارت سے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر کوڑے والی بالٹی میں یوں پھینک دیا، جیسے وہ فادی کزمچ ہو ——— یمیلیانوف ہنسا۔ اس نے اپنی بیوی کو بڑی محبت سے تھپتھپا کر کہا: "اخبار خرید لائیں؟"

"ہاں۔ لڑکے بھی آتے ہی ہوں گے۔ یہاں سب ٹھیک ہے؟"

"بالکل۔ انھیں یہ جگہ بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں وہ اس سے بہتر جگہ کی خواہش نہیں کر سکتے تھے۔"

وہ مسکرائی: "اگر ان کی کسی چیز کو دھلائی یا مرمت کی ضرورت ہو تو یہاں لے آنا۔"

"بہت اچھا۔"

"کولیا کا کیا حال ہے؟"

"اچھا لڑکا ہے۔ پہرے پر گیا ہے!"

"میں ان کے لیے مچھلی لے کر آئی ہوں، جاؤ تو ساتھ لے جانا۔۔۔"

"اچھا، اور فرانسیسی کونیک نہیں لائیں؟ مارتل؟"

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے ——— وہ پھر اس سے سوال پوچھنے لگی: "وہاں رات میں سردی تو نہیں بڑھ جاتی؟"

"ٹھیک ہی ہے۔ تھوڑی بہت نمی ضرور ہے۔ مچھر بھی بہت ہیں۔ تم فکر نہ کرو، وہ گلہ نہیں کرتے۔۔۔"

"تم گرمی سے جھلس گئے ہو، نکولائی؟"

"ہاں! میں نے آج گھاس کی بہت کٹائی کی ہے۔۔۔"

"تم تھکے تھکے بھی دکھائی دیتے ہو۔۔۔؟"

"جانے کیوں؟!"

"فکرمند ہو؟"

"ہاں۔۔۔! ہوں۔"

"نیند ٹھیک آئی تھی؟"

"اتنی ٹھیک نہیں۔ انھیں بھی تو سونے میں دیر لگ گئی تھی۔ ۔ ۔"

"بے چین رہے؟"

"نہیں خاموشی سے لیٹے رہے۔ مجھے احساس ہوا کہ سو نہیں رہے ہیں۔ ۔ ۔"

"خوف سے؟"

"نہیں۔ سوچتے رہے۔ پھر جانے کب سوئے۔ صبح جاگے تو پہلا کام یہ کیا کہ لکھنا شروع کر دیا۔ اخبار کا ہمیشہ بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ۔ ۔"

لڑکے جلد ہی اخبار لے کر آ گئے۔ آلو تیار تھے۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا، سب نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ نادیژدا ہمیشہ سب کے بعد ناشتہ کرتی تھی۔ ان کے ناشتے سے بچا کھچا کھاتی تھی کہ کہیں بچوں کے لیے کم نہ پڑ جائے —— حال ہی میں اسے ناشتے کے وقت تازہ اخبار پڑھنے کی عادت بھی پڑ گئی تھی۔

یمیلیانوف اپنے تھیلے میں اخبار اور سامانِ رسد رکھنے لگا۔

"بدمعاش۔ کتے۔ ۔ ۔" اس نے اپنی بیوی کی زبان سے سُنا —— "کن لوگوں کو کہہ رہی ہو؟" اس نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

اس نے اپنی بیوی کی زبان سے کبھی کوئی ناشائستہ لفظ نہیں سُنا تھا۔

"جو وہ لکھتے ہیں، بکواس ہے۔ انتہائی غلاظت ہے۔ ۔ ۔" نادیژدا نے اخبار پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ بہت محظوظ ہوا اور بیوی سے اخبار لیتے ہوئے ہنس پڑا۔

اخبار میں ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا: 'لینن اور میوزک ہال کی لڑکی' اس میں بیان کیا گیا تھا کہ لینن کی ساکھ، بونے دی ایتے کی گانے والیوں کے مداح کے طور پر کیا تھی اور میوزک ہال کی ایک مغنیہ، ارنا آئیمستی کے ساتھ کتنے 'قریبی تعلقات' تھے۔

—— "بونے تھیٹر میں، شہید لینن کی منظم کردہ عیاشیوں، رنگ رلیوں کی حقیقتوں کو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن وہاں کے بیرے ان دنوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے، جب لینن ان سے شمپین کی ایک بوتل ایک سو دس روبل میں خریدتا تھا اور پچیس روبل ٹپ سے نوازا کرتا تھا۔ وہ ایک اور سانحے کو ہمیشہ یاد کریں گے، جب لینن نے اپنے 'پرولتاری' ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی محبوبہ ارنا آئیمستی کے ساتھ کمرہ نمبر چار بُک کرانے کے بعد بیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے لیے بلایا۔ گھنٹی کی آواز سُن کر ایک بھاری بھرکم دیو قامت 'کازبک' نامی بیرا اس کے کمرے میں گیا۔ لینن، جو ہمیشہ پُرسکون رہتا تھا، اسے دیکھ کر یکدم طیش میں آ کر فرش پر پیر پٹختا چیخنے چلانے لگا: 'نکل جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ کمبخت بورژوا۔ کسی اور بیرے کو بھیجو۔' بھاری بھرکم 'کازبک' گھبرا کے مُڑا اور تیزی سے بھاگ اٹھا۔ اس نے لینن کے ہاتھ میں پکڑا بم دیکھ لیا تھا ——"

"کمال ہے!" یمیلیانوف نے بڑی سادگی سے کہا۔ پھر اس نے ایک نظر نادیژدا کو دیکھ کر اسے نرمی سے سمجھایا: "تم کیوں پریشان ہو گئی ہو؟ بعض دفعہ تو وہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ۔ ۔"

لیکن نادیژدا کو تسلی نہ ہوئی۔ وہ طیش اور نفرت میں لرز رہی تھی۔ عورت ہونے کے حوالے سے وہ سمجھتی تھی کہ لینن کے کردار پہ اس سے زیادہ اوچھا، خطرناک اور زہریلا وار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا: "یہ اخبار انھیں نہ دکھانا۔

انھیں پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اخبار یہیں چھوڑ جاؤ۔ ۔ ۔"

"کیا ؟ !"

"یہیں چھوڑ جاؤ یہ اخبار۔ ۔ ۔" اس نے ضد کی۔

یسیلیانوف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ لینن کے کردار پر اس سے زیادہ رکیک حملے ہو چکے ہیں۔ تاہم اس نے وہ اخبار وہیں رکھ دیا۔ چنانچہ لینن کو کبھی پتہ نہ چلا کہ میوزک ہال کی مغنیہ ارنا آئیمشتی کے ساتھ اس کے کتنے قریبی تعلقات تھے۔

اس سے ملنے بہت کم لوگ آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میٹر وگراڈ کے ساتھی نہیں چاہتے تھے کہ پولیس لینن کی بو لے سکے۔ ہر دوسرے تیسرے دن برگ آتا۔ برگ، الیگزانڈر واسیلیوچ شوتمان کا عرف تھا۔ وہ بادامی رنگ کی داڑھی، ناک پر جمانے والی بغیر کمانی کی عینک اور پناما ہیٹ کی وجہ سے ایک شریف شہری دکھائی دیتا تھا۔ ان حالات میں نادشردا شوتمان کے اس حلیے کو بہت ہی مناسب سمجھتی تھی۔ زوف اس سے بھی کم آتا۔ کبھی کبھار کوئی کم گو عورت بیوہ کے بہروپ میں دروازے سے داخل ہوتی اور ڈبل روٹی، کپڑے وغیرہ چھوڑ جاتی۔

یہ آنے والے ہمیشہ رات کی تاریکی میں آتے اور صبح کی روشنی سے پہلے پہلے چلے جاتے۔

ایک مرتبہ شوتمان صبح سویرے ہی آگیا۔ نادشردا بہت حیران ہوئی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے پوچھا کہ جھونپڑی کے آس پاس کوئی مشتبہ شخص تو نہیں پایا گیا۔ نادشردا کی یقین دہانی پر کہ نہیں، اس نے شام کے وقت دو ساتھیوں کی آمد کی اطلاع دی (" مرکزی مجلسِ عاملہ کے ممبر ہیں۔" شوتمان نے اس کے کان میں سرگوشی کی)۔ پھر وہ جلد ہی، واپس اسٹیشن کو چلا گیا۔

اور واقعی شام کے چھ بجے کے قریب، دو آدمی اس کے دروازے پر آئے۔ چند لمحے تذبذب کے بعد انھوں نے دروازہ کھولا اور اندر آگئے۔ وہ ان کے پاس چلی گئی۔ ان میں سے ایک چھوٹے قد کا تھا، ناتواں سا، ناک پر بغیر کمانی کی عینک، الجھی ہوئی سیاہ داڑھی، اداس آنکھیں۔ دوسرے کا چہرہ پتلا اور خشک سا تھا اور داڑھی نوکیلی۔

"کارپووچ کا کیا حال ہے ؟" بغیر کمانی کی عینک والے نے گمبھیر آواز میں یوں پوچھا جیسے کسی بجید بیمار، قریبی دوست کی صحت کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

"ڈاکٹر کہتا ہے، اب بہتر ہیں۔" نادشردا نے فوراً جواب دیا: " میں ابھی آپ کو ان کے پاس بھجواتی ہوں۔"

بغیر کمانی کی عینک والے نے اپنا تعارف آندرے کے طور پر کرایا۔ نوکیلی داڑھی والے نے بتایا کہ اس کا نام یوزف ہے۔

وہ دونوں بنچ پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ باڑ کے قریب ہی اگی گل یاسمین کی جھاڑیوں کو آندرے نے خوابیدہ آنکھوں سے دیکھا۔

"دیکھو !" آندرے نے ان جھاڑیوں کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں !" یوزف نے کہا۔

"ہم بھول ہی گئے تھے کہ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں!؟" آندرے نے قریباً سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، واقعی!" یوزف نے کہا۔

نادشہردا نے خاموشی سے پھولوں بھری ڈالی توڑ کے آندرے کو دے دی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈالی میں کھلے پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا: "ہمیں اندھیرا ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا؟"

"نہیں۔ آپ لوگ ابھی پار جا سکتے ہیں۔ کشتی میں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان لے کر جائیے گا تاکہ پتہ چلے آپ مچھلی کے شکار پر نکلے ہیں۔۔۔"

وہ اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بلانے چلی گئی۔ کوندراتی، باغیچے میں بیٹھا مطالعے میں مشغول تھا۔ اس نے کتاب ماں کو تھما دی اور جھیل کے کنارے غسل گاہ کو چل دیا جس میں چپو اور مچھلی کے شکار کا سامان چھپائے رکھے تھے۔ وہ دونوں شخص خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیے۔ احاطے کے آخر میں ایک چھوٹی سی کھاڑی تھی۔ بید مجنوں میں چھپی، کھونٹے کے ساتھ بندھی کشتی پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔

کوندراتی نے دنبال کا پتوار اور آندرے نے چپو سنبھال لیے۔ کشتی چھوٹی کھاڑی پر تیرتی بڑی جھیل میں آ گئی۔ بہت بڑی جھیل، جس کا دوسرا کنارہ فاصلوں میں گم تھا۔ یہاں لہریں، کھلے سمندروں کی طرح مچلتی اچھلتی تھیں۔ یوزف نے مچھلی پکڑنے کی کنڈی والی چھڑی فضا میں بلند رکھی تاکہ دور سے اسے دیکھا جا سکے۔ آندرے بڑی قوت اور مہارت کے ساتھ کشتی کھیتا رہا۔

راستے میں چھٹی کا دن منانے والوں سے بھری کشتی سے ان کا سامنا ہو گیا —— ایک خوبصورت سی لڑکی کشتی کے پچھلے حصے میں نیم دراز تھی، خوابوں میں گم، پتوں سے لدی ڈالی پکڑے، پتی پتی جھیل میں پھینک رہی تھی۔ آندرے چپوؤں کے سہارے بیٹھ گیا اور کچھ عرصہ اس کشتی کو دیکھتا رہا جو اپنے پیچھے پانی پر چھوٹی چھوٹی پتیاں پانی کی سطح پر ناچتے چھوڑتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے استہزائیہ مسکراہٹ سے چپو چلاتے ہوئے کہا: "لوگ یوں ہیں، جیسے دنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔۔۔ جیسے دو سال، سال یا دس سال پہلے تھے۔۔۔ طالسطائی کا مشاہدہ بہت صحیح تھا۔۔۔!"

"ہو سکتا ہے وہ بھول جانا چاہتے ہوں۔" یوزف نے کہا۔

کچھ دیر کے لیے ان دونوں پر خاموشی چھا گئی۔

"کتنی خاموشی ہے!" آندرے نے کہا: "مجھے اتنی چپ کی عادت نہیں نا، اس لیے لگتا ہے، بہرا ہو گیا ہوں۔۔۔"

"تم چپو اچھے چلا لیتے ہو!" یوزف نے کہا۔

"میں نے جلاوطنی میں کشتی چلانا سیکھی تھی۔ تین سال پہلے جب مجھے توروخانسک کے علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا تھا تو میں نے وہاں ایک کشتی کرائے پر لی تھی۔ میرے سوا کسی کو یانیے میں کشتی ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں اپنے پیش گوئیاں کرنے والے ساتھیوں پر ہنسا کرتا تھا، جو کہتے تھے کہ جھیل میں شارکیں دانت تیز کیے میری منتظر ہیں اور میں جانتا تھا کہ میں شارکوں کی مرغوب غذا نہیں ہوں۔ میں بہت کھردرا، کڑوا کسیلا ہوں۔ ان کے لیے مجھے نگلنا مشکل ہوگا۔ سو میں وہاں خوب کشتی رانی کیا کرتا۔ بہاؤ کے خلاف دور دور تک نکل جاتا۔ واپسی پر پتوار چھوڑ دیتا۔ دھیرے دھیرے کشتی، بہاؤ کے ساتھ بہتی رہتی اور میں خواب دیکھتا رہتا۔ بلند آواز سے شعر پڑھتا رہتا۔ ان دنوں شاعری مجھے اچھی لگتی تھی۔۔۔"

یوزف کا پیلا، کمزور چہرہ اداس ہو گیا۔ وہ مسکرا دیا، پر چپ رہا۔

آندرے بھی خاموش ہو گیا۔ جوں جوں کنارہ قریب آ رہا تھا، توں توں اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی لیکن بے

ساتھ ملاقات کے لیے اس کے اضطراب کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس کے کوٹ کی جیب میں اس کے اپنے مضمون "محنت کشوں کی بین الاقوامی تحریک" کی ایک نقل تھی۔ یہ مضمون اس نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں لکھا تھا۔ کئی ماہ سے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ مضمون لینن کو دکھائے، پر اسے ہمت نہ ہوتی تھی۔ آج اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ لینن سے ملنے جائے گا تو اپنا مضمون ساتھ لیتا جائے گا۔ اگر وہ جرأت سمیٹ سکا تو وہ مضمون لینن کو دے دے گا۔ شاید وہ اپنے فارغ وقت میں اس پر نظر ڈال لے۔ آندرے نے خود ہی اپنی تعلیم و تربیت کی تھی۔ جلاوطنی میں اس نے جرمن اور فرانسیسی زبانیں خود ہی سیکھیں۔ اس نے وہاں بہت پڑھائی کی تھی۔ اس کا جی مضمون لکھنے کو بہت چاہا کرتا تھا لیکن ایک تو وقت کی کمی تھی اور دوسرے اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی اس "ادبی جھلی" کا مذاق اڑایا۔ لینن کو مضمون دینے کو اس کا جی بہت چاہتا تھا لیکن جھجک اور شرم مانع تھی۔

کوندراتی کشتی کو کنارے کی اوٹ لے گیا۔ کشتی، پودوں کو چاقو کی طرح کاٹتی، کنارے سے جا لگی۔ وہاں ایک اور کشتی بندھی پانی پر ڈول رہی تھی۔

"ہم پہنچ گئے؟" آندرے نے پوچھا۔

وہ کنارے پر کود گئے اور تجسس سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ اسی لمحے ایک تیرہ سالہ لڑکا جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔ اس نے بڑے غور سے نوواردوں کو دیکھا۔ پھر یک لخت پلٹ کر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

"یہ کون تھا؟" یوزف نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"میرا بھائی!" کوندراتی نے مسکرا کے کہا: "بھاگ کر لینن کو اطلاع دینے گیا ہے۔ وہ یہاں گشت کے فرائض انجام دیتا ہے۔"

وہ پگڈنڈی پر چل دیے اور جلد ہی شام کی نیلاہٹوں میں پھیلے سبزہ زار پر پہنچ گئے۔ وسط میں ایک بہت بڑا گھاس کا ڈھیر تھا۔ اس کے قریب ہی ہلکی سی آگ جل رہی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یکدم دائیں طرف کی گھنی جھاڑیوں سے، گلے شکوے کے انداز میں خوشی سے چلاتی آواز آئی:

"کامریڈ ثوردلوف، ذوزرنسکی! تم نے بھئی یہ تو خفیہ گیری کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔"

ثوردلوف نے کندھے جھٹکائے: "اور کچھ کرنے کو نہیں تھا، ولادیمیر اِلیچ۔ . . یہاں آنا ضروری ہو گیا تھا۔"

لینن، درختوں کے درمیان پیر پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے اسی مٹی سے اُگا ہے۔ شام کی نیلاہٹ میں، جو ہر شے کو واضح خطوط دے رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس کا وجود کسی گہرے رنگ کی دھات میں ڈھلا ہے۔ اس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے نیچے اخبار بکھرے پڑے تھے کہ ہوا سے اُڑ نہ جائیں۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔ تو، آؤ غریب خانے میں . . ."

لینن نے بظاہر بے پروائی سے کہا لیکن آنکھوں میں غیر معمولی خوشی اور اضطراب تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے صحیح جذبات آشکار ہوں، مبادا ثوردلوف اور ذوزرنسکی اور ان کے توسط سے کروپسکایا کو یہ تاثر ہو کہ وہ تنہائی محسوس کر رہا ہے۔

"اب تم آ ہی گئے ہو . . ." لینن نے کہا: ". . . تو مجھے سب کچھ بتاؤ۔ سب کچھ۔"

"صبر، ولادیمیر اِلیچ . . ." ثوردلوف نے مسکراتے ہوئے کہا: ". . . آپ ہمیشہ یہ کرتے ہیں کسی کو اپنے خیالات

اکٹھا نہیں کرنے دیتے ۔

" تو پھر بیٹھو اور اپنے خیالات اکٹھا کر لو . . . گریگوری بھئی کہاں ہو ؟ مہمان آئے ہیں - بالآخر ہم ان سے براہِ راست خبریں سُنیں گے . . . "

زینووئیف نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا جھونپڑی سے برآمد ہوا - نوواردوں کو دیکھ کر اس کی نیند اُڑ گئی اور وہ چائے کی کیتلی لینے بھاگ گیا -

لینن درخت کے ٹھنٹھ والی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا - بہت سنجیدہ اور سوچ میں گم ——— " مجھے سب کچھ بتاؤ . . . ! "

یمیلیانوف ، کولیا اور کوندراتی کھانا تیار کرنے لگے - آگ بھڑک اٹھی - چنگاریاں اُڑنے لگیں -

ثور دولوف نے کہا : " کانگرس کے لیے تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں . . . ضلع وائبرگ میں سمپونیفسکی ٹمپرینس سوسائٹی کے احاطے میں . . . خفیہ پولیس کے شبہے کی صورت میں ہمارے پاس اس کا نعم البدل بھی ہے - تمام نمائندوں میں آپ کا پمفلٹ ' نعروں کے بارے میں ' تقسیم کیا جائے گا جو آج کرانٹ ٹاٹ میں چھپ کر تیار ہو جائے گا - شوتمان پروف لے کر آپ کے پاس آئیں گے . . . "

لینن کے چہرے پر خوشی کے ہیجان کی سُرخی چھا گئی : " تم نے مضمون پڑھا ہے ؟ "

" جی ! مرکزی کمیٹی اور پیٹروگراڈ کی تمام کمیٹیوں کے اراکین نے پڑھا ہے "

" تمھارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں ؟ "

" صورتِ حال کے جائزے پر سب آپ سے متفق ہیں . . . پُرامن دور گزر گیا . . . "

" اب ہمیں اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے . . . " دذرزہنسکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا -

لینن نے آنکھ کے کونے سے زینووئیف کو دیکھا ، پھر اس نے پیٹروگراڈ سے آئے مہمانوں سے بڑے اشتیاق سے پوچھا : " تمھیں ' تمام طاقت سوویتوں کے لیے ' والے نعرے کو ترک کرنے پر کوئی تشویش تو نہیں ہوئی ؟ " لینن ان کا جواب سننے کے لیے جم کر بیٹھ گیا -

" جولائی کے واقعات سے ہی صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا " ثور دولوف نے کہا -

" اگرچہ بہت سوں کے لیے یہ نتیجہ غیر متوقع ہے " دذرزہنسکی نے مسکرا کے کہا -

" تمھارے خیال میں یہ پمفلٹ بہت زیادہ بھڑکے یا غلیجان میں تو نہیں لکھا گیا ؟ بہت تیکھا تو نہیں ؟ "

" بہت تیکھا ؟ ان سنگینوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ، جو انھوں نے ہم پر تان رکھی ہیں . . . "

" خوب - خوب ! " لینن نے مطمئن ہو کے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا : " تمھارا کیا خیال ہے ، سب اس مضمون کو انھی معنوں میں لیں گے ؟ "

" جی میں سمجھتا ہوں کہ سب نہیں . . . "

" خوب - تو تم نہیں سمجھتے - ٹھیک ! " لینن نے اپنی آنکھیں شرارت سے چھوٹی کر لیں : " گریگوری بھی یہی سمجھتا ہے - "

" مرکزی مجلس نے جگاش ولی کو رپورٹ پیش کرنے کے فرائض دیے ہیں اور وہ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں

آپ سے بالکل متفق ہیں۔ وہ کانگرس میں آپ کے مُوقف کی مکمل حمایت کریں گے۔"

"یہ اچھا ہے۔ اشالن بھی کافی مُوثر اور مضبوط شخص ہے۔"

"مجھے تنظیم پر رپورٹ مل گئی ہے۔ مقامی رپورٹیں بھی ہوں گی۔ پیٹروگراڈ، ماسکو۔ ۔ ۔"

"اور کرانشٹاٹ یقیناً۔ ۔ ۔"

"جی! اور فن لینڈ، مرکزی صنعتی علاقہ، شمال میں، والگودا، نووگراڈ، سپکوف۔ وولگا کے خطے سے ڈونتس کا طاس۔ جنوب سے، اوڈیسہ، کیف، یورال، سائبیریا۔ بالٹک سے ریوا اور ریگا، لیتھوانیا، منسک اور شمال مغربی۔ ۔ ۔"

"بہت مؤثر ہوگی یہ کانگرس۔ قوت کا اظہار۔ کانگرس کی طرف سے تمام گرفتار شدہ ساتھیوں کو پیغامِ تہنیت بھیجنا نہ بھولنا۔"

"جی، گرفتار اور روپوش ساتھیوں کے لیے تہنیت کے پیغامات لکھے جا چکے ہیں۔" ثور دولوف کہتا چلا گیا: "آپ کے لیے ایک اور خوشخبری ہے جو میری جیب میں موجود ہے۔" اس نے جیب سے چھوٹے سائز کا اخبار نکالا: "پیٹروگراڈ نے اپنا بالشویک اخبار نکال لیا ہے۔ 'کارکن اور سپاہی'۔ یہ اس کا پہلا شمارہ ہے۔ میں مجلسِ ادارت کی طرف سے آپ کو اس میں باقاعدگی سے لکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

"واہ۔ بہت خوب۔" لینن نے کہا: "اس کا بندوبست کیسے کیا تم لوگوں نے؟"

"ہماری فوج، یعنی مِشا کیدروف اور پودوائیسکی نے سارا انتظام کیا ہے۔ پہلے کیدروف نے 'نووایا زِدن' پر ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن لادِشنیکوف کو ہذیان ہوگیا: 'جاسوس، دہشت پسند اور جانے کیسے الابلا قسم کے لوگ تمھاری تنظیم میں جمع ہیں۔ ہم قائل ہوگئے ہیں کہ پودوائیسکی بھی دہشت پسند ایجنٹ ہے۔' پھر کیدروف اور پودوائیسکی نے گورد خووایا میں ایک چھوٹا سا چھاپہ خانہ 'نارودنی نارود' دریافت کر لیا۔ انھوں نے اس کے منیجر کو اخبار چھاپنے کے لیے ورغلا لیا، اس وعدے پر کہ اخبار بہت شریفانہ انداز کا ہوگا، زادوشیقنائے سلوفو[1] جیسا۔ پہلا شمارہ بیس ہزار چھپا جو چند گھنٹوں میں بک گیا۔ ۔ ۔"

"بہت اچھے۔ ۔ ۔" لینن نے اپنی اختراع کی ہوئی بغنغو سے بنائی میز سے مسودہ اُٹھاتے ہوئے کہا: "یہ ہے میرا جواب، ان انکشافات کے بارے میں جو پیٹروگراڈ کے چیمبر آف جسٹس کے منصفوں نے میرے بارے میں کیے ہیں۔ اس مضمون کو میرے دستخطوں کے ساتھ شایع کر دو۔ اور یہ ایک اور مضمون ہے 'آئینی خوابوں' پر۔ اسے کل مکمل کر کے تمھیں بھیج دوں گا۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت اہم مضمون ہے۔ میں نے یہ اپنے ضمیر کی تسلّی کے لیے لکھا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے میں نے اپنے جذبات کو مکمل طور پر عقل کے حوالے کر دیا ہے۔ میں نے اپنے آپ پر ثابت کیا ہے، اور مجھے امید ہے کہ پارٹی ساتھی بھی اسے قبول کریں گے کہ عدالت کے روبرو نہ جانے کے بارے میں میرا فیصلہ درست ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرے لیے اس قسم کا فیصلہ کرنا کتنا تکلیف دہ تھا۔ عدالت میں پیش ہو کر مجھے وہ تمام باتیں کہنی چاہیے تھیں، جو ان حالات میں ایک سچّے انقلابی کو زیب دیتی ہیں۔ بظاہر میرے لیے یہی سچّا اور بہترین انقلابی قدم ہوتا۔ ۔ ۔ دو ماہ پہلے میں ایسا یقیناً کر سکتا تھا۔ لیکن اب میں بالغ ہوگیا ہوں اور میری بلوغت مجھے اس حرکت کی اب اجازت نہیں دیتی۔ انقلاب کے دوران لوگ بہت جلد بالغ ہو جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تمھارے پاس ایک انقلابی اخبار ہے۔ دو ایک روز میں میں تمھیں ایک اور مضمون دوں گا۔ 'انقلاب سے سبق'۔ یا ایسی ہی کوئی چیز۔ ۔ ۔"

---

[1]: بچوں کے رسالے کا نام جو اس زمانے میں روس میں چھپتا تھا۔

اس نے ثوردلوف اور دذرزہنسکی کو بڑے غور سے دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں خصوصی محبت جھلکنے لگی: "مجھے تم دونوں پر رشک آتا ہے کہ تم پیٹروگراڈ واپس جا سکتے ہو، واقعات کے عین درمیان چھلانگ لگا سکتے ہو، اپنے ساتھیوں کے درمیان رہ سکتے ہو۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ کانگریس کو ایک جھلک دیکھ سکوں۔" اس کی آنکھوں کے نیچے مخصوص جھُریاں پڑ گئیں: "کیا خیال ہے، چلوں تمہارے ساتھ؟ مجھے کون پہچانے گا۔ تم نے مجھے کبھی سر پر مصنوعی بال اوڑھے نہیں دیکھا۔ لو، میں تمہیں وگ پہن کر دکھاتا ہوں۔ انھوں نے مجھے بہت سی وگیں خرید کر بھیجی ہیں۔ لو، دیکھو۔ خدا گواہ ہے میں کافی محفوظ ہوں اس میں۔ ۔ ۔"

دذرزہنسکی نے اپنے مخصوص باقاعدہ اور پرخلوص لہجے میں کہا: "ولادیمیر ایلیچ! اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ صورتِ حال ابھی بہت کٹھن ہے۔ آپ کا ذہن یہاں رہ کر بہت بے نیاز ہو گیا ہے۔ لوگوں کو زندانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ آپ کے سر کی قیمت پڑ گئی ہے اور صرف پولیس اور خفیہ محکمے ہی آپ کی تلاش میں سرگرداں نہیں، بلکہ بہت سے رضاکاروں نے بھی یہ شغل اختیار کر لیا ہے۔ چند روز ہوئے، طوفانی دستوں کے پچاس افسروں نے حلف اُٹھایا تھا کہ یا وہ آپ کو ڈھونڈ لائیں گے، یا پھر مر جائیں گے۔ پرسوں کرانشٹاٹ بندرگاہ کے کمانڈر تائرتوف کو یہ خفیہ پیغام موصول ہوا کہ آپ جنگی جہاز 'زاریا سوویودی' میں چھپے ہیں۔ اس نے جہاز کی تلاشی لینے کی کوشش کی۔ جہاز والوں نے تلاشی کی اجازت نہ دی اور اسے سرکاری طور پر یقین دلایا کہ لینن جہاز پر نہیں ہے۔ سادہ لباس میں پولیس ہر اسٹیشن پر آپ کی تصویر لیے کھڑی ہے۔ آپ کی تصویریں فوجیوں کو بھی مہیا کر دی گئی ہیں۔ شاید آپ نے اخبار میں پڑھا ہو کہ پولیس کے مشہور کتے 'تریف' کو آپ کی بو لینے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ۔ نہیں! آپ ہنسیں نہیں۔ ولادیمیر ایلیچ مہربانی کیجیے، یہ مذاق نہیں۔ ۔ اگر ہم آپ کی حفاظت میں ناکام ہو گئے تو میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ ۔ ۔"

آخری جملے پر لینن کی ہنسی معدوم ہو گئی۔ اس نے بڑے غور سے دذرزہنسکی کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھا اور سوچا: "واقعی اس صورت میں یہ خودکشی کر سکتا ہے۔ بے شک، کر سکتا ہے۔" پر جب لینن بولا تو اس کی آواز غصے میں بھری تھی۔

"کامریڈ دذرزہنسکی! تم اس سر میں گولی مار لو گے؟ کیا انارکسٹ ڈرامائی انداز ہے! مجھے یقین ہے کہ روسی انقلاب کسی ایک شخص کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ اچھا بابا اچھا، نہ سہی۔ میں نہیں جاؤں گا۔ ۔ ۔"

لینن نے اس مایوس بچے کی طرح منہ پھیر لیا جسے اس کی من پسند چیز نہ ملی ہو۔ پھر اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو لاؤ اب قراردادیں، ایجنڈا، مقررین کی فہرست اور تقریریں دکھاؤ مجھے، نظر ڈال لوں۔ ۔ ۔"

اب گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنا کام آگ کی روشنی میں مکمل کیا۔ پھر انھوں نے رات کے کھانے پر تازہ مچھلیاں کھائیں جو اس گھر کے باسیوں نے گزشتہ شام جھیل سے پکڑی تھیں۔

کھانے کے دوران تمام عرصہ لینن ماسکو، پیٹروگراڈ، ہیلسنگفورس، کرانشٹاٹ، شمال مغربی محاذ، سائبیریا اور جنوبی علاقوں کے کارخانوں میں صورتِ حال کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اکثر جواب ثوردلوف نے دیے۔ اس نے تفصیل سے اعداد و شمار، کارکنوں کے نام اور ان کے عرف بتائے۔ یہ سب اسے زبانی یاد تھا۔ لینن بڑی توجہ سے سُنتا رہا۔ جب یمیلیانوف اس کی توجہ کھانے کی طرف دلاتا یا ہوا کے جھونکے سے دھوئیں کا بادل اس کے چہرے سے ٹکراتا تو اسے احساس ہوتا وہ کہاں بیٹھا ہے۔ تب وہ اپنے خیالات

میں گم مسکرا دیتا۔ اس کے چہرے پر فضا رفتہ شگفتگی سی چھا جاتی کہ اس کے سامنے سیدھے سادہ کسی حد تک شرمیلے ساتھی بیٹھے ہیں جن کے ہاتھوں میں بالشویک تحریک یا بورژوائیوں کے قول کے مطابق 'بالشویک سازش' کے تار و پود ہیں۔

بعد میں سب ثوردلوف اور دذرزنسکی کو جھیل کنارے تک وداع کرنے گئے۔ کچھ دیر وہ کنارے پر کھڑے رہے۔ آسمان میں دھندلا سا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ ان میں سے کسی کا جی بچھڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔

ثوردلوف نے کہا: "یہاں شکار تو بہت اچھا ہوتا ہوگا؟ جنگل کافی گھنا ہے!"

"ہاں!" یمیلیانوف نے کہا: "سرمئی مرغی، مرغابی اور جل ککڑی بہت ہوتی ہے۔۔۔!"

"شکاری یہاں اکثر آتے ہوں گے؟"

"صرف شکار کے موسم میں۔۔۔!"

ثوردلوف نے کہا: "شکار کے موسم سے پہلے پہلے ہمیں آپ کی رہائش گاہ بدلنی پڑے گی؟"

لینن خاموش تھا۔ جب وہ واقعی وداع ہونے لگے تو لینن نے کہا:

"میں نے اپنی نیلی نوٹ بک یہاں پہنچانے کو کہا ہے۔ نادہ ژدا کو نستانتینوونا کو معلوم ہے۔ انھیں یاد دلا دینا۔ یہ بہت ضروری ہے۔۔۔"

نوٹ بک کے ذکر سے ثوردلوف کو اپنی جیب میں پڑا اپنا مسودہ یاد آگیا۔ اسے ایک بار پھر یہ مسودہ لینن کو دینے کی ہمت نہ ہوئی: "یہ وقت مناسب نہیں ہے۔" اس نے سوچا: "پھر کبھی سہی۔ انقلاب کے بعد جب سوشلزم نافذ ہو جائے گا، تب ہی۔ پھر تو ان کے پاس کافی فالتو وقت ہوگا۔ بہر حال مضمون کوئی اتنا اہم نہیں ہے کہ اسے اسی وقت لینن پر ٹھونس دیا جائے۔" وہ اداس ہو گیا اور الوداعی انداز میں اپنی ٹوپی لہرانے لگا۔

"چپو میں چلاؤں گا۔" دذرزنسکی نے کہا۔

کشتی کنارے سے پھسل گئی۔ چند لمحوں کے لیے سب پر خاموشی چھا گئی۔ کوندراتی، دنبالی پتوار تھام کے بیٹھ گیا۔ ثوردلوف اپنے خیالوں میں گم گل یاسمین کی ڈالی سونگھنے لگا، جو وہ کشتی میں چھوڑ گیا تھا۔ پھول بدرنگ سے ہو گئے تھے، خوشبو باسی اور نم آلود ہو گئی تھی۔

ثوردلوف اب بھی لینن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہ پیار بھری طویل مسکراہٹ پھیل گئی جو ان لوگوں کے ہونٹوں پر پھیل جایا کرتی ہے جنھوں نے کوئی بہت پیاری، خوشگوار شے دیکھ لی ہو۔

دذرزنسکی کے ذہن پر بھی لینن چھایا ہوا تھا۔ یکدم اس کی آواز نے تاریکی کو چیرا: "لینن کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔۔۔"

ثوردلوف نے جلدی سے جواب دیا: "بالکل۔۔۔ پیرس میں لونا چارسکی نے رومان رولاں کے ساتھ گفتگو کے دوران یہی کہا تھا 'لینن ٹوٹ نہیں سکتا۔ اسے صرف قتل کیا جا سکتا ہے۔۔۔'"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔ سا چپوؤں کی چپ چپ آواز آتی رہی۔ پھر ثوردلوف نے لہجہ تبدیل کر کے کہا: "میں اس بات سے خوف زدہ ہوں۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ اس سلسلے میں مجھے رات رات بھر برے برے خواب آتے رہے ہیں۔۔۔"

اپنے اپنے حوالے سے وہ لینن کی ان خوبیوں کا ذکر کر رہے تھے، جو خود ان میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔

"وہ بہت حلیم الطبع ہے۔ غرور کا تو شائبہ تک نہیں۔ راہنماؤں میں یہ خوبیاں کم ہی ہوتی ہیں۔" ثوردلوف نے کہا۔

"وہ مشعل کی طرح روشن ہے۔ خالص روشنی۔" دذرزنسکی نے کہا۔

"بہت رحم دل۔ انسان پرست" تورد لوف نے کہا۔
"وہ دشمنوں کے لیے بہت سخت ہے۔ صرف دشمنوں کے لیے" دذرزنسکی نے کہا۔
پھر خاموشی کشتی، پانی کو تیر کی طرح چیرتی چلی جارہی تھی۔
"تم بہت اچھے کشتی ران ہو۔" تورد لوف نے کہا۔
"اس کی مشق جلاوطنی ہی میں کی تھی" دذرزنسکی نے مسکرا کے کہا: "میں تین مرتبہ فرار ہوا تھا۔ دو بار کشتی کے ذریعے۔ ۱۸۹۹ء میں کائیگورودسکی سے اور ۱۸۹۲ء میں ورخونیسک سے۔ وہ فرار بھی دیوانگی کا ایک نمونہ تھی۔ چپو چلانے سے ہاتھوں میں پڑے چھالے مدت بعد مندمل ہوئے تھے۔ . . ."
"مجبوراً کھلاڑی بنے!" تورد لوف نے ترچھی مسکراہٹ سے کہا۔
کوندراتی چپ چاپ دبلی پتوار تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے محبت جھیل کے پانی کی طرح موجزن تھی۔

کشتی کو دور فاصلے میں تحلیل ہوتے دیکھ کر لینن نے کہا: "کیا خوب لوگ ہیں۔ . . ! انھیں توڑا نہیں جاسکتا۔"
وہ کنارے پر بیٹھ گیا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ رات پرسکون تھی۔ جھیل پر پھیلتی ہلکی سی دھند خزاں کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ سرکنڈوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ قریب ہی سے ایک پرندہ سیٹی بجاتا اڑ گیا۔ جنوب کو اڑتے پنچھیوں کی بھید بھری اداس، دل کو رلا دینے والی آوازیں تاریکی کو چیر کے ان تک پہنچتی رہیں۔
لینن نے ایک بار پھر وہ تمام باتیں اپنے ذہن میں رشک کے ساتھ دہرائیں، جو اس کے ساتھی اسے بتا گئے تھے۔ اور زندگی کے اس اہم لمحے میں وہ یہاں بیٹھا تھا! اس کا خیال دور دراز علاقوں کی طرف چلا گیا۔ پیٹروگراڈ اور اس سے بھی پرے۔ ماسکو اور دوسرے علاقوں کی جانب، جہاں سے کانگرس کے لیے وفود آئے تھے۔ اس نے بڑے تاسف سے سوچا: اسے سیاحی کا موقع کتنا کم ملا تھا۔ وہ کریمیا، کاکیشیا کبھی نہیں گیا تھا۔ سائبیریا بھی محض جلاوطنی میں گیا، جہاں اسے ایک جگہ سے باندھ دیا گیا تھا اور جہاں اسے ہر قسم کے دباؤ میں زندہ رہنا پڑا تھا۔ اس کے دل میں ہر جگہ جانے کی تکلیف دہ خواہش پیدا ہوئی، عوام کے درمیان، ان سے باتوں کے لیے، ان کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے، خود کو اس قوت کا ایک ذرہ محسوس کرنے کے لیے۔
لینن نے ہلکی سی آہ بھر کے کولیا سے کہا: "تھوڑا سا تیر نہ لیں کولیا؟"
"جی، بہت اچھا خیال ہے۔" کولیا نے کہا ——— اس نے اپنا پیٹ اندر کو سکیڑا اور اس کی پتلون بغیر ہاتھ لگائے نیچے جا پڑی اور وہ بھاگ کر جھیل میں کود گیا۔

"اسے تم سے بڑی محبت ہے۔" زینوویف نے کہا۔
"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"[1] لینن نے فرانسیسی میں برجستہ کہا۔

---
1. Amor D'amour si Paga

پھر سب نے کپڑے اتار دیے اور جھیل میں اتر گئے۔ لینن اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"زیادہ دور نہ جاؤ۔" زنووئیف نے چیخ کر التجا کی۔

"فکر نہ کرو۔ پولیس کا کتا ترِیف پانی میں میری بو نہیں پا سکتا۔" دور سے لینن کی آواز آئی۔

پھر خاموشی۔ زنووئیف نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کی۔

"لینن کو روک کون سکتا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد یمیلیانوف کو بھی تشویش ہوئی۔

"میں ان کے پیچھے جاؤں؟" اس نے کہا اور تاریکی میں ڈبکی لگا دی۔

کولیا بہت خوش خوش تیرتا ہوا واپس آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ حیرت میں بار بار کہہ رہا تھا: "۔۔۔ کیا تیراک ہے۔۔۔! وزیرِ آب۔۔۔! اور اتنی دیر۔۔۔؟ واہ، کیا تیراک ہے!"

پانی پر تھپیڑوں کی آواز آئی۔ یمیلیانوف تیرتا واپس آ رہا تھا: "بہت دور نکل گئے وہ۔۔۔ اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتے۔۔۔"

تینوں، پانی میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے تاکہ لینن کی طرف سے کوئی آواز سن سکیں۔ آخر لینن، بڑی مہارت سے پانی میں بازو اور ٹانگیں چلاتا نمودار ہوا۔

"ولادیمیر ایلیچ!" یمیلیانوف نے منہ لٹکا کے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا: "آپ یہ حرکت کیسے کر سکتے ہیں؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟ بھئی میں ایک مشہور تیراک ہوں۔ یقین نہیں تو گریگوری سے پوچھ لو۔۔۔"

وہ کنارے پر آ گئے اور گھاس میں بیٹھ گئے۔ تیرنے کے بعد سب خوشگوار سے پرسکون تھے۔ رات بہت تپی ہوئی تھی اور فضا میں مچھروں کی بھن بھن کی گونج۔

زنووئیف نے سرور میں ان دنوں کو یاد کیا، جب جنگِ عظیم کے شروع دنوں میں لینن، کراکاؤ کے نزدیک پورونینو میں تھا۔ پھر وہ دن جب آسٹریا کی انتظامیہ نے لینن کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ زنووئیف بھی ان دنوں زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ زاکوپین میں رہتا تھا۔ لینن کی گرفتاری کے بعد اس نے موسلا دھار بارش میں سائیکل پر دس کلومیٹر سفر طے کیا اور جا کر پولینڈ کے انقلابی، ڈاکٹر ڈلسکی سے درخواست کی کہ وہ مداخلت کریں۔

"وہ بہت کڑوے وقت تھے،" زنووئیف نے کہا: "لیکن یہ وقت بدتر ہے۔۔۔"

"ایک روسی انقلابی کے لیے یہ بڑی دل شکن اور تکلیف دہ بات ہے کہ اس پر زارِ روس کا جاسوس ہونے کا الزام لگایا جائے۔ تمھیں راز کی بات بتاؤں؟ قیصر کے جرمنی کے لیے جاسوسی کا الزام بھی اتنا ہی مکروہ ہے۔۔۔"

یہ الفاظ غیر شعوری طور پر لینن کی زبان سے پھسل گئے۔ اس نے گفتگو میں کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ یمیلیانوف کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ ظاہری بے پروائی کے باوجود، لینن نے جاسوسی کے الزام کو بہت بری طرح محسوس کیا ہے۔ لینن جلدی سے موضوع بدل کر چپ ہو گیا۔ ستاروں کے نیچے تاریکی میں، دور تیرتی کشتیوں میں گٹار سے بہتے نغموں کی آواز آ رہی تھی۔ ستاروں کے نیچے پھیلی تاریکی، سریلے نغمے، مچھیروں کے گیت اور کنارے سے ٹکراتے پانی کی سنگت۔ سب پر پرسکون سی اداسی محیط ہو گئی۔

"ہاں!" لینن نے زیرِ لب کہا: "جنگل کی تنہائیوں میں بیٹھ کر فطرت کی خوبصورتیوں پر وچار کرنا بہت بھلا لگتا ہے۔

اگر شاعر اور مصور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس سے بہتر اور کیا چیز ہوگی؟ یاد ہے یہ لفظ؟ کہ وہ بڑے سکون، اطمینان سے اضطرابی کیفیت سے الجھا نغموں میں ڈوبا، بھاگ رہا ہے، دوڑ رہا ہے، کھوکھلی لہروں کے ساحلوں پر، وسیع طوفانی جنگلوں میں —— اور میں، اپنے گناہوں کی پاداش میں، پیٹروگراڈ جانے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ واقعات کے دل میں اترنے کے لیے، عوام کے ہجوم کی دھڑکنوں میں دھڑکن بننے کے لیے۔ بمبئی میں نے وہ شہر اس مرتبہ ٹھیک سے نہیں دیکھا حتیٰ کہ کانسی میں بنا گھوڑسوار کا مجسمہ بھی نہیں۔ میں جا کے میکسم گورکی کو یہاں بھیجوں گا۔ یہاں بیٹھ کر اسے استغراق میں گم ہونا چاہیے۔ مجھے نہیں۔ صد افسوس کہ اس نے اپنے آپ کو خالصتاً سیاسی سرگرمیوں میں مصروف کر لیا ہے۔ سیاست میں خواہ مخواہ الجھ جاتا ہے۔ اسے انسانوں، انسانی فطرت کی باریکیوں، انسانی تعلقات کی پیچیدگیوں، طبقاتی تضادات اور طبقاتی تعلقات کی باریکیوں پر پورا عبور حاصل ہے۔ گورکی نے اپنے پمفلٹ "لینن کو دست چھوڑو" میں میری پوری طرح مدافعت کی ہے۔ دوسرے مضامین میں اس نے مجھے الیانوف لینن کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے (جو اس کا دوست ہے، جس کی وہ بے حد قدر کرتا ہے۔ عزت کرتا ہے) ان مضامین میں اس نے میرا ذکر ایک خاص طبقے کے مفادات کا محافظ اور ترجمان ہونے کی حیثیت سے کم اور بطور ایک فرد زیادہ کیا ہے۔ سیاست انسانی رشتوں کا ایسا میدان ہے، جس میں فرد کے بجائے کروڑوں انسانوں سے سروکار ہوتا ہے۔ اگر ہم گورکی کے کام میں دخل دیں تو وہ یقیناً بُرا مان جائے۔ ہم اسے یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ تاروں بھری رات اور جھیل کی لہروں کے بارے میں یوں لکھو۔ فنکاروں کو بعض وقت پُرسکون تنہائی یقیناً چاہیے ہوتی ہے۔ ہم سیاست دانوں کو، جنھیں ہمیشہ عوام میں ہونا چاہیے، تنہائی کبھی راس نہیں آتی۔ ہماری روح عوام ہیں۔ اپنے فیضانی پیشے کے باوجود شاعر کو یہ شعور تو ہوتا ہے شاید کہ وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے یہ عمل بلاواسطہ نہیں ہوتا۔ اتنا خام نہیں ہوتا۔ شاید یہ اس وقت بہترین لکھتے ہیں جب وہ کچھ عرصہ کے لیے عوام کو بھول جاتے ہیں۔ اگر ہم عوام کو ذرا بھی بھولیں تو فنا ہو سکتے ہیں۔ . . تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی کولیا؟"

"جی نہیں!"

لینن نے ہنستے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"بہرحال ہماری زندگی اس وقت بھی اتنی بے کیف نہیں۔ یہ جھونپڑی، تنہائی، رازداری، بہروپ اور تعاقب میں پولیس کا کتا تریف۔ یہ قدامت پسند مارکسیوں کے بھی بس کی بات نہیں جو مارکس کے "سرمایہ" کو اتنی ہی تفصیل سے جانتے ہیں جتنا کسان اپنے گھر کے احاطے کو۔ سوشلسٹ انقلابیوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو رومانٹک سمجھا ہے اور ہم سوشل ڈیموکریٹوں کو خمی۔ اب تم سوشلسٹ انقلابیوں کی حالت دیکھ لو۔ ان کی کسانی رومانویت کہاں اڑ گئی ہے، کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس کا اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب وہ موٹی توندوں والے امن پسند لوگ بن گئے ہیں، ایک ایسی کسان پارٹی جو کسانوں کو زمین دینے سے انکاری ہے۔ . . اور ہم عجیب لوگ ہیں، جو کسانوں کو زمین دے کر رہیں گے، وہ طاقت چاہتے ہیں لیکن اس سے خائف بھی ہیں۔ . . ہم بالکل خائف نہیں۔ . . کسانوں کا وزیر چرنوف جاسوسی کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے اور اطمینان سے استعفیٰ دے کر اچھے بچوں کی طرح قانونی کارروائی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ انھوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس نے چہرہ پونچھتے ہوئے کہا: "مقدس شبنم ہے۔" لیکن ہم فرار ہو کے روپوش ہو گئے! اب ہمیں مچھر کاٹتے ہیں! کولیا، ایک ڈبکی اور لگا لیں؟"

"براہ کرم زیادہ دور نہیں جائیے گا۔" یمیلیانوف نے کہا۔

لینن اور کولیا دوبارہ پانی میں اتر گئے۔ اِدھر اُدھر تیرتے رہے، زور زور سے پانی پر تھپیڑ مارتے شور مچاتے رہے۔ پھر کنارے پر آ کے کپڑے پہننے لگے۔

"تمھارا اسکول میں داخلہ قریب آگیا ہے،" یمیلیانوف نے کہا: "تمھاری ماں نے کہا ہے کہ اب تمھیں اس کے پاس گھر میں رہنا ہوگا۔ ۔ ۔"

"میں نہیں جاؤں گا،" اس نے ترشی سے کہا: "میں یہیں رہوں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" یمیلیانوف نے اعتراض کیا: "تمھیں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔"

لینن نے تاریکی میں کہا: "یہاں پر کولیا کے بغیر اُداسی نہیں ہو جائے گی کیا؟ اسے یہیں رہنے دو۔ اس کی کتابیں کاپیاں یہیں لے آؤ۔ اسے میں پڑھایا کروں گا۔ ٹھیک ہے کولیا؟"

"جی۔ بالکل،" کولیا نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"شی!" یمیلیانوف نے سرگوشی کی۔ چھٹیاں منانے والوں سے بھری دو کشتیاں کنارے کی طرف آرہی تھیں۔ آوازیں اور گٹار سے ابھرتے نغمے قریب ہی کہیں تھے۔

"یہ لوگ یہاں تو نہیں اتر رہے؟" زینوویف نے سرگوشی میں کہا۔

کشتی میں کسی شخص کی زبان سے گیت بہنے لگا:

میرے بچّے! بہار میں گلاب کے پھول کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا،
گلاب تو تم جون کے مہینے میں چنو گے۔
بہار کے آغاز میں بنفشے کے پھول چنا کرتے ہیں
کہ یہ پھول بہت جلد مرجھا جاتے ہیں۔
جب گرمیاں آئیں گی تو تم بنفشے کے پھولوں کی خواہش کروگے ——
آہ —— تب تک تو ان کی سوکھی پتیاں فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہوں گی،
پھر تم آنسو بہاؤ گے کہ تم نے بہار کی پروا نہ کی،
لیکن تمھارے آنسو بہار کو واپس نہ لا سکیں گے۔ ۔ ۔

دوسری کشتی سے ایک خمار آلود بے سُری آواز اس آواز میں آملی:

تمھارے ہونٹ سٹرابری کے رس کی طرح ہیں، اور
تمھارے گال 'گلاُردی دریکوں' کے گلاب۔

"تم اپنا راگ نہ الاپو۔ چپ کرو،" ایک لڑکی نے بڑی نخریلی آواز میں کہا۔

"چپ کرو احمق،" ایک مردانہ آواز نے اس کی تائید کی۔

پہلی کشتی سے ناک سے نکلا، ہانپتا ہوا جواب آیا:

پہلے تو نظر آئے پیکوئن ماڈل
پھر بھڑکیلی سکرٹیں دیکھیں آپ
پھر جھاگ ایسی نئی لیس کا زیر جامہ
اور پھر —— اور پھر وہ یعنی۔

دوسری کشتی نے جواب دیا:

مادام کلائز ـــــــــ باریا کو لے جاؤ
یہ بچہ اپنا خیال رکھنے سے قاصر ہے
دیکھو اس نے فرش پر کیسا جوہڑ بنا دیا ہے

پھر ان کے قہقہوں سے یہ گیت اُبھرا :

جرمن ایجنٹ / جرمن جاسوس
قیصر ولہم کے منظورِ نظر لونڈے

"یہ ہمارے بارے میں ہے" لینن نے زیرِ لب، ہنستے ہوئے کہا۔
کشتیاں کنارے سے دور چلی گئیں :

رات کے زرد، سفید پھولوں کی خوشبو میں کو ملتا ہے۔

سب کشتیوں میں گاتے ہوئے اپنے گیتوں سمیت جھیل پر پھیلی تاریکی میں کھو گئے۔ رات پھر خاموش ہو گئی۔
"اگر انھیں پتا ہو تا کہ آپ یہاں ہیں . . . " یمیلیانوف نے کینے میں رچی مسرت سے کہا۔
"عامیانہ، بہت ہی عامیانہ" زینووئیف نے برہم ہو کر کہا۔
"ہاں!" لینن مسکرایا: "تمھارے گال، گلائردی دیکھوں، کے گلاب ہیں . . . "

وہ چپ چاپ جھونپڑی کو چل دیے۔ کولیا سمیت سب پر یہ عامیانہ، فاحشہ صفت بے ہودہ زندگی اپنا ناخوش گوار تاثر چھوڑ گئی تھی، جس نے اپنے شرابی، فحش سانسوں سے ان کی پناہ گاہوں کی تنہائی کو مکدر کر دیا تھا۔ ہر کوئی اس بارے میں اپنے اپنے انداز میں سوچ رہا تھا۔ زینووئیف نے سوچا: "پرانا روس زندہ ہے۔ گاتا ہوا، چاندنی پیتا ہوا، زوال پسند نغمے گاتا ہوا، فحش لطیفے بیان کرتا ہوا۔ کاروبار میں مصروف، جسے انقلابیوں کی شمہ بھر پروا نہیں، جنھیں ہر روز اذیت دی جاتی ہے۔ جنھیں خفیہ پناہ گاہوں میں چھپنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔" اسے یہ بھی خیال ہوا کہ باشعور پرولتاری بہت کم ہیں اور وہ بھی بورژوا دلدل میں گم ہیں۔

یمیلیانوف نے سوچا: "یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ لوگ کنارے پر نہیں اُترے۔ تاہم جب شکار کا موسم شروع ہو گیا تو لینن کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ثور دلوف کا مؤقف درست تھا۔"
کولیا ابھی تک لینن کی تیراکی پر متحیر تھا۔ ساتھ ہی اسے ان لفنگوں کے جرمن جاسوس والے گیت پر بےحد غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ لینن ان کی اس بکواس سے ضرور دکھی ہوا ہو گا۔ اس خیال سے وہ شدید روہانسا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو تاریکی میں کسی کو نظر نہ آ سکے۔

پر لینن کے ذہن میں بڑی مختلف باتیں آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا: "چاہے وہ پسند کریں، نہ کریں، انھیں انقلاب لانا پڑے گا اور ان چھوٹے لوگوں ہی کی مدد سے سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے گا جو کشتیوں میں بیٹھے، گاتے ہڑبونگ مچا رہے تھے۔ سوشلزم کے لیے کسی خاص آدمی کو گھڑا نہیں جا سکتا۔ ان ہی لوگوں کی دوبارہ تشکیل کرنا ہو گی۔ ایسے ہی لوگوں کو ساتھ ملا کر کام کرنا پڑے گا کیونکہ یہ ملک تصوراتی نہیں ہے۔ یہ ملک روس ہے یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا۔ بہت مشکل مراحل پیش آئیں گے۔ ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا، انقلاب لانے سے زیادہ مشکل ہو گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ بعد میں جب کولیا ایسے لوگ جوان ہوں گے تو ان میں بھی صحیح شعور پیدا کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہو گا۔ لیکن اتنا مشکل بھی نہیں ہو گا۔"

اس نے کوبیا کے کندھوں کے گرد بازو حائل کر دیے ——— اور یہ سوچ کر کہ لینن نے اس کے خیالات پڑھ لیے ہیں، کوبیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جھیل رزلیف کے کنارے۔ (رزلیف) کا یہ آخری فصل تھا۔ راتیں سرد ہو گئی تھیں۔ نادیژدا نے گرم کپڑے بھیج دیے تھے، پھر بھی صبح کے وقت جھونپڑی سے باہر آنا بہت ہمت طلب تھا۔ شروع خزاں کی ہوائیں درختوں، جھاڑیوں میں شرن شرناتی تھیں اور پیلے پڑتے ٹوٹے پتے تالابوں اور مرغزاروں میں کچھ کچھ جاتے تھے۔ لینن کو جیسے سردی کا کوئی احساس نہیں تھا، جیسے شدید گرمیوں میں اسے گرمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ اپنے نئے مضمون "انقلاب کے اسباق" پر کام کر رہا تھا اور پیٹروگراڈ میں پارٹی کانگرس کے پریزیڈیم کے ساتھ بڑی جاندار دلچسپ خط و کتابت میں مصروف تھا۔

ایک روز نادیژدا، ایک پستہ قد شخص کو جھونپڑی کے پاس لے کر آئی۔ اس کے سر کے بال بہت گھنے تھے اور بہت بڑی غیر روسی ناک کے نیچے سیاہ مونچھیں۔ گھاس کے ڈھیر اور درختوں کے تاج ڈوبتے سورج کی کرنوں سے منور تھے۔ شام، سرد ہوا کی کٹار پر جھولتی آ رہی تھی۔

مونچھوں والے آدمی نے سبزہ زار کو پار کیا اور بے یقینی سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا جنگل کے کنارے جا کر رک گیا۔ لینن، جو گھاس کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا، اس کے پاس گیا اور کہا: "شام بخیر!"

اس شخص نے مڑ کر لینن کو بے پروائی سے دیکھا۔

"کامریڈ سرگو[1]، تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" لینن نے مضحکہ خیز انداز میں کہا ——— وہ شخص لینن کو پہچان نہیں پایا تھا۔

سرگو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ تیزی سے بڑھ کر لینن کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ پھر اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر لینن کو بڑے پیار سے دیکھا، اور پھر اس سے بغل گیر ہو گیا: "ولادیمیر ایلیچ، میرے پیارے دوست . . ."

اس نے گرد و پیش دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف سیٹیاں بجاتی ہوا تھی۔ ڈوبتے سورج کی مانند پڑتی سرخ روشنی میں نہائے اس سبزہ زار میں لینن اسے بالکل تنہا لگ رہا تھا۔ سرگو اسے اپنے ساتھیوں کے بغیر اکیلا دیکھنے کا عادی نہیں تھا، اس لیے وہ چپ سا ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ لینن کسی بڑی دیہاتی حویلی میں رہ رہا ہو گا۔ معتمد ساتھی اور اُلفیلیں یا مشین گنیں لیے پہرے پر ہوں گے۔ اب وہ اپنی حماقت پر دل ہی دل میں نادم سا ہو گیا تھا اور یہ سوچ کر پریشان بھی ہو گیا تھا کہ پارٹی کا وہ عظیم راہ نما، جس پر ہزاروں کارکن اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں، یہاں بالکل غیر محفوظ کھڑا ہے۔

ارغوانی غروبِ آفتاب نے ماحول کو اور بھی اداس کر دیا جسے سرگو نے اپنی جنوبی علاقوں کی مخصوص طبع کے باعث بہت

---

[1] کامریڈ سرگو، گریگوری آرجانیکِدزے کا عرف تھا جو اسے پارٹی کی طرف سے دیا گیا تھا۔

بے کلی سے محسوس کیا۔

یہ جاننے کے بعد کہ لینن ایک معمولی سی جھونپڑی میں رہ رہا ہے، اس نے برہمی سے اپنے بازو فضا میں لہرائے: ”یہ اچھی بات نہیں۔ میں سمجھا تھا، تم جھیل کنارے کسی بنگلے میں رہ رہے ہو۔ یہاں تم کام کیسے کر سکتے ہو؟ یہاں تو میز بھی نظر نہیں آتی۔ ۔ ۔“

لینن نے پوچھا: ”کانگرس میں کیا ہو رہا ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔ ۔ ۔“

اس دوران میں کولیا اور زینووئیف جھونپڑی سے باہر آگئے۔ یمیلیانوف راز لف میں تھا۔ سرلوزا نے آکر آلوؤں کی بوری اور بھیڑ کی کھال کولیا کو تھما دی اور آگ جلانے میں مصروف ہو گیا۔

”آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔“ لینن نے کہا: ”صبح سویرے چلے جانا۔ تم کانگرس کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے پیٹروگراڈ پہنچ جاؤ گے۔ منظور؟ سرلوزا! تم واپس گھر چلے جاؤ۔ صبح آکے اس کامریڈ کو لے جانا۔ ۔ ۔“

سرلوزا کشتی کی طرف چل دیا۔

شام کا کھانا کھا کر وہ سب جھونپڑی میں چلے گئے۔ کولیا نیند کا مقابلہ کرتا رات گئے تک ان کی باتیں سنتا رہا۔ جو کچھ اس نے سُنا، اسے بہت خشک لگا۔ لینن اور کبھی کبھی زینووئیف اس سے سوال پوچھ لیتے۔ سرجو اکثر ناموں اور اعداد و شمار کے ساتھ جواب دیتا کہ اتنے لوگ ساتھ ہیں، اتنے مخالف ہیں۔ فلاں شخص ہمارے ساتھ ہے، فلاں خلاف ہے۔

لینن یہ سب کچھ بڑی توجہ اور بے قراری سے سنتا رہا۔ کبھی کسی سوال سے ٹوکتے ہوئے، ہنستے ہوئے، کبھی سنجیدہ، فکر مند۔ کولیا، ناموں اور اعداد و شمار کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ نیند میں اتر گیا۔ اس نے سرجو کا آخری جملہ یہ سُنا: ”میں نے چھنیدزے کو صاف اس کے مُنہ پر کہہ دیا کہ تم جیلر ہو۔ ۔ ۔ میں نے اس سے یہ جارجئین زبان میں کہا تھا تاکہ وہ میری بات پوری طرح سمجھ لے۔ ۔ ۔“

اس کے بعد کولیا سو گیا۔ اب صبح اُٹھا تو وہی باتیں ہو رہی تھیں۔ لینن سوال پوچھ رہا تھا اور سرجو جواب دے رہا تھا۔

”اچھا، تم مجھے مندوبین کے بارے میں بتاؤ۔ اگلی صفوں کے لوگ کون ہیں؟ مقامی کون ہیں؟ کیسے لوگ ہیں یہ سب؟ ان کا موڈ کیسا ہے؟ کہیں وہ منتشر الذہن تو نہیں؟ حوصلے تو بلند ہیں ان کے؟“

”او، ولادیمیر آلیچ، تم ان پر کیسے شک کر سکتے ہو؟! یہ سب جذبے سے بھرپور ہیں اور فتح میں یقین رکھتے ہیں۔ ہر کوئی پختہ اور بالغ نظر ہو گیا ہے۔ وہ راہ نما ہیں اور سچے معنوں میں راہ نمائی کر رہے ہیں۔ آتائیوم، فارکوف کی تنظیم سے۔ لوجانسک سے وارشلوف۔ باکو سے دجاپر دزے۔ سائبیریا سے شمیالسکی۔ آئیوانوفو وزنیسنک سے بنبوف۔ شلیانسک سے سولینگ۔ نسک سے میاسکوف اور ضلع وائبرگ سے ہارا، کائینین۔ پرولتاریہ کے دلوں، وزراتی دماغوں کے لوگ۔“

”ان میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے؟“

”مندوبین کی اوسط عمر انتیس برس ہے۔ ۔ ۔“

”منن تو نہیں آیا؟“

”وہ پیٹروگراڈ آتے ہوئے راستے میں گرفتار ہو گیا تھا۔“

”اور سارا توف سے انتونوف؟ وہ بھی نہیں پہنچ سکا؟“

”وہ بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ کشتی میں وہ اور منن دونوں تھے۔“

"کانگریس میں کتنے کارکن آئے ہیں؟ تم نے کتنے بتائے تھے؟"

"ستر!"

"نصف سے زیادہ۔ آج سے چھ ماہ پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنا اکٹھ ممکن ہے"۔ ذرا توقف کے بعد لینن نے پوچھا:

"مارتوف نے کیا پیغام بھیجا ہے؟"

سرجو غصے میں غرایا: "بالکل بکواس۔ اِدھر اُدھر کی ہانکی ہیں اس نے۔ ۔ ۔"

کولیا پھر نیند میں اُتر گیا۔ جب وہ دوبارہ برآمد ہوا تو سب سو چکے تھے۔

زرد سورج پھیکے آسمان پر رینگ رہا تھا۔ کولیا جھونپڑی سے نکل آیا اور جھیل پر نہانے کے لیے چلا گیا۔ پھر وہ اپنے معمول کے مطابق گشت پر نکل گیا۔

سب سے پہلے وہ راسولوف کے سبزہ زار کی طرف گیا اور گھاس کے میدان کے قریب جھاڑیوں میں چھپ کر جائزہ لینے لگا ——— دو برہنہ ٹانگیں جھونپڑی سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ پھر یہ ٹانگیں ایک دوسرے کو رگڑنے لگیں، شاید سردی کی وجہ سے۔ پیروں کے انگوٹھے اور انگلیاں مڑتے تڑتے رہے۔ پھر ایک ٹانگ اندر چلی گئی۔ اس کے بعد دوسری بھی جھونپڑی کے اندر غائب ہوگئی۔ چند لمحوں بعد پھر دونوں ٹانگیں باہر نکل آئیں اور پھر وہی عمل جاری ہوگیا ——— کولیا اپنی ہنسی کو روکتا روکتا دہرا ہوگیا۔ دن میں متحرک ٹانگیں اسے بیحد مضحکہ خیز لگیں۔ بالآخر دونوں ٹانگیں پھر جھونپڑی میں چلی گئیں اور راسولوف ٹھٹھرتا ہوا جھونپڑی سے برآمد ہوا۔ وہ کافی عام سی ہی ٹانگوں پر دھوپ میں کھڑا رہا جو کسی بھی انسان کی ٹانگوں کی طرح ٹانگیں تھیں۔ پھر اس نے طویل جمائی لی اور جنگل کو چلا گیا۔ کولیا وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ اس نے یکدم ٹانگوں کا ایک اور جوڑا جھونپڑی سے نکلتے دیکھا۔ کولیا اس کے بکھرے بکھرے بال اور سوئے سوئے چہرے کو دیکھ کر دل ہی دل میں ہنسا۔ اسے یہ سوچ کر بیحد خوشی ہوئی کہ اس کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کا بہت مزہ آئے گا۔ وہ چیخ کر ویتیا کو پکارنے ہی والا تھا کہ اسے اپنی ذمہ داریاں یاد آگئیں اور اس نے اپنا دم سادھ لیا۔ اگر ویتیا کو پتہ چل گیا کہ کولیا اس کے قریب ہی رہ رہا ہے تو وہ روز اس کے ہاں آیا کرے گا۔ کولیا اس غلطی کے احساس سے کانپ گیا۔ جو اس سے سرزد ہونے والی تھی۔ وہ اس تیزی سے جنگل کی طرف بھاگ اُٹھا۔ جیسے کسی حقیقی جاسوس کا پیچھا کر رہا ہو۔

چیونٹیوں کے ٹیلے کے پاس جاکر وہ گھاس پر بیٹھ گیا اور بڑی شدت سے سوچنے لگا۔ بہت مجبوری تھی کہ وہ ویتیا کے ساتھ کھیل نہیں سکتا تھا۔ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ وہ ویتیا کو یہ بتا کر حیران و پریشان کر سکتا تھا کہ جھیل کے کنارے دلدلی سرکنڈوں کے پیچھے جنگل میں ان کی ناکوں کے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ یکدم اسے ویتیا کے سوئے چہرے پر ترس آنے لگا۔ وہ بیچارہ یہاں خاصا بور ہو رہا ہوگا۔ اس نے اپنی اہم حیثیت کے پیشِ نظر مسکراتے ہوئے سوچا۔

"میرے بغیر کتنا بور ہو رہا ہوگا"، کولیا نے بلند آواز سے مونچھوں والے کی نقل اُتاری جو اس وقت لینن کے ساتھ تھا۔

اس نے سارے جنگل میں گشت کی۔ واپس جھونپڑی کے قریب آکے جھاڑیوں میں رُک کر اس نے دیکھا۔ اس کا باپ واپس آچکا تھا۔ ساشا اس کے ساتھ تھا۔ وہ سب بھڑکتی آگ کے گرد لینن کے ساتھ بیٹھے کسی گفتگو میں معروف تھے۔ اتنے میں سرجو بھی جھونپڑی سے نکل آیا۔

"تم خوب سوئے؟" لینن نے اس سے کہا: "صبح کے اجلاس میں دیر سے پہنچوگے؟ میں نے قراردادیں پڑھ لی ہیں۔ اور ان میں چند اضافے بھی کر دیے ہیں۔ ساتھیوں کو دکھا دینا۔ ۔ ۔"

سرجو نے اطمینان سے آنکھیں اُٹھا کے سورج کو دیکھا۔ زینووئیف بھی جھونپڑی سے آگیا۔ وہ کافی چاق و چوبند

دکھائی دیتا تھا۔ اس نے سَرجو کو جھیل کنارے نہانے کی دعوت دی۔ دونوں جھیل کی اور چلے گئے۔ کولیا نے محسوس کیا کہ زینوویئف مہمانوں کی موجودگی میں ہمیشہ ترو تازہ نظر آتا ہے ورنہ اکثر چپ چاپ سست سا رہتا ہے۔ کولیا کو اس کی تازگی میں تصنع کا رنگ نظر آیا۔ اس کا مبہم سا خیال تھا کہ لینن کی غیر موجودگی میں زینوویئف دوسروں کے سامنے لینن کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ لینن کی طرح سوچتا ہے، لینن ہی کی طرح بہادر اور پُر اعتماد دوست ہے، کولیا اپنے اس مشاہدے سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پایا۔ اس نے اس پر مزید غور ترک کر دیا۔ اس کی سمجھ میں صرف یہ بات آئی کہ اگر سَرجو وہاں نہ آیا ہوتا تو زینوویئف کندھے پر تولیہ رکھے بلند آواز میں بولتا اس طراری کے ساتھ جھونپڑی سے نہ نکلتا اور اس سرد صبح میں جھیل کنارے نہانے کے لیے کبھی نہ جاتا۔

جھیل سے واپسی پر سَرجو چائے پیے بغیر ہی ساشا کے ساتھ چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے بڑی گرمجوشی سے زینوویئف کے ساتھ مصافحہ کیا۔ لینن کا ہاتھ بہت دیر اپنے ہاتھوں میں تھامنے کے بعد یک لخت مڑا اور چلا گیا۔ جنگل کے کنارے پہنچ کر پلٹ کے لمحہ بھر کو جھونپڑی کی اور دیکھا، پھر گھاس کے ڈھیر اور سارے سبزہ زار پر نظریں دوڑائیں، پھر دل کھول کر ہنستا ہوا جنگل سے اوجھل ہو گیا۔

زینوویئف یکدم اداس ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھ کر اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ پیروں پر غلط طریقے سے پٹیاں باندھنے کی وجہ سے اس کے پیروں پر آبلے پڑ گئے تھے۔

کولیا آگ کے قریب اپنے باپ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا: "آپ میری کتابیں لے آئے؟"

اس نے اتنی بلند آواز سے یہ سوال کیا کہ لینن سُن لے اور اسے اپنا وعدہ یاد آ جائے۔ لینن اپنی سوچوں میں گم آگ کے شعلوں کو بے دھیانی سے دیکھ رہا تھا۔ یمیلیانوف بھی لینن کے اس وعدے کو بھول چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کولیا بار بار اپنی اسکول کی کتابوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے۔ لڑکا اتنا مستعد کیسے ہو گیا ہے!

"انھیں پریشان نہ کرو۔" اس نے لینن کی طرف سر سے اشارہ کر کے سرگوشی میں کہا: "چند روز بعد تم کوندراتی یا ساشا کے ساتھ خود پیٹروگراڈ چلے جانا اور ضرورت کی تمام کتابیں خرید لینا۔ وہاں تمھاری خالہ مارفا تمھیں اسکول کے لیے لباس بھی سی دے گی۔"

شام کے وقت شوتماں لینن سے ملنے آیا۔ سنہرے فریم کی، بغیر کمانی کی عینک ناک پر جمائے، سر پہ سیاہ ہیٹ اور ہاتھ میں چھڑی لیے وہ چھٹی پر سیر کے لیے نکلا شخص لگتا تھا۔ لینن آج کی خبروں سے بہت فکر مند تھا۔ وہ آگ کے پاس بیٹھا تھا۔ شعلوں کی روشنی اس کے چہرے سے کھیل رہی تھی۔ صبح کے اخبار پنسل کے نیلے اور سُرخ نشانات سے اٹے بکھرے پڑے تھے۔ اگر جلتی آگ پر کیتلی سے ہلکا ہلکا دھواں نہ اٹھ رہا ہوتا اور تینوں شخص آگ کے گرد چپ چاپ، پُر سکون نہ بیٹھے ہوتے تو بکھرے اخبارات سے یہ تاثر قطعی ہو جاتا کہ یہاں بھی ایک چھوٹی سی جنگ ہو چکی ہے۔

شوتماں نے اخفا کی خاطر تمام اخبار اکٹھے کر کے پلندہ بنا لیا اور آگ تاپنے لگا۔ وہ ہمیشہ مطمئن اور پُر سکون نظر آیا کرتا تھا لیکن اس لمحے وہ خلافِ معمول بہت مضطرب تھا۔ اخباروں نے جاری بالشویک کانگریس کی کارروائی کے بارے میں لکھا تھا اور

تو ردولوف کا یہ بیان بھی چھپا تھا کہ اگرچہ لینن ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تاہم وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہیں اور وہی ہماری کانگرس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس بیان کی وجہ سے سرکاری وکیل استغاثہ اور خفیہ پولیس میں ٹریونگ مچ گئی تھی اور پیٹروگراد میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ حکومت، کانگرس سے لینن کی برآمدگی کا مطالبہ کرے گی اور انکار کی صورت میں کانگرس کے مندوبین کے خلاف ایک مجرم کو پناہ دینے کے الزام میں مقدمہ چلائے گی۔ شام کے اخباروں میں، جو شوتماں ساتھ لایا تھا، ایک اور سنسنی خیز خبر چھپی تھی: لینن کے جرائم کی ایک اور گواہی: سمیان کشنیر، جسے اتفاق سے پولیس نے کیف میں حراست میں لیا تھا، روس میں تیسرے درجے کا جرمن جاسوس نکلا۔ اس نے فان ہنڈنبرگ سے طویل گفتگو کی۔ اس کی جاسوسی، آسٹریا کے فرائیڈرس کی زیر ہدایت تھی۔ فرائیڈرس نے اسے بتایا تھا کہ لینن، جرمنی میں کسی بھی بنک سے جتنی چاہے رقم نکلوا سکتا ہے۔

شوتماں نے لینن اور زینوویف کو یہ خبریں بہت اضطراب سے سُنائیں۔ لینن نے شام کے اخبار پر اُڑتی سی نظر ڈالی اور کندھے جھٹک کر کہا: "یہ کسی احمقوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ تیسرے درجے کے جاسوس نے جرمنی کے کمانڈر انچیف فان ہنڈنبرگ سے طویل گفتگو کی۔ واہ، نری بکواس ہے۔ اہم بات یہ ہے، تمام سیاسی صورتِ حال کی کنجی یہ ہے کہ اب بورژوازی نے پرولتاریہ کے خلاف خود کو منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ریاستی کانفرنس ہوگی اور وہ بھی یقیناً ماسکو میں، چالیس ضرب چالیس گرجوں کی گھنٹیوں کی جھنکار میں۔ تمام بڑے بڑے صنعت کار، اسٹاک ایکسچینج کے دیوتا، بینکر، جاگیردار، قدامت پسند مسیحی راہ نما، زار کے جرنیل اس کانفرنس میں شامل ہوں گے۔ اور سوشلسٹ انقلابی اور منشویک ان کے پیچھے پیچھے رینگتے ہوئے مرحوم پیوتر آئیوانوفچ بوبچنسکی[1] کی طرح جائیں گے۔ یہ تمام انقلاب دشمن طاقتیں آخری معرکے کی تیاری کر رہی ہیں اور ان کے ترکش میں چند تیر بھی ہیں۔ یہ دیکھو۔ ریابوشنسکی کاروباری لوگوں اور کارخانہ داروں سے کہتا ہے کہ اس صورتِ حال سے خلاصی صرف اسی صورت ممکن ہوگی اگر "قحط کا سوکھا پنجہ" عوام کے جھوٹے دوستوں یعنی جمہوری سوویتوں اور کمیٹیوں کو گلے سے پکڑ لے۔ یعنی ان لوگوں کا سب سے بڑا اتحادی قحط ہے۔ دوسرے، بونا پارٹ آمریت۔ اور ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انقلاب کو روکنے کے لیے یہ ان کا آخری حربہ ہوگا کہ انقلابی پیٹروگراد میں جرمنوں کو داخل ہونے دیں۔ روسی بورژوازی کو موسیو تھائیرز ابھی تک یاد ہے۔ جونہی ان کی جیبوں پر ہاتھ پڑنے لگتا ہے یہ ساری حب الوطنی بھول جاتے ہیں۔ تو صورتِ حال یہ ہے، الیکساندر وازلیویچ!"

"جی، خاصی سنجیدہ ہے صورتِ حال تو۔" شوتماں نے تیوریاں چڑھا کے کہا۔

"ازراہِ کرم مرکزی مجلسِ عاملہ کو میری طرف سے کہہ دو کہ اب قریباً سارا دارومدار ماسکو کے ساتھیوں پر ہے۔ ماسکو کی ساری پرولتاریہ کو اس نام نہاد کانفرنس کے خلاف احتجاج کرنا ہوگا۔ چاہے بھوک ہڑتال ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ . . ."

"میں یقیناً آپ کا پیغام اُنھیں دے دوں گا۔"

اس دوران کیتلی کا پانی اُبلنے لگا۔ یمیلیانوف مگوں میں گرم پانی انڈیلنے لگا، پھر اس نے کھانے کی چیزیں ان کے سامنے کر دیں۔ لینن نے مگ کے ربے دھیانی میں زمین پر رکھ دیا۔

"بہرحال اس آزاد بورژوازی کی کمینگی پر حیرت ہوتی ہے۔" اس نے کہا: "اخبار ایک اور سنسنی خیز خبر سے بھرے پڑے ہیں۔ عارضی حکومت، نکولاس رومانوف کو زارسکائے سیلو سے توبولسک منتقل کر رہی ہے۔ زار کی منتقلی کے سلسلے میں تمام انتظامات وزیرِاعظم کیرنسکی نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ زار کے ساتھ دو خانسامے اور پندرہ خدمت گار ہیں۔ سابق ولی عہد

---

[1]: گوگول کے کھیل "انسپکٹر جنرل" کا ایک کردار۔

شہزادہ الیکسی اپنے حفاظتی دستے اور فرانسیسی اتالیق جیلیارڈ کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ زار کی ریل گاڑی میں تین ڈبے ہیں، ایک رستوران، سیلون اور ایک اضافی ڈبہ . . . منہ سے ٹپکتے لعاب سے کتنی لذت کے ساتھ، آئینی جمہوریت والوں کا اخبار 'رائخ' لکھتا ہے، اگرچہ یہ زار معزول ہو چکا ہے، پھر بھی یہ اخبار رطب اللسان ہے : زار اپنی خادمہ نارشکینا کو جلو میں لیے گاڑی پر سب سے پہلے چڑھا۔ نکولس رومانوف خاموش تھا اور اس کے چہرے پر مایوسیاں چھائی تھیں۔ اس کے برعکس اس کا کنبہ بڑے جوش و خروش سے اپنے سفر میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا . . . ہوں۔ ان کمبختوں کی ہر حرکت، تیچوں، خوش آمدیوں اور مکاروں سے ہمدردی حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے . . . جی، اور پروفیسر ملیوکوف نے شاید بہ نفسِ نفیس آنسو بہاتے ہوئے لاطینی میں کہا ہوگا : خدا کرے آپ کا سفر بخیریت گزرے۔ اخبار اس قسم کی لغویات سے بھرے پڑے ہیں۔ اہم باتیں باریک حروف میں لکھتے ہیں تاکہ نظروں میں نہ آئیں . . . یعنی جیسے کازان کے شہر سویاژسک میں زمیندار اوبوخوو اکی ہل پر کسانوں نے قبضہ کر لیا۔ وسلکونو میں نواب بازٹیسکی کے کارخانوں کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ پیرپٹیسکی کمیٹی نے حکم جاری کیا ہے کہ الیگزاندرنیفسکی گرجے کے تمام باغات کسانوں میں بانٹ دیے جائیں۔ ضلع رودسلاول میں کسانوں نے جاگیردار پروزارکووچ کے کھیتوں میں بغیر اجازت ہل چلا دیے، جنگل کے بہت سے درخت کاٹ لیے اور باغیچوں پر قبضہ کر لیا۔ ضلع کُرسک میں کسانوں نے جاگیرداروں کے باغوں میں ہل چلا دیے اور گھاس کے تیس ہزار گٹھے اٹھا کر لے گئے۔ کہیں کسانوں نے کھیت اور باغات چھین لیے . . . اور اسی قسم کی بہت سی خبریں۔ زرعی انقلاب سارے ملک پر پا ہو رہا ہے اور اس کی خبروں کو باریک حروف میں شایع کیا جاتا ہے۔ محنت کش، کچھ عرصے کے انتشار کے بعد اب پھر بالشویک پارٹی پر مکمل اعتماد کر رہے ہیں۔ کیبل، پیوتیلوف، فرانکوروسی اور منت کے اسلحہ سازی کے کارخانے، پیوتیلوف کی گودیوں کے محنت کش جلسے کر رہے ہیں اور سب کے سب بالشویک یا قریباً بالشویک قراردادیں منظور کر رہے ہیں۔ بالٹک بحریہ کے تمام بیڑے، بالشویکوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن بورژوا اخبارات ان واقعات کا ذکر نہیں کرتے۔ جلی حروف میں حضرت ملیوکوف کے ارشادات چھاپتے ہیں : 'بالشویک بغاوت نے روس کو عنصری شورش سے ہٹا کر قابلِ قدر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔ اب بالشویکوں سے کوئی خطرہ نہیں' کوئی خطرہ نہیں ؟ چل جائے گا پتہ،، اس نے یکدم قہقہہ لگایا : ،، تمھیں یاد ہے گرگوری کس اخبار میں چھپا تھا کہ ؟،، اس نے اخباروں کے ڈھیر سے چھانٹ کر ایک اخبار نکالا اور مسکراتے ہوئے پڑھنے لگا: 'کامریڈ مقدس باپ، اگر آپ اور آپ کے حواری پادریوں نے گرجاؤں کی آمدنی نئے سرے سے تقسیم نہ کی، تو آپ سب کو باری باری قتل کر دیا جائے گا۔ قصبوں کی فوجی تنظیم اور گرجوں کے کلرکوں . . . دیکھا ! انقلاب گرجوں تک پہنچ گیا ہے، اگرچہ اس کی شکل بہت انوکھی ہے . . . !'

لینن نے اپنا مگ اٹھایا اور چسکیاں لینے لگا۔

شوتماں نے اپنے کاغذات میں، جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا : ،، . . . یہ، یہ ایک نوٹ بک ہے، جو نادیژدا کانستانتینووا نے بھیجی ہے . . . ،،

لینن، لمحہ بھر کے لیے حیرت میں ساکت ہو گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا مگ زمین پر رکھ دیا اور نوٹ بک لے لی۔ بالکل، یہ نیلی نوٹ بک تھی۔ وہی نیلی جلد والی۔ اس نے جلدی جلدی اس کی ورق گردانی کی، پھر دھیرے سے بند کر کے اپنے ساتھ رکھ لی۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے پھر اٹھالی اور پھر پڑھنے لگا۔ پھر بند کر کے سوچ میں گم اسے انگلی سے بجانے لگا۔ پھر کھول کر پڑھنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ پہلے اس نے ایک اور نوٹ بک اسی طرح کھولی تھی۔ ذرا سا پڑھ کے پھر بند کر دی تھی۔ تب بھی وہ اتنی ہی شدت سے مسرور ہوا تھا کہ آس پاس بیٹھے لوگوں سے اپنی مسرت نہیں چھپا سکا تھا —— آج سے کم از کم تیس سال پہلے، لیکن

اس نوٹ بک کی جلد نیلی نہیں تھی، زرد تھی۔ یہ ایک کتابچہ تھا، بعنوان "وہ عوام دوست ہیں اور سوشل جمہوریت پسندوں کے خلاف کس طرح محاذ آرائی کرتے ہیں" ——— یہ اس کی پہلی تخلیق تھی، جو شایع ہوئی تھی۔

لینن اخباروں میں اپنی روزمرہ دلچسپی کو بھی بھول گیا۔ اس نے شام کے اخبار بھی نہیں پڑھے تھے جو شوتماں ساتھ لایا تھا۔ وہ بار بار نیلی نوٹ بک کو کھولتا، پڑھتا، بند کرتا، کھولتا، پڑھتا۔ بس کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر شوتماں اور زینوویئف کو دیکھ لیتا جو پیٹروگراد کی صورتحال پر بحث کر رہے تھے۔

شوتماں نے ہنستے ہوئے کہا: "کل پیٹروگراد کمیٹی میں لاشیویچ نے کہا تھا، 'دیکھ لینا، ستمبر میں لینن وزیراعظم ہوگا۔ . .'"

لینن نے نوٹ بک کی ورق گردانی کرتے، چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ "اور اس میں حیرانی کی بات نہیں ہوگی . . ."

شوتماں ذرا خفت سے مسکرا دیا۔ لینن نے اسے گھور کر دیکھا اور گھاس پر اپنا مگ رکھتے ہوئے کہا: ". . . ہمیں نظر نہیں آرہا ہے کہ ہم یقیناً دوسرے انقلاب کی طرف پوری رفتار سے بڑھ رہے ہیں جو کہ مزدوروں اور کسانوں کی نئی ریاست کا امین ہے؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ایک مرتبہ پھر نوٹ بک میں اتر گیا۔

یمیلیانوف نے چند خشک لکڑیاں اٹھا کر آگ میں ڈال دیں تاکہ اس سے بھڑکتی روشنی میں لینن زیادہ آسانی سے پڑھ سکے۔

نیلی نوٹ بک میں مارکس اور اینگلز سے اقتباسات پڑھتے ہوئے اسے اسی قسم کی روحانی بالیدگی محسوس ہو رہی تھی جیسے ایک مرتبہ پہلے، تین اپریل کو فن لینڈ اسٹیشن سے باہر چوک میں پیٹروگراد کی پرولتاریہ کو دیکھ کر ہوئی تھی، جنھوں نے ہاتھوں میں جھنڈے اور دانفلیں لہراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔ اب وہ چند لمحوں کے لیے بھول چکا تھا کہ وہ اس وقت کہاں بیٹھا ہے، اس کے پاس کون لوگ ہیں اور وہ روپوشی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے تصور میں خود کو بکتر بند گاڑی پر کھڑا دیکھا۔ اب کروڑوں آنکھیں اس کے لیے محبت سمیٹے، اپنی فتح کی سرشاری میں اسے دیکھ نہیں رہی تھیں، بلکہ ان کی نظروں میں سوال تھے: اب تمھارا کیا حکم ہے؟ اب تم ہمارے لیے کیا کروگے؟ کیا تم ہمیں غربت کے اندھیاروں سے نکال سکوگے؟ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں بتاؤ، اگر بتا سکتے ہو تو . . .

جب سائیلگ راین، میونخ میں جیبلشانفت میوزیم لائبریری کے کمرہ نمبر ۳۱ میں بیٹھ کر وہ مارکس اور اینگلز سے ریاست اور پرولتاری آمریت کے بارے میں اقتباسات لے رہا تھا تو اس وقت اسے ان کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ اس سلسلے میں لکھنا چاہتا تھا۔ ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اس گرد کو جھاڑنا چاہتا تھا جو پیٹی بورژوا سوشلسٹوں نے ان پر چڑھا دی تھی۔ وہ اپنا یہ مضمون ۱۹۱۶ء میں سبورنک سوتسیل ڈیموکراتا کے چوتھے شمارے میں چھاپنا چاہتا تھا لیکن رقم نہ ہونے کے باعث وہ جریدہ چھپ ہی نہ سکا لیکن ان دنوں پرسکون سوئس قصبے کی لائبریری کی تنہائی میں اس نے یہ اقتباسات اور ان پر حاشیے ان چند سو لوگوں کے لیے تحریر کیے تھے جنھیں وہ ذاتی طور پر ان کے ناموں یا عرفوں سے جانتا تھا، ان لوگوں کے لیے بھی جو روس میں

گروپوں کی صورت روپوشی میں کام کر رہے تھے یا پھر تو روخانسک اور نارائم کے علاقوں میں جلاوطن تھے یا نقل مکانی کر کے پیرس، برلن، جینوا، نیویارک، لندن اور ویانا چلے گئے تھے۔ لینن کی یہ تحریر دراصل بخارین اور اسی قبیل کے دوسرے روسی مارکسیوں کی غلط تاویلوں کے خلاف تھی اور کرانسکی کے غلط، پتی بورژوا تصورات اور چند دوسرے بڑی توندوں والے جرمن سوشل جمہوریت پسندوں کے خیالات کی بیخ کنی تھی۔ کبھی یہ تمام ارادے اسے اپریل ۱۹۱۷ء میں اسٹیشن پر گاڑی کی تشویش کی لکیر جھوٹے اور مضحکہ خیز لگا کرتے تھے، جیسے محنت کشوں کی ٹوپیوں میں اس کا غیر ملکی بولر ہیٹ تھا۔ اب یہ اقتباسات اور اس سے اخذ کردہ نتائج کروڑوں کے لیے روٹی، کپڑے، مکان کا وسیلہ بن گئے تھے۔

اسی ایک ارادے میں اس دوسری تبدیلی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ احساس کچھ اسی قسم کا تھا جو، اگر پہیے کا موجد اپنی ایجاد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہتا تو اس کے دل میں پیدا ہوتا کہ اس کی ٹُرکھڑی ایجاد نے دُنیا کا نقشہ کیسے بدل کر رکھ دیا ہے۔

ظاہر ہے، لینن نے یہ تقابل فوراً سر سے جھٹک دیا اور اپنے چہرے پر گہری سوچ طاری کر کے، آنکھوں کے کونوں سے انھیں دیکھا کہ کہیں انھوں نے اسے ۱۷ءاباں کے لمحے "میں تو نہیں دیکھ لیا، جو ایک عملی انقلابی کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ لیکن وہ آگ کے گرد بیٹھے تھے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ پھر بھی اس نے جان بوجھ کر کہا: "یہ نوٹ بک بہت کام کی ہے، بہت ہی کام کی . . ."

اسے مسجع مرصع زبان پسند نہیں تھی۔ وہ ایسی زبان سے ڈرتا تھا، اسی لیے حتی الوسع اس سے پرے رہنے کی کوشش کرتا۔

بہرحال، وہ بہت خوش تھا۔ اس نے تصور میں مارکس اور اینگلز کو اپنے بہت ہی قریبی دوستوں میں دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں بزرگ اس کے ساتھ بیٹھے بڑی شفقت سے علاقانہ باتیں کر رہے ہیں اور ان کے گہرائیوں میں ڈوبے پر دمتی جرأت کے الفاظ اس کے دل میں گرمجوشی، اُبلتی، جوان خوشیوں کی صورت دھڑک رہے ہیں۔

"اوہ . . . آپ کتنے ذہین ہیں! میں اور آپ اس دُنیا کے دغابازوں اور غلاموں کے آقاؤں کو کیسا سبق سکھائیں گے! ہم اس بیچارے سیارے کو کس مصیبت میں مبتلا کر رہے ہیں! انھیں گلابی رنگ دی دیکھوں کے گلاب ایسے گال دیں گے!"

اس نے ان دونوں بزرگوں کو ان کی عمومی تصویر کے مطابق دیکھنے کے بجائے، داڑھیوں والے دو قد آور دیوتاؤں کی صورت دیکھا، جو ڈورے کی ڈرائینگوں سے نکل کر آئے تھے۔ فہیم، زیرک، ہمہ داں، ہمہ بیں، پیٹی بورژوا بونوں پر کھل کر ہنستے ہوئے —— اور چھوٹی چھوٹی داڑھیوں والے وہ بونے جو عوام کے ہجوم کے گرد، ایک اونچی مچان پر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے، حلقہ بنائے، اوٹ بنے کھڑے تھے کہ کہیں عوام کی نظریں ان دونوں دیوتاؤں پر نہ پڑ جائیں —— لینن اگلی صبح کا انتظار نہ کر سکا۔ وہ اسی وقت اس پمفلٹ سے نمٹنے بیٹھ گیا (اس نے انکساری سے، جان بوجھ کر اپنی نئی کتاب کو پمفلٹ، کہا تھا کہ اسے بڑبولا نہ سمجھ لیا جائے)۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو اسے ایک مبہم سا لیکن کافی مانوس طبعی قسم کا احساس ہوا کہ وہ اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی سے پتی بورژوا بونوں کو ہجوم میں سے چن چن کر، ان پر نظر ڈالے بغیر ہی انھیں جھاڑیوں میں پھینکتا جا رہا ہے۔

آنے والے دنوں میں لینن اپنا "پمفلٹ" لکھنے میں مصروف رہا۔ وہ اپنے ساتھیوں پر مشکل ہی سے توجہ دیتا تھا۔ غذا سے بھی اسے کوئی رغبت نہ رہی تھی۔ یمیلیانوف اور اس کی بیوی، اس کی طرف سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ نہ کھانا پینا، نہ بات چیت اور صبح کے اخباروں کے لیے بے صبری بھی نہیں۔

جب اس نے اپنی کتاب کا ڈھانچہ تیار کر لیا تو لینن نے زینوویف کو اس کے مندرجات بتائے۔ وہ جھونپڑی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ یمیلیانوف کسی کام سے جھیل کو گیا تھا اور کولیا شاید جنگل میں کہیں، شام کے کھانے کے لیے کھمبیاں چن رہا تھا۔

"یہ بہت فائدہ مند چیز ہو گی۔ . . . " لینن نے حسبِ عادت اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتے ہوئے کہا: " . . . اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلے دور کے لیے انتہائی جامع پروگرام۔ یا شاید پہلے دو سے بعد میں کام آئے۔ اس میں پرولتاری ریاست کا کردار یا سمجھو کہ پرولتاری ریاست کے انداز کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ کیمون قسم کی ریاست۔ لیکن یہ محض تصوراتی منصوبہ نہیں ہے کیونکہ ایک صحیح سوشلسٹ سماج کی تخلیق میں جو دشواریاں پیش آ سکتی ہیں، ہم انہیں اور اپنے انسانی مواد کو بالکل صاف طور پر دیکھ رہے ہیں۔ یہ پرولتاری آمریت کی ریاست ہو گی، جس کے دو پہلو ہوں گے۔ کروڑوں عوام کے لیے جمہوریت اور جابروں، استحصالی طبقوں کی بے رحمانہ تطہیر سمیت ان لوگوں کے، جو غیر شعوری طور پر سرمایہ داری کی حمایت کرنے پر بضد ہیں یعنی لوفر، نوسرباز، غنڈے، بدمعاش اور بڑے بڑے رجعت پسند۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہ دنیا کی پہلی ریاست ہو گی جس کا مقصد اپنے آپ کو ختم کرنا ہو گا۔ یہ ریاست رفتہ رفتہ غائب ہوتی جائے گی۔ آہستہ آہستہ انسانوں کو سماج کے اصولوں پر عمل کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔ ان کی محنت سے پیداوار اتنی بڑھ جائے گی کہ لوگ اپنی صلاحیتوں کے مطابق رضاکارانہ طور پر کام کریں گے۔ یہ ایسی ریاست ہو گی جس میں بڑی بڑی تنخواہ والے افسروں کی کوئی گنجایش نہیں ہو گی۔ جس میں تمام افسران منتخب ہوں گے اور انہیں کسی وقت بھی ہٹایا جا سکے گا۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال پر لوگوں کی اکثریت کا اختیار ہو گا۔ چونکہ مسلح کارکن جذباتی دانشور نہیں ہوتے، اس لیے وہ اپنے بارے میں تخمینوں کو برداشت نہیں کر سکیں گے، اس لیے حساب کی چوری نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ سماج کے اصولوں پر عمل کرنا عادت بن جائے گی۔ یہ پمفلٹ دو قسم کے یکساں خطرناک سیاسی اندھے پن کے خلاف ہمارا جنگ کرے گا۔ عاقبت نا اندیش انتشار پسندی میں دور کی چیزوں کو نہ دیکھنے کی خامی یعنی معروضی حقیقتوں کو جانچنے کی صلاحیتوں کا فقدان یا جان بوجھ کر ان سے چشم پوشی کرنا۔ اور دوسرے بزدل ابن الوقتی میں نزدیکی چیزوں کا نظر نہ آنا، یعنی مستقبل کے مقاصد اور تناظر کو دیکھنے کی صلاحیت کا فقدان یا اس سے چشم پوشی۔ ہاں! اینگلز نے بالکل درست کہا تھا: "ریاست ایک ایسی برائی ہے جو پرولتاریہ کو اپنی فتح کے بعد وراثت میں ملتی ہے۔ . . . " فاتح پرولتاریہ اس برائی کے مکروہ نقوش کو رفتہ رفتہ کاٹ کر پھینکتی رہے گی لیکن اسے محفوظ بھی رکھے گی۔ جب نئی نسل آزاد سماجی حالات میں پروان چڑھ کر تیار ہو جائے گی تو ریاست کے عفریت کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ اس کے علاوہ میرا پمفلٹ یہ ثابت کرے گا کہ پرانے نظریے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ انقلاب کو فرانسیسی شروع کریں گے اور جرمن اس کی تکمیل کریں گے۔ یہ سارا عمل روس میں شروع ہو گا۔ یہ کسی نجومی کی پیش گوئی نہیں بلکہ تاریخی ضرورت ہے۔ میں اپنے پمفلٹ کا نام "ریاست اور انقلاب" رکھوں گا۔ . . .

زینووئیف، لہروں میں کبھی ابھرتا کبھی ڈوبتا، سر جھکائے گیلی، الجھی گھاس سے کھیل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا کہ لینن کیسے کہہ رہا ہے کہ وہ عنقریب اقتدار پر قبضہ کریں گے : "لینن کی عقل تو نہیں ماؤف ہو گئی ؟ وہ واقعی سنجیدگی سے کہتا ہے ؟ کیا اس کا، حقیقت کا ادراک کہیں کند تو نہیں ہو گیا ؟ اور پھر اس ریاست کا تصور جو انقلاب کی فتح کے بعد روس میں قائم کی جائے گی، ایسے خیالات تو نہ صرف پارٹی کے وجود بلکہ انقلاب کے لیے بھی بیحد خطرناک ثابت ہوں گے۔ اور اگر لینن کا خیال درست ہوا اور اگر مستقبل قریب میں اقتدار پر واقعی ہمارا قبضہ ہو گیا اور کیرنسکی کی حکومت نے مدافعت نہ کی تو ناکامی کی نسبت، کامیابی پارٹی کے لیے اور بھی تباہ کن ثابت ہو گی۔ ہم اقتدار حاصل کرنے کے بعد کریں گے کیا ؟ موجودہ حکومت کی مخالفت کے باعث اب تو مخالفت کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے، اور جب ہم خود حکومت میں آئیں گے تو ؟ احتجاجی جلسوں کے انتظام کے بجائے احکام جاری کرنے پڑیں گے، تنقید کے بجائے حکم۔ ان دنوں ہمارا حکم کون مانے گا ؟ بد دل فوج، جرمنوں یا اتحادیوں کے سامنے روس کے ہتھیار ڈلوا دے گی ; کھیتوں سے اناج نہیں آئے گا ؟ فیکٹریوں میں خام مال نہیں جائے گا تو کیا ہم بھوک سے نہیں مریں گے ؟ کارکنوں کو اقتصادیات، منڈیوں اور زر مبادلہ قسم کی کسی شے کے بارے میں علم نہیں۔ اور لینن کو بہر حال یہ سب پتہ ہے۔ پھر وہ کیوں ایسے خطرات مول لینا چاہتا ہے۔ پھر وہ کیوں سمجھتا ہے کہ اقتدار پر قبضہ بس ہوا ہی چاہتا ہے۔ . . ."

زینووئیف کو محسوس ہوا کہ اب لینن کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جلدی میں کوئی ایسا قدم اٹھانے سے اسے باز رکھنا ہو گا جس کے نتائج تباہ کن ہوں۔ لینن سے یہ سب کچھ بہت سکون و اطمینان سے کہنا چاہیے تاکہ اس کے سامنے اس کے اپنے خدشات کا پول نہ کھل جائے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مسکرا کے کہا : "تمھیں لاشعوری طور پر اس سے مکمل اتفاق ہے کہ تم وزیر اعظم بننے والے ہو ؟"

" وزیر اعظم ؟" لینن نے متعجب ہو کر کہا۔ پھر جب اسے یاد آیا تو وہ ہنس پڑا : "کیوں ؟ یقیناً مجھے اس کے ساتھ اتفاق ہے۔ مجھے یقین ہے . . ."

" مجھے اندیشہ ہے کہ تم مستقبل کی پرولتاری ریاست میں اتنا کھو گئے ہو کہ حقیقی روسی ریاست کے حالات تمھاری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں . . ."

" اچھا ! تم واقعی یوں سمجھتے ہو ؟" لینن کی آنکھیں گہری ہو گئیں۔

" میں کہنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن . . ."

" نہیں، نہیں۔ کہو ! میں نے محسوس کیا ہے کہ تم چپ چپ سے رہنے لگے ہو۔"

" تم اپنے پمفلٹ میں بری طرح مصروف رہتے ہو۔ تم نے تو مجھ سے کلام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تم ہوش میں اس وقت آتے ہو جب کوئی پیٹرو گراڈ سے آتا ہے۔ کہیں اس بے آباد جزیرے پر میں تمھارے اعصاب پر تو سوار نہیں ہو گیا۔ رابنسن کروسو بھی تو کبھی کبھار اس شخص فرائیڈے سے بور ہو جایا کرتا تھا . . ."

" لیکن، لیکن تم تو مجھ سے کوئی اہم بات کہنا چاہتے تھے ؟"

" میرا خیال ہے کہ تم سے اور تمھاری تقلید میں مرکزی مجلس عاملہ سے بہت سی داؤ پیچ کی غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں۔ تم صرف نعروں کے ساتھ کھیل رہے ہو . . ."

" میں نعروں کے ساتھ نہیں کھیل رہا ہوں۔ میں انقلاب کے ہر موڑ پر، تیکھے موڑوں پر بھی عوام کے ساتھ سچ بول رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم عوام کے ساتھ سچ بولنے سے ڈرتے ہو۔ تم بورژوائی طریقوں سے پرولتاری انقلاب لانا چاہتے

ہو۔ وہ لوگ نما جو اپنے حلقوں میں سچ کی شناخت کرتے ہیں اور عوام تک اس سچائی کو اس لیے نہیں پہنچاتے کہ عوام کو کم فہم یا جاہل سمجھتے ہیں، در اصل پرولتاری راہ نما نہیں ہیں۔ سچ بولو۔ اپنی شکست کو کبھی فتح کے طور پر پیش نہ کرو۔ اگر تم سمجھوتہ کرتے ہو تو عوام کو بتاؤ تم نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اگر تمھیں آسانی سے فتح حاصل ہوئی ہے تو ان سے یہ نہ کہو کہ یہ فتح حاصل کرنا بڑا مشکل تھا۔ اور اگر فتح پانے میں دقت ہوئی ہے تو شیخی مت بگھارو کہ فتح آسان تھی۔ اگر تم نے کوئی غلطی کی ہے تو مانو کہ تم نے غلطی کی ہے۔ اگر حالات راستہ بدلنے پر مجبور کرتے ہیں تو اس حقیقت کو لوگوں سے نہ چھپاؤ۔ محنت کشوں کے ساتھ صداقت سے پیش آؤ۔ اگر تم محنت کشوں کے ادراک، ان کے طبقاتی احساسات اور ان کی سادہ فہم پر یقین رکھتے ہو تو ان سے کچھ نہ چھپاؤ۔ ایک مارکسی کا اس کے برعکس ایقان اس کے لیے باعثِ ندامت اور تباہی ہے۔ اس کے علاوہ دشمن کو فریب دینا بھی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ دو رُخی پالیسی کی اجازت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ صورتِ حال ٹھوس ہو اور فوجی داؤ پیچ براہِ راست اس کے متقاضی ہوں کیونکہ ہمارے دشمنوں اور دوستوں کے درمیان کوئی لوہے کی دیوار نہیں ہے۔ وہ اب بھی ہمارے دوستوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور عوام کو بیوقوف بنانے کی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمارے ذہین اقدامات و تدابیر کو کامیابی سے اس طور عوام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جیسے ہم عوام کو دھوکا دے رہے ہیں۔ دشمن کو فریب دینے کی خاطر عوام کے ساتھ ریاکاری برتنا ایک احمقانہ اور کوتاہ بین پالیسی ہے۔ پرولتاریہ سچائی چاہتی ہے اور اس سے زیادہ تباہ کن اور کوئی بات نہیں کہ ان کے ساتھ 'شریفانہ، میٹھی بورژوانہ' جھوٹ بولا جائے۔ ۔ ۔"

زینوویف آزردگی سے ہنس دیا: "سچ کی قسمیں بھی ایک سے زیادہ ہوتی ہیں۔ ۔ ۔" اس نے کہا: "ایسا سچ نہیں بولنا چاہیے کہ لوگ سادہ لوح ہی سمجھنے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ پچھلے اپریل میں واپسی کے فوراً بعد تم نے رِیڈ پیلیس میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بڑی سادگی اور سچائی سے کہا تھا کہ واقعات کی تصویر تمھارے ذہن میں ابھی نامکمل ہے کیونکہ تم صرف ایک کارکن سے ملاقات کر سکے تھے۔ تمھارے اس بیان سے مینشوکوں نے فلک شگاف قہقہے لگائے تھے اور ہمارے ساتھی اَمتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ ۔ ۔"

"خوب! یہ میں نے جان بوجھ کر کہا تھا۔ میں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ یہی سچ تھا۔ کیونکہ اگلی مرتبہ جب میں نے ان سے یہ حقیقت بیان کی تھی کہ میں پیوتیلوف، ترد بوشنی اور دوسرے کارخانوں کے مزدوروں سے تفصیلاً ملاقات کر کے آیا ہوں تو ان کے چہروں سے صاف عیاں تھا کہ انھیں میرے بیان پر ذرا شبہ نہیں ہے۔ خدا کرے کہ وہ دن کبھی نہ آئے کہ ہم اپنی پالیسیوں پر سازشی طریقوں سے عمل کرنے لگیں۔ سنگھاسن پر بیٹھ کر خفیہ طریقے اپنائیں اور عوام سے کہیں: 'ہم تم سے زیادہ عقل مند ہیں۔ ہمیں تمام سچائیوں کا ادراک ہے۔ اور ہم تمھیں صرف آدھا، ایک چوتھائی یا آٹھواں حصہ سچ بتائیں گے۔ ۔ ۔'"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس افراتفری اور اذیت کے ان دنوں میں تم لوگوں سے صاف کہہ رہے ہو کہ مسلح بغاوت کریں۔ تمھیں فوج کی اصل ذہنیت کا پتہ ہے، پھر بھی تم اقتدار پر پرولتاری قبضے کی بات کرتے ہو۔ یہ تو بالکل۔ ۔ ۔"

"اچھا، تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو! تم ذمہ دارانہ فیصلے کرنے سے ڈرتے ہو۔"

"میں غیر ذمہ داری سے ڈرتا ہوں۔"

"تم اس منزل سے ڈرتے ہو جس کے لیے ہم دونوں نے مل کر تمام عمر جدوجہد کی ہے۔ جس کی خاطر ہم دونوں نے کبھی ہاتھ سے قلم نہیں چھوڑا۔ ہم نے پرولتاری انقلاب کے جو خواب دیکھے ہیں تم ان کی تعبیر سے خوف زدہ ہو؟"

"میں ڈرتا ہوں ان ناساعد حالات میں مسلح جھڑپوں سے۔ ایسے انقلاب سے ڈرتا ہوں جس کا مقدر شکست ہو۔ ہم سب کچھ کھو بھی سکتے ہیں۔"

"ہم سب کچھ نہیں کھو سکتے۔ کسی فرد کا، ایلیانوف، زینوویف، کروپسکایا، یا لینا کا چاہے سب کچھ چلا جائے، لیکن

پرولتاری کا کبھی سب کچھ نہیں جایا کرتا کہ پرولتاری کے پاس اپنی زنجیروں کے سوا کھونے کے لیے اور کچھ نہیں۔ انقلاب کے لیے خطرات سے پاک آئیڈیل حالات کبھی پیدا نہیں ہوا کرتے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے، اس سے مجھے تاسیتس کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو بظاہر بہت سادہ ہے لیکن گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ یہ جملہ اس نے رومی سازشی، پیسان کے بارے میں کہا تھا: 'سزا سے معافی کی خواہش نے اسے باز رکھا۔ اور یہ خواہش اہم ذمہ داریوں کو نبھانے کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنا کرتی ہے۔' مجھے تم دونوں میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے گریگوری۔ ایک خوف زدہ رومن۔ لیکن سزا سے معافی کی گارنٹی کے ساتھ اہم ذمہ داریاں سرانجام نہیں دی جا سکتیں۔"

"اگر میں درست سمجھا ہوں تو تم مجھے بزدلی کا الزام دے رہے ہو۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو کہ۔ . . "

"نہیں! یہ ذاتی بزدلی کا سوال نہیں ہے۔"

"تم دیکھو تو سہی، فوج میں کیا ہو رہا ہے؟ جاہل فوجی اپنے اجلاس میں لیننی دہشت پسند ایجنٹوں کے خلاف ووٹ دے رہے ہیں۔"

"ہاں، ہاں! وہ لیننی دہشت پسند ایجنٹوں کے خلاف ووٹ دیتے ہیں اور ساتھ ہی امن کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور زمینوں کا بھی۔ یہ وہی مطالبہ ہے جو لیننی دہشت پسند ایجنٹ بھی کر رہے ہیں۔ بڑی سیدھی سی بات ہے۔ ہم عوام کے بنیادی مفادات کی آواز ہیں۔ اور ملیوکوف اور کیرنسکی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ . . "

"بہت سی جماعتیں عوام کے بنیادی مفادات کی زبان بنی تھیں لیکن سب کو بالآخر شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ تم فلسفیانہ باتیں کر رہے ہو، سیاسی نہیں۔ . . "

لینن کی آنکھیں چمک اٹھیں، پر اس نے فوراً خود پر قابو پا کر بڑے اطمینان سے ہنستے ہوئے کہا: "مدتوں پہلے افلاطون نے کہا تھا کہ جب تک فلسفیوں کو حکومت نہیں دی جاتی یا حاکم فلسفی نہیں بنتے اور ریاستی حکومت کا فلسفے کے ساتھ اختلاط نہیں ہو جاتا تب تک برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، ریاست کے لیے نہ نسلِ انسانی کے لیے۔ . . " وہ سنجیدہ ہو گیا: ". . . جب ہم طاقت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے، جو کہ جلد ہی ہو گا، تو پھر کندھے جھٹکنا لاحاصل ہو گا گریگوری! جب طاقت ہمارے ہاتھوں میں ہو گی، تو ہمارا کسی فلسفہ اس کی بنیاد ہو گا۔ اور اگر ہم نے گفتار کے ساتھ ساتھ عملاً بھی اس فلسفے کا دامن نہ چھوڑا اور عوام کو ان کی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں سمیت اس فلسفے کے حوالے سے تعمیر کی طرف راغب کر سکے، تو ہم نئے سماج کی تخلیق میں بہت کم غلطیاں کریں گے۔ . . "

"مجھے اندیشہ ہے، تمھارا رابطہ عوام سے ٹوٹ رہا ہے۔ تم ان سے بہت آگے ہو۔ تم بہت بے صبر ہو۔ تمھارے کوٹ کو پیچھے سے پکڑ کر تمھیں روکنا پڑے گا۔ اب ہمیں تدابیر اختیار کرنے کے بعد انتظار کرنا پڑے گا۔ . . "

لینن جو اس دوران ٹہلتا رہا تھا، یکدم رک کر زینوویف کی طرف پلٹا۔

"انتظار؟ روسی مارکسیوں سے بہتر انتظار کرنا کون جانتا ہے؟ کیا ہم نے اتنا عرصہ انتظار نہیں کیا؟ اس میں کوئی شبہ ہے کہ سائنسی سوشلزم پر عبور حاصل کرنے کے بعد، اذیتوں کے ذریعے علم و عرفان حاصل کرنے اور محنت کشوں اور ان کی حتمی فتح میں ایقان حاصل کرنے کے بعد ابھی تک ہمیں انتظار کرنا نہیں آیا؟ کیا ہم نے اپنے اندر نفرتوں اور مایوسیوں کے حملے پسپا نہیں کیے؟ دہشت گردی کی جبلّی خواہش کو نہیں دبایا؟ دشمن کی غلیظ ناانصافیوں کے خلاف ہم نے اپنے فوری ردِ عمل کو نہیں روکا؟ اور کیا ہم نے اس لیے اپنی تمام خواہشوں کو نہیں دبایا تھا کہ ہم جانتے تھے، اپنی قوت کو مجتمع کرنے کے لیے اپنے ایمان کی تشہیر کے لیے اور اپنے نظریات کی ترویج کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے؟ اور انتظار کیسے کیا جاتا ہے؟ حتیٰ کہ اپریل کے تھیسیز

جنھیں ہماری پارٹی کے بہت سے ساتھیوں نے انتہائی باغی اور نراجیت کا شکار کہا تھا، کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمارا سب سے بڑا کام صورتِ حال کو واضح کرنا ہے؟ یعنی اپنی جدوجہد کی سمت متعین کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر یہ نہیں کہا تھا: 'انتظار'؟ تمھیں یاد ہوگا کہ کامینوف نے مجھ پر 'بائیں بازو' کی جانب سے کتنی کڑی تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ 'وضاحت' سیاسی کارروائی نہیں ہے۔ اس کے نزدیک سیاسی کارروائی کا مطلب سیاسی ہمبندھ کو بننا تھا۔ دوسری جماعتوں کے ساتھ سازش کرنا، دھڑوں میں داخل ہونا، دھڑوں سے نکلنا اور پارلیمنٹ میں اچھی تقریریں کرنا تھا۔ اور آخر میں جولائی کے واقعات کے دوران اور اس کے بعد بھی کیا میں نے اس بات پر زور نہیں دیا تھا؟ اور شاید میں اس وقت عوام کا انقلابی جوش سمجھ نہیں پایا تھا کہ ہمیں سرگرم لڑائی بند کر کے پُرامن مظاہرے کرنے چاہئیں؟ کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم انتظار کرنا نہیں جانتے؟ لیکن ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ مزید انتظار کرنا جرم بن جاتا ہے۔ اور یہ وقت شاید جلد آجائے۔ آئے گا ضرور۔ اور اگر ہم نے دامن بچانے کی کوشش کی تو ہم بھی پیٹی بورژوا سوشلسٹوں کی طرح ہو جائیں گے۔ باتوں کے دھنی، خوش گفتار، اور ہم پر سے محنت کشوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اگر ہم انتظار کے چکر میں پڑ گئے اور 'صبر' کو خیرباد نہ کہا، جیسے فاؤسٹ نے کیا تھا، تب ہم بزدل ہوں گے۔ بیکار روگ۔ اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی . . .''

زینوویئف چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ اس المناک جوش و خروش سے بالکل بکھر سا گیا تھا کہ لینن کے ہونٹوں سے یہ سب کچھ ابھی سنا گیا تھا۔ پھر اس نے ہارتے ہوئے کہا: ''تمھیں پتہ ہے، اس وقت اقتدار پر قبضہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اس لمحے؟ آج کے روس میں؟''

''مجھے پتہ ہے؟'' لینن نے یکدم پُرسکون ہو کر زینوویئف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''مجھے اچھی طرح پتہ ہے سب معلوم ہے۔ میں دن رات اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا ہوں حتیٰ کہ میرا سر پھٹنے لگتا تھا۔ 'آج کا روس' تم کہتے ہو؟ مستقبل کے روس کو جنم دینے کے لیے ہمیں آج کے روس میں انقلاب لانا پڑے گا، اور کوئی راستہ نہیں۔ ہاں، جاہلیت ہے۔ ہاں پسماندگی ہے۔ ہاں، وحشی پن ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ انقلاب کے بعد ہم روسی زندگی کے یہ افسوسناک نقوش دوگنی، دس گنی، سو گنی رفتار سے مٹا سکیں گے۔ ہاں، ہمارے محنت کش تہذیبی اور تعلیمی لحاظ سے مغرب کے مقابلے میں پسماندہ ہیں اور اس کی وجہ سے اگرچہ ہماری مشکلات میں اضافہ ہو گیا ہے تاہم اس کا بھی ایک مثبت کردار رہتا ہے۔ روسی محنت کشوں میں ابھی تک روزمرہ کے بہترین طور پر منظم اور روح کو گھن لگانے والے پراپیگنڈے کا زہر سرایت نہیں کیا جو مغرب میں ہوتا رہتا ہے۔ وہ پراپیگنڈہ جو ذاتی املاک کی تعریف، منافع خوری اور پیٹی بورژوا آسانیوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہے۔ ہمارے محنت کشوں کے دل میں ان طبقوں کے خلاف نفرتیں کھول رہی ہیں جو ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ اور یہی نفرت ہی 'ادراکِ کل' کا آغاز ہے اور کسی بھی انقلابی کارروائی کی بنیاد!'' لینن نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد خشک لہجے میں کہا: ''اتفاق سے ہماری ایک پارٹی ہے، اس کی ایک مرکزی مجلسِ عاملہ بھی ہے اور وقت آنے پر وہ ہی فیصلہ کریں گے . . .''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟!'' زینوویئف نے بصد مشکل کہا: ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مرکزی مجلسِ عاملہ پر آپ کی رائے کا اثر براہِ راست ہوتا ہے۔''

''مجھے فخر ہے کہ مجھ میں اپنے ساتھیوں کو قائل کرنے کی صلاحیت ہے۔ راہنما وہ ہوتا ہے، جو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی کے ماحول میں اپنے ساتھیوں کو دلائل سے قائل کرے لیکن فیصلوں کے بعد اظہار کی یہ آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ تمھیں یاد ہے، صدیاں پہلے ایک رومن کمانڈر نے اپنے بیٹے کو خود سزائے موت دی تھی کیونکہ اس نے میدانِ جنگ میں حکم کی تعمیل کرنے سے

انکار کر دیا تھا۔ رومن جمہوریت پسند جانتے تھے نظم و ضبط کیا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک لاطینی بستی سلطنتِ روم بن گئی۔"

زینووئیف کچھ دیر تک مارکس، لینن اور پرودھوں کے حوالوں سے گفتگو کرتا رہا۔ لینن گفتگو میں دلچسپی کھو چکا تھا اس لیے چپ بیٹھا رہا۔

بارش میں بھیگی سُرمئی شام اُتر آئی تھی۔ بارش رُک رُک کے ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا جھیل کی اور سے چل رہی تھی۔ خاموشی سے دم گھٹنے لگا تھا۔ زینووئیف کے لیے بارش کے قطروں کی آواز دھند سے بنی گھڑی کی آواز کے مترادف تھی جو ٹک ٹک کرتی اس تکلیف دہ چپ کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ وہ زمین میں نظریں گاڑے لینن کی آواز کا منتظر تھا۔ لینن چلتا ہوا سبزہ زار کی دوسری طرف چلا گیا۔ پھر پلٹ کر جھونپڑی کے پاس آیا اور لمحہ بھر رکنے کے بعد جنگل کی جانب چل پڑا۔ زینووئیف کو محسوس ہوا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لینن جنگل کے کنارے اپنے مخصوص انداز میں کھڑا تھا۔ دونوں پیر ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر گڑے ہوئے جیسے زمین سے اُگ رہے ہوں۔ سر ایک طرف کو جھکا ہوا اور ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ کی بغلوں میں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے غور سے سُن رہا ہے، شاید پتوں کی سرسراہٹ، بارش کے نغمے۔ پھر وہ اس انداز میں واپس آیا جیسے ابھی زینووئیف کے سر پر ان گنت دلائل کا بوجھ لاد دے گا۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا اور اسی طرح ٹہلتا ہوا جنگل کو لوٹ گیا۔ شروع میں اس کی چہل قدمی کی رفتار آہستہ تھی جو رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جھونپڑی سے جنگل تک اور جنگل سے جھونپڑی تک۔ زینووئیف کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر جھونپڑی میں چلا گیا۔

لینن ٹہل رہا تھا۔ کولیا ہاتھ میں کھمبیوں سے بھری ٹوکری اٹھائے نمودار ہوا۔ زینووئیف نے دور سے لینن کو لڑکے کے ساتھ شگفتہ مزاجی سے باتیں کرتے سُنا۔ وہ دونوں کھمبیاں چھانٹ رہے تھے۔ لینن کولیا کے انتخاب میں بڑی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا: "واہ۔۔۔! بہت خوبصورت ہیں۔ آج رات کی بارش کے بعد اور بھی زیادہ تعداد میں کھمبیاں پھوٹیں گی۔"

کولیا نے بڑی اُداس سی آواز میں کہا: "کل تو میں شہر جا رہا ہوں۔۔۔"

"واقعی! مجھے تم پر رشک آتا ہے۔"

"میں وہاں کتابیں، کاپیاں خریدوں گا۔"

"واپسی کب ہوگی؟"

"تین دن تک۔ وہاں میری خالہ مارفا مجھے ایک سوٹ بھی سی کر دیں گی۔"

"واہ۔ اب میرا رشک دُگنا ہو گیا ہے۔ اوہ، یہ دیکھو۔ یہ کتنا خوبصورت ہے۔ کم از کم آدھا پاؤنڈ کا تو ہوگا۔ اور یہ کون سی قسم ہے کھمبیوں کی؟"

بارش موسلادھار ہونے لگی تو لینن اور کولیا بھاگ کر جھونپڑی میں آ گئے۔ وہ بستروں میں لیٹ کر بھی کھمبیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ زینووئیف نے سوچا کہ لینن کولیا سے یہ گفتگو محض اسے چڑانے کے لیے کر رہا ہے۔ پر یہ گفتگو زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی کہ کولیا سو گیا تھا اور لینن بھی اونگھ رہا تھا۔

لینن سویا نہیں تھا۔ وہ بےحد مضطرب تھا۔ اسے زینوویف کی باتیں سن کر بہت صدمہ ہوا تھا۔ لینن کے لیے زینوویف پارٹی کا وہ ساتھی تھا جو مکمل طور پر ہر بڑے سیاسی مسئلے پر لینن کی رائے سے ہمیشہ اتفاق کیا کرتا تھا۔ زینوویف خاصا تعلیم یافتہ تھا۔ بہت ہی محنتی، بہترین یادداشت اور مارکسی ادب پر گہرا عبور رکھتا تھا۔ اسے ہر موقع کے لیے مارکس کا کوئی نہ کوئی قول یاد تھا: "ادبی کام کے لیے تو یہ بہت کارآمد چیز ہے۔۔۔"، لینن نے سوچا: "۔۔۔ لیکن سیاسی جدوجہد میں، جہاں فوری اور خود مختاری سے فیصلے کرنا ہوتے ہیں، اس سے زیادہ پُرفریب بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اقوال کا حافظ بدلتی صورتِ حال کے حوالے سے ان اقوال کو لچک کے ساتھ نئے حالات کے مطابق ڈھال نہ سکے۔ مثلاً جارحانہ حملے کے درمیان، ایسا قول تلاش کیا جا سکتا ہے جو منظم پسپائی کے لیے قائل کرے اور پسپائی کے دوران ایسا قول جو بڑھ کر حملہ کرنے کے لیے اکسائے۔ اوہ۔ اقوالِ زریں! تم کتنا ملاذ ہن کے ہتھیار کے طور پر کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہو!"

زینوویف کے ساتھ گفتگو کو یاد کرتے ہوئے لینن کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کیونکہ اس نے اپنے ساتھی کے ذہن میں ابھرتے شبہات اور ہچکچاہٹوں کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ اس نے اس پر اثرانداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اسے اپنے دوست پر مکمل اعتماد تھا۔ اسے زینوویف پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ اتنا عرصہ چپ کیوں رہا۔ اس نے صورتِ حال کا تجزیہ گہرائی میں اتر کے کیوں نہیں کیا تھا۔ اس کا رویہ تمنافیر مخلص سا کیوں تھا۔

انھوں نے گزشتہ بیس سال میں کتنے نقصان اٹھائے تھے۔ اس کے پرانے ساتھی، ذہین پلیخانوف، قدرتی صلاحیتوں کا مجسمہ مارتوف، محنتی ایکسلرود اور رحمدل نیک فطرت ویرازاسولچ ——— اب یہ سب کے سب دشمن تھے۔ کٹھور، سنگدل، بےرحم دشمن۔ اپنے اطمینان کے لیے یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ وہ آدھے تیتر، آدھے بٹیر تھے۔ پیٹی بورژوا کے نظریات ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن اس سے تشفی نہ ہوتی تھی۔ دوستیاں، رفاقتیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان لوگوں کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ خود اپنے وجود سے گوشت کاٹ رہا ہو۔ اس وقت اسے کتنی دلی مسرت محسوس ہوئی تھی جب پیٹی بورژوا فلسفے کی گڑبڑ نظریاتی اساس کے باوجود ان کے ساتھ پلیخانوف اور مارتوف کے ساتھ صلح کے امکانات نظر آنے لگے تھے۔ اب انقلاب نے انھیں ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا۔

سوئے ہوئے زینوویف کے بھاری سانسوں کو سنتے ہوئے، لینن کے ذہن میں تلخیوں کا سیلاب پھر امڈ آیا: "وہ کیا کہا کرتے ہیں، اس سے پیشتر کہ مرغ تین مرتبہ اذان دے۔۔۔"

لینن کو دل میں اترتے خنجر ایسا درد محسوس ہوا۔ وہ دماغ کو بارش سے دھونے کے لیے جھونپڑی سے باہر آ گیا۔

بارش اب گرج چمک کے ساتھ ہونے لگی تھی۔ بجلی بڑی بیدردی کے ساتھ کڑک رہی تھی۔ روشنی کی لہر آسمان کے گنبد کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ چمٹ جاتی لینن کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان بجلیوں کے آتش فشاں لہو کو چکھتے ہوئے پروان چڑھے ہیں۔ بھڑکنے کے بعد گر گئے، مکمل طور پر سیر ہو کر کھو گئے، آنکھوں سے اوجھل کڑکتے فرار کے چند سیکنڈ بعد پھر کسی اور جگہ بھڑک کر لہو چکھنے کو لوٹ آئے ——— لرزتے درخت اور کانپتی جھاڑیاں لمحہ بھر کو روشن ہونے کے بعد پھر تاریکی میں ڈوب جاتیں تیز بارش کے قطرے سکے کی چھرّوں کی طرح زمین پر برس رہے تھے۔ ان چھرّوں کے زمین کے ساتھ ٹکرانے پر اڑتے چھینٹوں کے کروڑوں ننھے منے قطرے بجلی کی ہر لشک میں زمین سے اٹھتے دھوئیں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

لینن گھاس کے ڈھیر کے ساتھ دبکا کھڑا تھا، بارش کی سرد بوچھاڑ سے بیگانہ۔ وہ اب بھی ان نقصانات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پارٹی نے برداشت کیے تھے۔ اسے نکولائی ییگرافووچ فیدوسیف یاد آیا جو انتہائی صلاحیتوں والا ایک نوجوان تھا، جسے لینن نے اپنی

جوانی کے زمانے میں اپنا گرو تسلیم کیا تھا اور اسے روسی انقلاب کی امید کہا تھا۔ شدید یاس و نا اُمیدی کے ایک لمحے میں فیدوسئیف نے خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا تھا۔ اس وقت وہ ورخولینسک میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اس کی عمر ستائیس برس تھی۔ پھر لینن کو پیٹرزبرگ کا مستری، آئیوان بابشکن یاد آیا جو بجید ذہین انسان تھا۔ ایک جاں نثار انقلابی جسے ۱۹۰۵ء میں گولی مار دی گئی تھی۔ آئیوسف ددبروفسکی جو غیر معمولی فراست کا نیک دل شخص تھا اور جس نے اپنے آخری جلاوطنی کے علاقے تورخانسک میں خودکشی کر لی تھی۔ نکولائی بوماں ایک سچا انقلابی راہ نما جو "صد سیاہ" جماعت کے ہاتھوں مارا گیا۔ واسیلی شانستر پولیس کی، پاگلوں کے لیے حوالات میں مرگیا۔ اور سورین سپاندریاں جس نے کراسنویارسک کی جیل کے ہسپتال میں اپنی مسلسل دیانت دار زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ یکاترینوسلاف کا کارکن جو ترکِ وطن کے دوران تپ دق سے مرگیا تھا۔ اور بالشویک ساتھی یاکوتوف جسے اوفا جیل میں گولی مار دی گئی تھی ——— اور بہت سے لوگ۔

لینن، انھیں یاد کر کے بہت دُکھی ہوا کہ یہ تمام ساتھی فیصلے کی اہم گھڑی میں اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اس اُداسی میں اس نے سوچا کہ وہ لوگ ان لوگوں سے زیادہ ذہین اور بہادر ثابت ہوتے جو اس وقت موجود ہیں۔ پرانے ساتھیوں کی یاد نے اسے جذباتی رو میں بہا دیا اور اس کے سامنے اپنے موجود ساتھیوں کی خامیاں اُبھر آئیں۔ ایک میں طاقت کی ہوس، دوسرے کا غصہ، تیسرے کی کمزور قوتِ فیصلہ، چوتھے کا ذہنی ہلکا پن۔ اور اس نے سوچا کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد ان کی یہ خصوصیتیں کہیں خطرناک شکل نہ اختیار کر لیں۔ سب سے مشکل اور ہولناک کام دشمنوں کے ساتھ بے رحمی سے نپٹنا نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کا محاسبہ کرنا ہے جو نظریاتی طور پر آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اپنے کج رو ساتھیوں کو دلائل سے قائل کر کے راہِ راست پر دوبارہ لانے سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔ نہیں، نہیں۔ طاقت لوگوں کو بے راہ رو نہیں کر سکتی بشرطیکہ طاقت چھیننے والے یہ یاد رکھیں کہ انھوں نے کس مقصد کے لیے طاقت چھینی تھی۔ اگر وہ یہ یاد رکھیں کہ تحریک، جدوجہد بذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک اس کے سامنے خوبصورت مقاصد نہ ہوں۔ نہیں، نہیں۔ بالشویکیوں کی صورت ایسے لوگ آئے تھے جو کہ حرزن کے قول کے مطابق 'لوگوں کا نیا قبیلہ' ہے، جو جاں نثاری کے عظیم جذبے سے سرشار، اپنی شخصیتوں کو محنت کش طبقے کی مرضی اور امیدوں میں مدغم کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے . . .

اس لمحے لینن نے بجلی کے لشکارے میں کولیا کو جھونپڑی کے دروازے میں دیکھا۔ وہ نیم خوابیدہ، اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھ کیوں کھل گئی ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ یہ سب کچھ خواب سمجھ رہا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ جاگ رہا ہے تو وہ بہت مضحکہ خیز طور پر خوف زدہ نظر آنے لگا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور وہ آنکھوں کو مسلسل جھپک رہا تھا اسے خوف سے برآمد ہونے اور رات کے حسن کو پہچاننے میں کافی وقت لگا۔ لینن اس لڑکے کو دیکھ کر کافی حد تک پرسکون ہو گیا۔ اس سکون کے لیے وہ کولیا کی خوف زدہ، مضحکہ خیز صورت کا شکر گزار تھا۔ کولیا کی موجودگی اسے ایک بار پھر پیاری دھرتی پر واپس لے آئی۔

بارش ماند پڑ گئی۔ لینن نے آنکھیں موند لیں اور چند منٹ کے لیے بالکل ساکت کھڑا رہا۔ اس نے گہری آہ بھر کے اپنے چہرے سے بارش کے قطرے پونچھے، جیسے یوں کرنے سے وہ اپنی اُداسی بھی چہرے سے پونچھ رہا ہو۔ اس نے خوشی سے مسکرا کے سرگوشی کی: "کولیا . . ."

لڑکا گھبرا گیا: ". . . کون؟"

"تو ریف . . ."

"کون ہے؟"

"پولیس والا کتا... تریف..."

کوریا ہنس دیا اور باہر بارش میں سر نکال کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے لگا۔ پھر وہ جھونپڑی سے باہر آگیا۔

"نہیں نہیں۔ ارے بھیگ جاؤ گے..."

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ کوریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ لینن کو اس طوفان میں باہر کھڑے رہنے کی کیا سوجھی ہے۔ ایک عجیب سا مبہم خیال اس کے ذہن میں آیا کہ انقلاب کے عظیم راہ نما کے لیے اچھلتی بجلیوں میں تنہا کھڑے ہونا غیر مناسب نہیں لگتا۔ ایک عام انسان ان لپکتی بجلیوں اور کڑکتے طوفان میں اتنی بے پروائی سے نہیں کھڑا ہو سکتا پر لینن جیسے جان بوجھ کر کوریا کے تصور کو دھچکا پہنچانے پر تل گیا تھا۔

"بھئی، میرے تو سردی میں دانت بجنے لگے ہیں۔ آؤ جھونپڑی میں چلیں اور جا کر اپنے کمبلوں میں دبک جائیں..."

زینوویف بارش کے شور اور بادل کی گرج میں کوریا کے ساتھ لینن کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لینن کسی طرح ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لیا کرتا ہے جو اس سے اہم سیاسی امور پر متفق نہیں ہوتے۔ اسے اپنی تنہائی کے احساس سے متلی ہونے لگی۔

لینن اس کے قریب لیٹا بارش اور گیلی گھاس کی خوشبو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ زینوویف اس سے بات کرنا چاہتا تھا! اسے یقین تھا کہ اس کی سوچ درست ہے اور وہ محض اس لیے مایوس ہے کہ وہ لینن کو قائل نہیں کر سکتا۔ لینن کے مطمئن سانسوں سے اس کے دل میں رقابت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا: "کسی روز اسے احساس ہوگا کہ میں درست کہتا تھا۔" زینوویف نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنے آپ سے کہا: "لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

زینوویف جلد ہی گہری نیند میں اتر گیا۔ صبح کافی دیر سے جاگا تو اس کی آنکھوں میں گزشتہ شام چمک گئی۔ وہ بے حس و حرکت، پتھر بنا، آنکھیں بند کیے لیٹا رہا جیسے اس میں اپنی یتیم دنیا کو دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔ بہت دیر بعد اس نے آنکھیں نیم وا کیں۔ لینن دروازے کی طرف منہ کیے بیٹھا لکھ رہا تھا۔ جھونپڑی کے دروازے سے باہر کا حصہ تکون کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ اب ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بارش کبھی نہیں رکے گی۔ جھونپڑی میں بارش اور پودینے کی خوشبو رچی تھی۔

کوریا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت وہ پیٹرو گراڈ جانے کے لیے جھیل پار کر چکا تھا۔

لینن نے حسبِ معمول اپنا کام روکے بنا پوچھا: "جاگ گئے...؟ ہم طوفانِ نوح میں گھرے ہوئے ہیں..."

اس نے بس اتنا کہا اور بڑی تندہی سے لکھتا رہا۔ زینوویف کے لیے کاغذ پر قلم چلنے کی آواز بہت پُر اثر تھی۔ اس کے سوا جھونپڑی میں اور کوئی آواز نہیں تھی۔

جب یمیلیانوف آیا تو لینن فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ یمیلیانوف بہت پُرسکون اور خوش خوش نظر آتا تھا۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلے تھے۔ اس نے تالاب بنے سبزہ زار میں گھاس کے ڈھیر اور گہرے، سرکش

آسمان کو مالکانہ انداز میں دیکھا۔ اسے لینن کے بارے میں تشویش تھی کہ وہ کہیں اس یکدم سرد اور بے ہودہ موسم میں بے آرام نہ ہوا ہو۔

"چھت تو نہیں ٹپکنے لگی تھی ؟" یہ اس کا پہلا سوال تھا۔

اور کچھ کہے بغیر اس نے کلہاڑی اٹھائی اور زائد لکڑیاں کاٹ کر چھت پر ڈالنے لگا۔ یمیلیانوف کو اطمینان سے کام کرتا دیکھ کر لینن کو بڑی مسرت ہوئی۔ اسے ذرا تاسف سے کہا: "ہمیں اپنا گھر بدلنا پڑے گا۔ خراب موسم سے لوگوں کو تو نہیں، کاغذوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ دیکھ میری ساری نوٹ بکیں نم آلود ہو گئی ہیں۔ . . ."

یمیلیانوف ہاتھ میں کلہاڑی لیے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"جی . . . !" اس نے کہا: "یہ درست ہے!"

اس شام سر لوزا، شوتماں کو لے کر آ گیا۔ سردی سے کانپتے اور اپنی کمانی کے بغیر عینک کو بار بار صاف کرتے ہوئے شوتماں نے کہا: "بس بہت ہو گئی۔ اب آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔"

ایک ہفتہ پہلے یمیلیانوف نے فیکٹری سے، جہاں وہ ملازم تھا، چند شناختی کارڈ حاصل کیے تھے۔ لینن نے اپنے لیے ایک شناختی کارڈ منتخب کیا جو کونستانتین کے نام پر بنا تھا۔ اس پر پہلی تصویر کی جگہ لینن کی تصویر چسپاں کرنے کی ضرورت تھی اور اس کی تصویر پر باقی کی نصف مہر لگائی جانی تھی۔ یہ شوتماں کی ذمہ داری تھی۔

"آپ کو فن لینڈ بھیجنے کا ارادہ ہے" اس نے کہا: "کامریڈ زینوویف آپ کے ساتھ لیننائے جائیں گے۔ لیننائے میں بھی ایک خفیہ فلیٹ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔"

زینوویف جھونپڑی سے نکل آیا۔

"میں لیننائے جاؤں گا۔ پیٹروگراڈ کے قریب رہ کر شاید زیادہ کام آسکوں۔ اور پھر صوبائی حکومت کو مجھ سے زیادہ ولادیمیر ایلیچ میں دلچسپی ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔" اس نے لینن کی رائے سننے کی امید میں اس کی طرف دیکھا پر لینن اپنے ساتھیوں کے لیے ہدایات کی فہرست بنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے پاس نہیں بلکہ فن لینڈ میں کسی خفیہ جگہ پہنچ چکا ہے۔

زینوویف نے پھر کہا: "مجھے آج ہی چلا جانا چاہیے۔ کیوں الیگزانڈر وزیلیوچ ؟" اس نے شوتماں سے کہا، پر اس کی نظریں لینن پر تھیں۔

لینن نے کوئی جواب نہ دیا اور لکھتا رہا۔

ڈبل روٹی۔

گوند، چھوٹی ٹیوب۔

سوئی اور سیاہ دھاگا۔

لفافے۔

مجلہ، ایس۔ ڈی۔ شمارہ ۷، ۴۔

نیلی لال پنسل۔

چاقو۔

پین۔

میرا مضمون سیاسی صورتِ حال پر" (کانگرس کے لیے)۔
سوشلزم اور فنستانی لغات
انھوں نے زینووئیف کا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لینن بہت خوشگواری سے مذاق کر رہا تھا۔
"ہمارے تمام کپڑے آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں؟" اس نے کہا: "مجھے نہیں پتا تمہارے کون سے ہیں اور میرے کون سے نادیژدا کونستانتی نووِنا ایک مصیبت ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔"
"اور تم نادیژدا کونستانتینووا سے۔"
"جی نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، وہ اس دُنیا کی باشندہ نہیں ہے۔ بہرحال تمہارا لباس مجھ سے بہتر ہے نہیں؟ دوسروں کی چیزیں ہمیشہ بہتر نظر آتی ہیں۔"
زینووئیف کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ لینن سنجیدہ گفتگو کرنے سے گریز کر رہا ہے۔
یمیلیانوف اور سرپوز ا سامان اٹھا کر کشتی کی طرف چلے گئے۔ شام کے وقت زینووئیف اور سرپوزا روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ لینن نے زینووئیف کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: "اپنا خیال رکھنا گریگوری۔ . . کون جانے پھر ہم کب ملیں۔ شاید جلد ہی اور ایک دوسرے سے متفق . . ."
زینووئیف نے لرزتی آواز میں کہا: "کیوں نہیں۔ یقیناً۔"
لینن نے آنکھیں اٹھا کر مسکراتی نظروں سے دیکھا۔ زینووئیف نے اپنے صلح کن لہجے پر تاسف کرتے ہوئے سوچا: کیا میں نے پھر سر تسلیم خم کر دیا ہے؟ اس انتہاپسندی کے سامنے جو پارٹی کے لیے انتہائی تباہ کن ہے؟ میں ایک بار پھر لینن کی قوتِ ارادی اور دلکشی کے سامنے جھک گیا ہوں۔ نہیں۔ مجھے اس کا حق نہیں پہنچتا، اس نے خشک انداز میں پھر کہا: "ہمیں دوبارہ ملنے کی امید رکھنی چاہیے . . ."
لینن نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر بادل چھا گئے۔ تاہم وہ مسافروں کے ساتھ جھیل کے کنارے تک گیا۔ اور جب کشتی روانہ ہو گئی تو اسے دور تک، فاصلوں میں بڑھتا دیکھتا رہا۔ موسم بہت خراب تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور کشتی جھاگ اڑاتی تند لہروں پر اچھلتی، چھپتی، نکلتی چلی جا رہی تھی۔ پھر جلد ہی سُرمئی غبار میں تحلیل ہو گئی۔
"ہوں۔ ہوں۔" لینن نے یمیلیانوف کی طرف مڑتے ہوئے کہا جو کنارے پر اس کے قریب کھڑا تھا: "کشتیاں چلی جاتی ہیں اور زندگی اپنی راہ پر گامزن رہتی ہے۔" پھر اس نے کہا: "چلیں؟ چل کر آگ روشن کریں؟"
"آئیے، چلیں۔" یمیلیانوف نے نیک فطرتی سے کہا۔ اس نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نے اس کیمپ کی زندگی کے بارے میں سچے احساسات جو باتوں باتوں میں لینن سرسری طور پر کہہ گیا تھا، اس نے سن لیے ہیں۔ یمیلیانوف ایک کم آمیز شخص تھا جو اپنے خیالات اور احساسات کو بہت کم زبان پر لاتا تھا لیکن وہ سمجھتا سب کچھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چند دن سے لینن اور زینووئیف کے آپس کے تعلقات بڑی پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ زینووئیف کی طرف سے لینن کی مایوسی اور ناراضگی میں لینن کا خاموش ساتھی تھا۔
اگلی شام دمیتری اُلیچ لیشینکو کو کیمپ لے آگیا۔ وہ ایک دیرینہ پارٹی کامریڈ تھا جو کبھی زویزدا اور پراودا میں کام کرتا تھا۔ آج کل وہ واسبرگ کی ضلعی کونسل میں کام کرتا تھا اور ثقافتی تعلیمی کمیشن میں کروپسکایا کے ساتھ وابستہ تھا۔
اس رات وہ صبح تک باتیں کرتے رہے۔ پیٹروگراڈ میں صورتِ حال کے بارے میں کروپسکایا اور لوناچارسکی کے

بارے میں۔ لونا چارسکی لیشچنکو ہی کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا جہاں وہ روپوش تھا۔
سورج نکلنے کے بعد لینن مختصر سی نیند سے بیدار ہوا اور اس نے بڑی بے صبری سے لیشچنکو کو جگایا: "اٹھو... اب اٹھ بھی جاؤ... میری تصویر اتارو۔
اس نے ابھی سے سر پر مصنوعی بالوں کی وگ اور اس کے اوپر ٹوپی پہن لی تھی۔ لیشچنکو نے دھندلے آسمان کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا کہ روشنی مناسب نہیں۔ اس کے باوجود وہ تصویریں اتارنے لگا۔ کیمرے کے لیے ٹیک نہ ہونے کے باعث، کیمرے کو ہاتھوں میں تھام کر لینن کا سر اور کندھے بیک وقت احاطۂ تصویر میں لانا اسے ناممکن لگتا تھا۔
"بیٹھ جاؤں؟" لینن نے پوچھا۔
"بالکل۔ بہت اچھا خیال ہے۔"
لینن فوراً ہی زمین پر بیٹھ گیا اور بڑے صبر سے تصویر اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ لیشچنکو کو جھیل تک وداع کرنے گیا اور اس نے کچھ مضمحل ہو کر کہا: "براہ مہربانی کونستانتینووا سے یہاں کے بارے میں ذکر نہ کرنا... یہ گھاس کے ڈھیر، یہ نمی وغیرہ... اس سے کہنا، میں یہاں بڑے آرام میں ہوں۔ موسم خشک ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اسے تسلی دینا۔ اچھا؟ بھولنا نہیں..."
دو دن بعد شناختی کارڈ تیار ہو گیا۔ لینن نے اسے غور سے دیکھا اور اپنا اطمینان کر لیا کہ شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔
آخر روانگی کا دن آپہونچا۔ لینن اور یمیلیانوف، شوتماں کے منتظر تھے جسے کسی وجہ سے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ یکایک ان کے کانوں میں سیٹی کی آواز آئی۔ اب کولیا کی جگہ سریوژا نے لے لی تھی۔ لینن نے فیصلہ کیا کہ شوتماں ہی آرہا ہے، اس سے راستے ہی میں مل لیا جائے۔ لیکن شوتماں کے بجائے ایک لڑکا جنگل سے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے محنت کشوں کے لباس میں ایک اجنبی تھا۔ لینن رک گیا اور پلٹ کر آہستہ آہستہ جھونپڑی کو چل دیا۔ یمیلیانوف پیلا پڑ گیا۔ پھر اپنے بیٹے دیتا کے ساتھ راسولوف کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔
"صبح بخیر، نکولائی الیکساندرووچ" اس نے ایک نظر گھاس کے ڈھیر پہ ڈالی، پھر لینن کو دیکھتے ہوئے کہا جو جھونپڑی کے قریب بیٹھا تھا: "گھاس کا ڈھیر بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے تم نے کٹائی ختم کر لی ہے..."
"تھوڑی بہت کر ہی لی ہے" یمیلیانوف نے مبہم انداز میں کہا۔
"تمھارا افنستانی دوست میرے لیے کام کرے گا؟ ایک ڈیڑھ دن کے لیے؟ میں تنہا کام نہیں کر سکتا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور ویتیا میں ابھی اتنی طاقت نہیں..."
یمیلیانوف مسکرا دیا۔
"میرا دوست نہیں مانے گا" اس نے جواب دیا۔
"شاید مان جائے؟"
"نہیں مانے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں"
"ہماری زبان سمجھتا ہے؟"
یمیلیانوف نے دزدیدہ نگاہوں سے لینن کو دیکھا لینن کے چہرے پر خفگی تھی۔ اس کی آنکھیں سلوٹوں میں

دو سپاٹ لکیریں بن گئی تھیں۔

"نہیں۔" یمیلیانوف نے کہا، "وہ صرف اپنی زبان جانتا ہے۔ مجھے تھوڑی سی فنی زبان آتی ہے۔ سو، ہم گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔" وہ خود پر قابو پاکر بڑی روانی سے بول رہا تھا: "وہ نہیں جائے گا، سو اس سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے خود اس سے پوچھا تھا کہ دوسروں کے لیے کام کرے گا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اسے گھر جانے کی جلدی ہے۔ اس کے گھر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

راسولوف نے آہ بھری، بڑبڑایا اور وتییا کے ساتھ چلا گیا۔

جب تک ان کے قدموں کی چاپ جنگل میں بالکل معدوم نہ ہو گئی، تب تک لینن وہیں بیٹھا رہا۔ پھر وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور چمکتی آنکھوں سے ہنسنے لگا: "مجھے کرائے پر اس کے حوالے نہ کرنے کا شکریہ، نکولائی الیگساندرووچ۔"

"اس میں لفع کی بات بھی کوئی نہیں تھی۔" یمیلیانوف نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ دیر تک اس واقعے پر ہنستے رہے۔ شوتماں آیا تو وہ سنجیدہ ہو گئے۔ شوتماں کے اعصاب اتنی بڑی ذمہ داری کی وجہ سے تن سے گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے خطرناک سفر سے پہلے لینن کو ہنسی کیسے سوجھ رہی ہے۔

شوتماں تنہا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹے قد کا گٹھا ہوا فنی نوجوان بھی تھا۔ لینن نے اپنے آپ کو آئیوانوف کے نام سے متعارف کرایا۔

"میرا نام راٹزا ہے۔" فنی نے پلک جھپکے بغیر کہا۔

یمیلیانوف اور سریوزا نے لینن کا سامان اٹھایا اور جھیل کو چل دیے۔ سریوزا کشتی میں سامان رکھ کر جھیل کے پار روانہ ہو گیا۔ اور یمیلیانوف واپس آ گیا۔

"اچھا! جیسے کہا کرتے ہیں کہ، خدا حافظ۔" یمیلیانوف کی آواز میں اداسی تھی: "اب چلنا چاہیے۔ . ."

وہ آگے آگے چل پڑا۔ اس کے پیچھے راٹزا اور راٹزا کے پیچھے پیچھے شوتماں اور لینن۔

کولیا ابھی ابھی پیٹروگراڈ سے لوٹا تھا۔ بچوں کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ماں شاید کسی کام سے باہر گئی تھی۔ کولیا نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پیٹروگراڈ سے خریدی ہوئی کتابیں کاپیاں اٹھائیں اور کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ وہ اور سریوزا ایک دوسرے کے بغیر اداس بھی ہو جایا کرتے تھے۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ کشتی سے کود کر کنارے پر آیا اور تیزی سے دھڑکتے دل سے جھونپڑی کی جانب بھاگنے لگا۔ اسے مانوس سبزہ زار ویران، خاموش اور اجنبی سا محسوس ہوا۔ چاروں اور سکوت چھایا تھا۔ دھات کے ڈنڈے جن سے کیتلی کو آگ پر لٹکایا جاتا تھا، بجھی ہوئی آگ کی راکھ میں پڑے تھے۔ جھونپڑی میں کچھ نہیں تھا۔ بستر، کمبل، تکیے، کچھ بھی نہیں۔ گھاس میں بیٹھنے کی وجہ سے پڑے نشیب سرد تھے۔ لمحہ بھر کے لیے کولیا خوف سے ٹھنڈا پڑ گیا، کہ لینن کی پناہ گاہ کا دشمن کو پتہ چل گیا ہے۔ اور اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن پھر مخصوص جگہ پر گھاس کے نیچے چھپے اخبار اور جھونپڑی کی مجموعی حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ لینن وہاں سے چلا گیا ہے۔

گرد و پیش کی ہر چیز یوں متروک نظر آ رہی تھی جیسے بیتے ہوئے دن خواب سے۔ مختصر لیکن سہانے خواب جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ کوئی لینن وہاں نہیں آیا تھا، آگ کے پاس پر مسرت راتیں جیسے وہاں گزری ہی نہیں تھیں، جنگل میں کبھی گشت لگائی ہی نہیں گئی تھی، جیسے کسی نے کولیا سے اسے پڑھانے کا وعدہ ہی نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ چلا گیا تھا۔

اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اسے بھول گیا تھا۔ کوریانے ہاتھ میں پکڑی کتابوں کا پیوں کو دیکھ کر سسکی بھری۔ ہیجان ختم ہوگئی لیکن صدمہ باقی رہا جو اس کے چھوٹے سے دل کے لیے بہت بڑا تھا۔ وہ دیر تک کبھی آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھیل کی جانب روانہ ہوگیا، اپنی پرانی زندگی کی طرف جو اتنی غیر دلچسپ اور خالی خالی تھی۔

اس وقت لینن اور اس کے ساتھی بہت دور جا چکے تھے۔

گھوڑا گاڑیوں سے بنے راستے پر چلتے چلتے وہ سڑک پر آگئے۔ سامنے ایک چھوٹا سا دریا ان کے راستے کی روک تھا۔ یمیلیانوف دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن لینن بغیر کسی توقف کے دریا میں اتر گیا اور تیر کے پار جانے لگا۔ سب نے اس کی تقلید کی۔ کچھ دیر بعد وہ دلدلی علاقے کے قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر راستہ بدل لیا اور خود کو سوکھی گھاس کے سلگتے الاؤ میں گھرا پایا۔ ان کے اردگرد جھاڑیاں سلگ رہی تھیں اور ان سے نکلتا دھواں ان کی آنکھوں کو ڈس رہا تھا۔ گھاس ان کے پیروں تلے سلگ رہی تھی۔ یمیلیانوف بمشکل انھیں اس علاقے سے نکال سکا۔ وہ مزید آدھ گھنٹے تک تاریکی میں بھٹکتے رہے۔ پھر انھیں دور، ریلوے انجن کی سیٹی سنائی دی۔

”معلوم ہوتا ہے، ہم پہنچ گئے ہیں۔“ یمیلیانوف نے مغموم ہو کر کہا۔

”آپ لوگ بھی یونہی ہیں! کہاں ہے آپ کا جنگی نقشہ؟ آپ نے راستوں کا اچھی طرح مطالعہ کیوں نہیں کیا؟ یہ بھی ایک طریقہ ہے جنگ ہارنے کا۔۔۔“

”ہم رفتہ رفتہ سیکھ جائیں گے، کامریڈ ایوانوف۔“ راژا نے مدھم آواز میں اندھیرے میں کہا۔ جب سے وہ روانہ ہوئے تھے، یہ اس کا پہلا جملہ تھا۔

”جلدی سیکھ لو۔ وقت بہت قیمتی ہے۔“ لینن نے خشک انداز میں کہا۔

یمیلیانوف اور راژا، اسٹیشن کا جائزہ لینے چلے گئے۔ لینن اور شوتماں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اماوس کی تاریک رات تھی۔ وقت رینگ رہا تھا۔ لینن نے کوٹ کی جیب میں اپنی نیلی نوٹ بک کو چھوا ــــــــــ

”میری نیلی نوٹ بک! آخر مجھ تک پہنچ ہی گئی۔ اب مجھے اپنا پمفلٹ مکمل کر لینا چاہیے۔ پر کیا یہ ہو سکے گا؟ دیکھیں اسٹیشن پر اور اس کے بعد اپنی منزل تک پہنچنے میں کیسے حالات پیش آتے ہیں۔ اور کتنے حادثات پیش آئیں گے۔ اور کتنے حادثات!“

یمیلیانوف اور راژا نے اسٹیشن سے واپس آکر بتایا کہ اسٹیشن کا نام دائی بیوتی ہے بیلو اشوف نہیں، جیسا وہ سمجھتے تھے۔ شوتماں کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ دائی بیوتی، فن لینڈ سے صرف سات کلومیٹر دور تھا۔ سرحدی پولیس کے دستوں کے ساتھ آسانی سے مڈھ بھیڑ ہو سکتی تھی۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دور اسٹیشن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ لینن، کچھ دیر اپنی آنکھوں پر زور دے کر دھند میں لرزتی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ چند قدم تیز چل کر یمیلیانوف کے پاس پہنچا اور اس کے کاندھے کو تھپتھپایا: ”ہاں تو نکولائی الیکساندرووچ!“ اس نے کہا: ”اسٹیشن پر کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ تو غور سے سنو۔ نادیژدا کونستانتینوونا سے میرا آداب کہنا اور بچوں کو بہت بہت پیار دینا۔ خاص طور پر کولیا کو۔۔۔“

”جی اچھا۔ بہت بہت شکریہ۔“

”میں تمھارا اور تمھاری بیوی کا بیحد شکر گزار ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کو بڑی تکلیف دی۔ میرے بارے میں برا نہ سوچنا۔“

”کوئی بات نہیں جی۔ آپ یونہی شرمندہ نہ کیجیے۔ ہم تو آپ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ ولادیمیر ایلیچ، ہمارے دل۔۔۔“

"اچھا۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اوہ، ہاں۔ میرے پاس اس وقت بہت تھوڑی رقم ہے۔ میری بیوی نادیژدا کونستانتینووا کو پتہ ہے۔ وہ خود حساب چکا دے گی۔ . . ."

"یہ بات نہ کیجیے، ولادیمیر اِلیچ، میں برا مان جاؤں گا۔ واقعی۔ . . ."

"برا مان جاؤ گے؟ چھوڑو بھئی، اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ تمھارے حالات ایسے نہیں کہ تم مفرور انقلابیوں کے اخراجات یوں برداشت کرتے رہو۔ اور ہاں، اس سے پیشتر کہ میں بھول جاؤں، الیکسی کے بارے میں۔ تمھیں یاد ہے جو ہمارا پیغام رساں بننے کے لیے آیا تھا؟ اس کے لیے دل میں کدورت نہ رکھنا۔ انسان کو اس کی غلطیوں پر کوسنا نہیں چاہیے۔ وہ خود سمجھ جائے گا۔ حالات، انقلابی تجربات اسے سب کچھ سمجھا دیں گے۔ سو، اس کے خلاف دل میں کوئی میل نہیں رکھنا۔ . . ."

"جی اچھا۔ ولادیمیر اِلیچ۔"

"میں اپنے ساتھیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ سو بولنا نہیں۔"

"جی ولادیمیر اِلیچ۔ میں نہیں بولوں گا۔"

"اچھا۔ تو چلیں۔ اور ایک بار پھر شکریہ نکولائی الیکسانڈرووچ۔"

اس گفتگو سے یمیلیانوف بہت متاثر ہوا تھا اور خوش بھی۔ کیوں؟ اسے پتہ نہیں تھا۔ یہ بعد میں اس نے جانا کہ یہ معاملہ صرف دوسرے کے لیے لینن کے احساسات کا نہیں تھا اور نہ ہی حالات کے تقاضے کے تحت لینن اتنا حساس ہو گیا تھا بلکہ مستقبل میں اس کا لامحدود ایقان تھا کہ حالات ایسی صورت اختیار کر جائیں گے کہ الیکسی کی سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ الیکسی اپنی غلطیوں کی پہچان کر لے۔ شاید یمیلیانوف کی سمجھ میں اس وقت آیا تھا کہ محنت کشوں کا انقلاب کوئی دور کی چیز نہیں۔ شاید اس وقت اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان کو راز لف میں اپنے پاس چھپائے ہوئے تھا۔

اس دوران اسٹیشن کی روشنیاں قریب آ چکی تھیں۔ لینن شوتماں کے لیے رکا۔ شوتماں دو قدم بڑھ کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ پھر وہ اپنے خاص انداز میں چلنے لگے۔ آگے آگے یمیلیانوف، اس کے پیچھے راڑا اور راڑا کے پیچھے پیچھے شوتماں اور لینن۔

۱۹۶۱ء

شعور

ایک سو ایک

افکار

(سلسلہ: ۲)

انتونیو گرامچی

اقبال اختر

ذہن کی دنیا کا اسپارٹکس

اقبال اختر

نام : انتونیو گرامچی
پیدائش : ۲۲ جنوری ۱۸۹۱ء
موت : ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء

جنم اور انت کے درمیان چھیالیس سالہ زندگی پر محیط ایک نام —— انتونیو گرامچی! مارکسی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھلی لینن کی ہمعصر ایک شخصیت —— لینن کی ہی مانند مارکسی فکر و عمل کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی اہل —— سنگین قدرت، سنگین تر غربت و افلاس اور سنگین ترین حالات کے استبداد کا شکار، لیکن نحیف و نزار جسم میں تخریبی و تعمیری عناصر سے مملو ایک زندہ اور باغی ذہن —— تاریخ کی مادی جدلیات کا آئینہ دار، زمانۂ حال کی تاریک قوتوں سے برسرپیکار اور روشن مستقبل کے خوابوں سے سرشار —— انتونیو گرامچی!

انتونیو گرامچی —— جس نے اپنی مختصر مگر جہد آزما زندگی کے دس سال فاشزم کی کال کوٹھریوں میں خون تھوکتے ہوئے بتائے، لیکن جس نے ان صعوبتوں کو محنت کش طبقہ کے ایک سپاہی کی حیثیت سے خفیف ترین تاسف کے بغیر برداشت کیا۔ ذہن کی دنیا کا اسپارٹکس، گرامچی، جس نے فاشزم کی کال کوٹھریوں کی دبیز تاریکی میں نہ صرف اپنے ذہن کی روشنی کو قائم و دائم رکھا، بلکہ جس نے بے رحم تاریک قوتوں کے خلاف اپنے ذہن کو ایک مشعل کی صورت جلائے رکھا۔

مادکسی فکر و دانش کی یہ مشعل آج بھی ان گنت ذہنوں کے نہاں خانوں کو منور کر رہی ہے۔

جزیرۂ سارڈینیا کا فرزند، اٹلی کا باشندہ، دنیا کا شہری، عالمی محنت کش طبقہ کا غمخوار، دوست اور رہبر!

اٹلی کا جنوبی خطہ چند تاریخی عوامل کی وجہ سے ہمیشہ پسماندگی اور افلاس کا شکار رہا ہے۔ اس خطے کی معیشت زراعت پر مبنی ہے۔ جزیرۂ سارڈینیا بھی اسی افلاس زدہ جنوبی خطے کا ہی ایک حصّہ ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۹۱ء کو جب انتونیو گرامچی نے سارڈینیا کے ایک گاؤں، گلرزا میں مقامی سررشتے دار کے دفتر میں کلرک، سیلو گرامچی کے گھر میں جنم لیا تو اُس وقت اٹلی کا پورا جنوبی حصّہ شمال کے سرمایہ داروں کی حامی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے ایک کمر توڑ معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ انتونیو گرامچی سیلو اور اس کی بیوی پیپنا کی چوتھی اولاد تھا۔ انتونیو سے پہلے اوپر تلے تین اولادیں ہو چکی تھیں، جن میں سے دو لڑکیاں تھیں اور ایک سب سے بڑا لڑکا۔ انتونیو کی پیدائش کے ایک سال بعد سیلو کا تبادلہ سارڈینیا کے ہی ایک اور گاؤں، سارگونو میں ہو گیا، جہاں اگلے پانچ برسوں کے دوران، خاندان کے افراد میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا اور اضافہ ہو گیا۔

۱۸۹۷ء میں پورے اٹلی کے ساتھ سارڈینیا میں بھی عام انتخابات ہوئے، جن میں مختلف سیاسی جماعتوں نے حصّہ لیا۔ ان پارٹیوں نے خود پر مختلف سیاسی نظریات کے لیبل چسپاں کر رکھے تھے، لیکن اصلیت یہ تھی کہ اُن دنوں سیاسی جماعتوں کی ساس چند علاقائی مقتدر ہستیاں ہوتی تھیں، جو اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کے حصول اور تحفظ کی خاطر کوئی بھی ایسا سیاسی لیبل چن لیتی تھیں، جس سے فی الوقت فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو۔ ان علاقائی آمروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اقتدار کے قلعے کھڑے کر رکھے تھے۔ اکثر لوگ ان حلقہ بندیوں کی پاسداری کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ لیکن سیلو نے سارگونو میں قیام کے دوران اپنی سیاسی وفاداری ایک ایسے سیاست داں کے ساتھ وابستہ کر لی، جو ایک گھاگ مقامی آمر کو اکھاڑنے کی نیت سے انتخابی اکھاڑے میں کودا تھا۔ لیکن وہ گھاگ مقامی آمر خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والے نوسکھیے سیاست داں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا اور اس کے ساتھ ہی سیلو بھی اس مقامی آمر کے انتقام و عتاب کا شکار ہو گیا۔

سیلو کو اپنے بڑے بھائی کی اچانک موت کی وجہ سے کچھ دن کے لیے ایک قریبی گاؤں جانا پڑا۔ دشمن نے اس کی اس مختصر سی غیر حاضری کا فائدہ اُٹھایا۔ جب سیلو سارگونو واپس آیا تو دشمن اپنا جال پھیلا چکا تھا۔ سیلو پر دفتر کے حساب کتاب میں خرد بُرد کرنے کا الزام عائد کر کے معطل کر دیا گیا اور اس کی تنخواہ بھی روک لی گئی۔ سیلو اپنے گھر بار سمیت گلرزا گاؤں واپس آ گیا، لیکن گرفتاری کا خوف ایک تلوار بن کر اس کے سر پر لٹکا ہوا تھا۔ چند مہینے سیلو نے اسی تلوار کے سائے میں بتائے۔ آخر یہ تلوار چند مہینے بعد سیلو کے سر گری اور پولیس نے اُسے خرد بُرد کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس وقت سیلو کی عمر ۳۸ سال تھی۔ گرفتاری کے پندرہ مہینے بعد سیلو کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی اور یہ سماعت بھی ایک سال تک جاری رہی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو عدالت نے مبینہ طور پر خرد بُرد کی گئی رقم کو قلیل و حقیر دینے کے باوجود، سیلو کو

پانچ سال آٹھ مہینے، بائیس دن کی کڑی سزا دی۔

باپ کی گرفتاری کے وقت انتونیو صرف سات سال کا تھا اور اُس وقت سب سے چھوٹا بچہ پیپنا کی گود میں تھا، سب سے بڑے لوسنگتارد کی عمر چودہ سال تھی۔ سسیلو کی گرفتاری اور لمبی سزا پیپنا اور اس کے سات بچوں کے لیے لامتناہی مصائب کے دور کا آغاز بن گئی۔

مصائب کے اسی دور میں انتونیو کی کمر پر کوبڑ نکلنا شروع ہوا۔ اُس وقت تک انتونیو دبلا پتلا لیکن صحت مند بچہ تھا، لیکن اس کے جسم کی ساخت میں اس اچانک تبدیلی نے پیپنا کو مزید وحشت و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ پیپنا نے لیپ اور مالش سے لے کر باقاعدہ علاج تک کا سہارا لیا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور کمر کے ساتھ ساتھ انتونیو کے سینے پر بھی اُبھار نکلنے لگا۔ بعد میں پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ ایک بار ایک خادمہ کے ہاتھ سے انتونیو چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ بچپن میں ہی شاید خادمہ کے ہاتھوں سے گرنے کے بعد ہی، انتونیو کو تین دن تک خون کی قے دست ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے اظہارِ مایوسی کے باوجود انتونیو کی جان کسی طرح بچ گئی تھی، لیکن سات سال کی عمر میں بچپن کی یہ چوٹ کوبڑ کی صورت میں ظاہر ہونے لگی۔

عورت کو صنفِ نازک کہا جاتا ہے، لیکن جب مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو یہی صنفِ نازک تمام آفات کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر ہر آفت کو جھیل جاتی ہے۔ آفات کے گھیرے اور حالات کے اندھیرے میں پیپنا کی یہی مردانہ خصوصیت اُبھر کر سامنے آئیں اور وہ اپنے سات بچوں کو تمام آفات سے بچانے کے لیے اور انھیں سر لینے کے لیے برسرِ پیکار ہو گئی۔ معاشی مصائب اور انتونیو کے اچانک ظہور پذیر ہونے والے عارضہ نے پیپنا کو ہراساں تو کیا، مگر مایوس نہیں۔ معاشی مصائب کا مقابلہ پیپنا نے ترکہ میں ملے ایک قطعہ اراضی کو بیچ کر اور ساتھ ہی سلائی کڑھائی سے حاصل ہونے والی قلیل آمدنی کے ذریعہ کیا۔ پیپنا نے کسی رشتے دار سے مدد لینا بھی پسند نہ کیا اور مادرانہ غیرت و خودداری نے اُسے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دی۔ انتونیو کے عارضہ کے علاج کے لیے بھی پیپنا نے انتھک کوشش کی۔ لیکن جہاں پیپنا سات جانوں کو معاشی آفات سے کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہوئی، وہاں اُسے قدرت کے اس استبداد کو قبول کرتے ہی بنی، جس کا نشانہ سات سالہ انتونیو بنا تھا۔ انتونیو کا یہ عارضہ اُس کا عمر بھر کا ساتھی بن گیا۔

ساڑھے سات سال کی عمر میں انتونیو کے ذہنی سفر کی شروعات ہوئی اور اسے گلرزا کے ثانوی میں اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس ابتدائی دور میں ہی انتونیو کے ذہن کے جوہر کُھلنے اور کِھلنے لگے۔ حرف شناسی اور لفظ شناسی کے مراحل طے کرتے ہی ننھے انتونیو کے ذہن میں لفظوں کے لیے وہ بھوک بیدار ہو گئی، جو الفاظ کے معنی و مطالب کی تلاش کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ لیکن انتونیو کی یہ ذہنی بھوک معنی و مطالب کی تلاش پر ہی ختم نہیں ہوئی، بلکہ آگے چل کر انتونیو نے ان معنی و مطالب کو عمل کے قالب میں ڈھالنے کا جتن کیا۔

تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی انتونیو ہر موضوع میں دس میں دس یا نو نمبر لاتا تھا۔ ذہنی توانائی کے ساتھ انتونیو نے عملی توانائی کے جوہر بھی دکھلانے شروع کر دیے۔ وہ کھلونے، کشتیاں اور گاڑیاں بنانے میں کافی مہارت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ایک بار انتونیو نے کاغذ کی ایک اتنی خوبصورت ناؤ بنائی کہ گاؤں کے لوہار نے اُس ناؤ کے ماڈل پر ٹین کی کشتیاں بنا کر بیچیں۔

انتونیو کو اپنی جسمانی کمزوری کا احساس تھا اور اپنی اس کمزوری کو دُور کرنے کے لیے اس نے کسرت کرنا شروع کر دی۔ ایک ڈنڈی کے دونوں کونوں پر اس نے پتھر تراش کر اچھی طرح فِٹ کر دیے اور وہ روزانہ وزن اُٹھا کر اس کمزوری کی تلافی کرنے کی کوشش کرنے لگا، جو کسی کمزور قوتِ ارادی کے فرد کو عمر بھر کے لیے اپاہج بنا سکتی تھی۔

بچپن کے اس دور میں انتونیو اکثر اپنے ہم جماعتوں سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا، لیکن جب اُس کے ہم جماعت اُس سے کھل کر ملتے تھے تو وہ بھی اُن میں گھل مِل جاتا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں میں سے وہ اپنے سے چار برس چھوٹی بہن ترسینا سے بہت لاڈ پیار کرتا تھا اور اپنے جیب خرچ کے چند پیسوں میں سے بھی اُس کو تصویری رسالے خرید کر دیتا تھا۔

لیکن انتونیو کے معصوم ذہن پر معاشی مصائب کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ غربت کو ایک بھوکے ننگے بچے سے مخفی نہیں رکھا جا سکتا ———— پیپینا نے بچوں کو اُن کے باپ کی غیر حاضری کے سبب سے انجان رکھنے کی کوشش کی لیکن کسی بھی چھوٹے سے گاؤں میں اتنی بڑی خبر کو چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی بھی ایسی خبر کوٹھوں پر چڑھ کر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ انتونیو کے کانوں میں اپنے باپ کی حراست اور سزا کے بارے میں یہ خبریں بات کا بتنگڑ بن کر پہنچیں اور اس کے معصوم ذہن میں ایک اتھل پتھل سی مچ گئی۔ وہ اور زیادہ تنہا اور سب سے زیادہ الگ تھلگ ہو گیا۔

لیکن سچائی کو پوشیدہ رکھنے کی اس کوشش نے انتونیو کے ذہن پر ایک متضاد اثر مرتب کیا اور وہ ہر قیمت پر سچائی جاننے کا متلاشی بن گیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انتونیو گرامچی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں اس کی حقیقت جاننے کی خواہش بارہا ماں سے تکرار کا سبب بن جاتی تھی۔

پیپینا اور اس کے سات بچوں پر افلاس کی مار اتنی زبردست تھی کہ انتونیو کی بہنیں موم بتیوں کے پگھلے ہوئے موم سے موم بتیاں بنایا کرتی تھیں، تاکہ ان موم بتیوں کی دھندلی روشنی میں انتونیو اسکول کا کام پورا کر سکے۔ ۱۹۰۲ء میں انتونیو نے تیسری جماعت میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور گرمی کی چھٹیوں میں جب اس کی عمر گیارہ سال تھی، وہ اپنے بڑے بھائی گنارو کے ساتھ مقامی سررشتے دار کے دفتر میں کام کرنے لگا جو پہلے سے ہی اس دفتر میں کام کر رہا تھا۔ انتونیو کا کام اپنے وزن سے بھاری رجسٹر اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا تھا۔ کمزور صحت کے باوجود اس بھاری جسمانی مشقت نے انتونیو کے جسم و ذہن پر بُرے اثرات مرتب کیے۔

اگلی جماعت میں بھی انتونیو امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوا اور اس نے مضمون نویسی، املا، ریاضی، گرامر، تاریخ اور جغرافیہ میں سے ہر ایک موضوع میں سے دس میں سے دس نمبر حاصل کیے۔ لیکن ثانوی مدرسہ کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد حالات نے انتونیو کو تعلیم کا سلسلہ اُس وقت تک ترک کرنے پر مجبور کر دیا، جب تک اس کا باپ جیل سے رہا ہو کر باہر نہیں آتا۔ اس مجبوری نے انتونیو کے ذہن میں بغاوت کی پہلی چنگاری کو جنم دیا، کیونکہ اس کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی کہ قصائی، درزی، حجام تک کے لڑکے اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھ سکتے تھے جبکہ وہ ابتدائی تعلیم امتیازی شان سے مکمل کرنے کے باوجود سلسلہ تعلیم ترک کرنے پر مجبور تھا۔ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ترک کرنے کے باوجود، انتونیو نے اپنے طور پر لاطینی سیکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ سررشتے دار کے دفتر میں کمر توڑ مشقت بھی کرتا رہا۔

جنوری ۱۹۰۴ء میں انتونیو کا باپ جیل سے رہا ہونے کے بعد گھر واپس آیا اور اس بھرے پُرے گھر بار پر چھائے ہوئے مصائب کے بادل کسی حد تک چھٹ گئے، حالانکہ اس وقت پورے جنوب اور سارڈینیا کے معاشی حالات بحران سے ابتری کی طرف رواں دواں تھے۔ معاشی ابتری کی وجہ سے لٹیروں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ دوسری طرف کانوں میں کام کرنے والے مزدور منظم جدوجہد کر رہے تھے۔ ستمبر کے مہینے میں فوج نے ہڑتالی کان کنوں پر گولی چلا کر تین کان کنوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے خلاف اٹلی میں ملک گیر ہڑتال ہوئی۔

سیسیلو کی واپسی کے بعد کچھ عرصہ تک تنہا کمانے اور کھلانے والا فرد انتونیو ہی تھا، کیونکہ سیسیلو لوگوں سے ملنے جلنے سے کترا رہا تھا۔ انتونیو کا بڑا بھائی گنارو فوجی تربیت کے لیے جا چکا تھا، جبکہ چھوٹا بھائی بھی ثانوی تعلیم کے بعد مذہبی تعلیم کے لیے

ایک دھن گاہ میں داخل ہو چکا تھا۔ پیپیا کڑھائی سلائی اور اس کی دو بیٹیاں بُنائی کر کے گھر کا چولہا گرم رکھنے میں مدد دیتی تھیں، لیکن گاؤں کے لوگوں نے سیلو کی ہچکچاہٹ کو جلد ہی دور کر دیا، کیونکہ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے بے تصور سزا بھگتی تھی۔ سیلو لوگوں میں گھل مل گیا اور اس کے لیے روزی روٹی کے دروازے بھی کھل گئے۔ پہلے اس نے دو ایک چھوٹے موٹے کام کیے۔ بعد میں سیلو مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں قانونی مصالح کار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

آمدنی اب بھی قلیل تھی، لیکن اب کھینچ تان کر گزارہ چلایا جاسکتا تھا۔ سیلو اور پیپیا نے قلیل آمدنی کے باوجود انتونیو کے سلسلۂ تعلیم کو از سرِ نو شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انتونیو کو گلرزا سے اٹھارہ میل دور ایک سیکنڈری اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ اسکول تعلیم کے میدان میں ایک مثال قائم کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا مگر بد انتظامی کی ایک مثال بن کر رہ گیا تھا لیکن اس بد انتظامی کے باوجود انتونیو نے نہایت ذوق و شوق اور لگن سے تحصیلِ علم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ پیر سے سنیچر تک اسکول میں رہتا اور سنیچر کو گھر واپس آتا اور پیر کو اسکول واپس چلا جاتا۔

پیپیا کھانے پینے کا جو سامان اس کے ساتھ کرتی تھی، انتونیو اکثر وہ سامان بیچ کر کتابیں رسالے خرید لیتا تھا۔ پیپیا اس پر ناراض ہوتی اور سیلو بھی اُس پر گرم ہوتا۔ سیلو کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ انتونیو نے اُلٹی سیدھی کتابیں، رسالے پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ یہ کتابیں، رسالے گناروں میلان سے اپنے بھائی کے لیے بھیجتا تھا ——— اور ان سب کا ایک ہی موضوع ہوتا تھا ——— سوشلزم! لیکن سیلو اپنی غربت کے باوجود، خود کو کسی حد تک شاہی خاندان کا فرد سمجھتا تھا کیونکہ اس کے بڑے بھائی کو اٹلی کے مستقبل کے فرماں روا نے اپنی فوجی تربیت کے دوران ایک گھوڑا بطور تحفہ پیش کیا تھا اور اس گھوڑے کا فوٹو سیلو کے گھر میں بڑی شان کے ساتھ دیوار پر بگھارتا تھا!

۱۹۰۸ء میں انتونیو نے سیکنڈری کا اسکول کا آخری امتحان پاس کر لیا۔ بدنظمی کی وجہ سے انتونیو کی پڑھائی بھی متاثر ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود، انتونیو نے تاریخ کے مضمون میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ اُس وقت انتونیو کی عمر ساڑھے سترہ سال تھی۔

اس پورے عرصے میں، سارڈینیا کی معاشی ابتری اور اس کے ساتھ ساتھ کان کنوں کے بے رحمانہ استحصال کی وجہ سے پورے جزیرہ میں افراط و تفریط کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ کانوں میں کام کرنے والے پندرہ ہزار مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان مزدوروں کی اکثریت کسانوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھی، جنھیں زرعی بحران نے کانوں میں کام تلاش کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جہاں انھیں صبح چھ بجے سے شام پانچ بجے تک مشقت کرنا پڑتی تھی۔ مزدوری نہایت قلیل ملتی تھی اور وہ بھی ہر دو تین مہینے۔ اس دوران انھیں کمپنیوں کی دُکانوں سے اُدھار سودا سلف خریدنا پڑتا تھا اور یہ سامان بھی انھیں بازار سے مہنگے داموں پڑتا تھا۔ یہ مزدور جن گندی بستیوں میں رہتے تھے، وہ سُؤر کے باڑوں سے زیادہ متعفن تھیں۔ اکثر مزدوروں کو دق یا ایسی ہی دوسری موذی بیماریاں لاحق تھیں، لیکن کمپنیاں انھیں بیمار تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتی تھیں اور نہ مزدور ہی نوکری چھوٹنے کے ڈر سے اپنی بیماری کی اصلیت ظاہر کرنے پر تیار ہوتے تھے۔ ان حالات کا نتیجہ منظم اور غیر منظم مزدوروں کے منظم اور اکثر غیر منظم ابال ہڑتالوں اور پولیس اور فوج سے خونی تصادموں کی صورت میں نکلتا تھا۔

۱۹۰۸ء میں قریب اٹھارہ سال کی عمر میں انتونیو نے اسکول چھوڑ کر کالج اور شہر کا رُخ کیا۔ انتونیو نے کالیاری کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ سال کے اواخر میں اس کے والدین نے گناروں کا تبادلہ کالیاری کے ہی رشتے دار کے دفتر میں کرا دیا، تاکہ دونوں بھائی اکٹھے رہ سکیں۔ (اُسی سال گنارو اپنی فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد واپس آچکا تھا) لیکن گنارو نے رشتے دار کے

دفتر کی نوکری چھوڑ کر ایک آئس فیکٹری کا بہی کھاتہ سنبھال لیا۔

کالیاری چھوٹا سا شہر تھا، مگر پھر بھی شہر تھا جہاں تین روزنامے شایع ہوتے تھے۔ کچھ رسالے بھی نکلتے تھے جن میں ایک سوشلسٹ ہفتہ وار بھی شامل تھا۔ شہر میں دو تھیٹر بھی تھے، جہاں باقاعدگی کے ساتھ ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔ سینما بھی اپنے قدم جما رہا تھا۔ شہر میں کئی لیکچر ہال بھی تھے۔ شہر کی زندگی کی ان دلچسپیوں نے انتونیو کی توجہ اپنی طرف کھینچی، مگر انتونیو کی توجہ کا مرکز تحصیلِ علم ہی بنا رہا۔ انتونیو کو تحصیلِ علم کا کتنا شغف تھا، وہ ان متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، جو وہ اپنے باپ کو لکھا کرتا تھا۔ انتونیو اکثر دوسرے طلبا سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا اور اس کا زیادہ وقت مطالعے میں ہی صرف ہوتا تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً وہ طلبا کی محفلوں میں بھی شامل ہوتا تھا اور ان کے ساتھ خوش گپیوں کا لطف اٹھاتا تھا۔

انتونیو کے الگ تھلگ رہنے کی ایک وجہ اس کی تنگ دستی بھی تھی۔ اکثر اس کی جیب اور ہاتھ خالی ہی رہتے تھے۔ وہ باپ کے نام لکھے گئے خطوط میں بار بار اپنی اس تنگ دستی کا تذکرہ کرتا تھا۔ گنارو اس کی مدد کرتا تھا، مگر گنارو کی تنخواہ دونوں کے گزارے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ کپڑوں کے دو ایک جوڑوں میں ہی اُسے پورا سال گزارنا پڑتا تھا ——— لیکن ان تمام نامساعد حالات نے بھی انتونیو کی تحصیلِ علم کی پیاس کو سرد نہ کیا اور وہ تندہی کے ساتھ نصابی کتابوں کے علاوہ، کتابوں، رسالوں اور روزناموں سے علم کی اس پیاس کو سرد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہی ایک ایسی تشنگی ہے، جو کبھی آسودہ نہیں ہوتی۔ علم کی یہ پیاس ہی انتونیو کو کارل مارکس کے سرچشمۂ فکر تک پہنچانے کا سبب بن گئی۔ ساتھ ہی انتونیو اپنے گرد و پیش کی دنیا کے بارے میں بھی پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ وہ مقامی مسائل میں بھی گہری دلچسپی لینے لگا۔

اُس وقت جنوبی اٹلی کی پسماندگی کا مسئلہ سارڈینیا کے اخبارات میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ گرامچی کا ایک استاد، رفا گارزیا "لے یونین سارڈا" نام کا ایک اخبار نکالتا تھا، جس کے صفحات جنوبی اٹلی کی غربت، خصوصاً سارڈینیا کی غربت کے مسئلہ پر دھواں دھار مضامین کے لیے وقف تھے۔ گرامچی گارزیا کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ گارزیا اطالوی ادبیات پڑھاتا تھا۔ ادب سے متعلق گرامچی کے مضامین کی گارزیا کی نظر میں اتنی وقعت و اہمیت تھی کہ وہ ان مضامین کو بطور مثال پوری کلاس کے سامنے بہ آوازِ بلند سناتا تھا۔ گارزیا نے گرامچی کو اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ کچھ عرصے میں استاد اور شاگرد کے درمیان اس ذہنی رفاقت نے دوستی کی صورت اختیار کر لی۔

موسمِ گرما کی تعطیلات میں گھر جانے سے پہلے گرامچی نے گارزیا کے اخبار کے لیے خبریں بھیجنے کے بارے میں بات کی، لیکن گلزا میں پہلے ہی سے اخبار کا ایک نمائندہ موجود تھا۔ اس لیے رفا گارزیا نے گرامچی کو ایک اور قریبی قصبہ، آئیدو میگورے کی، خبریں بھیجنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۱۰ء کو گارزیا کے اخبار میں گرامچی کی یہ پہلی رپورٹ شایع ہوئی، جس میں اختصار کے باوجود، طنزیہ عنصر نمایاں تھا:

> قرب و جوار کے قصبات میں یہ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ چناؤ کے وقت آئیدو میگورے میں نہایت حیرت انگیز اور دہشت ناک واقعات ظہور پذیر ہوں گے لوگ کسی بھی انتہا پسند اقدام پر آمادہ تھے اور ایک ہی وار میں مکمل رائے دہندگی کا حق حاصل کرنے اور حقیقتاً میئر اور کونسلروں کا چناؤ خود کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ گلزا پولیس کے لیفٹیننٹ نے کو یہ علامات دیکھ کر گہری تشویش لاحق ہوئی اور اس

نے ایک پورا فوجی دستہ وہاں تعینات کر دیا۔ چالیس مسلح سپاہی اور چالیس فوجی ——— خیریت گزری کہ وہ توپ خانے سے لیس نہیں تھے ——— اور ایک پولیس مین (جس کا وجود بجائے خود کافی وشافی ہوتا) جب ووٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گرفتاری کے خوف سے ان لوگوں نے، جنھیں ووٹ دینے کا حق تھا اور ان لوگوں نے بھی جنھیں ووٹ دینے کا حق نہیں تھا، خود کو اپنے گھروں میں بند کر لیا اور حکام رائے دہندگان کو پکڑ پکڑ کر ان کے گھروں سے باہر نکالنے پر مجبور ہو گئے . . . "

گرامچی تعطیلات کے بعد تیسرے سال کی پڑھائی شروع کرنے کالیاری واپس پہنچا تو وہاں کی سیاسی فضا میں کافی گرماگرمی تھی۔ حکومتِ وقت برابر شمالی اٹلی کے صنعت کاروں کے مفادات کو بڑھاوا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور اس پالیسی کی وجہ سے زراعت پیشہ جنوبی اٹلی کی معاشی بدحالی ——— بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ سارڈینیا میں وبائی امراض کا بھی زور تھا۔ سارڈینیا کے اخبارات میں اس صورتِ حال پر کھل کر احتجاج کیا جارہا تھا اور جنوبی اٹلی سے مرکزی حکومت کے سوتیلے سلوک پر کڑی نکتہ چینی کی جارہی تھی۔ اس فضا میں پارلیمنٹ کے سوشلسٹ رکن، گوئیدو پودریکا کی سارڈینیا میں آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پودریکا پادری شاہی کا کٹر مخالف تھا۔ وہ ایک اخبار بھی شایع کرتا تھا، جس میں پادری شاہی پر سخت ترین حملے کیے جاتے تھے۔ پادری شاہی کے موافقین کی کوششوں کے باوجود سوشلسٹ رکنِ پارلیمنٹ کا یہ دورہ نہایت کامیاب رہا۔ پودریکا نے کالیاری چیمبر آف لیبر اور سوشلسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام کئی جلسوں میں پادری شاہی اور محنت کش طبقے کے موضوعات پر تقاریر کیں۔

کالیاری چیمبر آف لیبر اس وقت مزدوروں، پیشہ وروں اور دانشوروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گرامچی کا بڑا بھائی گنارو اکثر اور گرامچی کبھی کبھی اس کے ساتھ چیمبر آف لیبر کے دفتر میں جاتا تھا۔ پولیس دفتر میں آنے جانے والوں کی کڑی نگرانی کرتی تھی اور نوجوان اس خطرے کے باوجود بلکہ بعض اوقات اس خطرہ کی وجہ سے ہی، چیمبر آف لیبر میں آنا جانا ہمت کا کام سمجھتے تھے۔ گنارو چیمبر آف لیبر کا خزانچی چن لیا گیا تو انتونیو کا وہاں اکثر آنا جانا ہو گیا۔

پولیس نے گنارو کے پس منظر کے بارے میں چھان بین شروع کی تو اس کے ماں باپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ باپ تو نہایت برافروختہ ہوا اور اس نے کالیاری جا کر خود گنارو کی سرگرمیوں کی چھان بین کرنے کی سوچی، لیکن انتونیو نے یہ خط لکھ کر باپ کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی :

"خدا معلوم آپ کیا تصور کر بیٹھے ہیں : نناره[*] جیل میں ہے یا ننارہ کو چار مسلح سپاہی حراست میں لیے جارہے ہیں۔ بےفکر رہیے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ننارہ نے چیمبر آف لیبر کی کچھ ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ پولیس کی ناک کے نیچے ایک نیا نام آیا تو اس نے اس "خون کے پیاسے انقلابی" کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، جو اچانک ابھر کر سامنے آیا تھا۔ سمجھے آپ؟ بس اتنی سی بات تھی۔ میں

---

[*] گنارو کا پیار کا نام۔

کسی کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہاں ایک ہڑتال ہوئی تھی اور چونکہ میں نشاردچیمبر کا خزانچی ہے، اس لیے پولیس نے خزانے پر قبضہ کرنے اور ہڑتال ختم کرانے کے لیے اس کا پتہ جاننے کی کوشش کی، لیکن ہڑتال واپس لے لی گئی اور خزانے پر پولیس کا ہاتھ نہیں پڑا۔۔۔ آگے کبھی ایسی بات ہو تو خاطر جمع رکھیے اور پوچھ گچھ کرنے والے پولیس مین کے سامنے کھل کر ہنسیے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ یہ بیچارے ـــــ! مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔ ان کے سروں پر سوشلسٹوں اور مزاجیوں کا بھوت ایسا سوار رہتا ہے کہ انھیں اٹھائی گیروں اور غنڈوں کی فکر کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا اور یہ بیچارے اس خوف کے مارے ڈبک ڈبک کر چلتے ہیں کہ کوئی ان کا ٹوپ نہ لے بھاگے۔۔۔"

اُس وقت گرامچی کی عمر بیس سال تھی اور وہ شہر کی زندگی میں رچ بس گیا تھا ــــــــ وہ حتی المقدور شہر کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کی بھی کوشش کرتا تھا، لیکن معاشی حالات نے اس کے ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے۔ گنارو کی تنخواہ اور گھر سے آنے والے پیسے دونوں بھائیوں کے گزارے کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک جگہ گرامچی لکھتا ہے: "پیسے بچانے کی خاطر پہلے تو میں نے صبح کافی پینا بند کر دیا۔ اور دوپہر کا کھانا بھی بہت دیر میں کھانے لگا، تاکہ رات کا کھانا کھانے کی ضرورت نہ رہے۔ اس طرح آٹھ مہینے تک میں صرف ایک وقت ہی کھاتا رہا اور اس کا ہی نتیجہ تھا کہ میں نے کالج کا تیسرا سال ختم کیا تو میں غذائیت کی کمی کی وجہ سے سخت جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔"
اُس وقت گرامچی کی ذہنی نشوونما کیا تھی، اس کا اندازہ اُس کے اُس مضمون سے لگایا جا سکتا ہے، جو اُس نے نوآبادیاتی نظام اور محکوم عوام کے بارے میں "لے یونین سارڈا" میں سپردِ قلم کیا تھا:

"ایک دن یہ خبر ملتی ہے کہ کسی طالبِ علم نے ہندوستان کے انگریز گورنر کو ہلاک کر دیا یا کسی دن یہ خبر آتی ہے کہ دغالی کے مقام پر اطالویوں کو مار ڈالا گیا یا باکسر باغیوں نے یورپین مشنریوں کا صفایا کر دیا۔ بس، پھر کیا ہے، پورا کا پورا یورپ وحشیوں، غیر مہذب محکوموں کو صلواتیں سنانے لگتا ہے اور ان بیچارے محکوم عوام کے خلاف ایک نئے جہاد کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔۔ یہ جنگیں تجارت کے لیے لڑی جاتی ہیں، تہذیب کے لیے نہیں۔ جب چینیوں نے انگریزوں کی افیم خریدنے سے انکار کر دیا تھا تو انگریزوں نے چین کے کتنے شہروں کو تاراج کر دیا تھا؟ اسے کہتے ہیں تہذیب! روسیوں اور جاپانیوں نے کوریا اور منچوریا کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے ہی ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہایا تھا۔"

گرامچی نے یہ مضمون روس میں انقلاب سے چھ سال قبل، ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا۔ مضمون کے آخیر میں گرامچی نے یہ نتیجہ

اخذ کیا تھا کہ جب تک یورپ کا محنت کش طبقہ اقتدار پر قابض نہیں ہوتا، نو آبادیوں کے محکوم عوام پر تہذیب کے نام پر یوں ظلم ڈھاتے رہیں گے۔

گرامچی نے اسی سال کافی امتیازی شان کے ساتھ کالج کی پڑھائی ختم کرلی۔ اب اس کے سامنے مزید تعلیم جاری رکھنے کا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ تورین یونیورسٹی سارڈینیا کے ۳۹ غریب طلبا کو ستر لیرے ماہوار کی اسکالرشپ دیتی تھی، لیکن اسکالرشپ کے لیے ضروری تھا کہ وہ طلبا ایک بار پھر ان مضامین کا امتحان دیں، جو انھوں نے کالج میں پڑھے تھے۔ گرامچی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خرابیِ صحت کے باوجود، وہ ایک بار پھر اسکالرشپ کے لیے امتحان دے۔ گرامچی لمبا سفر طے کرکے نہایت ہلکی جیب اور خراب صحت کے ساتھ بڑے صنعتی شہر تورین پہنچا تو پُر شور شہر نے اسے حواس باختہ کردیا۔ لیکن وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور دو تین بار غشی کے دورے پڑنے کے باوجود، وہ پاس ہونے والے طلبا کی فہرست میں نویں نمبر پر آنے میں کامیاب ہوگیا۔ فہرست میں دوسرا نام پالمیرو تولیاتی کا تھا، جو سارڈینیا کے ہی ایک کالج سے امتحان دینے آیا تھا۔ یہ وہی تولیاتی تھا، جو بعد میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بن کر ابھرا، لیکن ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بعد میں قائم ہوا۔

تورین یونیورسٹی میں داخلہ ملنے کے بعد گرامچی نے ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا، لیکن اب اُسے تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ پھر اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے اس نے جو مشقت کی تھی، اس نے بھی اس کی کمزور صحت کو مزید نحیف و نزار بنا دیا تھا۔ گرامچی اُس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے: "۱۹۱۱ء میں سردی اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے میری صحت اتنی خراب تھی کہ مجھے ہر وقت یہ وہم ڈسنے لگا تھا کہ رات کو جب میں سو جاؤں گا تو ایک عظیم الجثہ مکڑی رات کے اندھیرے میں اپنے جال سے نکلے گی اور میرا مغز چاٹ جائے گی۔"

یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد بھی تنگدستی ایک جونک کی طرح گرامچی سے چمٹی رہی، کیونکہ اسکالرشپ کے ستر لیرے گزارے کے لیے ایک دم ناکافی تھے۔ اس تنگ دستی کا اندازہ، ان خطوط سے ہوتا ہے، جو گرامچی گھر لکھا کرتا تھا:

"... اس مہینے مجھے کالج سے صرف ۶۲ لیرے ملے ہیں، جن میں سے چالیس میں نے گھر کی مالکن کو دے دیے اور ۲۰ اور جلدی ہی اُسے دینے ہیں۔ بہرکیف، اس بار کرسمس بڑا کڑا گزرے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کڑاکے کی سردی میں میں کسی اوربل کی تلاش میں سارے تورین میں مارا مارا پھروں۔ نانا ونے مجھے جو دس لیرے بھیجے ہیں، اُن سے میں ایک اور کوٹ بنوانے کی سوچ رہا تھا۔ اب خدا معلوم اس میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سردی سے کپکپاتے کانپتے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانا اور پھر یخ بستہ ٹھنڈے کمرے میں واپس آنا اور گھنٹوں سردی سے کانپتے رہنا کتنا خوشگوار ہوتا ہوگا۔ اگر مجھے ان تکالیف کا پہلے سے علم ہوتا تو منجمد کردینے والی یہ زندگی جھیلنے یہاں ہرگز نہ آتا ——— کسی قیمت پر بھی نہیں! سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سردی کی فکر کرتے رہنے کی وجہ سے میں پڑھ نہیں پاتا، کیونکہ یا تو اپنے پیروں کو گرم رکھنے کے لیے مجھے ادھر سے اُدھر

چلتے رہنا پڑتا ہے یا پھر جاڑے کا پہلا پالا پڑتے ہی مجھے بستر میں دبکا رہنا پڑتا ہے...

"میں نے پورا جاڑا اوورکوٹ کے بغیر گزار دیا۔ میرے پاس ایک ہی ہلکا سا کوٹ تھا جو کالیاری کے لیے مناسب تھا۔ ۱۹۱۲ء کے مارچ میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ مجھے بولے ہوئے کئی مہینے بیت گئے۔ مجھے جب بولنا ہی پڑتا تھا تو سارے الفاظ گڈمڈ ہو جاتے تھے۔"

اس وقت تورین یونیورسٹی میں بہترین ذہن جمع تھے۔ یونیورسٹی میں طلبا کے ذہن میں گڑھے گڑھائے نظریات ٹھونسنے کے بجائے تحقیق اور تلاش وجستجو کی لگن بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور انھیں تحقیق کے طریقۂ کار کی ہی تربیت دی جاتی تھی۔ گرامچی کا ذہنِ رسا اس تربیت کو جذب کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں گرامچی کا ذہن اس نظم وضبط کا پابند ہوا، جو حق اور صداقت کی تلاش میں آگے چل کر اس کا معاون ثابت ہوا۔

اس زمانہ میں گرامچی اُن طلباء سے ہی ملتا جلتا تھا، جو اسی کی طرح سارڈینیا سے ہی وہاں آئے تھے۔ ان میں تولگلیاتی بھی شامل تھا۔ انجیلو تاسکا سے بھی گرامچی کافی قریب تھا۔ تاسکا ایک محنت کش سوشلسٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور تولگلیاتی کے برعکس، وہ اس کم عمر میں ہی عملی سیاست میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

انھیں دنوں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ کر لیا۔ خود اٹلی کا جنوبی خطہ متعفن غربت وافلاس، جہالت و امراض کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا، لیکن اٹلی نے اس کے باوجود ایک غیر ترقی یافتہ ملک پر غاصبانہ قبضہ کر کے جھوٹی عظمت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس وقت بھی اٹلی میں ایسے افراد موجود تھے، جو اس غاصبانہ قبضہ اور اس طرح تہذیب افریقہ برآمد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ اس فضا میں تولگلیاتی اور گرامچی ایک دوسرے کے قریب آئے اور اُن کے درمیان باقاعدگی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس وقت گرامچی محض سارڈینیائی قوم پرست تھا ——— کافی کٹر قوم پرست جس کا خیال تھا کہ باقی اٹلی کے لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی وجہ سے ہی سارڈینیا معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ لیکن سارڈینیائی قوم پرستی کے اس جذبہ میں سوشلسٹ رجحانات کی بھی آمیزش تھی۔ اُس وقت اٹلی کے سوشلسٹ بھی سارڈینیا کی پسماندگی کے اسباب اس جزیرہ کے عوام کی خصوصیت میں ہی تلاش کرتے تھے۔ گرامچی کے جذبات کو اس رویّہ سے ٹھیس لگتی تھی، اس لیے گرامچی تورین کے سوشلسٹوں سے ذرا دُور ہی رہتا تھا۔

لیکن گرامچی کا ذہنی جھکاؤ کچھ ایسا تھا کہ سوشلسٹ اس سے یکسر مایوس نہیں ہوئے تھے۔ تاسکا نے "جنگ اور امن" کے فرانسیسی ایڈیشن کی ایک جلد گرامچی کو بھینٹ کرتے ہوئے اس کا انتساب ان الفاظ میں لکھا تھا: "آج کے میرے دوست کے لیے، جو مجھے اُمید ہے کل کی جدوجہد میں میرا ساتھی ہوگا۔" اس انتساب پر ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کی تاریخ درج ہے۔

یونیورسٹی کے پہلے امتحان میں گرامچی نے جغرافیہ میں ۳۰ میں ۳۰، یونانی اور لاطینی گرامر میں ۳۰ میں سے ۲۷ اور لسانیات میں ۳۰ میں سے ۳۰ نمبر حاصل کیے۔ اس دوران، گرامچی، لسانیات کے استاد، پروفیسر بارتولی کے بہت قریب آگیا تھا اور سارڈینیا کی بولی پر وہ دونوں مل کر کام کر رہے تھے۔ گرامچی پروفیسر امبرتو کوسمو کے بھی کافی قریب تھا، جو اطالوی ادب کا

استاد تھا۔ دونوں کے درمیان ادب پر دھواں دھار بحثیں بھی ہوتی تھیں۔

مارچ ۱۹۱۳ء میں گرامچی کی عمر بائیس سال تھی اور وہ یونیورسٹی کے ادبیات کے شعبہ میں دوسرے سال میں داخل ہو چکا تھا۔ لیبیا پر قبضہ کی قیمت اٹلی کے محنت کش طبقہ سے وصول کی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے مزدوروں میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹ مارچ کو تورین کے کار بنانے والے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ مالکوں کی دھمکیوں اور انتقامی کارروائیوں کے باوجود، یہ ہڑتال ۹۶ دن تک جاری رہی۔ اس دوران ہڑتالی مزدوروں کی روزانہ ایک پارک میں میٹنگ ہوتی تھی، جہاں مزدور آپس میں صلاح و مشورہ کرتے تھے۔ جب تک یہ ہڑتال جاری رہی، شہر والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ گرامچی مزدوروں کی اس جدوجہد سے متاثر ہوا اور تو گلیاتی بھی۔ وہ جب بھی ملتے، اس ہڑتال کے بارے میں باتیں کرتے۔ دونوں کلاس روم سے نکل کر پارک کی طرف جاتے ہوئے ہڑتالی مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتے اور ان سے باتیں کر کے ان کی جدوجہد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر گرامچی اکتسابِ علم میں مصروف تھا۔ اپنے مضامین سے ذرا سی بھی فرصت ملنے پر گرامچی یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں میں لیکچر سننے چلا جاتا تھا۔ جسمانی اور اعصابی کمزوری بھی گرامچی کے ذہنی تجسس کو سرد اور کمزور نہ کر سکی۔

جولائی میں صحت کی خرابی کی وجہ سے گرامچی یونیورسٹی سے چھٹی لے کر گلرزا واپس آ گیا۔ چناؤ کے ضابطوں قاعدوں میں اصلاحات کے بعد نئے چناؤ ہونے والے تھے۔ اس وقت سارڈینیا میں آزادانہ تجارت کے حق میں زبردست مہم اخباروں میں چھڑی ہوئی تھی۔ حکومت نے اٹلی کے صنعت کاروں کے مفادات مدِنظر رکھتے ہوئے فرانس سے درآمدات بند کر دی تھیں جس کے جواب میں فرانس نے اٹلی سے زراعتی پیداوار کی درآمد بند کر دی تھی۔ اس پابندی کا براہ راست اثر جنوبی اٹلی بشمول سارڈینیا کے زراعت پیشہ خطے کی معیشت پر پڑا تھا۔ آزادانہ تجارت کے حق میں ایک مینی فیسٹو تیار کیا گیا تھا جس پر مختلف سوشلسٹ لیڈروں اور دانشوروں کے دستخط تھے۔ گرامچی نے بھی اس مینی فسٹو پر دستخط کیے اور اس طرح گرامچی کا نام پہلی بار کسی سیاسی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہوا۔

۲۶ اکتوبر کو سارڈینیا میں ووٹنگ ہوئی تھی، جس میں ۱۲ نمائندے چُنے جانے تھے۔ پہلی بار ان پڑھ کسانوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا تھا۔ سوشلسٹوں کو توقع تھی کہ یہ چناؤ ایک سیاسی زلزلہ ثابت ہوں گے۔ گرامچی لکھتا ہے: ”یہ مجذوبانہ یقین عام تھا کہ چناؤ کے بعد ہر چیز حیرت انگیز طور پر بدل جائے گی اور سماجی لحاظ سے زیر و زبر ہو جائے گا۔ کم سے کم سارڈینیا میں ایسا ہی یقین کیا جا رہا تھا۔“

لیکن واقعی صورتِ حال یہ تھی کہ پچھلے دو سالوں سے سوشلسٹ تحریک کمزور پڑ رہی تھی۔ کالیاری جیسے بڑے شہر میں سوشلسٹ پارٹی کی شاخ اور چیمبر آف لیبر نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ان پڑھ عوام میں نئے خیالات کا پرچار کرنے والے گنتی کے تھے۔ ان گنتی کے پرچارکوں کو بھی بعد میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ سو میں سے نوے مزدور ہماری بات کو سنتے تو ہیں لیکن یہ نئے خیالات اُن کے پلّے نہیں پڑتے۔ پھر اس زمانے کے سوشلسٹ اپنے پرچار میں چرچ اور پادری شاہی کی اندھی مخالفت کو ہی اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے۔ سوشلسٹوں کے چرچ دشمن پرچار سے مخالفین نے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور ان پڑھ ووٹروں کے ذہنوں میں بسے ہوئے صدیوں پُرانے ہوّوں کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ پھر بھی اس چناؤ نے حالات کو ایک نیا رُوپ دیا۔ اس سے پہلے چناؤ محدود حق رائے دہندگی کی بنیاد پر نظریات کے بجائے ذاتیات کی بنیاد پر ہی لڑے

جاتے تھے۔ اس چناؤ میں پہلی بار نظریات کی بنیاد پر صف بندی ہوئی۔ سارڈینیا کا صاحبِ زر و زمین طبقہ جو اس سے پہلے مرکزی حکومت کے خلاف مزدوروں کے مطالبات تک کی حمایت کرتا تھا، اچانک روم کی حکومت کا ہمنوا بن گیا اور غیر منظم محنت کش طبقے کے غیر منظم حملے کے خلاف ان کا ایک متحدہ محاذ وجود میں آگیا۔

لیکن سوشلسٹ دشمن طاقتوں کے متحدہ محاذ کے خلاف بھی سوشلسٹ ممبر پھر بھی چناؤ میں کامیاب ہوئے۔ گرامچی کا ذہن بھی اس تجربے سے متاثر ہوا۔ انجیلو تاسکا کے یقین کے مطابق، اس تجربے نے گرامچی کے ذہن کو سوشلسٹ قالب میں ڈھال دیا۔ چناؤ سے قبل گرامچی سارڈینیا کی علاقائی خود مختاری کا حامی تھا اور وہ باقی اٹلی کو سارڈینیا کے تمام معاشی مسائل کا سبب سمجھتا تھا۔ لیکن چناؤ کے تجربات نے گرامچی کو اپنے ان نظریات پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جنوبی اٹلی کے کسانوں، چھوٹے زمینداروں اور نچلے متوسط طبقے کا استحصال کرنے والے شمال کے مزدور اور صنعت کار نہیں، بلکہ صنعت کاروں اور جنوبی اٹلی کے حکمران طبقہ کا گٹھ جوڑ ہے۔ دشمن گھر کے دروازے پر بھی موجود تھا۔ تورین کا وہ مزدور سارڈینیا کے مغلوک الحال طبقہ کا دشمن نہیں تھا، جسے گرامچی ۹۶ دن تک ہڑتال کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس تجربہ اور احساس کے ساتھ گرامچی سوشلسٹ تحریک کے بہت قریب آگیا۔

اس مرحلہ پر سارڈینیائی قوم پرستی کا حامی ولمبردار گرامچی ہمہ گیر گرامچی میں تبدیل ہونے لگا، جو تعصباتی ذہنیت کو ترک کر کے وسیع تر ادراک کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا، لیکن گرامچی نے محض تعصباتی ذہنیت کو ہی ترک کیا تھا۔ اس زندگی کے تجربات کو فراموش نہیں کیا تھا، جس نے اس کے ذہن پر واضح نقوش چھوڑے تھے۔ گرامچی سوشلسٹ پارٹی کی پالیسیوں میں پسماندہ جنوب کے مسئلہ کو اہم مقام دیے جانے کا حامی تھا۔ اسی مرحلہ پر گرامچی طلباء کے محدود حلقے سے نکل کر ایک وسیع تر حلقے میں شامل ہو گیا، جس میں دفتروں میں کام کرنے والے کلرک بھی تھے اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور بھی۔ ان کے ساتھ گرامچی مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتا اور وہ گرد و پیش میں تبدیلیاں لانے اور ان تبدیلیوں کے موضوع پر گفتگو کرتے، جو گرد و پیش میں تیزی کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔

اس وقت یورپ پر پہلی جنگِ عظیم کے بادل چھا رہے تھے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو جنگ شروع ہونے سے چار دن قبل اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی نے مطالبہ کیا کہ اس جنگ میں اٹلی کو مکمل طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ لیکن اس غیر جانبداری کے مفہوم کے بارے میں سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ میں اختلاف رائے تھا۔ اس وقت مسولینی سوشلسٹ پارٹی کے اخبار "اوانتی" کا ایڈیٹر تھا۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد ۱۸ اکتوبر کو اس اخبار میں مسولینی کا ایک مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا: "مکمل غیر جانب داری سے متحرک اور معنی خیز غیر جانب داری تک۔" اس مضمون کے بارے میں مختلف ردِعمل سامنے آئے۔ گرامچی نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور بحث کے سلسلے میں گرامچی کا پہلا سیاسی مضمون ۳۱ اکتوبر کو تورین کے سوشلسٹ اخبار "الگریدو دیل پوپولو" (جنتا کی آواز) میں شائع ہوا۔ اشاعت سے پہلے گرامچی نے اپنا مضمون تولگیاتی کو دکھایا تھا اور تولگیاتی نے گرامچی کے دلائل سے اتفاق رائے ظاہر کیا تھا۔

مسولینی کا مضمون غیر واضح تھا۔ گرامچی اور مسولینی کے مضامین میں الفاظ کی مماثلت کے باوجود، جنگ کے بارے میں دونوں کا رویہ ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوا۔ گرامچی نے اصلاح پسندوں کو اپنے مضمون میں نشانہ بنایا تھا۔

"دیکھتے ہیں کہ وہ جنگ کے جوئے میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسرے

اس جوئے میں بازی لگائیں اور جیت جائیں تو انھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ پرولتاریہ واقعات کا غیر جانبدار تماشائی بنا رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ یہ واقعات بالآخر اس کے لیے ثمر آور ثابت ہوں گے، جبکہ اس دوران مدِ مقابل واقعات کے رخ کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کرتا ہے اور طبقاتی جد و جہد کے لیے فعال طریقے سے میدان تیار کرتا ہے۔"

گرامچی نے اپنے مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انقلابیوں کو ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں، جو فیصلہ کن سماجی انتشار، (دوسرے لفظوں میں، انقلاب) میں ان کے ممد و معاون ہوں اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے انقلاب پسندوں کو سماج کی فعال اور غیر فعال طاقتوں پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہنا چاہیے۔ بعد میں، اس مضمون کی بنیاد پر انتہا پسندوں نے گرامچی پر جنگ کی حمایت کرنے کا الزام عائد کیا تھا، جو قطعی بے بنیاد تھا، کیونکہ گرامچی نے اپنے مضمون میں جنگ میں مداخلت کی حمایت نہیں کی تھی. بلکہ اس نے جنگ کے پیدا کردہ حالات کا تختۂ مشق بننے کے بجائے اُن حالات کو موافق بنانے اور ان کو پرولتاریہ کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

اس مرحلہ پر گرامچی کی جسمانی و اعصابی کمزوری پھر عود کر آئی۔ اس مرحلہ پر گرامچی یونیورسٹی میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لے رہا تھا۔ گرامچی نے کسی نہ کسی طرح پڑھائی کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ ۱۲/ اپریل ۱۹۱۵ء کو وہ اطالوی ادب کے امتحان میں بیٹھا۔ اور گرامچی کے لیے یہ امتحان یونیورسٹی کا آخری امتحان ثابت ہوا۔ اور اس مرحلہ پر اس کی یونیورسٹی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

لیکن تعلیمی سلسلہ کا ختم ہونا گرامچی کے لیے سود مند ہی ثابت ہوا، کیونکہ اس سلسلہ کے ختم ہونے کے ساتھ گرامچی تنہائی کے اُس خول سے باہر نکل آیا، جس میں وہ اب تک قید تھا۔ گرامچی تورین میں ہی تھا کہ اٹلی کے جنگ میں شامل ہونے سے ایک ہفتہ قبل، ۱۷/ مئی کو تورین کے مزدور طبقہ نے اٹلی کی جنگ میں شمولیت کے خلاف عام ہڑتال کر دی، جس کے دوران مسلح پولیس اور مزدوروں کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں، "الگریدو ویل پوپولو" میں گرامچی کے پہلے مضمون کی اشاعت کے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ بیتنے کے بعد اس کا دوسرا مضمون ۱۳/ نومبر ۱۹۱۵ء کو اسی اخبار میں شائع ہوا۔ یہ مضمون یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں کی اس میٹنگ کے بارے میں تھا، جو دو مہینے قبل سوئزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر زمروالڈ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میٹنگ میں سوشلسٹ پارٹیوں نے سامراجی طاقتوں کی جنگ میں شمولیت کی مخالفت کی تھی۔ اس میٹنگ میں یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں کے جن رہنماؤں نے شرکت کی تھی، اُن میں لینن کا نام پہلی بار اٹلی کے محنت کش طبقہ کے سامنے آیا تھا۔ اسپین کی سوشلسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس کا تذکرہ کرتے ہوئے گرامچی نے اپنے اس مضمون میں لکھا تھا:

"چھوٹی چھوٹی تحریکیں ہماری نظر میں عظیم تحریکیں نظر آتی ہیں، کیونکہ ہم اِن تحریکوں کا رشتہ اُن تحریکوں سے جوڑتے ہیں، جنھیں صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم ان تحریکوں کو جی رہے ہیں، وہ تحریکیں خود ہم ہیں۔ . . ہم وہ ذرات ہیں، جو ابھی بطنِ حمل میں ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہی بے شمار قطرے ایک عظیم لہر بنیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس احساس و معنی میں انٹرنیشنل حقیقتاً زندہ و متحرک ہے۔"

گرامچی اپنی پچھلی تنہائی اور علیحدگی پسند زندگی کو پیچھے چھوڑ کر زندگی کے میدانِ عمل میں کود گیا اور عملی سیاست میں

حصہ لینے کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں اس کے وہ جوہر کھلنے لگے، جو تنہائی اور علیحدگی کی زندگی میں نشوونما پا رہے تھے۔ اسی مرحلہ پر گرامچی نے اپنے گھر والوں سے بھی دوبارہ رابطہ قائم کیا، جو تنہائی اور علیحدگی کے دور میں ایک دم منقطع نہیں تو کمزور ضرور پڑ گیا تھا۔ اس عملی دور کی شروعات کے ساتھ ہی ایک نئے گرامچی کا جنم ہوا، جس کے ادراک و احساس میں سوشلزم کا فلسفہ پوری طرح جذب ہو چکا تھا اور جو اب ایک پیشہ ور انقلابی تھا۔ اس وقت گرامچی کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

۱۹۱۶ء کے بعد سے گرامچی کا زیادہ تر وقت "کاسا ویل پوپولو" (جنتا بھون) میں بیتنے لگا، جہاں تورین کے مزدوروں کی مختلف تنظیمیں اور امداد باہمی کی انجمنوں کے دفاتر تھے۔ اسی جنتا بھون کی آخری منزل تر مین کرے تھے۔ ایک کمرہ میں "الگریدو دیل پوپولو" کا دفتر تھا، جبکہ دوسرے کمرے میں "اوانتی" کے تورین ایڈیشن کا دفتر تھا اور تیسرے کمرے میں سوشلسٹ پارٹی کی علاقائی شاخ کا مرکزی دفتر تھا۔ "الگریدو" کی ادارت جوزف بیانچی کے سپرد تھی۔ ۱۹۱۶ء کے اواخر میں بیانچی کو جبری بھرتی کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس کے بعد "الگریدو" کی ادارت کی ذمہ داری پرائمری اسکول ٹیچر، ماریا جیو ولیس نے سنبھالی، جو آٹھ بچوں کی ماں تھی۔ "اوانتی" کی ادارتی ذمہ داریاں پاستورے، گرامچی اور ایک سابق ویٹر لیو گیلیتو کے سپرد تھیں، جو ایک دلچسپ کردار تھا اور نہایت بھڑک دار لباس پہنتا تھا۔

ان دونوں اخبارات کے صفحات پر گرامچی ایک ایسے صحافی کے روپ میں ابھرا، جو کانفرنسوں سے لے کر معمولی جرائم تک، اور ڈراموں پر تبصروں سے لے کر کتابوں پر تنقید و تبصروں تک میں اپنے ایک انفرادی رنگ کا مالک تھا اور اور اس انفرادی رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان تبصروں میں سوشلسٹ اندازِ فکر و نظر ایک مشترکہ کڑی کے روپ میں موجود ہوتا تھا۔ گرامچی کے اس اسلوبِ تحریر کو طنز کے عنصر نے مزید دھاردار بنا دیا تھا، لیکن گرامچی نمود و نمائش سے اس قدر دور اور خیالات و افکار کی دنیا کے اتنے قریب تھا کہ اس کے اکثر یہ تبصرے اس کے نام کے بغیر ہی شایع ہوتے تھے۔ اس کے مضامین کے اخیر میں اکثر صرف اس کے نام کے ابتدائی حروف 'اے۔ جی' شایع ہوتے تھے یا "الفا گاما" کا قلمی نام شایع ہوتا تھا۔ بہت کم پڑھنے والوں کو لکھنے والے کو اصل نام کا علم تھا، لیکن ان مضامین کے ساتھ گرامچی کا نام شایع نہ ہونے کے باوجود، سب پڑھنے والے اس کے انفرادی رنگ سے کماحقہ واقف ہو چکے تھے۔

گرامچی اپنے مضامین میں مارکسی نظریہ اور اصول کی روشنی میں حقائق کو دیکھتا تھا اور وہ اس نظریہ و اصول سے گریزاں عمل کو بے اثر و بے ثمر سمجھتا تھا۔ ان مضامین میں گرامچی کا یہ نظریہ بھی کارفرما نظر آتا تھا کہ عوام کے ذہنوں کی تہذیب و تربیت جلسوں کے پلیٹ فارم پر سے نہیں، بلکہ سوال و جواب کے سلسلے وار ڈھنگ سے ہی ممکن ہے۔ گرامچی ۱۹۱۶ء میں ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ انقلابی سرگرمی اور عوام کی ذہنی تہذیب و تربیت میں گہرا رابطہ قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہی گرامچی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

> "انسان اوّلین سطح پر ذہن یا آتما کا ہی دوسرا نام ہے، یعنی وہ تاریخ کا حاصل ہے، نیچر کا نہیں۔ اس بات کو تسلیم کیے بغیر، اس کی توضیح پیش کرنا ممکن نہیں کہ سوشلزم اس سے پہلے وجود میں کیوں نہیں آگیا جبکہ استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے، دولت پیدا کرنے والے اور دولت کا خود غرضانہ صرفہ کرنے والے طبقے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ انسان کو اپنی قدر و قیمت کا

احساس آہستہ آہستہ قدم بہ قدم ہی ہوا ہے ———— سماج کے مختلف حلقوں میں یکے بعد دیگرے اپنی قدر و قیمت کا یہ احساس پیدا ہوا ہے . . . یہ احساس نوری حیوانی ضروریات کا پیدا کردہ نہیں تھا، بلکہ فہم و منطق کا نتیجہ تھا۔ پہلے چند لوگوں میں ہی فہم و ادراک پیدا ہوا اور بعد میں یہ فہم و ادراک ———— پورے طبقوں کا احساس بن گیا، جو سماجی حقائق کے اصل اسباب کا ادراک کرنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ استبدادی ڈھانچے کو بغاوت اور تعمیر نو کے ڈھانچے میں تبدیل کرنے کے ذرائع موجود ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک انقلاب سے قبل بڑے پیمانے پہ سماجی عوامل پر تنقید، ذہنوں کی نئی تہذیب و تربیت اور انجذاب ضروری ہے۔"

"الگریدو" اور" اوانتی" کے معاون مدیر کی حیثیت سے گرامچی نے جو کچھ لکھا، وہ پرولتاریہ میں یہی احساس بیدار کرنے کے نقطۂ نظر سے لکھا۔ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے گرامچی پرولتاریہ کے ذہن اور اس کی تہذیب و تربیت کو ہی سامنے رکھتا تھا، جبکہ گرامچی کے موضوعات مختلف النوع تھے۔ پیراندیلو کے ڈراموں پر توضیحی و تعریفی انداز میں سب سے پہلے گرامچی نے ہی اتنا کچھ لکھا تھا کہ ان سے دو سو صفحات کی کتاب ترتیب دی جا سکتی تھی۔ اپنے روزانہ کالم میں بھی گرامچی جو کچھ لکھتا تھا، وہ اتنا وزنی، اہم اور معنی خیز ہوتا تھا کہ وقت گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت و افادیت تازہ رہتی تھی۔ چنانچہ، گرامچی کے روزانہ کالم کا ایک انتخاب" اوانتی" کے قارئین کے لیے کتابی صورت میں شایع ہوا تھا۔

گرامچی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہی محنت کش طبقہ کے ذہن کو انقلابی نظریات سے روشناس کرانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ تورین کے ان محلوں اور آبادیوں میں بھی جاکر مزدوروں کے سامنے ان موضوعات پر تقاریر اور تبادلۂ خیال کرتا تھا، تاکہ ان کے ذہنوں کی وہ نئی تہذیب و تربیت ہو سکے، جو ان کے مادی حالات سے مطابقت رکھتی تھی۔ ان مزدوروں کے سامنے گرامچی کسی نئے ناول یا نئے ڈرامے کے پس منظر میں بھی بولتا تھا اور فرانسیسی انقلاب جیسے تاریخی موضوعات کے ذریعہ بھی وہ ان کے ذہنوں کی تہذیب و تربیت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

دوسری پارٹیوں سے سوشلسٹ پارٹی کے تعلقات کے بارے میں بھی گرامچی کی رائے سوشلسٹ لیڈروں کی عام رائے سے مختلف تھی۔ گرامچی کے بارے میں اپنے مضمون میں بارتستا سانیتا نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرامچی کا رویہ اس مسئلہ کے بارے میں کتنا وسیع، مدلل اور مارکسی تھا۔ سانیتا لکھتا ہے:

"ایک بار میں" الگریدو" کے دفتر گیا تو میں نے گرامچی کو چار نوجوانوں سے محو گفتگو پایا۔ جب یہ طویل گفتگو ختم ہوئی اور مجھے پتہ چلا کہ یہ چاروں نوجوان کیتھولک تھے تو میں حیرت زدہ رہ گیا، کیونکہ ان کی جنگ کی مخالفت کی وجہ ہماری جنگ کی مخالفت کی وجہ سے مختلف تھی۔ وہ اپنے صلح کل کے نظریہ کی بنیاد پر جنگ کے مخالف تھے۔ (ہم ہر قسم کی جنگ کے خلاف ہیں، وہ بار بار یہی دہرا رہے تھے) ان کی

اس مخالفت کی بنیاد ہی انجیل مقدس تھی۔ گرامچی نے مشتعل کرنے کے خیال سے مجھ سے کہا کہ شاید میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ میں فوری طور پر گرامچی کی نیت کو نہیں بھانپ سکا اور میں نے سادہ لوحی سے پوچھا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں معجزاتی امن کے لیے ان نوجوان کی دعاؤں میں ان کے ساتھ دو زانو ہو جاؤں۔ گرامچی نے بڑے خشک لہجے میں کہا۔ "یہاں تمہیں محض اندھی پادری شاہی کی مخالفت ہی سکھائی جاتی ہے، جو دانش اور سیاست کے تقاضوں کے عین برعکس ہے۔ چرچ میں بھی نہیں جاتا، کیونکہ میں مذہب پرست نہیں ہوں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی اکثریت مذہب پرست ہے۔ اگر ہم الحاد پرستوں کے علاوہ سبھی کو نظر انداز کرتے رہے تو ہم ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ بورژوا ذہنیت رکھنے والے الحاد پرستوں کی بھی کمی نہیں ہے، جو پادریوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور کبھی چرچ میں قدم نہیں رکھتے، لیکن یہ الحاد پرست سوشلسٹ دشمن، جنگ میں شرکت کے حامی اور ہمارے کٹر دشمن ہیں۔ یہ لڑکے گرجا میں مناجات ضرور کرتے ہیں، مگر یہ صنعت کار نہیں ہیں۔ یہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ انہیں ہمارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے، تاکہ جنگ کو جلد سے جلد بند کرایا جا سکے۔"

اس طرح اپنے قلم اور زبان کے ذریعہ گرامچی سوشلزم کے نظریات کو اس تنگ حد بندی سے نکالنے کی انتھک جدوجہد کر رہا تھا، جو پرانے سوشلسٹ رہنماؤں نے ان نظریات کے گرد کھڑی کر دی تھی۔ اس جدوجہد میں ہی گرامچی کا تمام تر وقت صرف ہوتا تھا۔ اس مرحلہ پر اس کی نجی زندگی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ جن لوگوں سے وہ کبھی کبھار نجی سطح پر ملتا تھا، ان کی تعداد ایک ہاتھ کی آدھی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

۱۹۱۶ء کے اواخر میں گرامچی کے علم میں آیا کہ نوجوان سوشلسٹوں کی تنظیم ایک کتابچہ شایع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ گرامچی نے فوراً یہ کتابچہ لکھنے کی پیش کش کی۔ ۱۱ فروری ۱۹۱۷ء کو یہ کتابچہ شایع ہوا۔ کتابچہ کا عنوان تھا: "شہر مستقبل" یہ کتابچہ اپنی چند نظریاتی خامیوں کے باوجود، جس کا اقرار بعد میں خود گرامچی نے کیا تھا، گرامچی کی اس وقت تک کی ذہنی نشو و نما کا مظہر ہے۔ اس کتابچہ کے پہلے مضمون کا عنوان ہے: "تین اصول تین نظام"

"نظم اور بدنظمی ایسی اصطلاحات ہیں، جو سیاسی مباحثوں میں بکثرت استعمال کی جاتی ہیں۔ نظم پیدا کرنے والی پارٹی، نظم لاگو کرنے والے لوگ اور عوام میں نظم و ضبط . . . لفظ "نظم" میں معجزاتی قوت پوشیدہ سمجھی جاتی ہے اور سیاسی ادارے اکثر اسی قوت کے بل بوتے پر زندہ رہتے ہیں۔ موجودہ سماجی نظام کو ایک ایسے مستحکم نظام کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے، جس کی

بنیادی متناسب ہم آہنگی پر رکھی گئی ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کا دل کسی بنیادی تبدیلی کے خیال سے ہی بیٹھنے لگتا ہے کہ نہ جانے یہ بنیادی تبدیلی کیسی تبدیلی ثابت ہو۔ ۔ ۔ یہ لوگ محض حال کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا تو تصور کر سکتے ہیں، لیکن اس نظام کا تصور نہیں کر سکتے، جو ممکن ہے اور جو پچھلے نظام سے بہتر نظام ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ یہ لوگ محض پرتشدد تخریب کا ہی تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو کچھ اُن کے پاس ہے، اُسے کھونے کے خیال سے ہی کانپ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ۔ ۔"

مضمون کے اخیر میں گرامچی لکھتا ہے:

"سوشلسٹوں کا کام ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام تھوپ دیں۔ اُن کا کام ایک نئے نظام کی تخلیق کرنا ہے، جو حقیقی نظام ہے۔ انہیں اس اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ انسان کی پوری شخصیت کی ہمہ جہت تکمیل ممکن ہے اور اس تکمیل پر ہر شہری کا مساوی حق ہے۔ اگر اس اصول کو عملی شکل دے دی جائے تو ماضی کے امتیازات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح انسان کم از کم پابندیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آزادی سے بہرہ مند ہو سکے گا۔ یہ نظام انفرادی اہلیت اور پیداواری صلاحیت کو زندگی اور معاشیات کے قانون کا درجہ دے دے گا اور باقی سارے روایتی ڈھانچے فرسودہ ہو جائیں گے۔ ایسے نظام میں دولت غلامانہ نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ نہیں رہے گی، بلکہ دولت غیر شخصی سطح پر سب کی ملکیت ہو گی اور ہر ایک کو حتی المقدور اس سے فلاح پانے کا حق ہو گا۔ کسی تفریق کے بغیر اسکول فہم و دانش کی نشو و نما کریں گے۔ ۔ ۔ اس اصول پر ہی باقی تمام سوشلسٹ اصولوں کی اساس رکھی جانی چاہیے۔ یہ ماورائے حقیقت تصور نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھوس اصول ہے، جسے آزادی قوت سے ٹھوس عملی شکل دی جا سکتی ہے، یہی اصول حقیقی، سوشلسٹ نظام کا بنیادی اصول ہے۔ ۔ ۔"

انسان زندگی بھر اچھے، بُرے اور نیک و بد کے درمیان شعوری یا غیر شعوری سطح پر کسی ایک کا انتخاب کرتا رہتا ہے۔ اس بارے میں گرامچی لکھتا ہے:

"فریڈرک ہسل کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جینے کا مطلب اُس طرف

یا اُس طرف کا انتخاب کرنا ہے... میں بے حس لوگوں سے نفرت کرتا ہوں... بے حسی تاریخ میں ایک زبردست قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ غیر فعال، لیکن مؤثر طریقے سے کام کرتی ہے... واقعات سازشوں میں پروان چڑھتے ہیں... چند ہاتھ، جو کسی کے بھی سامنے جواب دہ نہیں ہوتے، اجتماعی زندگی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ عوام الناس کو ان واقعات کی اصلیت کا کبھی علم نہیں ہو پاتا، کیونکہ وہ اس کے بارے میں جاننا ہی نہیں چاہتے... میں جانبدار ہوں، میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے حزب کے توانا وجود کو اپنے دل کی دھڑکن میں محسوس کرتا ہوں... اس شہر مستقبل کی زندگی کے وجود کو جس کی تعمیر میرے حزب نے شروع کر دی ہے... میں زندہ ہوں اور میں اپنے حزب کا انتخاب کرتا ہوں۔ چنانچہ میں ہر اس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو اپنے حزب کا انتخاب نہیں کرتا... میں بے حسی سے نفرت کرتا ہوں...“

گرامچی نے اس ضمن میں اپنے اس یقین کا بھی اظہار کیا تھا کہ انسان کی مضبوط قوتِ ارادی تاریخ کے ارتقا میں اہم ترین مقام رکھتی ہے، کیونکہ واقعات خود بخود وقوع پذیر نہیں ہوتے، بلکہ وہ انسان کی قوتِ ارادی اور عمل کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔

یہ کتابچہ فروری ۱۹۱۷ء میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت روس میں انقلاب کی شروعات ہو چکی تھی —— لیکن انقلاب کے بارے میں اٹلی میں جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں، وہ غیر واضح اور الجھن میں ڈالنے والی تھیں۔ بورژوا اخبارات اور خبر رساں ایجنسیاں بھی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی تھیں۔ ۸ / مارچ کو یہ خبر آئی کہ زار کا تختہ پلٹ دیا گیا ہے اور روس میں ایک عبوری حکومت قائم ہو گئی ہے، جو جنگ جاری رکھنا چاہتی ہے، لیکن لینن کی رہنمائی میں بائیں بازو کے انتہاپسند انقلابی ہر قیمت پر جنگ بندی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

۲۹ / اپریل ۱۹۱۷ء کے ”اِلگریدو“ میں روسی انقلاب کے بارے میں گرامچی کا پہلا تبصرہ شایع ہوا :

”بورژوا اخبارات نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ وہاں شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی طاقت نے لے لی ہے۔ بورژوا اخبارات یہ امید کر رہے ہیں کہ یہ طاقت، بورژوا طاقت ہوگی۔ انھوں نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے : روسی انقلاب فرانسیسی انقلاب۔ وہ ان دو واقعات کو ایک دوسرے کے مماثل ظاہر کر رہے ہیں... بہر کیف، ہمارا یقین ہے کہ روسی انقلاب کی نوعیت پرولتاری ہے اور اس کی یہ نوعیت اس کے اب تک کے اقدامات سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ پرولتاری انقلاب سوشلسٹ حکومت پر ہی منتج ہوگا۔“

لینن کے اس اعلان کے بعد کہ" مزدوروں اور کسانوں کی کونسلوں کے ذریعہ سارا اقتدار پرولتاریہ کو سونپ دیا جائے" لینن پر بورژوا اخبارات میں حملے کیے جانے لگے، جبکہ اٹلی کے محنت کش طبقہ کی نگاہ میں لینن ایک ایسے رہبر کے روپ میں ابھرا، "جو سب سے زیادہ سوشلسٹ" اور" الگریدو" کے الفاظ میں" روس کی سوشلسٹ پارٹیوں کے سربرآوردہ رہنماؤں میں سب سے زیادہ انقلابی رہنما تھا۔"

۱۳ اگست، ۱۹۱۷ء کو انقلابی حکومت کے دو نمائندے، گولڈن برگ اور سمرنوف تورین پہنچے تو چالیس ہزار مزدوروں کے مجمع غفیر نے اُن کا استقبال کیا۔ یہ دونوں نمائندے اتحادی حکومتوں سے ابتدائی رابطہ قائم کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ چند دن قبل ہی گولڈن برگ نے پیرس میں بیان دیا تھا" لینن ہمارا حلیف نہیں ہے۔ ہم اُس کے حریف ہیں۔" مگر کرنیسکی سرکار کے یہ دو نمائندے جب تورین میں جنتا بھون کی بالکنی میں مزدوروں کے سامنے آئے تو مزدوروں نے" لینن زندہ باد!" کے نعروں سے اُن کا استقبال کیا! کرنیسکی سرکار کے نمائندوں کی آمد سے چند دن پہلے" الگریدو" نے روس کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ" کرنیسکی اور اس کے ساتھیوں نے فی الحال طاقتوں کے موجودہ توازن کے بل بوتے پر عنانِ اقتدار سنبھالی ہے۔ کرنیسکی اور اس کے ساتھی رُوسی انقلاب کا محض آج ہیں، لیکن لینن اور اس کے ساتھی انقلابی روسی انقلاب کا آنے والا کل ہیں۔"

دس دن بعد تورین کی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں اور ٹریفک بند ہوگیا۔ اس ابال کا فوری سبب یہ تھا کہ دکانوں سے اچانک روٹی عنقا ہوگئی تھی، لیکن اس کا بنیادی سبب یہ احساس تھا کہ جرمنوں کے خلاف، بورژوا طبقہ کے مفادات کے لیے، دس ہزار جانیں گنوانے سے بہتر ہے کہ خود مزدوروں کے کاز میں پانچ سو جانیں قربان کردی جائیں۔ مزدوروں نے درخت اکھاڑ کر اور ٹرامیں اور ریل کے ڈبوں کو گھسیٹ کر راہیں مسدود کردیں، لیکن مزدوروں کی یہ بغاوت غیر منظم تھی اور باغیوں اور سوشلسٹ لیڈر شپ میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ مزدوروں کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ مسلح فوجی ان کے ہمدردی ظاہر کریں گے۔ فوج نے ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے جگہ بہ جگہ مزدوروں پر گولیاں چلائیں، جس میں پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے اور دو سو سے زیادہ زخمی۔

غیر منظم بغاوت کے فرو ہونے کے بعد سوشلسٹ لیڈروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ فوج نے جنتا بھون پر قبضہ کرلیا۔ شہر میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ اس ہنگامی مرحلہ پر تورین کے محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی ترتیب دی گئی، جس کے بارہ اراکین میں گرامچی کا نام بھی شامل تھا۔ اس دوران فلورنیس میں سوشلسٹ پارٹی کی ایک خفیہ کانفرنس ہوئی جس میں جنگ کی مخالفت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گرامچی کی رائے یہ تھی کہ جنگ کے پیدا کردہ بحران میں، انقلابی محنت کش طبقہ اب بھی موثر طریقے سے اثر انداز ہوسکتا ہے۔

اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کی یہ خفیہ کانفرنس ۱۸ نومبر کو ہوئی تھی، جبکہ چار دن قبل، ۱۴ نومبر کو رُوس میں لینن کی رہنمائی میں بالشویک برسرِ اقتدار آچکے تھے۔ ۱۰ نومبر کو اٹلی کے ایک بورژوا اخبار" گزیتا ویل پوپولو" نے یہ خبر شائع کی تھی: " انتہا پسندوں کی ایک بھیڑ نے محل سرا کے شراب کے تہہ خانوں کو لوٹ لیا اور یہ بھیڑ شراب پی کر بدمست ہوگئی۔ بعد میں اس بھیڑ کو بزور طاقت منتشر کردیا گیا" اس بورژوا اخبار نے روس کے تاریخ ساز انقلاب کو شراب نوشوں کی ہڑدنگ کا درجہ دینے پر قناعت کی تھی۔ سنسر شپ کی پابندیوں کے باوجود، رُوس سے ملنے والی اطلاعات کا تجزیہ کرنے کے بعد ۲۴ نومبر کو گرامچی نے" الگریدو" میں یہ نتیجہ اخذ کیا: " الگریدو" کی یہ پیش بینی صحیح ثابت ہورہی ہے کہ روسی انقلاب کرنیسکی دور پر ختم

نہیں ہوگا۔ روسی انقلاب جاری ہے اور جاری رہے گا" ۲۴ نومبر کو ہی روزنامے "اوانتی" میں گرامچی کے نام کے ساتھ ایک اداریہ شایع ہوا۔ اس اداریہ کا عنوان تھا: "کیپیٹل کے خلاف انقلاب" صداقت کے متلاشی دجویا گرامچی نے اس اداریہ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صداقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"بالشویک انقلاب مارکس کے کیپیٹل کے خلاف انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ روس میں پرولتاریہ سے زیادہ بورژوا طبقہ کیپیٹل سے متاثر تھا۔ کیپیٹل میں انتقادی نقطۂ نظر سے یہ دکھایا گیا ہے کہ روس میں جبری احتیاج کے طور پر، بورژوا طبقے کا قیام عمل میں آئے گا اور وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی داغ بیل ڈالی جائے گی، مغربی طرز کی جمہوریت وہاں فروغ پائے گی اور اس کے بعد ہی پرولتاریہ اپنی نجات، اپنے طبقاتی مفادات، اپنے انقلاب کے بارے میں فکر کر سکے گا۔ لیکن واقعات نے اس ڈھانچے کو تار تار کر دیا ہے، جس کے چوکھٹے میں، تاریخی مادیت پرستی کے مطابق، روس میں واقعات ظہور پذیر ہونے چاہیے تھے۔ بالشویکوں نے اس طرح مارکس کی تردید کی ہے اور انھوں نے اپنے افعال، اپنی کامرانیوں سے اس حقیقت کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ تاریخی مادیت پرستی کے قوانین اس سے زیادہ لچکدار ہیں، جتنا کہ اب تک انھیں سمجھا جاتا رہا ہے... اگر بالشویکوں نے کیپیٹل کی چند پیش گوئیوں کی تردید کی ہے تو اسی کے ساتھ ہی انھوں نے اس کے ان عناصر سے انحراف نہیں کیا ہے، جو اس میں زندہ اور مستقل عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں...."

اس مضمون میں بھی گرامچی نے اپنے اس نظریہ کا اعادہ کیا ہے کہ تاریخ کا ارتقاء مکمل طور پر (اثبات پرستی کے مفہوم میں) معاشی قوتوں کا پابند نہیں ہے، بلکہ تاریخی ارتقاء میں انسان کی قوتِ ارادی بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

گرامچی کی صداقت پسندی اور حقیقت پسندی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ روس میں زارشاہی کا خاتمہ ہوتے ہی خوشحالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ گرامچی کی رائے تھی کہ انقلاب کے بعد کافی عرصے تک روس میں اجتماعی سطح پر، لوگوں کے حصہ میں مصائب اور تکالیف ہی آئیں گی، لیکن اس وقت کے حالات میں روس میں سرمایہ دارانہ نظام بدتر مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔

تورین میں اب بھی مارشل لا نافذ تھا، مقامی پارٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے گرامچی کے لیے کام کرنے کی راہیں مسدود تھیں۔ مگر وہ صحافت کے میدان میں سرگرم عمل تھا۔ "الگریدو" کی ایڈیٹر ماریا جیوڈیس کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب گرامچی تنہا "الگریدو" کی ادارت کا ذمہ دار تھا۔ جلد ہی نئے مدیر کے زیر نگرانی رسالے کی نئی شخصیت کے نقوش واضح ہونے لگے۔ ۲۷ سالہ گرامچی نے انقلابی روس سے کسی نہ کسی طرح موصول ہونے والا مواد جمع کر کے ان کے تراجم "الگریدو" میں شایع کیے۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ گرامچی کے تین بھائی گنارو، کارلو اور ماریو بھی فوج میں تھے، لیکن خوش قسمتی سے وہ

تینوں اس خون آشام جنگ سے زندہ بچ کر آ گئے۔ گناروا اور کارلو نے فوج کو خیر باد کہا، جبکہ گرامچی کے تیسرے بھائی ماریو نے فوج میں رہنا پسند کیا۔ گنارو کالیاری کی اُسی کوآپریٹیو سوسائٹی میں کام کرنے لگا، جہاں وہ جنگ سے پہلے کام کر رہا تھا۔ کارلو ماں باپ کے پاس گلرزا واپس آ گیا۔ اُس وقت گرامچی کی دو بہنیں گریزیتا اور تریسینا بھی ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھیں، جبکہ تیسری بہن، ایما ایک قریبی مقام پر ایک ڈیم کی تعمیر کرنے والی کمپنی میں ملازمت کر رہی تھی۔ معاشی لحاظ سے اب ان کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ صحافی کی حیثیت سے گرامچی نے جو کامیابی حاصل کی تھی، اس پر اس کے گھر والے کچھ کچھ فخر محسوس کرنے لگے تھے، حالانکہ گرامچی جو کچھ لکھتا تھا، وہ ان کے کچھ خاص پلے نہیں پڑتا تھا۔ دنیا کو بدلنے کی باتیں انھیں کسی اور کرۂ ارض کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ گرامچی کے مضامین پڑھ کر اس کا باپ، سیسلو کبھی کبھی نہایت چراغ پا ہوتا تھا۔ یہ مضامین پڑھ کر وہ بڑبڑانے لگتا تھا، لیکن گرامچی کی ماں یہ کہہ کر اس کی بڑبڑاہٹ کو ختم کر دیتی تھی: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں جانتی ہوں، مگر کیا کیا جائے۔ . . . وہ چیزوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ . . "

۵ دسمبر ۱۹۱۸ء سے گرامچی نے "اوانتی" میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اب گرامچی میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی اور جولانی تھی۔ اسے اپنی جسمانی معذوری کا احساس بھی اتنا نہیں ستاتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ تاسکا تو گلیاتی اور تراسینی کے تورین واپس آتے ہی ان سب ساتھیوں نے گرامچی کے ساتھ مل کر ایک نیا ہفتہ وار رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس پورے عرصے میں گرامچی لینن کی تقریروں اور روسی لٹریچر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اس رسالے "لا اوردائن نوووو" کا پہلا شمارہ نکلا۔

اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ گرامچی اور اُس کے ساتھیوں نے تورین کے محنت کش طبقہ کو نہ صرف رُوس کے حالات سے روشناس کرایا، بلکہ انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ تورین کے مزدوروں کو روسی طرز پر کارخانوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لینے پر آمادہ کیا۔ مزدوروں میں یہ تحریک غیر معمولی حد تک مقبول ہوئی اور کاریں بنانے والے کئی کارخانوں میں مزدوروں کی کمیٹیاں وجود میں آ گئیں اور تیس ہزار مزدور اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ان کمیٹیوں نے کارخانوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کارخانوں کے مالکان اور مزدوروں میں تصادم ناگزیر ہو گیا۔ یہ تصادم مزدوروں کی اس تحریک کی ناکامی کی صورت میں نکلا، کیونکہ بحیثیت مجموعی سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ اس تجربہ کو قبل از وقت سمجھتی تھی اور باقی اٹلی کے مزدور تنظیمی سطح پر تورین کے مزدوروں کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے۔

اسی دوران اتحادی حکومتیں رُوس اور ہنگری کی انقلابی حکومتوں کے خلاف انقلاب دشمن تحریکوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ ۲۰، ۲۱ جولائی ۱۹۱۹ء کو روس اور ہنگری کی انقلابی حکومتوں سے اٹلی کے محنت کش طبقہ کے اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لیے ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ اس ہڑتال کے سلسلے میں دوسرے سوشلسٹ لیڈروں کے ساتھ گرامچی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی زندگی میں جیل کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ گرامچی جیل میں مختصر مدت تک ہی رہا لیکن اس عرصہ میں بھی اُس نے ساتھی قیدیوں کے ذہنوں کو نئے خیالات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔

۱۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو اٹلی میں جنگ کے بعد پہلا عام چناؤ ہوا۔ چناؤ سے ایک ہفتہ پہلے سوشلسٹ پارٹی نے بولونا کے مقام پر اپنی کانگریس میں تھرڈ انٹرنیشنل سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس چناؤ میں سوشلسٹ پارٹی کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی اور اُس کے ۱۵۰ ممبر پارلیمنٹ کے لیے چنے گئے، جبکہ پچھلی پارلیمنٹ میں اس کی صرف ۵۰ سیٹیں تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کی ممبرشپ بھی پچاس ہزار سے بڑھ کر تین لاکھ ہو گئی، جبکہ سوشلسٹ پارٹی کے تحت ٹریڈ یونینوں میں بیس لاکھ

سے زیادہ مزدور شامل تھے، لیکن سوشلسٹ پارٹی کی طاقت میں اس کی وجہ سے تنظیمی سطح پر نئے مسائل کھڑے ہو گئے اور پارٹی میں یہ خیال بھی قوی ہو گیا کہ اقتدار ایک پکے پھل کی مانند ایک نہ ایک دن اس کی گود میں آگرے گا۔ پارٹی کا دایاں اور بایاں بازو ایک دوسرے سے دست بگریباں تھا۔ دائیں بازو والے ہر صورت میں پارلیمانی راہ سے ہی اقتدار پر قبضہ کرنے کے حامی تھے، جبکہ پارٹی کا بایاں بازو پارلیمنٹ کے مکمل بائیکاٹ پر زور دیتا تھا۔ ان دو انتہا پسند نظریوں کے بیچ میں پارٹی کی لیڈر شپ تھی جو ٹھوس اور قابل پروگرام پیش کرنے کے بجائے، محض زبانی سطح پر انقلابی لفاظی پر یقین رکھتی تھی۔

اس مرحلہ پر گرامچی نے سوشلسٹ پارٹی کی صورتِ حال پر ایک رپورٹ تیار کی۔ یہ رپورٹ پارٹی کی تورین شاخ نے منظور کرلی اور پارٹی لیڈر شپ کے سوچ بچار کے لیے اوپر بھیج دی گئی۔

گرامچی کی اس رپورٹ میں کہا گیا تھا:

> "سوشلسٹ پارٹی واقعات کی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ وہ ان واقعات کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے سے بھی گریز کرتی ہے۔ وہ ایسی پالیسیاں پیش کرنے سے بھی تہی دامن ہے، جنھیں عوام سمجھ سکیں اور قبول کرسکیں۔ پارٹی مارکسزم یا کمیونسٹ انٹرنیشنل کے انقلابی نظریات کا مؤثر استعمال کرنے سے قاصر ہے اور نہ وہ کوئی ایسی عام حکمتِ عملی نافذ کر پا رہی ہے، جو انقلابی سرگرمیوں کو ایک مرکز پر مجتمع کر سکے۔ محنت کش طبقہ کے منظم پیش دستہ کی حیثیت سے پارٹی کو ایسے مشترکہ اقدام کو تقویت دینے کی کوشش کرنی چاہیئے، جس سے مزدور ایسا انقلاب لانے میں کامیاب ہوسکیں، جو قائم و دائم رہ سکے... اس کے بجائے بولونا کانگریس کے بعد بھی پارٹی محض ایک پارلیمانی پارٹی بنی ہوئی ہے، جو بورژوا جمہوریت کی حد بندی میں قید ہے..."

گرامچی کی اس رپورٹ کا اہم ترین حصہ وہ ہے، جس میں اس نے فاشزم کے خطرہ کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

> "اٹلی میں طبقاتی جدوجہد کا موجودہ دور، ایک ایسا دور ہے، جو یا تو انقلابی پرولتاریہ کے اقتدار پر قبضہ کے لیے راہ تیار کرتا ہے یا صاحبِ جائداد اور حکمران طبقہ کے وحشیانہ ردِ عمل کا دور ثابت ہوتا ہے۔ یہ حکمران طبقہ صنعتی اور زرعی پرولتاریہ کے خلاف کسی بھی قسم کے تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کرے گا۔ یہ طبقہ مزدوروں کی سیاسی جدوجہد کے ذرائع کے ساتھ سوشلسٹ پارٹی کو ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے اور مزدوروں کے معاشی طاقت کے ذرائع یعنی ٹریڈ یونینوں اور کوآپریٹیو انجمنوں کو بورژوا ریاست کی مشینری میں ضم کرنے

کی کوشش کریں گے۔

جس وقت گرامچی نے یہ نوٹ لکھا تھا، اسی وقت ہی تورین کے مزدوروں کی کارخانوں میں نظم و نسق سنبھالنے کی تحریک ناکامی سے دوچار ہوئی تھی۔ حکومت اور کارخانے داروں نے مزدوروں کی تحریک کو ہر صورت میں کچل دینے کا فیصلہ کر لیا اور تورین کو فوجی قلعے کا روپ دے دیا۔

۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو ماسکو میں تھرڈ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس شروع ہوئی۔ اس وقت تک روس میں سرخ فوج انقلاب دشمن طاقتوں کو شکست دے چکی تھی، لیکن جرمنی میں جنوری ۱۹۱۹ء میں فوج اور سوشل ڈیموکریٹوں کے گٹھ جوڑ نے اسپارٹکسٹ انقلاب کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ روزا لکسمبرگ اور کارل لیب نیخت وہاں قتل کیے جا چکے تھے، جبکہ ہنگری میں بیلاکن کی کمیونسٹ حکومت کا بھی ایک ایسے ہی گٹھ جوڑ نے تختہ پلٹ دیا تھا اور وہاں امیر البحر ہورتھی کی حکومت انقلابیوں کو چن چن کر قتل کر رہی تھی۔

اس پس منظر میں، تھرڈ انٹرنیشنل نے روس میں انقلاب کی کامیابی اور ہنگری اور جرمنی میں انقلابات کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوشل ڈیموکریٹوں کو بین الاقوامی انقلابی تحریک سے نکال باہر کیا جائے۔ اٹلی کے جس وفد نے کانگریس میں شرکت کی تھی، اگرچہ اس میں گرامچی یا "لا اوردائن نوود" کے نظریات کی نمائندگی کرنے والا کوئی فرد شامل نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس کانگریس نے گرامچی اور "لا اوردائن نوو" کے نظریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ لینن نے اس کانگریس کے سامنے جو پروگرام پیش کیا تھا، اس کا سترہواں نکتہ یہ تھا:

> "اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کے بارے میں، دوسری کانگریس، ۸ رمئی ۱۹۲۰ء کو پارٹی کی تورین شاخ کی طرف سے "لا اوردائن نوو" میں شایع شدہ "پارٹی کے تنقیدی جائزے اور عملی تجاویز" سے مجموعی طور پر اتفاق رائے کا اظہار کرتی ہے، کیونکہ یہ تھرڈ انٹرنیشنل کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔"

اس طرح لینن اور تھرڈ انٹرنیشنل کی اس دوسری کانگریس نے گرامچی اور "لا اوردائن نوود" کے نظریات پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

اگست ۱۹۲۰ء میں تورین کے مزدوروں اور کارخانے داروں کے درمیان ایک اور تصادم ہوا۔ ۳۱ اگست کی رات کو کارخانوں کے مالکان نے لاک آؤٹ کا اعلان کر دیا، لیکن اگلے دن مزدوروں نے کارخانوں میں داخل ہو کر ان پر قبضہ کر لیا اور کلرکوں اور تکنیکی ماہرین کی غیر حاضری کے باوجود، مزدوروں نے کارخانوں میں پیداوار کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ اس دوران، "لا اوردائن نوو" نے اشاعت کا سلسلہ بند کر دیا تھا، کیونکہ گرامچی اور اس کے ساتھی کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ صلاح مشوروں کے ذریعہ کارخانوں میں کام کاج جاری رکھنے کے مسائل پر اپنی توجہ صرف کر رہے تھے۔ لیکن آخر کار مزدوروں کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اس بار بھی ناکامی کے اسباب وہی تھے، جن کی وجہ سے اپریل ۱۹۱۹ء کی ہڑتال ناکام ہوئی تھی۔

اس مرحلہ پر اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی اصلاح پسندوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کے اخراج کے مسئلہ میں الجھی ہوئی تھی۔ اس دوران ہی اٹلی میں نومبر۔ اکتوبر میں مقامی انتخابات منعقد ہوئے تھے اور سوشلسٹ پارٹی نے ۶۹ میں سے ۲۶ صوبوں اور ۸۰۰۰ میونسپل کمیٹیوں میں سے ۲۱۶۲ کمیٹیوں میں اکثریت حاصل کی، جن میں میلان اور بولونا جیسے بڑے شہروں کی میونسپل کمیٹیاں شامل تھیں۔ ۲۱ نومبر بولونا کا نیا سوشلسٹ میئر ٹاؤن ہال کی بالکنی میں بھیڑ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے پہونچا تو ایک مسلح فاشسٹ گروہ نے اچانک ایک اونچی جگہ سے بھیڑ پر اندھا دُھند گولیاں برسانا شروع کردیں۔ ٹاؤن ہال کی کھڑکی سے بھیڑ پر دستی بم بھی پھینکے گئے۔ فاشسٹوں کی اس دہشت انگیزی کی وجہ سے ۶۸ افراد ہلاک ہوگئے۔ اس قسم کے واقعات عام ہوتے جارہے تھے اور سوشلسٹوں کی محدود مدافعت کے باوجود فاشسٹوں کی دہشت انگیزی کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

ایسی صورتِ حال میں، جبکہ فاشسٹوں کی دہشت انگیزی کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں، سوشلسٹ پارٹی میں پھوٹ اور انتشار خودکشی کے مترادف ہوتا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے حامی پارٹی کے اندر رہتے ہوئے اور پارٹی اور محنت کش طبقہ کے اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے پوری پارٹی کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔ ۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء کو لورنو میں اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کی ساتویں کانگرس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں اٹلی کے محنت کش طبقہ یا صحیح معنوں میں اُن کے لیڈروں نے تھرڈ انٹرنیشنل کی رہنمائی قبول نہیں کی۔ ۹۸۰۰۰ ووٹوں کے بل بوتے پر سوشلسٹ پارٹی کی لیڈرشپ سیراتی کے ہاتھوں میں رہی، جبکہ ۵۸۰۰۰ ممبروں نے تھرڈ انٹرنیشنل کی حمایت کی اور ۱۴۰۰۰ نے اصلاح پسندوں کی تائید کی۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۱ء کو گرامچی کی ۳۰ ویں سالگرہ سے ایک دن قبل سوشلسٹ پارٹی کے کمیونسٹ ارکان کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی عالمِ وجود میں آگئی۔ امادیو بوردیگا کو پارٹی کا سکریٹری چُنا گیا۔ پندرہ ارکان پر مشتمل مرکزی کمیٹی بھی چُنی گئی، جن میں گرامچی بھی شامل تھا۔

یکم جنوری ۱۹۲۱ء سے "لاأوردائن نوؤو" ہفتہ وار سے روزنامہ بن گیا تھا۔ اس کا ایڈیٹر اب بھی گرامچی ہی تھا۔ اب یہ اخبار پارٹی کا ترجمان تھا۔ گرامچی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ گرامچی بوردیگا کی گروہ بندی کی پالیسی سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود، پارٹی لائن پر عمل کررہا تھا۔ پارٹی لائن یہ تھی کہ اٹلی میں فاشسٹ یا فوجی ڈکٹیٹرشپ ممکن نہیں ہے۔ لیکن گرامچی حالات کا معروضی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ اٹلی میں رجعت پسند اور فاشسٹ طاقتیں متحد ہورہی ہیں۔ گرامچی کا خیال تھا کہ اس خطرہ کے خلاف کمیونسٹوں کو سبھی ہم خیال عناصر سے اتحاد کرنا چاہیے لیکن گرامچی نے ان خیالات کا اظہار مرکزی کمیٹی کی میٹنگوں میں نہیں کیا۔ گرامچی نے شاید اس وجہ سے نکتہ چینی کرنے سے احتراز کیا کہ اس نکتہ چینی کی وجہ سے خود کمیونسٹ پارٹی میں مزید انتشار نہ پھیل جائے۔

کمیونسٹ پارٹی نے اپنی دوسری کانگرس میں، جو مارچ ۱۹۲۲ء میں روم میں منعقد ہوئی، گرامچی کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایگزیکیٹو میں اطالوی پارٹی کا نمائندہ نامزد کیا ——— مئی کے اواخر میں گرامچی ماسکو روانہ ہوگیا۔

گرامچی ماسکو پہونچا تو اس کی صحت بڑی دگرگوں تھی۔ سیاسی اور ذاتی مسائل کا تناؤ ایک ساتھ اپنا اثر دکھانے لگے اور گرامچی کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کے صدر کے مشورہ پر ماسکو کے نواح میں واقع ایک سینی ٹوریم میں داخل کردیا گیا۔ یہاں گرامچی کی ملاقات یوجینیا شوشٹ سے ہوئی، جو عمر میں گرامچی سے کچھ سال بڑی تھی اور وہ اطالوی زبان فراٹے سے بولتی تھی۔ یوجینیا کا باپ پُرانا انقلابی تھا اور زارشاہی نے اسے سائبیریا جلاوطن کردیا تھا۔ وہیں یوجینیا کی پیدائش ہوئی تھی بعد میں

یوجینی کے باپ نے جلاوطنی کے کئی سال فرانس اور اٹلی میں بتائے تھے۔
یوجینی کی چھوٹی بہن جولیا اُس سے ملنے سینی ٹوریم آیا کرتی تھی۔ گرامچی نے اپنے سرد دل میں محبت کا پہلا گرم جھونکا محسوس کیا اور اس کا سارا وجود تھرتھرا اٹھا۔ اب تک گرامچی اپنے ذہن میں ہی جیا تھا اور اُس نے اپنی جسمانی معذوری کے باعث کبھی یہ سوچا تک نہیں تھا کہ کوئی اس سے محبت کر سکتا ہے۔ ۲۶ سالہ حسین جولیا نے گرامچی کے نحیف جسم کے باوجود، اس کی آنکھوں کی چمک میں غیر معمولی توانائی کا احساس کیا ——— اور وہ دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔
اس تجربے نے گرامچی کے دل و دماغ پر خوشگوار اور گہرے اثرات مرتب کیے۔ گرامچی نے اپنے ان احساسات کو جولیا کے نام اپنے ایک خط میں یوں بیان کیا ہے:

”میں نے کتنی بار یہ سوچا ہے کہ کیا کسی ایسے آدمی کے لیے لوگوں کے ایک جمِ غفیر سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہے، جس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی ہو، اپنے والدین تک سے جو محبت نہ کر سکا ہو؟ کیا انسانوں کے ایک مجموعے سے محبت کرنا ممکن ہے، جبکہ خود اس سے کسی نے انفرادی سطح پر گہری محبت نہ کی ہو؟ کیا اس بات نے بحیثیت سیاسی کارکن میری زندگی کو متاثر نہیں کیا ہے؟ کیا اُس نے مجھے خشک دماغ نہیں بنایا اور بحیثیت انقلابی میری حیثیت کو کم نہیں کیا ہے اور جس نے مجھے محض ایسا انقلابی بنایا ہے، جو ہر چیز کو خالص ذہن، محض حسابی سطح پر دیکھتا ہے؟ میں نے ان سب باتوں کے بارے میں کافی سوچا ہے، اور پچھلے کچھ دنوں میں تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئی ہیں ——— یہ سوچتے ہوئے کہ تم کس طرح میری زندگی میں آئیں اور تم نے مجھے محبت دی، ایک ایسی شے جس سے میں ہمیشہ محروم رہا ہوں۔ یہی وہ محرومی تھی، جس نے مجھے تنک مزاج اور ترش رو بنا رکھا تھا...“

اُدھر اٹلی میں ٹریڈ یونین اور کوآپریٹیو انجمنوں کے دفاتر پر فاشسٹوں کے حملوں کی شدت اور تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۲ء کو کمنترن کی چوتھی کانگریس ماسکو میں شروع ہوئی۔ اٹلی میں فاشسٹ برسرِ اقتدار آ چکے تھے اور اٹلی کے شمالی اور وسطی صنعتی خطوں میں بائیں بازو کے رہنماؤں کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا اور انھیں فاشسٹ مسلح گروہ بنا روک ٹوک قتل کر رہے تھے۔ کمنترن نے اس مسئلہ پر غور کیا اور زنوویف، بخارن اور دوسرے سربرآوردہ بالشویکوں نے یہی رائے ظاہر کی کہ اٹلی کے محنت کش طبقہ اور سبھی جمہوری پارٹیوں کو متحد ہو کر فاشسٹ حملوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ اتحاد اب امکان کی حدود میں بھی تھا، کیونکہ اکتوبر میں اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی اصلاح پسندوں کو پارٹی سے خارج کر چکی تھی، لیکن کمنترن کے اس مشورہ کو اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی اب بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ مسولینی اور فاشسٹ پارٹی کا برسرِ اقتدار آنا ایک بورژوا حکومت

کی جگہ دوسری بورژوا حکومت کے قیام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، حالانکہ اس وقت اٹلی میں بورژوا جمہوریت کی جگہ بورژوا ڈکٹیٹرشپ قائم کی جا رہی تھی۔

گرامچی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر امادیو بوردیگا کی علیحدگی پسندی کی پالیسی کا مخالف تھا لیکن گرامچی کو خدشہ تھا کہ اس مرحلہ پر بوردیگا کی مخالفت کی گئی تو اس کے غیر متوقع نتائج نکل سکتے ہیں اور پارٹی مزید پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن اپنی اس رائے کے باوجود گرامچی نے کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کے اُس بازو کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، جو کمنترن کا حامی تھا۔ دونوں پارٹیوں میں اتحادی رشتہ قائم کرنے کے لیے ایک چودہ نکاتی تجویز تیار کی گئی اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ بوردیگا نے اس کمیٹی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تو اس کی جگہ گرامچی کو نامزد کیا گیا۔

لیکن گرامچی اٹلی واپس نہ جا سکا۔ مشترکہ کمیٹی کے سوشلسٹ رکن سیراتی کو اٹلی واپس پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا، جبکہ ایک اور رکن تاسکا کو فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینا پڑی۔ گرامچی ماسکو میں ہی مقیم رہا۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے جولیا اور اُس کی ملاقاتیں پل بھر کی ملاقاتیں بن کر رہ گئی تھیں۔

۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو اٹلی میں بوردیگا اور دوسرے اہم کمیونسٹ لیڈر بھی گرفتار کر لیے گئے۔ کمنترن نے اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد جون ۱۹۲۳ء کو اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ سنبھالنے کے لیے ایک نئی ایگزیکٹیو کمیٹی نامزد کی، لیکن ستمبر کے مہینے میں اس نئی ایگزیکٹیو کمیٹی کے سب ارکان میلان میں اس وقت گرفتار کر لیے گئے جب ایک مزدور کے گھر میں ان کی میٹنگ چل رہی تھی۔ کمنترن نے گرامچی کو ماسکو سے وائنا بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اٹلی کی سرحدوں سے قریب رہ کر اٹلی کی پارٹی کی صورتِ حال پر نظر رکھ سکے اور اس بحرانی دور میں اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس طرح سے کمنترن کی نظر میں گرامچی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کا سب سے ذمہ دار لیڈر بن گیا۔ اس وقت گرامچی کی عمر بتّیس سال تھی۔

جولیا کو ماسکو میں چھوڑ کر گرامچی نومبر ۱۹۲۳ء کے اواخر میں وائنا پہنچا۔ ماسکو میں گرامچی کا قیام ڈیڑھ سال تک رہا تھا اور اس قیام نے گرامچی کے دل و ذہن پر ناقابلِ مندمل اثرات چھوڑے تھے۔ وائنا میں گرامچی گمنام، خفیہ اور الگ تھلگ زندگی جینے پر مجبور تھا، کیونکہ بصورتِ دیگر اس کے پکڑے جانے کا خدشہ تھا۔ تنہائی کا احساس گرامچی کے دل و دماغ کو ایک بار پھر ڈسنے لگا اور اسے جولیا کی جدائی شاق گزرنے لگی۔ جولیا کے نام اپنے خطوط میں گرامچی نے بار بار اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس وائنا آ جائے تاکہ جدائی کے یہ تکلیف دہ دن اور راتیں ختم ہو جائیں، لیکن جولیا اپنے گھر بار کی الجھنوں کی وجہ سے وائنا آنے سے معذور تھی۔ اعصابی کمزوری کے علاوہ، اس وقت جولیا حاملہ تھی اور جب گرامچی کو جولیا کے خط میں اس کی اطلاع ملی تو اُسے جولیا کی جدائی اور بھی کھلنے لگی۔

وائنا میں ساڑھے پانچ مہینے کے قیام کے دوران گرامچی نے انتھک کوشش کی کہ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے مختلف گروہ آپس میں متحد ہو سکیں اور اٹلی کی دوسری جمہوریت پسند طاقتوں کے اشتراک و تعاون سے فاشزم کے اُس خطرہ کا مقابلہ کر سکیں، جو اب واہمہ سے سنگین حقیقت بن چکا تھا۔ فاشزم نے اپنی پوزیشن کافی مستحکم کر لی تھی اور طاقت کے اس استحکام کے بعد فاشزم کے سائے میں ۶ر اپریل کو پارلیمانی چناؤ ہوئے تھے۔ گرامچی بھی ایک حلقۂ انتخاب سے امیدوار تھا اور غیر حاضری کے باوجود گرامچی کو عوام کی تائید و حمایت حاصل ہوئی تھی اور اُسے ایک حلقۂ انتخاب سے

نمائندہ چُن لیا گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو قوانین کے تحت گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پارلیمانی تحفظ کی رُو سے گرامچی گرفتاری سے محفوظ تھا۔ چنانچہ، گرامچی دو سال کی غیر حاضری کے بعد اٹلی واپس پہنچا اور اُسے پچھلے دو سال کے خوں آشام واقعات کا ذاتی طور پر علم ہوا۔ خود گرامچی کا بھائی گنّارو فاشسٹوں کے تشدد کا شکار ہوا تھا اور اس نے فرار ہو کر فرانس میں پناہ لی تھی۔

فاشزم کے عروج کے باوجود، اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی شدید اختلافات اور گروہ بندی کا شکار تھی۔ بوردیگا اب پارٹی کا لیڈر نہیں رہا تھا لیکن پارٹی پر اب بھی اس کا اثر و نفوذ باقی تھا۔ صورتِ حال حوصلہ شکن تھی، مگر گرامچی نے پھر بھی پارٹی کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا، کیونکہ گرامچی کا یہ عقیدہ تھا کہ افکار و خیالات میدانِ عمل میں ہی اپنی توانائی اور کھرا پن ثابت کرتے ہیں۔

گرامچی کی واپسی کو ایک مہینہ بھی نہیں بیتا تھا کہ پارلیمنٹ کے سوشلسٹ رُکن، میتوتی کو پُراسرار طریقے سے غائب کر دیا گیا۔ فاشسٹ حکومت کی پولیس نے اخبارات کو وارننگ دی کہ اس گمشدگی کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ کی جائے۔ میتوتی نے پارلیمنٹ میں فاشسٹ دہشت انگیزی کی شدید مذمت کی تھی۔ میتوتی نے مسولینی پر الزام لگایا کہ اگر فاشسٹ چناؤ میں کامیاب نہ ہوتے تو مسولینی نے تشدد استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس پر فاشسٹ بنچوں سے شور اُٹھا تھا: ”ہاں، ہاں!“، اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد جب میتوتی بیٹھا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”تم لوگ میرے جنازہ پر کی جانے والی تقریر تیار کر لو۔“ چند دن بعد ہی میتوتی کو فاشسٹوں کے ایک مسلّح غول نے ہلاک کر دیا اور اس کی لاش روم سے پندرہ میل دُور ایک جنگل میں دفن کر دی گئی، جس کا پتہ دو مہینے بعد ہی مل سکا۔

میلان سے شائع ہونے والے ”لا یونیٹا“ کو بھی پولیس نے میتوتی کی گمشدگی کے بارے میں کوئی خبر نہ چھاپنے کی دھمکی دی تھی۔ پولیس کے استبداد کے خطرے کے علاوہ، اخبار کے دفتر کے باہر سیاہ پوش فاشسٹ ٹولیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ گرامچی نے اس اخبار کے ایڈیٹر کو روم سے ٹیلی فون کیا۔ گرامچی نے ہدایت کی کہ اس معاملے پر فاشسٹ حکومت پر سخت ترین حملہ کیا جانا چاہیے۔ اگلے دن اخبار شائع ہوا تو اس کی شاہ سُرخی تھی: ”قاتلوں کی اس حکومت کو ختم کر دو!“

اس واقعہ اور خبر نے فاشسٹ دہشت انگیزی کے خلاف عوام کے سلگتے ہوئے جذبات میں آگ لگا دی اور عوام کے سلگتے ہوئے یہ جذبات غیظ و غضب کی صورت میں اُبل پڑے اور وہ فاشسٹ دہشت انگیزوں پر پل پڑے، لیکن عوام کے اس غیظ و غضب کو کنٹرول اور منظم کرنے والی کوئی طاقت اٹلی میں نہیں تھی۔

فاشسٹوں کی اس دہشت انگیزی کی مخالفت کرنے والی مختلف پارٹیاں بھی بطور احتجاج صرف پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کرنے پر ہی متفق ہو سکیں، لیکن یہ پارٹیاں ایک دوسرے کی اتنی ہی مخالف تھیں، جتنی کہ فاشزم کی۔ ان پارٹیوں کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی تھی کہ یہ سب پارٹیاں سوشلزم کی بھی کٹر مخالف تھیں۔ اُدھر سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے بیچ الگ سے ایک کھائی حائل تھی۔

اس طرح فاشسٹوں کو مخالف قوتوں کے کسی متحدہ محاذ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گرامچی نے پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کرنے والی پارٹیوں کے سامنے ملک گیر پیمانے پر سیاسی ہڑتال کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن ان پارٹیوں نے گرامچی کی تجویز کو ٹھکرا دیا، کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ اس ہڑتال کی لیڈرشپ کمیونسٹوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ کمیونسٹ پارٹی کی علیحدگی پسندی اور انتہا پسندی نے بھی ان پارٹیوں کو اس سے متنفر اور خوفزدہ کر رکھا تھا، کیونکہ بوردیگا بدستور اپنے اس عقیدہ پر قائم تھا کہ

کمیونسٹ پارٹی کا مقصد ڈکٹیٹرشپ کا قیام ہے اور کمیونسٹ پارٹی کی بورژوا جمہوریت کی بحالی کے لیے کسی سے کوئی تعاون واشتراک نہیں کرنا چاہیے، جبکہ گرامچی جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے کوشاں تھا۔

ان سیاسی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف رہنے کے باوجود، گرامچی نے جولیا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ جولیا کو اب بھی محبت بھرے خطوط لکھتا تھا۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۴ء کو جولیا نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا، لیکن گرامچی کو دو ہفتے بعد خبر ملی کہ وہ ایک لڑکے کا باپ بن گیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد جولیا سے جدائی کا غم گرامچی کے لیے دوگنا ہو گیا۔

فاشسٹ حکمرانوں کے خلاف عوام کے غیض وغضب کے غیر منظم مظاہرے سے گرامچی بھی کچھ عرصہ کے لیے اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ فاشزم اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے۔ گرامچی نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی تھی، جس میں اسی خوش فہمی کا اظہار کیا گیا تھا' جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ فاشسٹ ایک بار پھر سنبھل گئے تھے اور غیر منظم اور غیر مؤثر اپوزیشن اُن کے ہوش ٹھکانے لگانے میں ناکام رہی تھی اور فاشسٹوں نے اپنے مخالفین کو ایک بار پھر تشدد و دہشت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جوابی کارروائی کے طور پر، روم میں پارلیمنٹ کے ایک فاشسٹ ممبر، ارماندو کاسالینی کو ایک نوجوان نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

گرامچی کی نقل وحرکت محدود ہو گئی، کیونکہ فاشسٹ پولیس اب دن رات اس کی "نگرانی" کرنے لگی تھی۔ پھر بھی گرامچی چھپ چھپا کر خفیہ میٹنگوں میں شامل ہونے کا موقع نکال لیتا تھا۔ اسی دور میں اسے ایک بار دس دن کے لیے اپنے گھر، گلرزا جانے اور ماں باپ، بھائی، بہنوں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ یہ ملاقات ان کی آخری ملاقات ثابت ہونے والی تھی۔

جولائی ۱۹۲۵ء میں گرامچی نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی، جس میں کہا گیا تھا:

> "کیا فاشزم اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ممکن ہے؟ ... اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ... اپنی تنظیمی نوعیت کے اعتبار سے بھی فاشزم برابری کی سطح پر تعاون واشتراک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ فاشزم کے تحت کوئی نمائندہ اسمبلی وجود میں نہیں آسکتی۔ فاشسٹ حکومت ہر اسمبلی کو ایک مسلح کیمپ کی شکل دے دیتی ہے یا اسے رنڈی خانے کا ایسا نغلی کمرہ بنا دیتی ہے جو سب سے نچلی سطح کے بدمست کارکنوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے ..."

کچھ جمہوری پارٹیاں اب بھی اس غلط فہمی کا شکار تھیں کہ فاشسٹوں کی دہشت انگیزی میں مسولینی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ بس، فاشسٹ پارٹی سے چند انتہا پسندوں کا اخراج ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا مگر، ۳ دسمبر کو مسولینی نے اس غلط فہمی کو صاف اور کھلے الفاظ میں پارلیمنٹ کے سامنے دُور کر دیا۔ اس وقت تک مسولینی زبانی طور پر آئین اور قانون کی قسمیں کھاتا تھا اور عملی سطح پر قانون اور آئین کے خلاف اپنے حواریوں کی تمام سرگرمیوں کی تائید و حمایت کرتا تھا، لیکن مسولینی نے اپنے اس دوغلے پن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پارلیمنٹ کے سامنے اعلان کیا:

"میں یہاں، اس وقت تمام اطالوی عوام کے سامنے اور اس اسمبلی کے سامنے اعلان کرتا

ہوں کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کی سیاسی، اخلاقی اور تاریخی ذمہ داری میں اور صرف میں قبول کرتا ہوں۔ اگر فاشزم ایک مجرمانہ سازش ہے تو سب سے بڑا سازشی میں ہوں۔

اس دریدہ دہن اعلان کے تین دن کے اندر اندر ۳ سے ۶ جنوری ۱۹۲۵ء کے دوران، کئی سیاسی تنظیموں اور ان کی شاخوں پر فاشسٹ پولیس نے تالے ڈال دیے۔ اسی عرصہ میں ساڑھے چھ سو سے زیادہ، رہائشی گھروں کی تلاشی لی گئی اور سینکڑوں لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اپوزیشن کے اخبارات کے دفاتر پر تالے ڈالے جانے لگے۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو ماسکو میں کمنترن کی ایکزیکیٹو کی میٹنگ منعقد ہونے والی تھی۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے وفد کی قیادت گرامچی کو سونپی گئی۔ گرامچی فروری کے اواخر میں ماسکو پہنچا۔ وہ جولیا سے ڈیڑھ سال بعد اور اپنے بچے دلیو سے پہلی بار ملا۔ ماسکو پہنچنے کے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس سے گرامچی کافی متاثر ہوا۔ گرامچی اور جولیا نے بچے کی ڈاکٹر کو ایک خوبصورت تصویر پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تصویر پر گرامچی اور جولیا نے دستخط کیے۔ جولیا کی بہن یوجینی نے، جو سینی ٹوریم میں گرامچی کے ساتھ زیر علاج رہی تھی، جولیا کے دستخط کے نیچے اپنے دستخط کر کے نیچے لکھ دیا: " دونوں ماؤں کی طرف سے " ظاہر ہے یوجینی اپنے اعصابی مرض سے کلی طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی اور وہ خود کو بچے کی ماں سمجھتی تھی۔

کمنترن نے اس کانگریس میں بھی اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کو اٹلی کی جمہوریت پسند اور فاشزم دشمن طاقتوں سے اتحاد قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ گرامچی ۲۸ اپریل کو اٹلی واپس آ گیا۔ اس وقت حکومت فری میسن تنظیم پر پابندی لگانے کے لیے قانون کا مسودہ تیار کر رہی تھی، لیکن اس قانون کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ حکومت کسی بھی تنظیم پر اس قانون کی مدد سے پابندی لگا سکتی تھی۔

۱۶ مئی ۱۹۲۵ء کو گرامچی پارلیمنٹ میں افتتاحی تقریر کرنے کے لیے داخل ہوا۔ مسولینی اور گرامچی کے درمیان یہ پہلا آمنا سامنا تھا۔ مسولینی، جو ۱۹۱۴ء تک سوشلسٹ اخبار " اوانتی " کا ایڈیٹر رہا تھا۔ دونوں اس سے پہلے ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے، کیونکہ گرامچی کی تحریریں " لا اوردائن نوؤو " کے علاوہ " اوانتی " کے تورین ایڈیشن میں بھی شایع ہوتی تھیں، لیکن مسولینی اب فاشسٹ پارٹی کا لیڈر تھا اور گرامچی پارلیمنٹ میں بائیں بازو کی اپوزیشن کا لیڈر۔

گرامچی بلند بانگ مقرر نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود جب گرامچی نے اپنی دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا تو پارلیمنٹ کے فاشسٹ ممبر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اگلے دن روم کے اخباروں میں مسولینی کا ایک فوٹو شایع ہوا، جس میں وہ آگے جھکا ہوا، کان پر ہاتھ رکھے گرامچی کی تقریر سن رہا تھا۔ گرامچی نے فری میسن پارٹی اور فاشزم کی طبقاتی نوعیت کا تار و پود بکھیرا اور کہا کہ " فری میسن پارٹی اور فاشسٹ پارٹی میں کوئی بنیادی طبقاتی فرق نہیں ہے، بنیادی طور پر دونوں پارٹیاں ایک ہی طبقے کی پارٹیاں ہیں۔ فری میسن پارٹی شہری بورژوا طبقہ کی نمائندہ ہے، جبکہ فاشزم دیہی بورژوا طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ اس بنا پر فری میسن اقتدار کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ لینا چاہتا ہے کہ فری میسن حکمران طبقہ اس کے خیال میں محنت کش طبقہ پر وہ سختی نہیں کر رہا، جو اسے کرنی چاہیے " گرامچی نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ فری میسن

پارٹی بالآخر فاشسٹ پارٹی میں جذب ہوجائے گی :

" . . . چونکہ پوری کی پوری فری مین تحریک فاشسٹ پارٹی میں ضم ہوجائے گی اور اس کا ہی ایک حصہ بن جائے گی، اس لیے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس قانون کے ذریعہ مزدوروں اور کسانوں کو وسیع پیمانے پر منظم ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس قانون کا یہی مقصد ہے اور اس کے یہی معنی ہیں۔"

گرامچی کی تقریر کے دوران مسولینی اور دوسرے فاشسٹ ممبروں نے مداخلت کرکے گرامچی سے بحث شروع کرنا چاہی، لیکن اس قسم کے بحث مباحثہ میں پڑنے کے بجائے، گرامچی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا :

" آپ حکومت پر قابض ہوسکتے ہیں، آپ آئین میں تبدیلی کرسکتے ہیں، آپ تنظیموں کی اُن صورتوں کو ختم کرسکتے ہیں، جن میں وہ اب تک کام کرتی رہی ہیں، لیکن آپ ان معروضی حالات پر حاوی نہیں ہوسکتے جو خود آپ کے افعال کا تعین کررہے ہیں۔ آپ صرف پرولتاریہ کو نیا تنظیمی روپ اختیار کرنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔ اس فورم سے، ہم اٹلی کے محنت کش طبقہ اور کسانوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں : قوم کی انقلابی طاقتیں ہرگز تباہی کو قبول نہیں کریں گی اور آپ حضرات کا تاریک خواب کبھی حقیقت نہیں بن سکے گا۔"

گرامچی کے تقریر ختم کرتے ہی پارلیمنٹ میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ پارلیمنٹ میں گرامچی کی یہ افتتاحی تقریر اُس کی الوداعی تقریر بھی ثابت ہوئی، کیونکہ پارلیمنٹ میں محنت کش طبقہ کی نمائندگی کے دور کا خاتمہ قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ گرامچی کی تقریر سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے اس خطرہ کا مکمل احساس تھا۔ فاشزم کی دہشت انگیزی کی سیاہ کارروائیوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگریس جنوری ۱۹۲۶ء لیونز میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس کانگریس کے سامنے پیش کرنے کے لیے گرامچی اور تولگیاتی نے ایک دستاویز تیار کی۔ اس دستاویز میں اٹلی کی اُس وقت کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا :

" فاشزم کے تمام تر پروپگنڈا اور اس کے تمام تر سیاسی اور اقتصادی اقدامات کا رجحان امپریلزم کی ہی طرف ہے۔ یہ رجحان اٹلی کے زرعی، صنعتی حکمران طبقے کی اِس ضرورت کو ظاہر کرتا ہے کہ اٹلی کے سماج کے بحران کا حل، اٹلی کے باہر کسی سماج میں تلاش کیا جائے۔ اس رجحان میں ایک ایسی جنگ کے بیج پوشیدہ ہیں، جو بظاہر اطالوی توسیع کے لیے لڑی جائے گی، مگر جو اصلیت میں فاشسٹ اٹلی کو اُن امپریلسٹ گروہوں میں سے کسی ایک گروہ کے ہاتھ کا کھلونا بنا دے گی، جو دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔"

اس دستاویز میں اٹلی کی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام فاشزم کے ذریعہ استحکام حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اُس میں اُن عوامی طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا، جو اس فاشزم دشمن جدوجہد میں محنت کش طبقہ کا ساتھ دیں گی۔ ساتھ ہی اس میں بورژوا طبقہ کی اُن طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا جو حتمی

طور پر فاشزم سے ناطہ جوڑ چکی تھیں اور ان بورژوا طاقتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا، جو فاشزم کے خلاف جدوجہد میں اشتراک و تعاون کر سکتی تھیں۔

اس بحرانی دور میں جب گرامچی کو یہ خبر ملی کہ جولیا روم آرہی ہے تو وہ خوش ہونے کے بجائے ہراساں ہو گیا، کیونکہ ان بحرانی حالات میں اس کا روم آنا خطرہ و خدشے سے خالی نہ تھا۔ لیکن جولیا ڈیلیو کو لے کر روم پہنچ گئی۔ اس نے روم میں روسی سفارت خانہ میں اس لیے ملازمت حاصل کرلی تھی کہ وہ گرامچی کے قریب رہ سکے، لیکن گرامچی نے اس خیال سے جولیا کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنا مناسب نہیں سمجھا کہ حکومت جولیا کا ویزا رد نہ کردے۔ پھر بھی وہ روزانہ کچھ نہ کچھ وقت جولیا اور ڈیلیو کے ساتھ گزارتا تھا۔

جنوری ۱۹۲۶ء کے اواخر میں گرامچی سرحد پار کر کے فرانس پہنچا، جہاں لیونز میں کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی۔ کانگریس کے سامنے گرامچی کی دستاویز بھی پیش کی گئی اور گرامچی نے بائیں بازو کے انتہا پسندانہ رجحان کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا:

"کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے، جہاں پرولتاریہ اپنے طور پر اقتدار حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے کی پوزیشن میں ہو۔ چنانچہ، اسے ہمیشہ اتحادیوں کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسے ایسی پالیسی اپنانی چاہیئے، جس کے ذریعے وہ سبھی سرمایہ دار دشمن طبقات کی لیڈر شپ حاصل کر سکے۔ اٹلی میں اس سوال کی خاص اہمیت ہے، کیونکہ یہاں پرولتاریہ ایک اقلیت ہے۔ اور جہاں وہ جغرافیائی لحاظ سے اس طرح منتشر ہے کہ وہ اس وقت تک اقتدار کے لیے کامیاب جدوجہد کی رہنمائی نہیں کر سکتا، جب تک وہ کسانوں کے طبقے سے اپنے تعلق کے مسئلے کو صحیح حل نہیں کر لیتا۔ فوری مستقبل میں ہماری پارٹی کو اس مسئلے کی توضیح اور حل پر توجہ دینی چاہیئے۔"

گرامچی کی تجویز دستاویز کے حق میں ۹۰ فی صد ووٹ ملے، جبکہ بوردیگا کے زیر اثر بائیں بازو کے انتہا پسندوں کو ۹،۲ فیصد ہی ووٹ مل پائے۔ بوردیگا نے انٹرنیشنل سے اپیل کی کہ کانگریس کے انعقاد میں بے ضابطگیاں ہوئی ہیں، مگر کمنترن نے اس اپیل کو رد کر دیا۔

اٹلی میں حالات پیچیدہ اور سنگین ترین رخ اختیار کرتے جارہے تھے۔ ایک طرف فاشسٹوں کی دہشت انگیزی جاری تھی۔ دوسری طرف مسولینی پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا۔ ایک ۶۲ سالہ انگریز عورت، وائلٹ گبسن نے مسولینی پر گولی چلادی، لیکن اس کا نشانہ خطا گیا اور مسولینی کی ناک پر ہلکا سا زخم آیا۔ انتقامی کارروائی کے طور پر فاشسٹ جوانوں کے مسلح گروہوں نے دو آزاد اخباروں کے دفاتر نذر آتش کر دیے۔

جولیا پھر دنوں سے تھی، لیکن بحران کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر ماسکو واپس نہ جاسکے تو کم سے کم روم سے باہر چلی جائے۔ چنانچہ اگست کے شروع میں جولیا، ڈیلیو اور یوجینی روم سے روانہ ہو گئے۔ ۱۳ اگست کو ترانوئی کے مقام پر جولیا نے ایک اور لڑکے کو جنم دیا۔ ستمبر میں ڈیلیو اپنی خالہ اور ماں کے ساتھ روس کے لیے روانہ ہو گیا۔ گرامچی

کو دوبارہ اپنے بیوی بچے کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ادھر اٹلی میں فاشزم کی تاریک قوتوں کی بہیمیت سے منتشر اور کمزور جمہوری اور عوامی طاقتیں نبرد آزما تھیں اور اُدھر سوویت روس میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ اس کشمکش نے اٹلی کے کمیونسٹوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو گرامچی نے اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکیٹو کی طرف سے سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو ایک خط لکھا، جس میں روس کی کمیونسٹ پارٹی سے دردمندانہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس نظریاتی بحث کے دوران صرف روس کے حالات کے بارے میں ہی نہ سوچیں بلکہ اس کشمکش کے بین الاقوامی اثرات کو بھی پیش نظر رکھیں۔

گرامچی کا خط موصول ہونے کے بعد، کمنترن نے روسی کمیونسٹ پارٹی میں جاری نظریاتی بحث کا پس منظر اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سامنے پیش کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ سوئٹزرلینڈ بھیجا، لیکن اس نمائندے اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے درمیان میٹنگ سے قبل، ۳۱ اکتوبر کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حالات دگرگوں ہو گئے۔

اس دن بولونا میں مسولینی پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا اور اس حملے کا ذمہ دار اس بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کو گردانا گیا۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد، فاشسٹ دہشت انگیزی نے نہایت بھیانک روپ لے لیا۔ اور گرامچی اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کی نقل و حرکت نہایت محدود ہو گئی۔

۵ نومبر کو فاشسٹ حکومت نے بولونا کے واقعہ کا سہارا لے کر رہی سہی جمہوری آزادی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ تمام پاسپورٹ رد کر دیے گئے اور فاشسٹ دشمن اخبارات کو بند کرنے کے ساتھ ساتھ اُن پارٹیوں اور تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی، جو فاشزم کی مخالف تھیں۔

اس پابندی کے باوجود، گرامچی نے ۹ نومبر کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اُسی رات کو ساڑھے دس بجے فاشسٹ پولیس نے گرامچی کو حراست میں لے لیا۔ گرفتاری کے کچھ دن بعد گرامچی نے جولیا کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"تم کہا کرتی تھیں کہ ہم دونوں اتنے جوان ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے پروان چڑھتے دیکھنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اب بھی ہمیں اس اُمید کو تروتازہ رکھنا ہے اور جب بھی تم میرے بارے میں، بچوں کے بارے میں، سوچو تو تمہارے دل میں یہ اُمید تروتازہ ہونی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مستقل مزاج اور ثابت قدم رہو گی۔ ماضی سے بھی زیادہ، تاکہ بچوں کی معقول طریقے سے پرورش ہو سکے اور وہ تمہارے شایانِ شان ثابت ہو سکیں۔"

اور اس نے اپنی ماں کو لکھا:

میں نے تمہارے بارے میں پچھلے کچھ دنوں میں بہت زیادہ سوچا ہے۔ میں نے اس تازہ دُکھ کے بارے میں بھی سوچا، جو اس عمر میں میں نے تمہیں پہنچایا ہے

اور ان تمام دکھوں کے بارے میں بھی، جو تم اب تک سہہ چکی ہو۔ ان سب کے باوجود تمھیں چٹان کی سی مضبوطی سے اس کا سامنا کرنا ہے ——— مجھ سے زیادہ مضبوطی سے۔ اور تمھیں مجھے معاف کر دینا ہے اپنی عظیم محبت کے تمام تر گداز اور نیکی کے ساتھ۔ میرے لیے یہ جاننا ہی مزید حوصلے کا باعث ہوگا کہ تم اس دکھ کو صبر و تحمل اور استقامت کے ساتھ برداشت کر رہی ہو۔ ۔ میں پرسکون ہوں۔ ذہنی طور پر میں کسی بھی چیز کے لیے تیار تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ جو بھی اذیتیں پیش آئیں، انھیں میں جسمانی سطح پر پورے تحمل کے ساتھ برداشت کر سکوں اور پرسکون رہ سکوں ——— پیاری امّاں، سبھی پیارو، اس لمحے یہ سوچ کر میرا دل اور بھی بھاری ہو گیا ہے کہ میں تم سب کو وہ محبت اور سکھ نہیں دے سکا، جو مجھے دینا چاہیے تھا اور جس کے تم سبھی مستحق تھے۔ اس کے باوجود، مجھے تم لوگ جو بھی محبت دے سکو، دو اور مجھے یاد رکھو۔"

یہاں سے گرامچی کی زندگی کا، فاشزم کی کال کوٹھریوں میں وہ دس سالہ دور شروع ہوا، جس کے دوران انتونیو گرامچی نے فاشزم کی تاریک اور بہیمانہ قوت کے خلاف جسمانی آزار اور صعوبتیں سہتے ہوئے اپنے ذہن کو ایک مشعل کی مانند فروزاں رکھا اور جس طرح فروزاں رکھا، وہ بجائے خود ایک الگ ولولہ انگیز داستان ہے اور ایک مزید مضمون کی محتاج۔

دس برس لمبی رات

اقبال اختر

۸ نومبر ۱۹۲۶ء کو رات کے ساڑھے دس بجے مسولینی کی فاشسٹ پولیس نے انتونیو گرامچی کو گرفتار کرلیا۔ فاشزم کی کال کوٹھریوں میں گرامچی کی یہ کالی رات دس سال، چار مہینے، ۱۹ دن لمبی تھی۔ ۲۷ راپریل ۱۹۳۷ء کو صبح چار بجکر دس منٹ پر ذہن کی دُنیا کا یہ اسپارٹکس، جس کا ذہن زندگی کی تاریک ترین قوتوں کے خلاف ایک مشعل کی طرح فروزاں رہا تھا، سدا کے لیے خاموش ہوگیا۔ موت اور فاشزم کے جبر کے خلاف گرامچی کے نحیف و نزار، مختلف مہلک عوارض کے عرصۂ دراز سے شکار جسم نے ایک ولولہ انگیز جدّ و جہد کے بعد ہی شکست تسلیم کی تھی، جبکہ اس کا باغی ذہن آخری لمحہ تک ایک برہنہ و روشن تلوار کی مانند تاریکی کے سینہ کو چاک کرنے کا کوشاں رہا تھا۔

گرامچی کو شہید بننے یا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا قطعی کوئی شوق نہیں تھا۔ گرفتاری کے کچھ دن بعد ہی گرامچی نے اپنی بیوی جولیا کی بڑی بہن تاتیانہ کے نام ایک خط میں شکایتی لہجہ میں لکھا تھا: "مجموعی طور پر تم مجھے ایک ایسے شخص کے رُوپ میں دیکھتی ہو، جو اپنے اذیت سہنے، شہید بننے کے حق پر مُصر ہو، جو اپنی سزا کے ایک بھی لمحہ یا ذرّہ سے محروم رہنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ تم مجھے ایک اور گاندھی سمجھتی ہو، جو دنیا کے سامنے ہندوستانی عوام کے دکھوں کا شاہد ہے۔ ۔ ۔" گرامچی کو افعال کے عملی نتائج کا شدید احساس تھا اور وہ ہمیشہ ادھ کچرے اور نامکمل افعال سے بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ، گرامچی جیل کی زندگی کے دوران ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے دُکھ کو جھیلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا جس سے بچنے کے لیے جیل کے قوانین میں جواز موجود تھا۔ جیل کے قوانین کے مطابق، اُسے لکھنے پڑھنے کا سامان اور کتابیں مانگنے کا حق تھا۔ اسے یہ بھی حق تھا کہ بیمار پڑنے پر وہ جیل کے طبی مرکز میں بھیجے جانے کی مانگ کرے، اپنے لیے الگ کوٹھری کا مطالبہ کرے یا دوبارہ مقدمہ چلائے جانے یا ضمانت پر رہا کیے جانے کا مطالبہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی گرامچی نے کبھی کوئی ایسا حق طلب نہیں کیا، جس کا وہ قانوناً مجاز نہیں تھا اور نہ کبھی اس نے کوئی ایسی رعایت ہی مانگی، جس سے اس کے کردار پر حرف آتا۔

گرامچی کا رویہ کیا تھا، اس کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو گرامچی نے اپنے بھائی کارلو کے نام لکھا تھا:

"اس وقت میرے لکھنے لکھانے کے حق کو تسلیم کرانے کے سلسلے میں کارروائی چل رہی ہے۔ یہ کارروائی کامیاب ہونی چاہیے۔ ۔ ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تاتیانہ پھر اس بارے میں افسانے گڑھ رہی ہے کہ صحت کے اسباب کے سہارے میری

قید کو کس طرح گھر بیٹ قید میں بدلا جاسکتا ہے۔ . . . درحقیقت، ایسا ہوا تو یہ میرے لیے ایک ذاتی رعایت ہی ہوگی اور یہ رعایات صرف اس صورت میں ہی مل سکتی ہیں جب کہ میں سرکاری طور پر درخواست دوں، اور اس میں وجہ یہ بتاؤں کہ میں نے اپنے خیالات بدل لیے ہیں، میں اب اس بات، اُس بات کو تسلیم کرنے لگا ہوں۔ . . تاتیانہ کبھی ان باتوں کے بارے میں نہیں سوچتی۔ اس کی یہ انتہائی تیز فہمی بعض اوقات مجھے خوف زدہ کردیتی ہے، کیونکہ کسی کے آگے، کسی چیز کے لیے گھٹنے ٹیکنے یا اپنے برتاؤ میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اتنا صابر ضرور ہوں کہ اس رویّے کے جو بھی نتائج نکلیں، میں سکونِ قلب سے اُن کا سامنا کرسکوں۔ کچھ عرصے سے میں جاننے لگا تھا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس حقیقت کے احساس نے ہی میری قوتِ ارادی کو مضبوط بنایا ہے۔ بات جب ایسی ہو تو تاتیانہ کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایسے من گھڑنت افسانوں کا تذکرہ تک کرنا غلط بات ہے، کیونکہ ان کے تذکرہ سے ہی کوئی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ میں ہی ان امکانات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ . . .“

خود تاتیانہ کو گرامچی نے اس بارے میں کافی سخت اور کھرے انداز میں لکھا تھا: ” . . . تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس قسم کے معاملات میں تم میری عزت اور میرے وقار کی اہمیت کو سمجھنے کے ناقابل، قطعی طور پر ناقابل ہو؟ . . .“

گرفتاری کے فوری بعد گرامچی کو اُستیکا نامی ایک جزیرے میں بھیج دیا گیا، جہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ اس چھوٹے سے جزیرہ کی آبادی . . . ۱،۶ نفوس پر مشتمل تھی، جن میں سے پانچ چھ سو غیر سیاسی قیدی تھے۔ گرامچی کو جن سیاسی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا اُن میں دو سوشلسٹ ممبران پارلیمنٹ اور تین کمیونسٹ شامل تھے۔ اُن میں آمادیئو بوردیگا بھی تھا جس کے نظریات کی گرامچی نے پارٹی میں جم کر مخالفت کی تھی، لیکن ان اختلافات کو بھلا کر قید کی زندگی میں کچھ نظم و ضبط لانے میں وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگے۔

مطالعہ کے لیے گرامچی کو کتابیں بھی میسر آگئیں۔ تورین میں طالب علمی کے زمانے میں گرامچی اور پیئر و زرافا کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے۔ یہی دوستانہ تعلقات اس آڑے وقت میں کام آئے۔ پیئر و زرافا نے، جو کالیاری یونیورسٹی میں معاشیات کا پروفیسر تھا، میلان کے ایک کتب فروش کے یہاں گرامچی کے نام سے ایک کھلا کھاتہ کھلوا دیا۔ اس طرح جو کتابیں گرامچی کو موصول ہوئیں، وہ اس اسکول میں بھی کام آئیں، جو استیکا کے سیاسی قیدیوں نے قائم کیا تھا۔ گرامچی استاد بھی تھا اور طالب علم بھی۔ وہ تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا تھا اور خود جرمنی سیکھتا تھا۔ سائنس پڑھانے کی ذمہ داری بوردیگا نے اُٹھا رکھی تھی۔ استیکا میں قید کی زندگی کا یہ رنگ ڈھنگ صرف ۴۴ دن تک ہی باقی رہا، کیونکہ ۲۰ جنوری، ۱۹۲۷ء کو اُسے میلان کی سان ویتورے جیل میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کردیے گئے۔

گرامچی کو کڑاکے کی سردی میں یہ سفر پیدل طے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئیں اور ہتھ کڑیوں کے باوجود اُسے اپنا چھوٹا موٹا سامان اُٹھا کر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا۔ اس اذیت ناک سفر کے بعد سان ویتورے جیل اُسے جنت ہی معلوم ہوئی۔ جیل پہونچنے کے دو دن بعد، ایک مجسٹریٹ نے اُس سے ابتدائی پوچھ گچھ کی۔ گرامچی اپنے بارے میں فکر مند نہیں تھا، لیکن وہ اپنی ماں کی طرف سے ضرور فکر مند تھا۔ اس نے اپنی ماں کو خط لکھ کر اس فکر و تردّد کو دور کرنے کی کوشش کی۔

”ضرورت قوتِ برداشت کی ہے اور خوش قسمتی مجھ میں یہ بدرجہ اتم موجود ہے، ٹنوں کے حساب سے گاڑیاں بھر کے کئی گھر بھر کے (تمھیں یاد ہوگا جب کار لو چھوٹا سا تھا اور کوئی مٹھائی اُسے خاص طور پر پسند آتی تھی تو وہ کہا کرتا تھا،

مجھے یہ سوگنا بھر کے چاہیے!، تو مجھ میں بھی اتنی ہی قوتِ برداشت ہے، سوگنا بھر کے، اس سے بھی زیادہ) مگر تمھیں بھی قوتِ برداشت کی ضرورت ہے۔ تمھارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری ذہنی حالت بالکل مختلف ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم بوڑھاپے کا احساس کررہی ہو، مگر میرا یقین ہے کہ تم اب بھی مضبوط اور توانا ہو، اپنے بوڑھاپے کے باوجود اور ان تمام غموں اور آفات کے باوجود، جو تم نے جھیلی ہیں . . . "

۲۰ فروری کو گرامچی نے اپنی بہن تیریسینا کو ماں کی فکر و تشویش کو دور کرنے کے بارے میں لکھا۔ اس خط میں گرامچی نے اپنی ماں کی فکر و تشویش کے بارے میں یہ بھی لکھا:

" . . . ہمارے درمیان احساس کی ایک پوری دُنیا اور ایک پورا طرزِ فکر کھائی کی مانند حائل ہے۔ جبکہ میرے لیے یہ اُس سیاسی جدوجہد کا ایک وقوعہ ہے، جو جاری ہے اور جو نہ صرف اٹلی میں، بلکہ ساری دُنیا میں جاری رہے گی، اس کے لیے یہ ایک ناگفتہ بہ سانحہ ہے، جس کے پیچیدہ اسباب و اثرات اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ میں پکڑا گیا بالکل اس طرح جس طرح جنگ کے دوران کوئی قیدی پکڑلیا جاتا ہے، جسے یہ علم ہوتا ہے کہ ایسی بات ہوسکتی تھی اور یہ بھی کہ اس سے بدتر بھی بات پیش آسکتی تھی "

مئی میں تاتیانہ بھی میلان میں آکر رہنے لگی، تاکہ وہ اپنے بہنوئی کے قریب رہ سکے۔ لیکن اُسے بیماری نے آن دبوچا اور اسے ایک شفاخانہ میں داخل ہونا پڑا۔ خاندان کے افراد میں تاتیانہ ہی اس حالت میں تھی، جو بوقت ضرورت گرامچی کی مدد کرسکتی تھی۔ بھائیوں سے اس کا ناتہ ٹوٹ سا گیا تھا۔ ماریو سے اس کی آخری ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ مقامی فسطائی فیڈریشن سے ملوث رہنے کے بعد وہ کچھ الگ تھلگ تو ہوگیا تھا، مگر اب بھی وہ انھیں نظریات کے زیرِ اثر تھا۔ جس وقت تورین کے فسطائیوں نے اس کے بھائی گنّارو کو زدوکوب کیا تھا ٹھیک انھیں دنوں کمیونسٹوں نے ماریو پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے کے بعد وہ پارٹی سے الگ ہوگیا تھا اور اپنے بیوپار میں لگ گیا۔ ماریو ایک بار گرامچی سے ملنے جیل آیا بھی تو اس نے گرامچی کی حالت کے بارے میں ایک ایسا خط گھر لکھ مارا جس سے گھر والے یہ سمجھ بیٹھے کہ گرامچی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ ماریو کی اس بے وقوفی پر گرامچی نہایت برافروختہ ہوا اور اس نے آئندہ ماریو سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے ناتے بھی ڈھیلے پڑتے جارہے تھے۔ ماسکو سے اس کی بیوی جولیا کا خط بھی کبھی کبھار آتا۔ تین چار مہینے میں جولیا کا خط آتا بھی تو وہ چند سطروں پر ہی مشتمل ہوتا۔ اپنی بہن کی اس بے اعتنائی کا کفارہ تاتیانہ بڑی شدومد سے ادا کرنے کی کوشش کرتی۔ گرامچی کے دس سالہ دورِ اسیری میں تاتیانہ نے بے دریغ قربانیاں دیں اور ہر ممکن طریقہ سے گرامچی کے مصائب کو کم کرنے کی کوشاں رہی اور اس کے دُکھ کو بانٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

گرامچی مقدمہ شروع ہونے کا منتظر تھا۔ مقدمہ کا کیا نتیجہ نکلے گا، اس کے بارے میں وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسے سزا ہوگی اور کڑی سزا ہوگی، لیکن اس خیال نے بھی اُسے ہراساں نہ کیا:

"میری ہمت بلند ہے، لوگ کچھ بھی کہتے رہیں یا سمجھتے رہیں۔ شہید یا ہیرو بننے کی میری قطعی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں محض ایک اوسط آدمی ہوں، جس کے عقائد کی جڑیں کافی گہری تھیں اور جو کسی قیمت پر بھی انھیں ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے . . . "

ابتدائی تفتیش کافی وقت لے رہی تھی۔ پولیس کی رپورٹوں میں الزامات کی بھرمار تھی، مگر ثبوت اور شہادت کے معاملے میں پولیس کی یہ رپورٹیں تہی دامن تھیں۔ روم کی پولیس کی ایک رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ نومبر ۱۹۲۲ء میں

اس کے قبضے سے ہتھیار اور گولہ بارود برآمد ہوا تھا، جب کہ نومبر ۱۹۲۶ء میں گرامچی کو ماسکو پہنچے ہوئے چھ مہینے بیت چکے تھے اور وہ اس وقت ایک سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھا۔

اس تفتیش کے دوران، پولیس نے دو بار اپنے ایک جاسوس کے ذریعہ گرامچی کے خلاف الزامات تراشنے کی ناکام کوشش کی۔ پولیس کے اس جاسوس نے ساتھی سیاسی قیدی کے بھیس میں گرامچی کی ہمدردی حاصل کرنے اور اُسے چکمہ دینے کی کوشش کی، مگر پولیس گرامچی کو اس جال میں پھانسنے میں ناکام رہی۔

گرامچی کی گرفتاری کا پہلا وارنٹ ۴ ر جنوری، ۱۹۲۷ء کو جاری کیا گیا تھا۔ ۲۰ ر مئی کو ایک نیا وارنٹ جاری کیا گیا، جس میں گرامچی پر خانہ جنگی کو ہوا دینے اور جائداد اور جانوں کے اتلاف کا الزام عائد کیا گیا۔ ۲ ر جون سے اس نئے مقدمے کی ابتدائی تفتیش شروع ہوگئی۔ لیکن پولیس کے پاس اب بھی گرامچی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس بار پولیس نے ایک نیا حربہ آزمایا۔ گرامچی کو قیدِ تنہائی سے نکال کر دن میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ میدان میں جسمانی کسرت کرنے کی اجازت دے دی۔ یہاں ایک قیدی میلانی نے گرامچی سے ربط بڑھانے کی کوشش کی۔ اس قیدی نے گرامچی کو بتایا کہ میلان کی فاشسٹ فیڈریشن کے سیکرٹری سے دشمنی کی وجہ سے اسے جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ اس قیدی نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں، جن سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ میلان فاشسٹ فیڈریشن کا سیکرٹری قحبہ خانے اور رنڈی خانے چلاتا ہے۔ اس قیدی نے پیش کش کی کہ اگر گرامچی کمیونسٹ پارٹی سے اس کا مستقل ماہانہ مشاہرہ بندھوا دے تو وہ یہ کاغذات گرامچی کے حوالے کرسکتا ہے، لیکن اس بار بھی گرامچی جھانسے میں نہ آیا اور پولیس نے اس بار بھی مُنہ کی کھائی۔

ثبوت فراہم کرنے میں پولیس کی ناکامی کے باوجود، مقدمہ میں مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ گرامچی کو اس خاص عدالت کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جو مسولینی نے مملکت کے تحفظ کے لیے قایم کی تھی، کیونکہ مسولینی کو عام عدلیہ نظام پر بھروسہ نہیں تھا، کیونکہ ابتدا میں عدلیہ نے فسطائیوں کے قبضہ کی تھوڑی بہت مزاحمت کی تھی۔

گرامچی کو اس خاص عدالت میں پیش کرنے کے لیے میلان سے روم پہنچا دیا گیا۔ مسلح پولیس کے سخت پہرے میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ۲۸ ر مئی ۱۹۲۸ء کو اس عدالت کے سامنے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ صدرِ عدالت ایک جنرل تھا جبکہ جوری فاشسٹ ملیشیا کے پانچ کرنلوں پر مشتمل تھی۔ گرامچی کے علاوہ، ۲۱ دوسرے "ملزمین" عدالت میں موجود تھے۔ یہ سبھی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ ان سب نے کمیونسٹ پارٹی میں اپنی سرگرمیوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ۳۰ ر مئی کو سب سے پہلے گرامچی سے سوالات کیے گئے۔

صدرِ عدالت : تم پر سازش کرنے، خانہ جنگی کو شہ دینے، مجرمانہ افعال کو برحق ٹھہرانے اور طبقاتی نفرت کو ہوا دینے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ تمھیں اپنے دفاع میں کیا کہنا ہے؟

گرامچی : میں پولیس کو دیے گئے اپنے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔ پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ میں کمیونسٹ ہوں اور میری سرگرمیاں بھی کسی سے مخفی نہیں رہیں۔ اور پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت اور لا اونیتا کے مضمون نگار کی حیثیت سے میں ان کی توضیح پیش کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا اور اگر میں چاہتا بھی تو میرے لیے یہ ناممکن ہوتا، کیونکہ کئی برسوں سے پولیس کے ایجنٹ ہر جگہ میرے پیچھے لگے رہے ہیں۔ گھر اور گھر کے باہر انھوں نے مجھ پر نظر رکھی ہے۔ چنانچہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا

گیا۔ بظاہر میری حفاظت کے لیے میری کڑی نگرانی کی گئی، جو اب میرا سبب مسکت دفاع بن گئی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ تورین کے ناظم اور پولیس کے چیف کو میرے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے بطور گواہ طلب کیا جائے۔ علاوہ ازیں کمیونسٹ ہونے کے ناتے مجھ پر جو بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انھیں میں قطعی طور پر تسلیم کرتا ہوں . . ."

گرامچی کے ایک ساتھی ملزم این ریکو فیراری پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے، ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس نے ۱۹۱۳ء میں مزدوروں کی ایک ہڑتال کی رہ نمائی کی تھی، جس کی پاداش میں اسے سزا بھگتنا پڑی تھی۔ جب صدر عدالت نے اس سزا کا ذکر کیا تو فیراری نے جواب دیا: "جناب صدر، اس مرحلہ پر میرے اعمال کی اوانتی کے ایڈیٹر نے نہایت تعریف و توصیف کی تھی اور وہی شخص اس وقت ہماری ریاست کا سربراہ ہے۔" ایک اور ملزم، ریولدی ممبر پارلیمنٹ بھی تھا اور وکیل بھی، اور ایک وکیل کی حیثیت سے وہ سینکڑوں ایسے مقدموں میں وکیل صفائی کے طور پر پیش ہو چکا تھا جن میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو ملزموں کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ ریولدی نے عدالت کے سوالات کے جواب میں کہا: "میں نے تین سو سے زائد کمیونسٹوں کی وکالت کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو ججوں نے بے گناہ قرار دے کر رہا کیا تھا۔ ان کا دفاع کرنے پر آج مجھے کیوں ملزم گردانا جا رہا ہے؟"

استغاثہ نے ۲ جون کو عدالت سے خطاب کیا۔ استغاثہ نے سبھی ملزمین پر الزامات کا ایک طومار سا باندھ دیا۔ گرامچی کا تذکرہ کرتے ہوئے استغاثہ کے وکیل نے کہا: "ہمیں بیس برس کے لیے اس ذہن کو کام کرنے سے روک دینا ہے۔"

امبر تو تراچینی نے، جو سیاسی بار یک بیں ہونے کے ساتھ ساتھ قانونی باریک بیں بھی تھا، اخیر میں سبھی ملزمین کی طرف سے عدالت سے خطاب کیا۔ اس خطاب نے صدر عدالت اور تراچینی کے درمیان ایک طویل سیاسی اور قانونی بحث کی صورت لے لی۔ لیکن یہ بحث بے سود تھی، کیونکہ فاشسٹ حکمران ان ملزموں کو پہلے ہی سے مجرم ٹھیرا چکے تھے اور یہ نام نہاد مقدمہ محض ایک دکھاوا ہی تھا۔ امبر تو تراچینی نے اپنی بحث کے اخیر میں کہا: "طبقاتی نفرت کو انگیخت کرنے اور خانہ جنگی کو ہوا دینے کا ہمیں تھوڑی دیر بعد ہی مجرم اور سزاوار گردانا جانے والا ہے مگر تاریخ ان کڑی سزاؤں کی فہرست دیکھ کر، جو ہمیں سنائی جانے والی ہیں، اس کارروائی کو خانہ جنگی کا ایک وقوعہ ہی قرار دے گی . . ."

ایک طے شدہ امر کے طور پر سب ملزموں کو کڑی سزائیں سنا دی گئیں۔ گرامچی کو بیس سال چار مہینے اور پانچ دن کی سزا دی گئی۔ اتنی ہی سزا رویدا اور اسکاچی ماترو کو بھی دی گئی، جبکہ تراچینی کو بائیس برس نو مہینے، پانچ دن کی سزا دی گئی۔ باقی ملزموں کو بھی اتنی ہی سخت سزائیں دی گئیں۔

۸ جون ۱۹۲۸ء کو تیر پینا نے مسولینی کو خط لکھا، جس میں اس نے گرامچی کا طبی معائنہ کرانے اور خرابی صحت کی بنا پر اسے جیل کے ہسپتال میں بھیجے جانے کی درخواست کی۔ گرامچی کا طبی معائنہ ہوا۔ کچھ عرصہ قبل گرامچی کے بارہ دانت گر گئے تھے۔ اس کا منہ اور مسوڑھے ورم آلود تھے اور اس کے جسم میں زہر باد پھیل رہا تھا۔

گرامچی کو توری کے جیل خانہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بارہ دن کے سفر کے بعد ۱۹ جولائی کو گرامچی توری پہنچا:

"روم سے توری تک کا سفر ہولناک تھا۔ روم میں میں نے جو درد محسوس کیا تھا اور جسے میں نے معدہ کی معمولی شکایت سمجھا تھا، وہ نہایت تیز بخار کی شروعات ثابت ہوا۔ میں شدید ترین بیمار تھا۔ بینے دنیتو میں میں نے دو جہنمی دن اور راتیں ایک کیڑے کی طرح تڑپتے گزاریں، اس طرح کہ میں نہ ساکت رہ سکتا تھا، کھڑا رہ سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی لیٹ سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا یہ بخار سینٹ انتھونی کی آگ ہے اور اسے فرو کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ٹوری جیل میں پہنچتے ہی گرامچی کو فوراً سختیوں کا احساس ہو گیا۔ جیل کے منتظم بھی نہایت بے حس ثابت ہوئے۔ قیدیوں کی صحت کی دیکھ بھال ایک ڈاکٹر کرتا تھا، جس کا نام کِستر مینو تھا۔ ایک ادیب، دومیکوزوکا رو نے گرامچی کے حالات اور اس ڈاکٹر کی یہ تصویر کشی کی تھی :

" گرامچی کو طبّی مدد کی سخت ضرورت ہے اور اس کے رہن سہن کو فوری طور پر بہتر بنایا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر کستر مینو اس پر کوئی توجہ نہیں کرتا، بلکہ ایک دن اس نے اسے (گرامچی) کو بتایا کہ اچھے فاشسٹ کے طور پر وہ اُسے مُردہ دیکھنا ہی پسند کرے گا . . . "

دو برس چار مہینے قید میں بتانے کے بعد آخر فروری ۱۹۲۹ء کے اوائل میں گرامچی کو اپنی کوٹھری میں لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی اور ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا سامان بھی مل گیا۔ گرفتاری کے چار مہینے بعد ہی گرامچی نے جولیا کے نام ایک خط میں اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا تھا کہ وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایسے موضوعات پر گہرائی اور نظم و ضبط کے ساتھ لکھنا چاہتا ہے، جو اس کی پوری توجہ کو جذب کر سکیں اور اس کی باطنی زندگی کو مرتکز کر سکیں اور اسے سمت دے سکیں۔ اس وقت چار موضوعات اس کے ذہن میں تھے، جن پر وہ اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا :

۱۔ اطالوی عبقریوں (intellectuals) کی تاریخ، ان کے مختلف ماٰخذ، ثقافتی رجحانات کے تعلق سے ان کی متنوع گروہ بندیاں اور ان کے مختلف النوع اندازہائے فکر (۲) تقابلی لسانیات کا مطالعہ (۳) پیران دیلو کے تھیٹر اور اس کے ذریعہ اطالوی تماشائی theatrical ذوق میں تبدیلی کا مطالعہ، جس کا ترجمان پیران دیلو تھا اور جسے وضع کرنے میں اس نے اعانت کی تھی۔ (۴) سلسلہ وار شائع ہونے والے ناولوں اور ادب کے بارے میں عامیانہ ذوق پر ایک مضمون۔

لیکن کاغذ قلم ملتے ہی گرامچی ان موضوعات پر متوجہ نہیں ہوا، بلکہ اس نے پہلے جرمن سے کچھ تراجم کیے : " فی الحال میں ترجمہ کر رہا ہوں، ہاتھ کو سدھانے کے لیے اور اس دوران میں اپنے خیالات میں کچھ نظم لانے کی کوشش کر رہا ہوں "۔ گرامچی نے جن حالات میں اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لانا شروع کیا، انھیں حوصلہ افزا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اپنے منتخب کردہ موضوعات پر لکھنے کے لیے اُسے کتابوں اور دستاویزات کی ضرورت پیش آتی تھی، جو اُسے جیل میں میسّر نہیں ہوتی تھیں۔ اسے باہر سے جو کتابیں ملتی تھیں، اُن میں باقاعدگی سے زیادہ بے قاعدگی ہی تھی۔

گرامچی کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ غور و فکر میں ڈوبا اپنی کوٹھری میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ جب اس کے ذہن میں وہ بات صاف ہو جاتی، جو وہ لکھنا چاہتا تھا تو وہ اپنی لکھنے کی میز پر جاتا، ایک چھوٹے اسٹول پر گھٹنا ٹیک کر اسے ضبطِ تحریر میں لے آتا۔ لکھنے کے بعد وہ سیدھا ہوتا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ روزناموں کی صحافت کا تجربہ ہونے کے باوجود گرامچی کبھی آسانی یا روانی سے لکھنے کا عادی نہیں ہو سکا۔ لیکن گرامچی غور و فکر کے ہر وقفہ کے بعد جو کچھ لکھتا تھا، اس میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں کرتا تھا۔

گرامچی کے لیے روزانہ دو تین گھنٹے لکھنا معمول بن گیا۔ جیل کے نامساعد حالات، تیزی سے رُو بہ انحطاط صحت اور جولیا کی طویل خاموشیوں کے وقفوں سے لاحق ہونے والی ذہنی کوفت کے باوجود گرامچی روزانہ ——— مہینے در مہینے سال در سال ——— لکھتا رہا۔ اس طریقے سے گرامچی نے اپنی انقلابی جدّوجہد کو جاری رکھا اور دنیا سے، انسانی سماج سے اپنے ربط کو باقی رکھا۔

گرامچی نے اخیر میں ۳۲ نوٹ بکس چھوڑیں، جن میں ۲۱ نوٹ بکس اس نے تُوری میں پُر کرلی تھیں یا جن میں اُس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نوٹ بکس ۲۸۴۸، ۲ صفحات پر مشتمل تھیں یہ صفحات تخمیناً۔ ۔ ۔ ۴۰۰۰ ٹائپ شدہ صفحات کے برابر تھے۔
ان نوٹ بکس کا مطالعہ کرنے پر ان کے بارے میں پہلا تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ موضوعات ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھنے کے باوجود مکمل اور بھرپور طور پر نہیں اُبھر سکے۔ اکثر مقامات پر گرامچی نے مختصر نوٹس ہی رقم کیے تھے۔ بعض جگہ سالوں بعد گرامچی نے ان نوٹس کو کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ ان نوٹ بکس کے حاشیوں میں اُن مضامین کا ماحصل بھی اختصار کے ساتھ درج کیا ہے، جو اُس کے زیرِ مطالعہ آتے تھے یا جو اُس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے تھے۔ دوسرے مرحلہ پر یہ نوٹس کچھ ٹھوس صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف چند موضوعات ہی ایسے تھے، جن میں مسودہ اپنی آخری صورت میں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نوٹ بکس نوٹ بکس ہی ہیں، جنہیں تکمیل شدہ مسودات کی صورت نہیں دی جا سکی۔

ان بکھرے ہوئے اور غیر اتمام شدہ نوٹس میں بھی ایک مرکزی خیال مشترکہ کڑی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ مرکزی خیال پہلے پہل گرامچی نے غیر مکمل صورت میں جنوبی اطالیہ کے مسئلہ پر اپنے مضمون میں پیش کیا تھا۔ اس مضمون میں گرامچی نے طبقاتی اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی۔ گرامچی کا یقین تھا، پرولتاریہ صرف اس حد تک کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور اپنے نئے نظام کے استحکام کو مضبوط بنا سکتا ہے جس حد تک وہ استحصال و لوٹ کھسوٹ کے شکار دوسرے طبقات کو اپنے کاز کا ہمنوا و حامی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ گرامچی اس ضمن میں پرولتاریہ اور کسان طبقہ کے اتحاد کو خاص اہمیت دیتا تھا، مگر گرامچی کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ کسان طبقہ حکمران اور بورژوا طبقہ کے نظریہ کائنات و حیات کا تابع و پابند ہے۔ اس نظریہ کائنات و حیات کو حکمران طبقے کے دانش ور صیقل کرتے رہتے ہیں۔ گرامچی کا خیال تھا کہ کسان طبقہ کو زمیندار طبقہ سے الگ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دانش وروں کا ایک ایسا نیا گروہ سامنے آئے، جو بورژوا نظریہ کائنات و حیات کو رد کرتا ہو۔

اپنی نوٹ بکس میں گرامچی نے اطالوی سماج میں دانش وروں و عبقریوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ اور اُن فلسفوں کا بھی جائزہ لیا تھا جو بورژوا اقتدار کی بنیاد بنتے ہیں۔ گرامچی نے پرولتاریہ کے نئے نظریہ کائنات و حیات پر بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ گرامچی کا نظریہ یہ تھا کہ بورژوا نظام کی اصل طاقت حکمران طبقہ کے تشدد یا ریاستی آلات جبر میں مضمر نہیں ہوتی، بلکہ حکمران طبقہ کے اس نظریہ کائنات و حیات میں مضمر ہوتی ہے، جسے محکوم طبقے قبول کر لیتے ہیں۔ حکمران طبقہ کے فلسفۂ حیات کو 'عمومی عقل' کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، یعنی یہ فلسفۂ حیات عوام کا فلسفۂ حیات بن جاتا ہے اور وہ اس معاشرہ کی اخلاقیات، رسوم و رواج اور برتاؤ کے سکے بند ڈھانچوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ گرامچی نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ حکمران طبقہ کس طرح اور کیسے محکوم طبقات کی تسلیم و رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے؛ ساتھ ہی گرامچی نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے کہ محکوم طبقات کس طرح اور کیسے پرانے نظام کو ختم کرنے اور اس کی جگہ عام آزادی کا ایک نیا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

گرامچی نے نوٹ بکس میں ۱۹ ویں صدی میں اطالوی بازخیزی کے دور میں عوام کے محدود و ثانوی کردار کے اسباب کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس دور بازخیزی نے ایک ایسی 'شاہی فتح و کامرانی' کا روپ اس لیے لیا تھا کیونکہ اس وقت عوام میں قومی شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کی ثقافت اور ادب بھی قومی۔ عوامی شعور، سے محروم تھے اور دانش ور و عبقری قومیت سے مبرا و عظیم اداروں، چرچ اور سلطنت کی ہی ضروریات کی آئینہ داری کرتے تھے۔ اطالوی تاریخ کے اسی دور میں، جب اوپر سے لادا ہوا قومی اتحاد وجود میں آ چکا تھا، بینے دیتو کروچے کے بورژوا ڈیموکریٹک نظریہ کائنات نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

گرامچی نے کروچے کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور مارکسزم اور کروچے کے نظریات کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد کچھ دور رس نتائج اخذ کیے ہیں۔ گرامچی نے یہ تقابلی جائزہ اپنے اس یقین کی روشنی میں لیا ہے کہ نیا پرولتاری نظریۂ کائنات اوّلین طور پر محکوم طبقات کے ذہن میں پیوست و جذب ہونا چاہیئے۔ اس نئے پرولتاری نظریۂ کائنات سے لیس ہونے کے بعد ہی محکوم طبقات ریاست کے حکمراں طبقے کے نظریۂ کائنات کے سہارے حکومت کرنے کے حق کو چیلنج کر سکتے ہیں اور امکانی طور پر حکمراں طبقے کی ریاست کی جگہ محکوم طبقوں کی ریاست کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد امکانی حد تک وسیع ترین تائید و حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ پرولتاریہ کو ایک ساتھ غالب طبقہ اور حکمراں طبقہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ سرمایہ دارانہ گروہوں کو زیر کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے اسے غالب طبقہ بننا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اُسے معاشرہ کو اخلاقی اور دانشورانہ سمت دینے کے لیے 'حکمرانی' کرنی ہوگی، تاکہ ان سب گروہوں کو سوشلزم کا ہمنوا و حامی بنایا جائے، جو کسی نہ کسی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہیں: گرامچی لکھتا ہے: "ریاستی اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے ایک سماجی گروہ کی حکمرانی و فرمانروائی قائم ہو سکتی ہے اور قائم ہونا ضروری ہے (اقتدار پر قبضہ کے لیے اپنے آپ میں یہ ایک بنیادی شرط ہے)؛ بعد میں یہ گروہ اقتدار کو استعمال کرنے کے دوران غالب گروہ بھی بن جاتا ہے، لیکن اُسے حکمراں و فرماں روا بنے رہنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔"

گرامچی کا یقین تھا کہ روسی انقلابی تجربہ کا مغرب میں کہیں بھی اعادہ نہیں ہو سکے گا۔ روس میں کھلم کھلا محاذ آرائی کے بعد تیز اور فیصلہ کن حملہ کرنا ممکن تھا، کیونکہ مہذب سماج ابتدائی اور لجلجی شکل میں تھا اور اس کے علاوہ، زارشاہی ریاست اپنے محکومین کی رضامندی پر مبنی نہیں تھی۔ جبکہ مغرب کے بورژوا طبقہ کے عبقری اور اخلاقی حکمرانی کے ذریعہ لبرل ریاستی نظام کے حق میں اپنے شہریوں کی عظیم اکثریت کی رضامندی حاصل کر لی ہے، جس کی وجہ سے مغرب میں ریاست محض ایک ہراول خندق ہے، دفاع کی اوّلین صف ہے اور اس کے پیچھے کنکریٹ کے چھوٹے چھوٹے مورچوں پر مشتمل ایک زبردست قلعہ ایستادہ ہے یہ قلعہ لوگوں کا طرزِ زندگی، طرزِ فکر، اُمیدوں، اخلاقی اصولوں اور عادات پر مشتمل ہے، جو اکثر لوگوں نے بورژوا حکمراں طبقہ نظریۂ حیات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے عمل کے دوران اپنے اندر جذب کیے ہیں؛ اور یہ خصوصیت ہی فوری معاشی اسباب و (بحرانات، کساد بازاری وغیرہ) کے زیرِ اثر، مہذب معاشرہ کو زیر و زبر کر دینے والے ابال سے محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ مغرب کی بورژوا جمہوری ریاستوں میں کھلم کھلا محاذ آرائی کے بجائے مقامات کے لیے جنگ لڑنی چاہیے اور بولشویک حکمتِ عملی کی جگہ ایک ایسی حکمت عملی اپنانی چاہیے، جس کا سیدھا سادا مقصد ریاستی اقتدار (ہراول خندق) پر قبضہ کرنا نہ ہو، بلکہ جس کا مقصد اس زبردست قلعہ پر قبضہ کرنا ہو، جو کنکریٹ کے چھوٹے چھوٹے مورچوں پر مشتمل ہے۔ گرامچی اپنی نوٹ بک میں آگے لکھتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ ایلیچ (لینن) نے سمجھ لیا تھا کہ کھلم کھلا محاذ آرائی کو، جو مشرق میں کامیاب ہوئی تھی، بدل کر مقامات کی جنگ کی حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ صرف یہی حکمتِ عملی مغرب میں سمجھ میں بھی آتی ہے۔ مگر اُسے اس نظریہ کو فروغ دینے کے لیے درکار وقت میسّر نہیں آسکا اور بہرکیف وہ صرف نظری طور پر ہی ایسا کر سکتا تھا، کیونکہ بنیادی طور پر یہ فریضہ ایک قومی فریضہ ہے یعنی اس کے لیے مختلف معاشروں کی صورتِ حال کا جائزہ لینا اور اُن کے سبھی عناصر کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔"

اپنی نوٹ بکس میں گرامچی نے اسی ٹھوس صورتِ حال اطالیہ کی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور اطالوی معاشرہ کے مختلف عناصر کا تجزیہ اور ان کی نشاندہی کی ہے۔ گرامچی بار بار اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہے کہ مقامات (positions)

کی اس جنگ کے لیے پرولتاری فوج کو ایک نئے نظریۂ کائنات، نئی طرزِ زندگی، نئی طرزِ فکر، نئی اخلاقیات، نئے افکار سے لیس ہونا چاہیے اور اس کے بعد ہی بورژوا نظریۂ کائنات کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے۔

اقتدار پر قبضہ کے بعد، اقتدار کے استعمال کا مرحلہ آتا ہے۔ گرامچی لینن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ غلبہ (جبر) اقتدار کی صرف ایک صورت ہے، جو تاریخ کے ایک مرحلہ پر ضروری ہوتا ہے؛ عبقری اور اخلاقی فرمانروائی ہی اقتدار کی وہ صورت ہے جو استحکام کی ضمانت ہے، کیونکہ عبقری اور اخلاقی فرماں روائی عوام کے وسیع ترین حلقوں کی رضا کے ذریعہ استحکام کی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔

محنت کش طبقہ کے 'اجتماعی عبقری' کا فریضہ انقلابی سیاسی پارٹی ادا کرتی ہے، جسے گرامچی نے جدید شہزادہ بھی کہا ہے:

"شہزادۂ جدید یا دیومالائی شہزادہ ایک حقیقی انسان، ایک فرد نہیں ہوسکتا (جیسا کہ ماکیاویلی نے اپنے اسی نام کے مشہور مقالہ میں اُمید باندھی تھی) وہ ایک اجتماعی تنظیم ہی ہوسکتی ہے؛ ایک مرکب سماجی ادارہ، جس میں اجتماعی ارادہ، اپنے وجود کا احساس کرنے اور عمل کے دوران، اپنے وجود کا شعور حاصل کرنے کے بعد، صورت پذیر ہونے لگا ہو۔ تاریخ ایسی اجتماعی تنظیم کو سیاسی پارٹی کے روپ میں جنم بھی دے چکی ہے۔ ایک ایسا بنیادی خلیہ جس میں اجتماعی ارادہ کے بیج جمع ہوں گے اور عالمگیر اور کلّی شکل اختیار کرنے کے کوشاں ہوں گے۔ . . شہزادۂ جدید کو عبقری اور اخلاقی اصلاح کا نقیب اور ناظم ہونا چاہیے اور اسے یہ ہونا ہی پڑتا ہے —— یعنی وہ اعلیٰ تر اور ہمہ پہلو تہذیب کی مزید ترقی و فروغ کی سمت میں اجتماعی، قومی۔ عوامی ارادہ کے لیے لائحۂ عمل پیش کرتا ہے۔ اجتماعی، قومی۔ عوامی ارادہ (جس کا شہزادۂ جدید مظہر بھی ہے اور خالق بھی) اور عبقری اور اخلاقی اصلاح، وہ دو بنیادی نکتے ہیں، جن پر (پارٹی کے) کام کا ڈھانچہ مبنی ہونا چاہیے۔"

گرامچی نے بنیادی طور پر نوٹ بُکس میں انہی دو بنیادی نکتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور اس نے اٹلی کے ٹھوس حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ نہایت باریک بینی کے ساتھ، عبقری اور اخلاقی اصلاح کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ گرامچی نے اس اصلاح کے بعض مسائل کی طرف محض اشارہ ہی کیا ہے، کیونکہ جیل کے حالات نے اُسے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کی بھی اجازت نہیں، جبکہ اس کے کام کرنے کی اہلیت، دگرگوں صحت کے باوجود محض اس کی زبردست قوتِ ارادی کی رہینِ منت تھی۔ اس وقت جولیا کی طویل سے طویل تر ہوتی ہوئی خاموشی کی وجہ سے گرامچی سخت ترین ذہنی اذیت میں مبتلا رہتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۹ اور جولائی ۱۹۳۰ء کے دوران ایک برس میں اُسے جولیا کا ایک ہی خط ملا تھا۔

جولیا کی اس سرد مہری کے برعکس تاتیانہ اپنے بہنوئی کی دلجوئی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ وہ روم سے تورین آئی اور عرصہ تک وہاں مقیم رہی، وہ کسی نہ کسی طرح گرامچی کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ اسے دلاسا دیتی اور جولیا کی خاموشی کے بارے میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراشنے کی کوشش کرتی۔ جیل میں تاتیانہ کی مختصر ملاقاتوں کے دوران اور جیل سے تاتیانہ کے نام لکھے گئے خطوط میں گرامچی اپنے جلے ذہن اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا تھا۔

گرامچی نے تاتیانہ کے نام اپنے ایک خط میں اپنے اور جولیا کے تعلقات کو اسکینڈے نیویا کی اس لوک کتھا سے واضح کیا تھا: "ایک دفعہ کا ذکر ہے اسکینڈے نیویا میں تین دیو دراز پہاڑوں کی تین چوٹیوں پر مقیم تھے۔ ہزاروں سال کی خاموشی کے بعد پہلے دیو نے باقی دو سے بلند آواز میں کہا، "مجھے مویشیوں کے ریوڑ کے ڈکرانے کی آواز سنائی دے رہی ہے!" تین ہزار برس بعد دوسرے دیو نے جواب دیا: "سنائی تو مجھے دے رہی ہے!" اور تین سو برس کے بعد تیسرے دیو نے

باقی دو سے کہا، "اگر تم یہ شور شرابہ بند نہیں کرتے تو میں چلا!"

اگست اور ستمبر ۱۹۳۰ء میں گرامچی کو جولیا کے دو خط ملے، لیکن ان کا لب و لہجہ نہایت خشک اور اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ان خطوط نے گرامچی کی ذہنی کوفت میں اضافہ ہی کیا۔ گرامچی کے ذہن کو ایک اہم سیاسی وقوعہ نے بھی پراگندہ بنایا۔ کمنترن نے اپنی چھٹی کانگریس اور جولائی ۱۹۲۹ء میں اپنی ایکزیکیٹو کمیٹی کے دسویں اجلاس میں ایک نئی سیاسی لائن اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کمنترن کی اس نئی سیاسی لائن کے خدوخال یہ تھے: سرمایہ دار ریاستیں تباہی کے دہانے پر کھڑی لڑکھڑا رہی ہیں، جبکہ محنت کش طبقہ کا انقلابی شعور بیدار ہو رہا ہے۔ پرولتاریہ کو بورژوا ڈیموکریٹک پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنانے کے بجائے اپنے بل بوتے پر بورژوا اور فاشسٹ ریاستوں کا خاتمہ کر کے ان کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنی چاہیے۔ جبکہ گرامچی کا یہ یقین تھا کہ امکانی طور پر فاشزم کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ لے سکتی ہے، لیکن اس امکان کو یقینی نہیں سمجھا جا سکتا ——— یقینی امکان یہی ہے کہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کے قیام سے پہلے پرولتاریہ کو فاشزم کا تختہ پلٹنے کی مہم میں جمہوری حلقوں کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔

کمنترن کی اس نئی سیاسی لائن کے نتیجہ میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور متحدہ محاذ کے حامیوں کو ابن الوقتی کا مجرم قرار دے کر پارٹی سے خارج کیا جانے لگا۔ اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے ماہانہ رسالے State Operais میں، جو پیرس سے شایع ہو رہا تھا، متحدہ محاذ کے حامیوں کے خلاف تولگیاتی کے مضامین شایع ہو رہے تھے۔

اس وقت گنارو گرامچی بھی پیرس میں ہی تھا۔ تولگیاتی نے اس سے رابطہ قایم کیا اور اسے نئی لائن کے بارے میں انتونیو گرامچی کے خیالات جاننے کی ہدایت کی، کیونکہ گنارو اب بھی قانونی طور پر اٹلی میں داخل ہو سکتا تھا اور انتونیو سے توری جیل میں ملاقات کر سکتا تھا۔

چنانچہ گنارو جون ۱۹۳۰ء کے دوسرے ہفتے میں اٹلی میں داخل ہوا اور انتونیو سے ملنے کے لیے توری جیل پہنچا۔ ایک ہمدرد وارڈر کی موجودگی نے، جو ان دونوں بھائیوں کے گاؤں کے قریب کا ہی رہنے والا تھا، دونوں کھل کر گفتگو کرنے کا موقع دے دیا۔ پارٹی اور کمنترن کی نئی لائن کے بارے میں سن کر گرامچی دم بخود رہ گیا۔ گرامچی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پارٹی متحدہ محاذ کے حامیوں کے پارٹی سے اخراج کے معاملے میں جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

اس مختصر ملاقات اور نئی لائن کے بارے میں انتونیو کے خیالات جاننے کے بعد گنارو اپنے گاؤں گلرزا چلا گیا۔ مہینہ کے اواخر میں پیرس جانے سے پہلے گنارو پھر انتونیو سے ملنے کیلیے جیل پہنچا، لیکن اس بار خفیہ پولیس اس کی سخت نگرانی کر رہی تھی، جس کے باعث یہ دونوں بھائی کسی سیاسی مسئلہ کو نہیں چھیڑ سکے اور انھوں نے اپنی بات چیت گھریلو معاملات تک محدود رکھا۔

لیکن گنارو نے پیرس واپس پہنچ کر پارٹی کو نئی لائن کے بارے میں گرامچی کی اصل پوزیشن سے مطلع نہیں کیا۔ گنارو نے تولگیاتی کو یہی بتایا کہ انتونیو پارٹی کی نئی لائن سے قطعی متفق ہے۔ گنارو نے جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر پارٹی کو انتونیو کی اصل پوزیشن بتا دی گئی تو پارٹی اسے بھی موقع پرست، قرار دے کر پارٹی سے خارج کرنے میں ہچکچائے گی نہیں۔

پارٹی لائن میں اس تبدیلی کی خبر نے گرامچی کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا۔ گرامچی نے ایک بار پھر مسائل اور واقعات کا اپنے ذہن میں تجزیہ کیا اور اس بار بھی وہ اسی نتیجہ پر پہنچا، جس نتیجہ پر وہ پارٹی لائن میں تبدیلی سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ گرامچی کو اس پر

سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوتی تھی کہ خود کو کمیونسٹ کہنے اور سمجھنے والے اس کے ساتھی معروضی طور پر صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بجائے محض خالی خولی انقلابی لفاظی پر اکتفا کرتے تھے اور اسی لفاظی کو عمل کا نعم البدل سمجھ کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ گرامچی کے یہ ساتھی انقلابی لفاظی کی رَو میں یہ پیش گوئی بھی کرتے تھے کہ فاشزم بس دو تین مہینے کا ہی مہمان ہے۔ . . موسم سرما تک یقیناً فاشزم کا جنازہ نکل جائے گا اور اس کے فوری بعد ہی فاشسٹ ڈکٹیٹر شپ کی جگہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے گی۔

گرامچی اپنے ساتھیوں سے اس وقت ان مسائل پر گفتگو کرتا تھا جب روزانہ مقررہ وقت پر انھیں جیل کے صحن میں ٹہلنے کے لیے کوٹھریوں سے باہر نکالا جاتا تھا۔ یہ گفتگو کبھی کبھی تلخ بحث کا رنگ لے لیتی، کیونکہ وہ ان تصورات کو غیر مارکسی میکانیکی اور ماورائی تصورات قرار دیتا۔ یہ سبھی تصورات اس ایک تصور پر قائم تھے کہ معاشی بدحالی، عوام کو پرولتاری انقلاب کی راہ پر لانے کا واحد سبب بنے گی۔ جبکہ گرامچی نہایت شدومد سے یہ کہا کرتا تھا کہ بدحالی اور بھوک کی وجہ سے بغاوتیں پھوٹ سکتی ہیں، ایسی ابتری پھیل سکتی ہے، جو سماجی نظام کی چولیں ہلا ڈالے، لیکن اس سے وہ شرائط پوری نہیں ہوتیں، جو سرمایہ دار کا قلع قمع کرنے اور اس کی جگہ پرولتاری حکومت کے قیام کو ممکن بنا سکیں۔

گرامچی اور اس کے جیل کے ساتھیوں کے موقف میں اس تفاوت و اختلاف کا نتیجہ قطعہ کلام اور ایک دوسرے پر شک کی صورت میں نکلا۔ قطعہ کلام ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ گرامچی کے ساتھی جیل وارڈروں سے نہایت اشتعال انگیز طریقے سے پیش آتے تھے، جبکہ گرامچی ان کے اس برتاؤ کو غلط سمجھتا تھا۔ گرامچی اپنے ساتھیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ جیل کی سختیوں کے لیے جیل وارڈر ذمہ دار نہیں تھے۔ اس پر گرامچی کے ساتھیوں نے اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ قانون کا احترام کرنے پر اس لیے زور دیتا ہے کہ وہ لکھنے اور باہر سے کتابیں منگانے کی سہولیات سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ اختلاف رائے، غلط فہمی اور قطعہ کلامی کا یہ نتیجہ نکلا کہ گرامچی سب سے الگ تھلگ ہو گیا۔

جیل سے باہر کی دُنیا سے گرامچی کا تعلق اور رابطہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ جُولیا کے خط بھی اکا دکا ہی آتے تھے۔ گھر سے بھی کبھی کبھار ہی کوئی خط آتا تھا۔ صرف تاتیانہ باہر کی دُنیا سے گرامچی کے ربط و تعلق کا بھروسے قابل ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ تاتیانہ کے ذریعہ گرامچی کو یہ سُن گن ملی کہ جولیا اعصابی مرض کی شکار تھی اور ہسپتال میں زیرِ علاج تھی۔ گرامچی کو جولیا کے خاموشیوں کے طویل وقفوں کی وجہ بھی ایک حد تک سمجھ میں آئی۔ گرامچی نے جولیا کو ایک طویل خط لکھا اور ٹوٹتے ہوئے تعلق کو استوار کرنے کی کوشش کی۔ جُولیا کا جواب آیا۔ اس بار اس کے خط میں احساس کی گرمی تھی۔ مگر جلد ہی احساس کی یہ گرمی بھی ختم ہو گئی اور خطوط کے درمیان پھر لمبا وقفہ حائل ہونے لگا۔

گلرزا سے بھی بھولے بھٹکے کوئی خط آجاتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ہی گرامچی ماریو سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ گنارو سے آخری ملاقات کے بعد گرامچی کو اس کا ایک ہی خط مل پایا تھا۔ اور وہ بھی سنسر کی سیاہی کا شکار ہونے کے بعد۔ کارلو نے گلرزا میں جوتوں کی دوکان کھولی تھی، مگر یہ دوکان چل نہیں سکی تھی۔ اس نے ایک ڈیری میں نوکری کر لی تھی، مگر یہاں بھی چھٹنی کی زد میں آنے کے بعد وہ بے کار تھا۔ کارلو ستمبر/اکتوبر ۱۹۳۰ء میں گرامچی سے ملنے توری جیل آیا تھا، لیکن واپس پہنچنے کے بعد اُس نے کوئی خط نہیں بھیجا تھا۔ اس کا خط نہ ملنے پر گرامچی کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں وہ بھی پولیس کے نظرِ کرم کا شکار نہ ہو گیا ہو۔

کبھی کبھی وہ اپنی ماں کو شکایتی لہجہ میں لکھتا :

"تم اتنے عرصہ تک مجھے خیر خیریت سے کیوں محروم رکھتی ہو؟ . . . لوگ جیل میں بند شخص کو اس لیے خط نہیں لکھتے کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتے یا پھر ان کی قوتِ تخئیل کمزور ہوتی ہے۔ تمھارے اور گھر کے دوسرے افراد کے بارے میں میں یقین نہیں کرسکتا کہ تمھیں میری پروا نہیں ہے۔ اس کی وجہ قوتِ تخئیل کی کمی ہی ہوسکتی ہے؛ جیل کی زندگی کیسی ہوتی ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ اور اس کا بھی کہ خطوط کتنی اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں، دن کے خلا کو وہ کس طرح پر کرتے ہیں اور وجود کو کس طرح کچھ رنگ، کچھ معنی دیتے ہیں۔ میں یہاں کی زندگی کے منفی پہلو کے بارے میں زیادہ اس لیے نہیں لکھتا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھ پر رحم کھایا جائے۔ میں ایک سپاہی تھا جسے لڑائی کے دوران ایک مرحلہ پر بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا اور لڑنے والے جب شعوری فیصلہ کے بعد لڑیں تو ان پر رحم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان پر رحم کھانا چاہیے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منفی پہلو کا کوئی وجود ہی نہیں ہے یا جو مجھے عزیز ہیں، وہ کم سے کم اسے بدتر نہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔"

یہ شکایت دراصل اسے اپنی بہنوں، تیریسینا اور گریزیتا سے تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ خط لکھ سکے۔ ایک بار اس کی ماں نے تیریسینا کو بول کر خط لکھوایا۔ اس خط نے گرامچی کے دل و ذہن کو نہایت متاثر کیا اور اس خط نے ماں کے تعلق سے ان تمام یادوں کو تروتازہ کردیا، جو گرامچی کے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ تھیں۔ اس نے ماں کو لکھا:

"تیریسینا سے لکھوایا ہوا مجھے تمھارا خط ملا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس طرح ہی خط لکھوا کر بھیجا کرو۔ مجھے اس خط میں تمھاری پوری روح اور طرزِ فکر سمایا ہوا محسوس ہوا ——— یہ خط تمھارا ہی تھا، تیریسینا کا نہیں۔ تمھارے اس خط نے میرے ذہن میں کیسی کیسی یادیں تازہ کی ہیں . . . تم اندازہ ہی نہیں کرسکتیں کہ ایسے کتنے مناظر میرے ذہن میں تازہ ہوگئے، جن میں تم ایک شفیق اور ہر طرح سے مدد کرنے والی ہستی کے روپ میں اُبھرتی ہو۔ اگر تم سوچو تو روح اور روح کے لافانی ہونے یا جنت یا جہنم کے تمام مسائل اس ایک سیدھی سادی حقیقت کو دیکھنے کے مختلف طریقے ہی ہیں: یہ حقیقت کہ ہمارا ہر ایک فعل اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے خود ہماری نیکی اور بدی کے لحاظ سے، دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ باپ بیٹے کو، ایک نسل دوسری نسل کو ایک لامتناہی سلسلے کے روپ میں یونہی متاثر کرتی ہے۔ اور چونکہ ہماری تم سے وابستہ سبھی یادیں نیکی اور استقامت سے بھرپور یادیں ہیں اور ان قربانیوں کی یادیں ہیں، جو تم نے ہمیں پرورش کرنے کی غرض سے دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو ہمیں جنت میں پہنچ گئیں۔ ایک ماں کے لیے حقیقی جنت، میرے خیال میں خود اس کے بچوں کے دلوں میں ہی ہوسکتی ہے۔ دیکھا، میں نے تمھیں کیا لکھ مارا ہے؟"

گمرزا سے کبھی کبھی آنے والے خطوں کے ساتھ گرامچی کے بھتیجوں اور بھانجے بھانجیوں وغیرہ کے فوٹو بھی آجاتے تھے۔ خالی اوقات میں گرامچی ان فوٹوؤں کو بغور دیکھتا رہتا تھا، اور ان کے خدوخال میں مماثلتیں تلاش کرتا تھا۔

صحت اس کی خراب ہی تھی اور راتوں کو اسے بہت کم نیند آتی تھی۔ رات کو بمشکل دو ڈھائی گھنٹے کے لیے ہی اس کی آنکھ لگتی تھی۔

۲۷ جولائی ۱۹۳۱ء کو گرامچی نے تاتیانہ کو لکھا:

"پچھلے کئی مہینوں سے میں گھنگھور نسیان کا شکار ہوں۔ مجھے اس سر درد کی تو شکایت نہیں ہوئی، جنھوں نے ماضی میں میرا ناطقہ بند کر رکھا تھا (میں انھیں "مکمل" سر درد کہتا ہوں) مگر اس کے بدلے مجھ پر بظاہر مستقل ایسی حالت طاری ہے، جسے میں دماغی قوتوں کا کافور ہو جانا ہی کہہ سکتا ہوں: عام نقاہت، بے حسی، کسی نقطہ پر

توجہ مرکوز کرنے کی نااہلیت، یادداشت کی گمشدگی وغیرہ ۔ ۔ ۔"

یہ خط لکھنے کے سات دن بعد، ۳ اگست کی صبح کو گرامچی نے اچانک خون تھوکا۔ تاتیانہ کے نام ایک خط میں گرامچی نے اس خون تھوکنے کے واقعہ کی تفصیل لکھ بھیجی۔ کچھ ایسے انداز میں جیسے وہ کسی اور کے خون تھوکنے کا واقعہ بیان کر رہا ہو:

"یہ خون کی قے نہیں تھی، جیسا کہ میں نے لوگوں کو تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے۔ میں نے اپنے گلے میں خرخراہٹ سنی ——— جیسی نزلہ کے وقت ہوتی ہے ——— پھر کھانسی آئی اور میرا منہ خون سے بھر گیا۔ یہ کھانسی خاص زور کی نہیں تھی۔ ایسی ہی کھانسی تھی، جو گلے میں کچھ اٹک جانے سے آجاتی ہے۔ رک رک کر کھانسی کا دورہ یا حملہ نہیں۔ یہ کھانسی چار بجے تک آتی رہی اور اس عرصے میں نے ۲۵۰ سے ۳۰۰ گرام خون تھوکا ۔ ۔ ۔ میں یہ بھی بتادوں کہ اس نے مجھے کچھ زیادہ کمزور نہیں کیا ۔ ۔ ۔ تو بھی، فکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اگرچہ جیسا کہ ڈاکٹر لوگ کہا کرتے ہیں، ہمیں اس پر نظر رکھنا ہوگی۔"

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گرامچی نے ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لیے تیار کر رکھا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے جسمانی قویٰ جواب دے جائیں گے، لیکن اس نے جن موضوعات پر لکھنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا ان پر وہ وقتاً فوقتاً اپنی کال کوٹھریوں میں کتابوں اور حوالوں کی عدم موجودگی کے باوجود لکھتا رہتا تھا۔ ان دنوں وہ اطالوی عبقریوں کی تاریخ پر نوٹس تیار کر رہا تھا۔ آخر کار اس کے قویٰ جواب دے گئے۔ ۲۹ اگست ۱۹۳۲ء کو اس نے تاتیانہ کے نام اپنے خط میں لکھا:

"میں ایک ایسے نکتہ پر پہنچ گیا ہوں جہاں میری مدافعتی قوتیں مکمل طور پر جواب دینے کے قریب ہیں۔ مجھے نہیں معلوم نتیجہ کیا نکلے گا۔ پچھلے چند دنوں میں اتنا بیمار رہا ہوں جتنا پہلے کبھی نہیں رہا۔ پچھلے آٹھ دس دن سے میں رات کو کبھی پون گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا اور کبھی کبھی تو میری پلک بھی نہیں جھپکی۔ بے خوابی سے ممکن ہے خاص بیماریاں نہ پیدا ہوتی ہوں، مگر یقیناً یہ ان امراض میں شدت پیدا کرتی ہے، جو پہلے سے موجود ہوں اور اس سے حالت میں ایسی ابتری آجاتی ہے کہ اپنا پورا وجود ہی ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا ہے۔"

حالت کی ابتری نے اُسے بدمزاج بھی بنا دیا۔ انھیں دنوں اس نے اسی تاتیانہ کو ہمیشہ کے لیے ماسکو چلے جانے کا مشورہ دیا۔

"جولیا سمجھتی ہے کہ تم روم میں اس لیے رکی ہوئی ہو اور تم اپنے ماں باپ کے پاس جانے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ میرے ساتھ اپنا (نسبتاً) قریبی تعلق ختم کرنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات صحیح ہے یا صرف یہی ایک وجہ ہے یا یہ ایک وجہ ہے، جس نے تمھیں یہاں روک رکھا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو تمھیں اس کے بارے میں فیصلہ کر لینا چاہیے اور فوراً چلے جانا چاہیے۔"

انھیں دنوں اُسے دو ایسی باتوں کا علم ہوا جن کی وجہ سے اس کا ذہنی اضطراب اور بڑھ گیا۔ گریزیتا کے خط سے اسے پتہ چلا کہ ماں قریب المرگ ہے، جبکہ کارلو نے اپنے خط میں اُسے یہ خبر دی کہ اس کی جیل سے رہائی کے امکان پیدا ہو رہے ہیں۔ کیا ماں کے انتقال سے پہلے وہ اسے دیکھ سکے گا، کیا اُسے رہائی مل جائے گی؟

روم پر فاشسٹوں کے قبضہ کی دسویں سالگرہ کے موقع پر کچھ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا اور کچھ قیدیوں کی قید کی مدت کم کی جا رہی تھی۔ گرامچی ان قیدیوں میں سے ایک تھا، جن کی قید کی مدت میں تخفیف کی گئی تھی۔ پھر گرامچی نے سنا کہ

ویٹیکن اور سوویت یونین کے درمیان سیاسی قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بات چیت شروع ہونے والی ہے، لیکن مسولینی نے اس خیال کو ہی سختی سے رد کر دیا۔

اب گرامچی، اپنے جسم سے ہار جانے کے بعد، جولیا سے اپنے تعلق کو سدا کے لیے منقطع کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ جولیا کے خط اب بھی کبھی کبھار آتے تھے، جن سے گرامچی نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اب اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ جولیا اگر کچھ دن کے لیے ہی روم اور تورین آنے میں کامیاب ہو جاتی تو شاید بدگمانی کے بادل چھٹ سکتے تھے، جو برسوں کی جدائی اور سرد تعلق کی وجہ سے گرامچی کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ جولیا اُس وقت ۳۶ برس کی تھی۔ گرامچی کی خواہش تھی کہ وہ جولیا کو ازدواجی بندھن سے آزاد کر دے، تاکہ وہ ہو سکے تو اپنے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔

نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء میں گرامچی نے جولیا کو طلاق دینے کے بارے میں تاتیانا کو یکے بعد دیگرے تین تفصیلی خط لکھے۔

۳۰ دسمبر کو گلرزا میں گرامچی کی ماں سینورا پیپنا کا انتقال ہو گیا۔ اس کے گھر والوں نے گرامچی کو ماں کے انتقال کی خبر سے بے خبر رکھنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ وہ اس سانحہ کو برداشت نہیں کر پائے گا۔ چنانچہ، اپنی ماں کی موت سے بے خبر، گرامچی نے تین مہینے بعد، ۳ر اپریل ۱۹۳۳ء کو تیریسینا کو لکھا:

"اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں، تم ایسٹر پر ماں کو میری بہترین خواہشات پہنچا نا نہ بھولنا۔ میں اس سال انھیں نام رکھے جانے کی سالگرہ کی مبارک باد دینا بھول گیا تھا اور اس پر مجھے بہت قلق محسوس ہوا تھا۔"

۱۹۳۲ء گرامچی کے لیے گزر جانے والے برس سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ حالات اور خاص طور پر اپنی صحت کے مسلسل انحطاط کا خود گرامچی کو بھی احساس تھا۔ ۲ جنوری ۱۹۳۳ء کو اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا:

"اگر ۳۲ء بُرا تھا تو یقینی سی بات ہے کہ ۳۳ء اس سے بدتر ہی ثابت ہوگا۔ میری صحت بہت گر چکی ہے اور مجھے جو بوجھ اٹھا کر گھسیٹنا پڑ رہا ہے، وہ مسلسل بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ جن قوتوں کو میں مجتمع کر سکتا ہوں اور انھیں مجتمع کرنے کے لیے مجھے جو کوششیں کرنا پڑتی ہیں، ان کا تناسب نامساعد سے نامساعد ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی میں بے حوصلگی کا شکار نہیں ہوا ہوں؛ اس کے برعکس میری قوتِ ارادی اس حقیقت پسندی سے نئی طاقت حاصل کرتی ہے، جس سے میں حقائق حال کا تجزیہ کرتا ہوں . . ."

حقیقت یہ تھی کہ سانس بہ سانس گرامچی موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے خوابی ایک مستقل عذاب بن چکی تھی۔ اس کے دانت گر چکے تھے۔ اسے معدہ کے مختلف اور تکلیف دہ عوارض لاحق تھے۔ پھیپھڑوں کی دق کے ساتھ اُسے ریڑھ کی ہڈی کی دق نے بھی آدبوچا تھا مگر عوارض کے اس ہجوم میں بھی گرامچی ذہنی قوتیں صحیح سالم تھیں۔ اور اتنی صحیح سالم تھیں کہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ذہن جسم کے اس زوال و انحطاط کا تماشائی بنا ہوا تھا اور وہ جسم کی اذیتوں سے محفوظ و مامون تھا۔ خود گرامچی کو اپنے ذہن کی اس توانائی کا پورا احساس تھا: "میں نے کئی بدصورت لمحے جھیلے ہیں اور اکثر میں نے خود کو جسمانی طور پر کمزور محسوس کیا ہے، مگر میں نے کبھی اس کمزوری کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے اور ——— جہاں تک ایسی باتوں کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ مستقبل میں اس کے آگے گھٹنے ٹیک دوں گا۔ تکلیف اور کمزوری کا مجھے جتنا احساس ہوتا ہے، اتنا ہی میں خود کو کڑا بنا لیتا ہوں اور قوتِ ارادی کے ہر ایک اونس کو مجتمع کر کے جینے کا سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔" (۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء) یہ زندگی اذیت ناک تھی اور قابلِ نفرین، مگر گرامچی ان اذیتوں کو جینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

۱۳ فروری ۱۹۳۳ء کو تاتیانہ کے نام گرامچی نے اپنے خط میں لکھا :

"کچھ عرصے سے، تقریباً ڈیڑھ برس سے، میں جو کچھ جھیل رہا ہوں، اُسے ایک مسلسل عذاب ہی کہا جاسکتا ہے۔ اب جسمانی عارضہ کا مجھ پر تیزی کے ساتھ ردِ عمل نہیں ہوتا۔ میں اپنی طاقت کو تحلیل ہوتے محسوس کررہا ہوں، مگر میں ہار نہیں مانوں گا اور عدم مزاحمت کی راہ منتخب نہیں کروں گا۔ ان اذیتوں کو کم کرنے یا اُن کا خاتمہ کرنے کے معمولی سے معمولی امکان کو چاہے وہ کتنا ہی معدوم یا ناممکن کیوں نظر آتا ہو، ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ میرے خیال میں ایسے کسی معمولی سے امکان کو نظر انداز کرنا ایک طریقے سے خودکشی کے کرنے مترادف ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اضداد کا مجموعہ بن گیا ہوں، مگر اتنا بھی نہیں، جو میں اُن بنیادی باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔"

لیکن گرامچی کے لیے یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ جسمانی عوارض اور ان کی اذیتوں نے اس کی ذہنی گرفت کو ڈھیلا یا ختم کر دیا تو وہ کہیں اس حالت میں گھٹنے تو نہیں ٹیک دے گا اور رحم کی بھیک تو نہیں مانگنے لگے گا۔ گرامچی کے ذہن نے اس خدشہ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اپنی ڈائری اور اپنے خطوط میں بھی گرامچی نے اس خدشہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

تاتیانہ اس وقت توری میں ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھی اور گرامچی کے جسم کے اس مسلسل انحطاط و زوال کے ڈوبتے دل کے ساتھ مشاہدہ کررہی تھی۔ ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو گرامچی بستر سے اٹھا اور اٹھتے ہی گر گیا۔ اس وقت اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ بغیر سہارے کے کھڑا ہوسکے۔

اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ دو ساتھیوں نے کوٹھری میں باری باری گرامچی کی دیکھ بھال کی۔ بعد میں ان دونوں رفیقوں نے گرامچی کو بتایا کہ ہذیانی کیفیت میں وہ روح کے لافانی ہونے کے بارے میں تقریر کرتا تھا اور بیچ بیچ میں وہ سارڈینیائی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگتا تھا۔ بعد میں گرامچی نے اپنی ڈائری میں اس ہذیانی دورے کے بارے میں لکھا: "لگتا ہے پوری رات میں روح کی لافانیت کے بارے میں، حقیقت پسندی اور تاریخی معنی میں، تقریر کرتا رہا یعنی ہمارے بعد ہمارے مؤثر و مفید اور ضروری اعمال باقی رہتے ہیں اور وہ ہماری خواہشات سے قطع نظر، عالمی سلسلۂ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔"

"... کھڑکیوں اور دیواروں میں مجھے لوگ اور ان کے چہرے نظر آتے؛ خاص طور پر چہرے، ڈراؤنے نہیں، بلکہ مسکراتے ہوئے چہرے، عجیب عجیب انداز میں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے ٹھوس، مگر اس کے باوجود رقیق ہیولے میری نظروں کے سامنے ہوا میں تیررہے ہیں، جمع ہورہے ہیں۔ یہ ہیولے جمع ہوکر مجھ پر گرتے ہیں اور میں دھپ سے بستر پر گرجاتا ہوں۔ میری پتلیوں میں ماضی کی تصویریں اُبھرتیں اور یہ تصویریں حال کی تصویروں پر چسپاں ہوجاتیں۔ مجھے سماعتی واہمے بھی سُنائی دیتے۔ ذہن کو سکون دینے کے لیے میں جب بھی آنکھیں بند کرتا تو صاف طور پر مجھے آوازیں یہ کہتی سُنائی دیتیں، "تم وہاں موجود ہو؟" "کیا تم سورہے ہو؟" وغیرہ ..."

چنانچہ گرامچی کا ذہن کا ایک حصہ پوری طرح چوکنا تھا اور وہ حصہ جسم کی ہار کو اپنی ہار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس حالت میں بھی گرامچی کا ذہن رحم کی درخواست کے خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

تاتیانہ نے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ریاست کے سربراہ سے بہتر سلوک کیے جانے کی اپیل کی تھی، جس میں باہر کے کسی ڈاکٹر سے گرامچی کا معائنہ کرانے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ ۲۰ مارچ ۳۳ء کو پروفیسر امبرتو آرک انجیلی کو جیل میں گرامچی کا معائنہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ آرک انجیلی نے گرامچی کو فوراً کسی ہسپتال میں منتقل کیے جانے کی سفارش کی مگر اس

سفارش پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔

جولیا اور بچوں کا خیال بھی گرامچی کو رہ رہ کر آتا تھا۔ ۲۷ مارچ کو اس نے جولیا کے نام اپنے خط میں لکھا: "کافی عرصے سے مجھے تمہارا کوئی خط اور بچوں کی کوئی خیریت نہیں ملی۔ اس دوران، میں نے تم کو کئی خط لکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تاتیانہ کو بھی اس عرصے میں کوئی خیر خبر یا خط نہیں ملا ہے۔ مجھے لکھو اور اطمینان دلاؤ۔"

اسی عرصہ میں گرامچی کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا، مگر گرامچی کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خبر کو اس سے مخفی رکھا گیا تھا۔ گھر سے اسے اب جو خطوط ملتے تھے، ان میں ماں کے ذکر کو مفقود پا کر گرامچی شکایت کرتا کہ اسے ماں کی خیریت سے کیوں مطلع نہیں کیا جاتا۔

تاتیانہ کو ماسکو سے ۲۹ مئی کو باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ یکم جولائی کو وہ گرامچی سے ملنے جیل گئی تو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گرامچی کی جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ گرامچی نے ایک بار پھر نہایت سختی کے ساتھ اسے روم واپس چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن تاتیانہ بھی اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ اس نے روم واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

کچھ دن بعد گرامچی کی کوٹھری بدل دی گئی۔ کوٹھری بدلنے کے ساتھ گرامچی کی حالت میں کچھ سدھار ہوا —— اور گرامچی رات کو نیند کی دو تین جھپکیاں لینے لگا۔ اس نے ایک بار پھر مطالعہ شروع کر دیا اور نوٹ بکس میں نوٹس کا اضافہ بھی ہونے لگا۔

کارلو نے ۱۴ اگست ۳۳ء کو روم جا کر گرامچی کو ہسپتال منتقل کیے جانے کے بارے میں ایک درخواست مسولینی کے اس ڈاکٹر کو پیش کی، جو سفر میں مسولینی کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن اس درخواست کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اسی دوران پیرس میں گرامچی اور دوسرے قیدیوں کو فاشزم کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے ایک کمیٹی قائم ہو چکی تھی، جس میں رومان رولاں اور ہنری باربوسے جیسے مشاہیر شامل تھے۔ اس کمیٹی کی اپیل سے بین الاقوامی رائے عامہ متاثر ہوئی۔ فاشسٹ حکومت نے اس اثر کو ایک حد تک قبول کیا۔ اور اکتوبر میں، روم اور نیپلز کے درمیان واقع شہر، فورمیا کے ایک کلینک میں گرامچی کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط وابستہ تھی کہ علاج کا ۲۰۰ لیرے روزانہ کا خرچ اور حفاظتی اقدامات کا خرچ گرامچی اٹھائے گا۔ گرامچی کی طرف سے یہ سارا خرچ اٹھانے کی ذمہ داری کارلو نے قبول کی۔ ۱۸ نومبر کو گرامچی کی روانگی کا پروانہ آ گیا۔ گستاو تریبتی کوٹھری میں گرامچی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ توری جیل سے گرامچی کی روانگی کا منظر اس نے اس طرح کھینچا ہے:

"جیل کے اسٹور کی دیکھ بھال کرنے والے وارڈر کے ساتھ گرامچی اور میں سامان باندھنے لگے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے، اس نے وارڈر کو باتوں میں لگا لیا اور میں نے ۱۸ نوٹ بکس دوسری چیزوں کے ساتھ ٹرنک میں رکھ دیں (ان نوٹ بکس کی تعداد ۱۸ نہیں، ۱۹ تھی) کوٹھری میں واپس آنے کے بعد گرامچی کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ . . صبح چھ بجے جب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ایک مسلح دستہ اسے لے جانے کے لیے آ گیا۔ . ."

جیل سے نکلنے پر گرامچی پر جو تاثرات مرتب ہوئے تھے، گرامچی نے انھیں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے: "چھ برس تک وہی چھتیں، وہی اونچی دیواریں، وہی سُتے ہوئے چہرے دیکھتے رہنے کے بعد ٹرین میں بیٹھتے ہی مجھے زبردست سنسنی کا احساس ہوا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس پورے عرصے میں باہر کی دنیا کا وجود جاری و ساری رہا تھا؛ اس کے کھیت، اس کے جنگل، اس کے لوگ، بچوں کے جمگھٹے، یہاں کے یہ درخت، وہاں کے وہ باغ۔ . . مگر اتنے عرصہ کے بعد آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر مجھے جو صدمہ پہنچا،

اس کے مقابلے میں یہ نسبی کچھ بھی نہیں تھی۔ ۱۹ نومبر کی شام کو ہی گرامچی سویتا وپیا کے جیل ہسپتال پہنچ گیا۔ یہاں دو دوسرے سیاسی قیدی بھی تھے، جن میں تیراسینی بھی تھا۔ مگر گرامچی کو ان میں سے کسی سے بھی ملنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

۷ دسمبر ۳۳ء کو گرامچی فورمیا پہنچ گیا۔ یہاں کلینک کے اس کمرے میں، جہاں گرامچی کو رکھا گیا، ایک مسلح فوجی ہر وقت موجود رہتا تھا۔ برآمدوں اور باغ میں لگ بھگ بیس سپاہی چوکسی کے لیے تعینات رہتے تھے۔ اس چوکسی سے قطع نظر، کلینک میں گرامچی کا بہتر طریقے سے علاج معالجہ ہونے لگا تاخیر کے باوجود، اس علاج معالجہ کا گرامچی پر اچھا اثر ہوا۔ ہفتے میں ایک بار گرامچی کو باغ میں ٹہلنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

کرسمس کے موقع پر کارلو اور تاتیانہ گرامچی سے ملنے فورمیا پہنچے۔ کرسمس کے دن انھیں گرامچی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی، مگر اگلے دن ان دونوں کو گرامچی سے ملنے دیا گیا۔ کارلو اور تاتیانہ کا گرامچی نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اس کی حالت میں کسی قدر افاقہ دیکھ کر دونوں کو خوشی ہوئی۔ تیریسینا نے کارلو کے ہاتھ کرسمس کا تحفہ بھیجا تھا۔ کارلو نے یہ پارسل کھولنے کے لیے اس مسلح سپاہی سے ہی کہا، جو اس کمرہ میں تعینات تھا۔ مسلح سپاہی کو بسکٹوں کا پیکٹ کھولتے دیکھ کر گرامچی نے کہا: "یہ بسکٹ یقیناً ماں نے ہی بنائے ہوں گے" دونوں نے گرامچی کی رائے پر صاد کیا، کیونکہ ابھی گرامچی کی حالت ایسی تھی کہ ماں کی موت کی خبر اس کے لیے جاں کاہ ثابت ہو سکتی تھی۔

۸ مارچ ۳۴ء کو گرامچی نے اپنی ماں کے نام ایک خط لکھا، جبکہ اس کے انتقال کو ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔

"پیاری ماں، پچھلے برس میں نام رکھنے کے دن کی سالگرہ پر تمھیں مبارکباد نہیں بھیج سکا تھا، کیونکہ اس وقت میں شدید بیمار تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ برس بھی میری طرف سے یہ یاد دہانی کرائے بغیر گزر جائے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ تاتیانہ نے یہاں کے میرے حالات کے بارے میں تیریسینا کو مطلع رکھا ہے۔ . . . حالات بہت اچھے نہیں، مگر ایک سال پہلے کے حالات کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ . . . جسمانی یا ذہنی لحاظ سے میری صلاحیتیں بحال نہیں ہوئی ہیں۔ توری میں آخری دنوں میں میری حالت نہایت خستہ ہو گئی تھی اور میری صحت کی بحالی شکست ثابت ہو رہی ہے۔ . . . مجھے نہیں معلوم تمھارا کیا حال ہے۔"

گرامچی نے اپریل ۳۴ء میں اعصابی امراض کے لیے مخصوص ہسپتال میں بھیجے جانے کی درخواست کی۔ جولائی میں گرامچی کا طبی معائنہ ہوا۔ درخواست پر فیصلہ ہونے میں تاخیر ہونے پر گرامچی نے ایک اور درخواست دی۔ اس بار اس نے مشروط رہائی کا مطالبہ کیا۔ اٹلی کے باہر گرامچی کی رہائی کی مہم جاری تھی۔ رو ماں رولاں نے گرامچی کی شہادت کے بارے میں ایک پمفلٹ بھی شایع کیا۔

اکتوبر ۳۴ء میں اس کی درخواست قبول کر لی گئی۔ مگر یہ رہائی محض رسمی تھی، کیونکہ مسلح پہرہ دار کو کمرے سے ہٹا کر عمارت کے باہر تعینات کر دیا گیا تھا اور اسے علاج کے لیے خاص ہسپتال یا کلینک چننے کی بھی اجازت نہیں دی گئی تھی، کیونکہ فاشسٹ حکومت کو یہ شک تھا کہ گرامچی فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ عملی طور پر گرامچی کی یہ 'مشروط رہائی' برائے نام ہی رہائی تھی۔

گرامچی نے اس حالت میں بھی جبکہ اس کے جسمانی قویٰ جواب دے رہے تھے، مطالعہ اور لکھنے کا کام جاری رکھا۔ فورمیا میں اپنے قیام (۱۹۳۴-۱۹۳۵ء) کے دوران گرامچی نے ایسی پانچ نوٹ بکس پر کام کیا، جو اس نے توری میں شروع کی تھیں۔ اس دوران گرامچی نے زیادہ تر تصحیح، نظر ثانی اور اضافہ پر ہی توجہ دی۔ اس وضاحت و تشریح کی وجہ سے گرامچی کے تصورات کے خدوخال ابھر کر سامنے آ گئے۔ ان پانچ نوٹ بکس کی تکمیل کے علاوہ، گرامچی نے گیارہ نوٹ بکس فورمیا میں قیام کے دوران پوری کیں۔ آخری نوٹ بکس میں اس کی تحریر میں جسمانی کمزوری کی جھلک صاف نظر آنے لگی تھی۔ ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں اس کی بگڑتی ہوئی حالت نے اس ذہنی کاوش کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں تحریروں پر وہ نظر ثانی بھی نہیں کر سکا۔

مشروط رہائی کے دس مہینے بعد گرامچی کو روم کے کوئی سیسانا Quisisiana کلینک میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ ۲۴ اگست ۱۹۳۵ء کو گرامچی روم کے لیے روانہ ہو گیا۔ روم کے اس کلینک میں داخلے کے بعد گرامچی کے جان لیوا امراض کا باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ گرامچی نے اس عرصہ میں جولیا سے تعلقات کی تجدید کی کوشش کی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ہی روم آ جائے لیکن گرامچی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اب گرامچی نے دنیا سے قطع تعلق سا کر لیا۔ اس نے پارٹی یا اس کے کسی عہدیدار سے بھی کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۷ء کو اس کی رہائی عمل میں آنے والی تھی اور وہ اس رہائی کی اُمید میں ہی سانسیں گن رہا تھا۔ رہا ہونے پر وہ سار دینیا واپس جانے اور زندگی کے باقیماندہ دن وہیں گذارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

فرانسیسکو گرامچی کو جب اپنے بیٹے کے اس منصوبہ کا علم ہوا تو ۹۰ سالہ بوڑھے اور بیمار جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے ۱۹۲۴ء کے بعد سے گرامچی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے بھی اس سے دور تھے۔ گناروسپین میں ری پبلکن آرمی کے ساتھ فرانکو کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ماریو افریقہ میں تعینات اطالوی فوج میں تھا؛ کارلو میلان میں کام کر رہا تھا۔ ایڈمیا گرامچی کے الفاظ میں:

"جب چچا نینو کی قید کی مدت پوری ہونے کو آئی تو انھوں نے ہمیں لکھا کہ ہم سانتو لو سرجیو میں اُن کے لیے ایک کمرہ تلاش کریں۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں وہاں رہ چکے تھے اور اس کی آب و ہوا مناسب تھی۔ تیریسینا اور ایک دوست، پینا یوسالردکے ساتھ میں وہاں گئی۔ ہمیں ایک بہت اچھا کمرہ مل گیا۔ اس کے بعد ہم چچا نینو کی واپسی کے انتظار میں گن گن کر دن بتانے لگے۔ انھیں ۲۷ اپریل کو واپس آنا تھا۔ ہم نے اس دن اُن کا سارے دن انتظار کیا۔ ہمیں یقین تھا وہ کسی بھی لمحہ وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ دن بیت گیا اور وہ نہیں آئے۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ دادا جان بھی اپنے بیٹے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہم نے انھیں دلاسا دیا کہ وہ کل بخیریت پہنچ ہی جائیں گے۔ اگلے دن ایک عورت ہمارے گھر آئی اور اس نے پوچھا، "کیا یہ خبر سچ ہے کہ نینو کا انتقال ہو گیا ہے؟" یہ سن کر ہم سناٹے میں آ گئے۔ "ریڈیو نے یہی کہا ہے، میں نے ریڈیو پر یہی سُنا ہے۔" عورت نے بتایا۔ اس کے بعد لوگ تعزیت کے لیے آنے لگے۔ دادا جان کی طبیعت خراب تھی اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ انھیں یہ خبر دے۔ اس لیے کوئی ایک آدمی اُن کے کمرہ کے دروازے کے باہر موجود رہتا، تاکہ لوگوں کو اندر جانے اور انھیں یہ خبر دینے سے روک سکے۔ میں ہی اکثر وہاں موجود رہتی تھی۔ اس وقت سترہ برس کی لڑکی ہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ کسی کام سے مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ میں باورچی خانہ میں تھی کہ میں اُن کی چیخ کی آواز سُنی۔ ہم سب اُن کی طرف بھاگے۔ دادا جان چیخ رہے تھے: "قاتل! ہتیارے! ان قاتلوں نے میرے بیٹے کو مار ڈالا، مار ڈالا!" مجھے یہ سب اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے: "انھوں نے میرے بیٹے کو مار ڈالا" اور وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال نوچ رہے تھے اور اپنے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔ بڑا دہشت ناک منظر تھا یہ ۔ ۔ ۔"

انتونیو گرامچی نے ۲۷ اپریل کو گھر واپس پہنچنے کا وعدہ کیا تھا اور اُسی دن صبح چار بجکر دس منٹ پر وہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ موت کے وقت اس کی عمر ۴۶ برس تھی۔ اگلے دن دوپہر کو اسے نذرِ آتش کرنے کے لیے لے جایا گیا تو اس وقت روم میں طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ مُردہ گاڑی روم کے بازاروں سے گذر رہی تھی اور اس گاڑی کے پیچھے کارلو اور تاتیانہ کی گاڑی تھی۔

۱۶ مئی کو فرانسیسکو گرامچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ بستر مرگ پر فرانسیسکو نے بار بار اس خط کو پڑھا تھا جو انتونیو گرامچی نے مقدمہ شروع ہونے سے پہلے اپنی ماں کے نام لکھا تھا:

" اپنے ذہنی سکون کے لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی بھی سزا کیوں نہ دی جائے، تم اس پر ہراساں یا رنجیدہ مت ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سمجھ لو اور محسوس کر لو کہ میں ایک سیاسی قیدی ہوں۔ اور اس میں قطعی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر میں شرمندگی محسوس کروں اور آئندہ بھی کسی بات پر محسوس نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سمجھ لو کہ ایک معنی میں تو میں خود قید ہونے اور سزا پانے کا خواہش مند تھا، کیونکہ میں اپنے خیالات بدلنے پر تیار نہیں تھا اور بلاشبہ میں نہ صرف ان کے لیے جیل جانے بلکہ جان تک دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ جان لو کہ اسی باعث میں ذہنی طور پر پُرسکون ہوں اور جو کچھ میں نے کیا ہے، اس پر نادم و ناخوش نہیں ہوں۔ عزیز ماں، میں تمھیں اپنے سینے سے لگا لینا چاہتا ہوں، تاکہ تم یہ جان سکو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں اور میں اس عظیم دُکھ پر تمھیں کتنا دلاسہ دینا چاہتا ہوں جو میں نے تمھیں پہنچایا ہے۔ لیکن میں اس کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے ——— نہایت سنگین۔ اور بیٹوں کو بعض اوقات اپنے ماؤں کو عظیم دُکھ پہنچانا پڑتا ہے، بشرطیکہ وہ مردوں کے طور پر اپنی عزت اور اپنے وقار کا تحفظ کرنے کے خواہش مند ہوں۔ "

”مادیت پرستی کی لہر“ اور ”حاکمیت کا بحران“

انتونیو گرامچی

جدید بحران کا وہ پہلو، جسے ”مادیت پرستی کی لہر“ قرار دیتے ہوئے اظہارِ افسوس کیا جاتا ہے، وہ دراصل ”حاکمیت کے بحران“ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر حکمران طبقہ اس اجتماعی اتفاقِ رائے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے تحت وہ رہنمایانہ کردار ادا کرتا ہے اور وہ محض ایسا ”غالب“ طبقہ بن کر رہ جاتا ہے، جو محض استبدادی قوت کو استعمال کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کی بڑی اکثریت اپنے روایتی نظریات سے الگ تھلگ ہو گئی ہے اور ان باتوں پر اس کا یقین باقی نہیں رہا ہے، جن پر وہ یقین کرتی تھی۔ اس بحران کی حقیقت اس میں مضمر ہوتی ہے کہ جو چیزیں، باتیں پرانی ہو چکی ہیں، وہ جاں بلب ہیں اور جو چیزیں، باتیں نئی ہیں، وہ پیدا ہونے کی سکت سے محروم ہیں۔ اس درمیانی وقفے میں مرض کی کئی سنگین علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً نوجوان نسل کا مسئلہ، جو دراصل صاحبِ اقتدار پرانی نسلوں کے ”حاکمیت بحران“ کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میکانکی رکاوٹ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جو ان لوگوں کی راہ میں کھڑی کر دی جاتی ہے، جو نئی عملداری اور حاکمیت کے اہل ہوتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے: کیا عوام الناس اور حکمران نظریات، کے درمیان اس قطع تعلق کو محض طاقت کے استعمال سے جوڑا جا سکتا ہے اور اس طرح نئے نظریات کو عملداری حاصل کرنے سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا یہ درمیانی وقفہ بحران، جس کے تاریخی لحاظ سے، نارمل حل کی راہ میں اس طرح رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے، پرانے نظریات کی بحالی پر منتج ہو سکتا ہے؟ نئے اور پرانے نظریات کی ماہیت کے پیشِ نظر اس امکان کو رد کیا جا سکتا ہے، مگر مکمل طور پر نہیں۔ اس درمیانی وقفہ میں جبر و استبداد کی وجہ سے وسیع پیمانے پر منکرانہ جو پھیلتی ہے . . .

اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخی مادیت پرستی کی عدیم المثال توسیع کے لیے نہایت سازگار حالات پیدا کیے جاتے ہیں . . . پرانے نظریات کی موت سبھی نظریوں اور فارمولوں کے بارے میں منکر پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور ظاہر ہوتی ہے خالص معاشی حقیقت پرستی کے روپ میں (روپیہ پیسہ اور آمدنی کو ہی سب کچھ سمجھا جانے لگتا ہے)؛ پرانے نظریات کی موت ایسی

سیاست کے روپ میں بھی ظاہر ہوتی ہے، جس کا در حقیقت، حقیقت پرستی سے شعور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

لیکن ہر ایک چیز کو معیشت اور سیاست کی حدود میں تحدید کر دینے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سبھی ارفع ترین یا لافانی اصول اس سطح پر بھی آجاتے ہیں، جو اصل ڈھانچے سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس صورت حال میں ایک نئی تہذیب تخلیق کرنے کا امکان ابھرتا ہے اور اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

(اقتباس)

———— "سیاست الادمد فی معاشرہ"

(۱۹۳۰ء)

انسان کیا ہے؟

انٹونیو گرامچی

یہ فلسفے کا بنیادی اور خاص سوال ہے۔ اس کا جواب کس طرح دیا جائے؟ اس کی تشریح خود انسان کے اندر تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر انسان کے اندر اس کی تشریح دریافت کی جاسکتی ہے۔ لیکن کیا یہ درست ہے؟ ہم فردِ واحد میں یہ دریافت کریں کہ ہر "فردِ واحد" کیا ہے؟ لیکن ہمیں دلچسپی یہ جاننے سے نہیں ہے کہ ہر انسان کیا ہے، جس کے معنی ہیں یہ جاننے سے دلچسپی یہ جاننے سے نہیں ہے کہ ہر انسان کیا ہے، جس کے معنی ہیں یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ ہر انسان ہر خاص لمحے میں کیا ہے۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اٹھا کر "انسان کیا ہے؟" ہم دراصل یہ پوچھنا چاہتے ہیں: "انسان کیا ہوسکتا ہے؟" جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تقدیر کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں، "خود اپنی تعمیر" کرسکتا ہے یا نہیں، خود اپنے لیے زندگی کے شیرازہ بندی، کرسکتا ہے یا نہیں؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک سلسلہ ہے، ایک سلسلۂ عمل۔ جب ہم اس طرح غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال "انسان کیا ہے؟"، کوئی "مجرد یا خارجی" سوال نہیں ہے۔ یہ سوال ابھرتا ہے اس بات سے کہ ہم نے اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں کیا سوچا ہے، اور اس چیز سے متعلق کہ ہم نے کیا سوچا اور دیکھا ہے، ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہم کیا بن سکتے ہیں، آیا یہ سچ ہے اور کس حد تک سچ ہے۔ کہ "ہم اپنے آپ کو بناتے ہیں"، اپنی زندگیاں تخلیق کرسکتے ہیں اور اپنی تقدیر بنا سکتے ہیں۔ ہم "اس وقت" یہ جاننا چاہتے ہیں، "حال میں"، اور اپنی روزمرہ کی زندگی کے خاص حالات میں یہ جاننا چاہتے ہیں۔ ہم کسی اور زندگی کے بارے میں کسی شخص کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے۔

یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ جاننے کی کوشش و کاوش سے کہ انسان کی زندگی کیا ہے اس کے خاص اور متعینہ تانوں بانوں سے یہ سوال اٹھتا ہے اور اسی سے یہ سوال اپنے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔ ان تانوں بانوں میں سب سے اہم ہیں "مذہبی" تانے بانے ——— اور ایک خاص قسم کے مذہبی تانے بانے ——— اسے کیتھولسزم (مذہبی آفاقیت) کے تانے بانے کہہ لیجیے۔ درحقیقت جب ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں "انسان کیا ہے، اس کی رضا کیا ہے۔ خود اپنی تخلیق و تشکیل اور جس قسم کی زندگی وہ جی رہا ہے اس کی تشکیل و تخلیق پر خود اس کی ٹھوس رائے سرگرمی کیا ہے؟" تو ہماری مراد ہوتی ہے: "کیا کیتھولسزم انسان کا اور زندگی کا سچا تصور ہے؟ کیتھولک ہوتے ہیں، کیتھولسزم کو ایک طرزِ حیات بنانے میں، ہم حق پر ہیں یا غلطی پر؟" ہر شخص کا دل کہتا ہے کہ کیتھولسزم کو طرزِ حیات بنانا غلطی ہے، کیوں کہ کوئی بھی کیتھولسزم کو ایک طرزِ حیات کے طور پر مکمل ڈھنگ سے نہیں برتتا، ایسے میں بھی جب وہ اپنے آپ کو کیتھولک ظاہر کرتا ہے تو ایک کٹر قسم کا کیتھولک، جو اپنی زندگی کے ہر عمل میں کیتھولک قوانین کا

اطلاق کرتا ہے، دیوزاد نظر آئے گا۔ اور اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خود کیتھولسزم کی سب سے شدید، ناقابلِ تردید تنقید بن جاتا ہے۔

کیتھولک عقیدے پر ایمان رکھنے والے کہیں گے کسی تصور پر بھی اتنی سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔ اور وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ تاریخی طور پر تو ایک ضابطہ یا قانون ہو اور غور و فکر اور عمل کے لیے دوسرا قانون جو تمام لوگوں پر یکساں لاگو ہوتا ہو۔ یہ کیتھولسزم کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح ہے کہ صدیوں سے فکر و عمل کا یہ انداز منظم رہا ہے اور اس کے نتائج بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی اور ایسے مذہب کے ساتھ نہیں پیش آئی ہے جس کے پاس اسی قسم کے نظام کی اسپرٹ ہو، جس کے پاس اسی قسم کا تسلسل اور مرکزیت ہو۔ "فلسفیانہ" نقطۂ نظر سے تسکین بخشی میں کیتھولسزم کی ناکامی اس بات میں مضمر ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود، یہ تمام خرابیوں کی جڑ خود انسان میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی نظر میں انسان ایک واضح اور حد بستہ فرد ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک تمام تر فلسفے کیتھولک عقیدے کے ماننے والوں کی اسی پوزیشن کو دہراتے رہے ہیں۔ انسان کو ایک ایسی ذی رُوح کی شکل میں دیکھا جاتا ہے جس کو اس کی انفرادیت محدود کرتی ہے، اس کی انفرادیت کو اور اس کے جذبے کو بھی۔ اسی نکتے پر انسان کے تصور میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یعنی، ایسے انسان کا تصور کرنا ضروری ہے جس کو فعال رشتوں کے ایک سلسلے کے طور پر دیکھا جائے، جس میں انفرادیت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، غور و خوض کا سب سے بنیادی عنصر نہیں ہے۔ ہر فرد میں جس انسانیت کا اظہار ہوتا ہے مختلف عناصر پر مبنی ہوتا ہے (۱) فرد (۲) دوسرے لوگ (۳) فطرت۔ دوسرا اور تیسرا عنصر اتنے سیدھے نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ فرد دوسرے لوگوں سے رشتہ مخالفت کے ذریعے نہیں پیدا کرتا بلکہ ان سے جماعتی اتحاد کے ناتے کے ذریعے کیوں کہ وہ سادہ ترین سے لے کر پیچیدہ ترین سماجی سانچوں اور ڈھانچوں تک ہر چیز کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح انسان فطرت سے صرف اس لیے رشتہ نہیں قائم کرتا کہ وہ خود فطرت کا حصہ ہے بلکہ سرگرم عمل کے ذریعہ، کام کے ذریعہ اور تکنیک کے ذریعہ ایسا کرتا ہے۔ یہ رشتے میکانکی نہیں ہیں۔ یہ رشتے سرگرم اور شعوری ہیں۔ اور یہ کم یا زیادہ ذہانت کے مطابق ہوتے ہیں جس سے فرد لیس ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بدلتا ہے، نئے سانچے میں ڈھالتا ہے، جس حد تک وہ رشتوں کے پورے پیچیدہ سلسلے کو بدلتا ہے، اور جس کا وہ خود دُھرا ہوتا ہے۔ اس معنی میں سچا فلسفی سیاسی ہوتا ہے۔ اور وہ سیاسی ہونے پر مجبور ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا سرگرم انسان ہے جو اپنے ماحول کو بدلتا ہے۔ یہاں ماحول اس معنی میں لینا چاہیے کہ اس میں وہ تمام رشتے شامل ہیں جن کے دائرے میں فرد داخل ہوتا ہے۔ اگر انفرادیت ان تمام رشتوں کا مجموعی سلسلہ ہے تو پھر اکتسابِ شخصیت کے معنی ہیں ان رشتوں کے شعور کا اکتساب اور شخصیت کو بدلنے کے معنی ہیں ان رشتوں کے پورے مجموعی سلسلے میں تبدیلی کرنا۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، یہ رشتے سیدھے سادے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ، کچھ غیر ارادی ہیں اور کچھ رضاکارانہ۔ مزید یہ حقیقت کہ انسان اس بات کا کم و بیش گہرا شعور رکھتا ہے (یعنی یہ جاننا کہ وہ ڈھنگ کیا ہے جس کے ذریعہ ان رشتوں کو بدلا جاسکتا ہے) یہی شعور ان رشتوں کو بدل دیتا ہے۔ ایک بار ان رشتوں کو ضروری تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی ضروری رشتے اپنے پہلوؤں اور اہمیت میں بدل جاتے ہیں۔ اس معنی میں تسلیم کرنے کا عمل طاقت ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ایک اور پہلو میں بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ یہ جاننا کافی نہیں ہے کہ ایک خاص تانے بانے کے اندر، ایک خاص لمحے میں موجود رشتوں کی مجموعی کیفیت اور خصوصیت کیا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی شانِ نزول کیا ہے، یہ چشمے پھوٹتے کس سوتے سے ہیں، وہ چنگاری کون سی ہے جو انھیں شعلہ بناتی ہے یعنی وہ نقطۂ آغاز جہاں یہ قوتِ نمو آشکار ہونا شروع ہوئی۔ کیوں کہ ہر فرد بذاتِ خود موجود رشتوں کا مرکب و مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ ان رشتوں کی تاریخ بھی ہے، ماضی کا نچوڑ۔ یہ کہا جائے گا کہ ایک فرد جو کچھ بدلنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ بہت کم ہے، بہت حقیر لیکن ذرا اس بات کو پیش نظر رکھیے کہ ہر فرد ان تمام دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے

جو اسی طرح ان ہی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں، اور اگر تبدیلیاں عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں، تو پھر اس صورت میں فرد واحد گویا اپنے آپ کو ضرب دے کر، ان کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کر سکتا ہے اور اس طرح ان تبدیلیوں سے کہیں زیادہ بڑی تبدیلیاں لا سکتا ہے جتنی پہلی نظر میں ممکن معلوم ہوئی تھیں۔

ایسی انجمنوں کی تعداد جن میں فرد شرکت کر سکتا ہے بہت زیادہ ہے (جتنی آدمی سمجھتا ہے اس سے کہیں زیادہ) ان ہی انجمنوں کے وسیلے سے فرد نسل انسانی کے حرکت و عمل میں حصہ لیتا ہے۔ اس طرح جن طریقوں سے فرد فطرت کے ساتھ رشتوں کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، گوناگوں ہیں۔ کیونکہ تکنیک ہماری مراد صرف سائنسی تصورات و تخیلات کی مجموعی شکل نہیں ہے جن کا اطلاق، اپنے عام معنوں میں صنعت پر ہوتا ہے، بلکہ ان سے مراد "دماغی" آلات بھی ہیں، فلسفیانہ علم بھی۔

یہ عام بات ہے کہ ایسے انسان کا تصور کرنا نا ممکن ہے جو سماج سے باہر جیتا ہو، جس کا وجود سماج سے باہر ہو۔ لیکن تمام ضروری نتائج، وہ بھی جن کا اطلاق افراد پر ہوتا ہے، ہمیشہ دسترس میں نہیں ہوتے۔ یہ بات بھی عام ہے کہ ایک خاص سماج میں اشیاء کے ایک خاص سماج کا ہونا ضروری ہے اور انسانی سماج کا تصور صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اشیا کے سماج کا وجود ہو۔ ان اشکال کو، انفرادی مثالوں سے قطع نظر، اب تک ایک میکانکی اور تعین پسندانہ معنویت کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ اس لیے ردِ عمل ظاہر ہے۔ ایک ایسے نظریے کی ترتیب و نشو و نما ضروری ہے جس میں ان تمام رشتوں کو متحرک اور فعال حقیقت کے روپ میں دیکھا جاتا ہے، تا کہ یہ بات بالکل صاف صاف طے ہو سکے کہ اس سرزمین کا سوتا انسان کا انفرادی شعور ہے جو جانتا ہے، جو رضا و رغبت رکھتا ہے، جو کوشش و کاوش سے کام لیتا ہے، جو تخلیق کرتا ہے کیوں کہ جاننا، چاہنا، جتن کرنا، تخلیق کرنا وغیرہ اس کی سرشت میں پہلے سے شامل ہے کیوں کہ وہ اپنا تصور ایک کٹے چھٹے فرد کی حیثیت سے نہیں کرتا، بلکہ وہ امکانات کے شعور و ثروت سے لیس ہوتا ہے جو اس کو دوسروں سے اور اشیا کے سماج سے حاصل ہو سکتے ہیں جن کا اسے علم ہے (کیوں کہ ہر فرد فلسفی ہے، ایک سائنس داں وغیرہ)۔

فیور باخ کا نظریہ ہے: "انسان وہ ہے جو وہ کھاتا ہے۔" اگر بطور خود دیا جائے تو اس کی تاویل مختلف طرح سے کی جا سکتی ہے۔ اگر اس کی تاویل تنگ نظری سے اور احمقانہ پوچ پن سے کی جائے تو کہا جا سکتا ہے: "انسان وہ ہے جو وہ مادی طور پر کھاتا ہے۔" یا ——— غذائیں انسان کے طرزِ فکر و خیال پر فوری اثر ڈالتی ہیں۔ مثال کے طور پر اماد ے بوردیگا کے اس بیان کا خیال آتا ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص نے تقریر کرنے سے پہلے کیا کھایا تھا تو وہ اس کی تقریر کی تاویل بہتر ڈھنگ سے کر سکتا ہے ——— یہ ایک بچکانہ بیان ہے جس کی متحمل مثبت سائنس بھی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ دماغ کی پرورش و پرداخت سیم اور ساگ سے نہیں ہوتی بلکہ ان غذاؤں سے، جو متوازن و یکساں قابلِ جذب مرکب میں بدل جاتی ہیں، اور متحد ہو کر دماغ کے خلیوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ یعنی غذائیں، امکانی نقطۂ نظر سے دماغی خلیوں کے لیے "یکساں فطرت" رکھتی ہیں۔ اگر یہ بیان درست ہوتا تو آپ کو بطنِ تاریخ کہیں باورچی خانے میں کار فرما نظر آتی اور انقلاباتِ زمانہ عام لوگوں کی بنیادی غذاؤں میں تبدیلیوں کے ساتھ اپنا چولا بدلتے رہتے۔ تاریخی صداقت اس کے برعکس ہے۔ انقلابی اور پیچیدہ تاریخی ارتقا نے ہی خوراک کی عادتوں کو بدلا ہے اور بتدریج غذا کے انتخاب کے "مذاق و شوق" میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اناج کی کاشت میں نظم و ضبط نے خانہ بدوشی کا سلسلہ روکا بلکہ قصہ بالکل اس کا الٹ ہے۔ ان حالات نے جو خانہ بدوشی کی وجہ سے رونما ہوئے تھے، باضابطہ کاشت کی طرح ڈالی۔

بہر حال، چونکہ غذا پیچیدہ سماجی رشتوں کا ایک اظہار ہے اور ہر سماجی گروہ کا اپنا غذائی ڈھانچہ ہوتا ہے، اس لیے

اس بیان میں کچھ صداقت تو ضرور ہے کہ " انسان وہی ہے جو وہ کھاتا ہے " لیکن اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ " انسان وہی ہے جو وہ پہنتا ہے " " انسان اپنی قیام گاہ ہے "، انسان وہ سلسلۂ عمل ہے جو اس کی افزائش نسل کرتا ہے یا یہ کہ " انسان اپنا خاندان ہے " کیوں کہ غذا، لباس، جائے رہائش، اور افزائش نسل سماجی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن میں، سماجی رشتوں کا پورا پیچیدہ سلسلہ انتہائی نمایاں اور وسیع پیمانے پر ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح یہ مسئلہ کہ انسان کیا ہے، ہمیشہ ایک ایسے مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، جسے کہتے ہیں " انسانی فطرت " یا " عام معنی میں انسان "، اس لیے انسان کو سائنس بنا کر پیش کرنا (یعنی اس کو ایک فلسفہ بنانا) جس کا نقطۂ آغاز بنیادی طور پر " یکجائی " کا تصور ہے اور اس کی تجرید کر کے اس کو اس کے سانچے میں سمونے کی کوشش یہ سب " انسانی " کرشمہ ہے۔ لیکن کیا " انسانیت " بحیثیت حقیقت اور بحیثیت تصور، انسان کی آفرینش کا تصور ہے یا اس کے سفر کے آغاز کا یعنی اس کے نزول کا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ نقطۂ آغاز کا نکتہ پیش کر کے دراصل اس بات کی تان صرف اس پر ٹوٹتی ہے کہ دینیات اور مابعد الطبیعات کو کس طرح برقرار رکھا جائے! فلسفے کو کاٹ پیٹ کر آثار قدیمہ کا فطرت پرست علم نہیں بنایا جاسکتا۔ بنی نوع انسان میں اتحاد، انسان کا حیاتیاتی وصف نہیں ہے۔ انسان میں وہ فرق و امتیاز، جس کی تاریخ میں اہمیت ہے، حیاتیاتی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ (یعنی نسل، کھوپڑی کی ساخت، جلد کا رنگ وغیرہ کا فرق) جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ انسان وہی ہے جو کھاتا ہے۔ یورپ میں انسان اناج کھاتا ہے، ایشیا میں چاول وغیرہ ——— جس کو ایک اور بیان کی شکل دی جاسکتی ہے: " انسان وہ ملک ہے جس پر وہ آباد ہے " کیوں کہ غذا کا تعلق عام طور پر اس ملک سے ہوتا ہے جہاں انسان رہتا ہے۔ اور یہ " حیاتیاتی اتحاد " بھی تاریخ میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں انجام دے سکا ہے (انسان جب اپنی " فطری حالت " سے سب سے زیادہ قریب تھا اور وہ ایک ایسا جانور تھا جو اپنے ہمزاد کو اپنا لقمہ بنا لیتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے قدرت کی نعمتوں کو " مصنوعی " طور پر پیدا کرنا نہیں سیکھا تھا) " منطقی دلایل کی صلاحیت " یا " جذبے " نے بھی یہ اتحاد نہیں پیدا کیا۔ اس کو " اتحاد ساز " حقیقت کی حیثیت سے نہیں تسلیم کیا جاسکتا کیونکہ یہ ایک متعینہ ذہنی تصور ہے۔ یہ " خیال " نہیں، بلکہ جو واقعی خیال ہے انسانوں کو متحد اور منقسم کرتا ہے۔

سب سے زیادہ اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ " انسانی فطرت ، انسانی رشتوں کا پیچیدہ سلسلہ " ہے کیونکہ یہ جواب " بن جانے " کے تصور کو اپنے اندر شامل کرتا ہے (انسان بنتا ہے، اپنے آپ کو بدلتا ہے، سماجی رشتوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے) اور اسی لیے " عام معنی میں انسان " کے تصور سے انکار کرتا ہے۔ حقیقت میں سماجی رشتوں کا اظہار انسانوں کے مختلف گروہ کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے وجود کو مانتے ہیں اور جن کا اتحاد جدلیاتی اور ذہنی نہیں۔ انسان اپنی سرشت میں حاکمانہ اور خادمانہ، دونوں عناصر رکھتا ہے وغیرہ۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطرت ہے تاریخ (اور اس معنی میں تاریخ جذبے یا روح کی ہم پلہ ہوتی ہے)، اگر تاریخ کو " بننے " کے معنی دے دیے جائیں جو اتحاد کو تہس نہس نہیں کرتی بلکہ اپنے اندر وہ بنیادیں سنبھال کر رکھتی ہے جو اتحاد کو ممکن بناتی ہیں۔ اس لیے " انسانی فطرت " ایک خاص انسان میں نہیں دریافت کی جاسکتی بلکہ بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں دریافت کی جاسکتی ہے (اور یہ حقیقت کہ ہم لفظ " نوع " کا استعمال اس کے فطری معنی میں کرتے ہیں، بڑی اہمیت رکھتی ہے) ہر فرد واحد میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہیں دوسرے افراد کی خصوصیات ہی واضح کرتی ہیں اور یہ فرق ان خصوصیات کا ہے جو مختلف افراد میں پائی جاتی ہیں۔ " روح " کا تصور روایتی فلسفے میں اور " انسانی فطرت " کا تصور حیاتیات میں ——— دونوں کو " سائنسی یوٹوپیا " کی حیثیت مل گئی، جن کے زیر اثر انسان نے غدا میں انسانی فطرت کا فرماد دیکھی (انسان، خدا کا بیٹا ہے وغیرہ) اور یہی " یوٹوپیا " تاریخ کے لمبے، پُرپیچ اور سنگلاخ راستے کی

آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں عقلی روشنی بھی ہے اور جذباتی امیدیں بھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے، یہ سچ ہے کہ وہ مذاہب جنھوں نے خدا کے بیٹوں کی حیثیت سے انسانوں کی برابری کی تبلیغ کی، اور ساتھ ہی وہ فلسفے بھی جنھوں نے انسانوں کی برابری کا تصور منطقی دلائل کی بنیاد پر پیش کیا، دراصل پیچیدہ انقلابی تحریکوں کا اظہار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان تحریکوں نے تاریخی ارتقا کے پورے سلسلے میں مضبوط ترین کڑیوں کا کام کیا۔

یہ خیال کہ ہیگل کی جدلیات اسی تاریخی ارتقا کی آخری شکل ہے اور یہ جدلیات معاشرتی تضادات کی آئینہ داری نہیں کرتی، بلکہ ان تضادات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ وہ خالص نظری جدلیات بن جاتی ہے، کروچے کے فلسفہ کی ہی مانند، یوٹوپیائی فکر کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔

تاریخ میں اصلی "برابری" جو "روحانیات" کا درجہ رکھتی ہے، "انسانی فطرت" کے تاریخی ارتقا کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔ اس کی شناخت ہوتی ہے "پبلک اور پرائیویٹ" کے نظام میں، "ظاہر اور مخفی" اجتماعیت میں جن کے تانے بانے "ریاست" اور عالمی سیاسی نظام میں پیوست ہوتے ہیں۔ یہاں "برابری" سے مراد وہ برابری ہے جو ایک جماعت یا انجمن کے اراکین آپس میں محسوس کریں۔ اور "نابرابری" وہ ہے جو مختلف جماعتوں یا انجمنوں کے درمیان محسوس کی جائے۔ برابری اور نابرابری جن کی قدر و قیمت ہے —— بشرطیکہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا ادراک موجود ہو۔ اس طرح ہم "فلسفے اور سیاست" کی برابری یا باہمی رشتے کے نکتے پر پہنچتے ہیں۔ یعنی خیال اور عمل کے باہمی تعلق کے سوال پر یعنی مارکسزم تک پہنچتے ہیں۔ سب کچھ سیاست ہے۔ فلسفہ بھی اور فلسفے بھی۔ اور واحد فلسفہ ہے تاریخ، اپنے سلسلۂ عمل میں۔ یعنی خود زندگی۔ اس معنی میں جرمن پرولتاریہ کے نظریے کی تاویل کی جا سکتی ہے، جو جرمن کلاسیکی فلسفے کے وارث ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معنی میں لینن کا نظریۂ عملداری اور اس کی تشریح بھی ایک بہت بڑا "مابعد الطبیعاتی" واقعہ تھی۔

فلسفے اور تاریخی مادیت کا مطالعہ

انتونیو گرامچی

یہ ایک عام حُسنِ ظن ہے کہ فلسفہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، اور یہ اس لیے کہ فلسفہ ماہر عالموں کی یا پیشہ ور اور باضابطہ فلسفیوں کی دانشورانہ سرگرمی کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا حُسنِ ظن ہے جس کی بیخ کنی ضروری ہے۔ اور یہ نیک کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ ثابت کریں کہ تمام انسان "فلسفی" ہیں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس "بے ساختہ فلسفے" کی حدوں کی وضاحت کریں جس سے "ہر شخص" لیس ہوتا ہے یعنی اس فلسفے کی حدوں کی وضاحت جو مندرجہ ذیل عناصر میں پوشیدہ ہوتا ہے :

۱ - خود زبان، جو متعینہ خیالات و تصورات کی کُلّی امین ہوتی ہے، جو صرف و نحو کی سطح پر محض الفاظ کا ایسا مجموعہ نہیں جو معنوی مواد سے خالی ہو۔

۲ - عقلِ سلیم اور نیک طینتی۔

۳ - مقبولِ عام مذہب اور اس لیے اعتقادات، توہمات، آرا، اندازِ نظر و عمل کا پورا نظام جن سے اسی چیز کی ترتیب و ترکیب ہوتی ہے جسے "لوک ادب" کہتے ہیں۔

یہ دکھانے کے بعد کہ ہر شخص فلسفی ہے، خالص اپنے ڈھنگ کا فلسفی سہی، غیر شعوری فلسفی ہی سہی، مگر ہے فلسفی، (کیوں کہ دانشورانہ سرگرمی ——— حتیٰ کہ "زبان ——— کا مختصر ترین مظہر بھی، دنیا کا ایک قطعی تصور رکھتا ہے) ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں، ہم اب تنقید اور باخبر ہونے کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب ہم اس سوال سے دوچار ہوتے ہیں : کیا قابلِ ترجیح یہ ہے کہ بغیر تنقیدی شعور کے "سوچا" جائے بے ربط اور بے ضابطہ ڈھنگ سے سوچا جائے، دوسرے لفظوں میں، کیا دُنیا کے اس تصور میں شرکت کی جائے جسے باہر کے ماحول نے میکانکی طور پر "مسلط" کیا ہے، یعنی جس کو ان بہت سے سماجی گروہوں میں سے ایک نے "مسلط" کیا ہے جس سے ہر شخص اسی آن سے وابستہ ہو جاتا ہے جب وہ شعوری دُنیا میں قدم رکھتا ہے (وہ اُس شخص کا اپنا گاؤں ہو سکتا ہے یا صوبہ۔ اس کی جڑیں کلیسا میں اور پادری شاہی میں ہو سکتی ہیں یا اس بڈھے سر قبیلی مکھیا میں ہو سکتی ہیں جس کی عقل قانون ہے، اس چرب زبان بڑھیا میں جس کی گھُٹی میں فن جادوگری کا علم ہو، یا بدی قسم کے دانشور میں جس کو خود اُس کی حماقتوں اور بےبسی نے ترش رو بنا دیا ہو)؛ یا قابلِ ترجیح یہ ہے کہ شعوری طور پر اور تنقیدی طور پر خود ہی دُنیا کا تصور مرتب کیا جائے اور خود اپنے دماغ کے اس کام کی بنیاد پر خود اپنی سرگرمی کے میدان کا انتخاب کیا جائے، اس

طرح دُنیا کی تاریخ بنانے میں حصہ لیا جائے اور چُپ چاپ آنکھ بند کرکے باہر سے "مسلط" کیے ہوئے سانچے میں اپنی شخصیت کو نہ ڈھالا جائے؟

نوٹ : (ایک) : آدمی دُنیا کے اپنے تصورِ عالم کے سلسلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی گروہ سے منسلک ہوتا ہے، خاص طور پر اُن تمام سماجی عناصر سے منسلک ہوتا ہے جو اسی کی طرح سے سوچتے ہیں اور اسی کی نوعیت کا کام کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی قسم کی مطابقت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ جمِ غفیر کا انسان ہوتا ہے یا جماعت کا۔ سوال یہ ہے : یہ مطابقت کس تاریخی قسم کی مطابقت ہے؟ کس قسم کے جمِ غفیر کا آدمی ہے وہ، یعنی وہ جمِ غفیر کس قسم کا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے؟ جب وہ انسان دُنیا کا صاف تصور نہیں رکھتا، جب اس کا تصورِ عالم تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہُوا اور مربوط نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا سیدھا اور غیر مربوط ہوتا ہے تو اس صورت میں وہ بیک وقت بہت سے جمِ غفیر سے منسلک ہوتا ہے۔ اس کی اپنی شخصیت کی ترتیب و ترکیب کچھ عجیب طرح سے ہوتی ہے۔ اس میں غندقی انسان کے عناصر اور جدید ترین اور انتہائی ترقی یافتہ، علم کے اصول یکجا ہوئے ہیں۔ اس میں تمام گزرے ہوئے تاریخی مراحل کی فرسودہ اور مقامی عصبیتیں اور پُوری دُنیا میں متحد انسانی نسل کے مستقبل کے فلسفے کی مدرکات یکجا ہوتی ہیں۔ اس لیے خود اپنے تصورِ عالم پر تنقید کرنے کے معنی ہوتے ہیں کہ اس کو مربوط و متحد کیا جائے اور اس کو اس ارفع نقطے پر پہنچایا جائے جہاں ترقی یافتہ ترین جدید فکر پہنچ چکی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب تک کے موجود فلسفے پر بھی تنقید کی جائے۔ اس معنی میں کہ مقبولِ عام فلسفے میں اس کی تہیں سمٹ آئی ہیں۔ تنقیدی تشریح کی ابتدا ہوتی ہے اس شعور سے کہ وہ واقعی خود کیا ہے یعنی "اپنے آپ کو جانو" کے اصول سے یعنی اس حیثیت سے کہ یہ تاریخی سلسلۂ عمل کی پیداوار ہے جس نے مختلف نقوش و آثار کی ایک لامحدود دُنیا یکجا کر کے انسان کے حوالے کر دی ہے لیکن اُن کی کوئی فہرست یا مجلّہ مرتب اور دستیاب نہیں۔

نوٹ : (دو) : فلسفے کو تاریخِ فلسفہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ تہذیب کو تاریخِ تہذیب سے۔ براہِ راست فوری اور معقولیت کے معنی میں ایک شخص فلسفی نہیں ہو سکتا، یعنی وہ دُنیا کا ایک پرکھا پرکھایا اور جچا تلا تصور نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ اس تاریخ سے آشنا نہ ہو جب تک اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ تاریخ ارتقا کے کن مرحلوں کی نمائندگی کرتی ہے، اس کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو کہ یہ تصور دوسرے تصورات اور اُن کے بعض عناصر سے متضاد ہے۔ دُنیا کا صحیح تصور وہ ہے جو حقیقت سامنے رکھتا ہے جو اپنی عملی معنویت میں بالکل متعینہ ہے اور ممیز خصوصی حیثیت رکھتی ہے۔ حال کے بارے میں سوچنا، اور اُس بالکل متعینہ حال کے بارے میں اس فکر و خیال کی روشنی میں سوچنا کیوں کر ممکن ہے جو ماضی کے مسائل کی بنیاد پر مرتب اور مروج ہوئے ہوں۔ اور وہ بھی ایسا ماضی جو بہت پیچھے رہ گیا ہو اور از کار رفتہ ہو چکا ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ آدمی خود اپنے زمانے میں "غلط زمانی" کی حیثیت اختیار کر چکا ہے یعنی "خارج از وقت" کی حیثیت سے جی رہا ہے۔ وہ ایک قدیم زندہ انسان نہیں بلکہ آثارِ قدیمہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور شے جامد ہے۔ یا کم از کم وہ ایک "عجوبہ" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سماجی گروہ جو بعض طریقوں سے انتہائی ترقی پذیر جدیدیت کا اظہار کرتے ہیں، دوسرے میدانوں میں انتہائی پچھڑے ہوئے رہ جاتے ہیں اور اس کی وجہ اُن کی سماجی جگہ ہوتی ہے اور اس لیے، وہ مکمل تاریخی خود کفالت اور آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

نوٹ : (تین) : اگر یہ صحیح ہے کہ زبان میں دُنیا کے تصور کے عناصر شامل ہوتے ہیں تو یہ بھی سچ ہے کہ ایک آدمی کے تصورِ عالم کی کم یا زیادہ پیچیدگی کا فیصلہ اُس کی زبان سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف بولی میں بات چیت کرتا ہے یا جو قومی زبان سمجھتا ہے تو لیکن ناہموار ڈھنگ سے تو ایسا آدمی عالمی تاریخ پر حاوی فکر و خیال کی لہروں کے مقابلے میں دُنیا کا کم و بیش، محدود اور قصباتی، جامد اور از کار رفتہ تصور رکھتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں محدود رہوں گی، کم و بیش جماعتی اور

معاشی، ـــــــ آفاقی نہیں۔ اگر ہمیشہ غیر ملکی زبانیں سیکھنا، اور اس طرح دوسری عظیم تہذیبوں سے آشنا ہونا ممکن نہ ہو تو آدمی کو کم از کم قومی زبان سیکھنا چاہیے۔ ایک عظیم تہذیب کو ایک دوسری عظیم تہذیب کی زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے، یعنی ایک عظیم قومی زبان جو تاریخی طور پر زیادہ رچی بسی، مالا مال اور پیچیدہ ہے کسی بھی عظیم تہذیب کو منتقل کر سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی زبان عالمی اظہار بن سکتی ہے۔ لیکن کسی بولی کے بس کا یہ روگ نہیں۔

منوٹ : (چار) : ایک نئی تہذیب کی تخلیق و تشکیل کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ انفرادی طور پر "اوریجنل" دریافتیں کی جائیں۔ اس کے معنی خاص طور پر دریافت شدہ حقائق کی تنقیدی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں، یہی ہیں کہ ان کو سماجی سانچے میں ڈھال دیا جائے، تاکہ وہ اس طرح ان کے زندہ عمل کے لیے ایک بنیاد بن جائے۔ ہم آہنگی کا ایک عنصر، دانشورانہ اور اخلاقی نظریے کا ایک عنصر موجودہ زندگی کی حقیقت کے بارے میں مربوط اور مبسوط ڈھنگ سے سوچنے کی طرف عام لوگوں کو راغب کرنا ایک "فلسفیانہ" حقیقت ہے جو کہیں زیادہ اہمیت اور "ندرت" کی مالک ہے، اس چیز کے مقابلے میں جو کسی "عاقل و دانا" کی فلسفیانہ فراست کی بدولت کسی نئی حقیقت کی دریافت کی شکل میں سامنے آتی ہے اور جو دانشوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی وراثت کی جھولی میں چلی جاتی ہے۔

عقلِ سلیم، مذہب اور فلسفے کے درمیان ربط و تعلق

فلسفہ ایک ایسا ذہنی نظام ہے جو نہ مذہب ہو سکتا ہے، نہ عقلِ سلیم۔ دیکھیے، حقیقت میں عقلِ سلیم اور مذہب کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ لیکن مذہب خود غیر مربوط اور بکھری ہوئی عقلِ سلیم کا ایک حصہ ہے۔ ویسے "عقلِ سلیم"، مذہب کی طرح ایک اسمِ نکرہ ہے : عقلِ سلیم صرف ایک نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی پیداوار اور صورتِ حال ہے۔ فلسفہ تنقید ہے، اور مذہب کی تسخیر اور عقلِ سلیم پر عبور۔ اور اس معنی میں یہ "عقلِ احسن" ہے جو عقلِ سلیم سے مختلف ہے۔

سائنس، مذہب اور عقلِ سلیم کا رشتے

مذہب اور عقلِ سلیم ایک دانشورانہ نظام کی تشکیل نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ ایک انفرادی شعور میں بھی اتحاد و آہنگ کی سطح پر یکجا نہیں کیے جا سکتے : ان کو اتحاد و آہنگ کی سطح پر "اپنی مرضی سے" یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ کام "اختیار و اثر" سے ہو سکتا ہے جیسا کہ ماضی میں خاص حدود کے اندر ہوا ہے۔ مذہب کا مسئلہ اقرار و اقبال کے ادارے کے مفہوم میں پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ عام معتقدوں کے مفہوم میں، یعنی تصورِ عالم اور مقررہ معیارِ عمل سے مطابقت کے درمیان اتحاد عقیدہ کے معنی میں، لیکن اس اتحادِ عقیدہ کو "مذہب" کیوں کہیں؟ اسے "فکر و نظر" یا سیدھے سیدھے "سیاست" کیوں نہ کہیں؟

عام معنی میں، درحقیقت، فلسفے کا کوئی وجود نہیں : مختلف فلسفوں اور تصوراتِ عالم کا وجود ہے اور انسان

ہمیشہ کئی ہی فلسفوں میں سے اپنے لیے انتخاب کرتا رہتا ہے۔ یہ انتخاب کس طرح ہوتا ہے؟ یہ محض دانشورانہ عمل ہے یا یہ زیادہ پیچیدہ عمل ہے؟ اور کیا اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ دانشورانہ حقیقت اور معیارِ عمل کے درمیان ایک تضاد ہوتا ہے؟ تو پھر اصلی تصورِ عالم کیا ہوگا: وہ جس کا اعلان دانشورانہ حقیقت کے طور پر ہوتا ہے یا وہ جو ایک شخص کی اصلی سرگرمی سے منتج ہوتا ہے، جو اس کے فعل و عمل میں پوشیدہ ہے؟ اور چونکہ عمل ہمیشہ سیاسی ہوتا ہے، کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر شخص کا اصلی فلسفہ اس کی سیاست میں پوشیدہ ہوتا ہے؟ خیال اور عمل میں تنازعہ، یعنی دو تصوراتِ عالم کی بقائے باہم، جن میں ایک کا اعلان الفاظ میں ہوتا ہے اور دوسرا جس کی وضاحت و تشریح مؤثر فعل و عمل میں ہوتی ہے، ہمیشہ بدعقیدگی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بدعقیدگی، بعض افراد کے لیے اگر ان کو فردِ واحد کی حیثیت سے دیکھا جائے، ایک اطمینان بخش وضاحت و تشریح کا کام کر سکتی ہے۔ یہ کم و بیش بہت سے گروہوں پر بھی صادق آ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات اُس وقت اطمینان بخش نہیں رہتی جب عام لوگوں کے وسیع حلقوں میں تضادات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو ایک خاص تاریخی اور سماجی نظام کے گہرے تضادات کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سماجی گروہ، جو دُنیا کا ایک اپنا تصور رکھتا ہے، خواہ یہ تصور بالکل ابتدائی کیوں نہ ہو۔ (جو اپنے آپ کو عمل میں نمایاں کرتا ہے اور اس لیے، رہ رہ کر، تشنجی شکل میں، نمایاں کرتا ہے، یعنی، جب اس قسم کا گروہ ایک نامیاتی وحدت کی شکل میں متحرک ہوتا ہے) ایسی صورت میں یہ سماجی گروہ، دانشورانہ اطاعت گزاری اور سپردگی کی وجہ سے ایک ایسے تصور کا اعلان الفاظ میں کرتا ہے، جو اس نے ایک دوسرے گروہ سے مستعار لیا ہے۔ ایک ایسا تصور جو اس کا اپنا نہیں ہے۔ اور اس مانگے کے تصور کے بارے میں بھی اُس کا خیال یہ ہے کہ وہ اس تصور کو اپنی عملی زندگی میں برت رہا ہے۔ اور ایسا اس لیے کہ وہ اس تصور پر "نارمل" زمانے میں عمل کر رہا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب اس کا طرزِ عمل خودمختار نہیں ہے یعنی اپنی مرضی کا نہیں ہے بلکہ تابع اور اطاعت گزار ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دکھا سکتے ہیں کہ کسی تصورِ عالم کے انتخاب یا اس نکتہ چینی کا عمل بجائے خود ایک سیاسی حقیقت ہے۔

اس لیے ہمیں اس کی وضاحت کرنی ہوگی کہ ہر دور میں بہت سے فلسفیانہ نظام اور رجحانات ایک ساتھ برقرار رہتے ہیں، وہ کس طرح جنم لیتے ہیں، کس طرح ان کی توسیع ہوتی ہے، توسیع و تبلیغ کے عمل میں کس طرح ان کے بہت سے دھارے بن جاتے ہیں اور کس طرح یہ دھارے مختلف سمتوں میں نکل جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دُنیا کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، خود اپنے ادراک و بصیرت کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر منظم کرنا کتنا ضروری ہے۔ بڑے مربوط ڈھنگ سے ادراک و بصیرت کے فیضان کو ٹھونک بجا کر متعین کرنا اور یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ "نظام" سے ہماری مراد کیا ہے، کیوں کہ اس کو اسکول کے تدریسی یا نصابی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔ لیکن یہ تشریح صرف فلسفے کی تاریخ کے چوکھٹے کے اندر ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خیال و فکر کی تشریح صدیوں میں کن مرحلوں سے گزری ہے، ہمارے موجودہ اندازِ فکر تک پہنچنے کے لیے کتنی اجتماعی کاوش سے کام لینا پڑا ہے۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس میں اس پورے ماضی کی تاریخ کا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔ اس نچوڑ میں اس کی غلطیاں اور لغزشیں بھی ہیں اور غلط روی بھی —————— لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ چونکہ ماضی میں ان پر اعتقاد تھا، اور چونکہ ماضی میں ان کی اصلاح ہوئی تھی، اس لیے آج ان کو ویسا اپنایا جا سکتا ہے اور آج کے لیے بھی وہ درست ہیں۔

فلسفے کے بارے میں لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے تانے بانے ہم زبان زدِ عام فقروں اور جملوں سے بُن سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ عام نقطۂ نظر کا اظہار اس جملے سے ہوتا ہے: "چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے دیکھو۔" اگر ہم اس جملے کا

تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں یہ دعوت پوشیدہ ہے کہ صبر و تحمل اور تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کیا جائے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس میں زیادہ اہم نکتہ یہ چھپا ہوا ہے کہ اس میں غور و فکر کی دعوت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرح اپنے آپ کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تہہ میں ایک عقلی توجیہہ کام کر رہی ہے۔ اور اس کا سامنا اسی ڈھنگ سے کرنا چاہیے یعنی عقل و شعور کی تمام قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے اور جبلّی اور جذباتیت کی تیز و تُند لہر میں نہیں بہہ جانا چاہیے۔ مقبولِ عام کہاوتوں کو مقبول ادیبوں کے ویسے ہی فقروں سے ملا کر دیکھا جاسکتا ہے، جہاں ہمیں "فلسفے" اور "فلسفیانہ ڈھنگ سے" جیسی اصطلاحیں ملتی ہیں ——— اور تب ہم دیکھیں گے کہ ان کی جچی تلی اہمیت ہے ——— وہ جچی تلی اہمیت اور معنویت یہ ہے کہ جبلی اور فطری ردعمل پر قابو پا یا جائے اور اس کے لیے ضرورت کے تصور کو اپنایا جائے جو خود اپنے عمل کو ایک خاص رُخ دینے میں مددگار ہوتا ہے۔ یہ ہے عقلِ سلیم کی مضبوط کڑی۔ اس کو عقلِ نیک کہہ سکتے ہیں۔ اس کی نشوونما کرنے کی اور اس میں اتحاد و آہنگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بنا پر بھی "عالمانہ" فلسفے اور "عامیانہ" مقبولِ عام فلسفے میں فرق کیا جاسکتا ہے جو خیالات و عقائد کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے۔

یہاں پر ہم تصورِ عالم کے ہر نقطۂ نظر کا بنیادی سوال اُٹھاتے ہیں۔ یہ سوال ہر فلسفے کا ہے، جواب ایک تحریک بن چکا ہے، ایک "مذہب"، ایک "عقیدہ" دوسرے لفظوں میں، جس نے عملی سرگرمی اور ارادی حرکت و عمل کا راستہ دکھایا ہے، جس میں یہ ایک معنوی نظریاتی "مقدمہ" بن گیا ہے۔ (اس کو ایک آئیڈیولوجی کا نام دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس میں ایک تصورِ عالم کے اعلیٰ معنی کو شامل کرلیا جائے، اور جو مزید لطافت کے ساتھ آرٹ میں اپنے آپ کو ظاہر کرے، آرٹ میں، قانون میں، معاشی سرگرمیوں میں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مظاہر میں۔ یہ ایک پورے سماجی بلاک کے نظریاتی اتحاد کو بچانے اور محفوظ کرنے کا مسئلہ ہے اور اگر یہ یگانگت و اتحاد قائم ہے تو صرف اسی آئیڈیولوجی کی بدولت۔ مذہبوں کی طاقت، خاص طور پر کیتھولک چرچ کی طاقت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھیں تمام "مذہبی" جم غفیر کے نظریاتی اتحاد کی بے حد ضرورت ہے۔ اور وہ اس بات کی جدوجہد کرتے ہیں کہ برتر دانشور عناصر کمتر دانشور عناصر سے کٹ کر الگ نہ ہو پائیں۔ اس جدوجہد میں رومن چرچ ہمیشہ سے بے حد پیش پیش رہا ہے تاکہ "سرکاری" طور پر عقیدہ دو مذہبوں میں نہ بٹ سکے یعنی ایک مذہب تو "دانشوروں" کے لیے ہو اور دوسرا "سیدھے سادے" لوگوں کے لیے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ اس جدوجہد میں خود چرچ کے لیے شدید مشکلات نہ پیدا ہوئی ہوں۔ لیکن ان مشکلات کا واسطہ اس تاریخی سلسلۂ عمل سے ہے جو پورے معاشرہ عامہ کو بدل دیتا ہے اور جس میں مجموعی طور پر تنقید کا ایک ایسا عنصر چھُپا ہوا ہے جو مذاہب کے لیے تباہ کن ہو سکتا ہے اسی لیے کلیسا نے پادریوں اور راہبوں کے اعلیٰ زمرے نے تہذیب کے میدان میں اپنی تنظیمی صلاحیت کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس دائرۂ توازن کے سب سے بڑے معمار بلاشبہ تھے یسوع مسیح۔ انھوں نے اس کو برقرار رکھنے کے لیے چرچ پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ یہ چھاپ ایک ترقی پسند تحریک ہے جو خود کلیسائی دائرے میں چلتی ہے اور اس کا مقصد ہے کہ سائنس اور فلسفے کے تقاضوں کی کسی حد تک تسکین کی جائے، لیکن اس کی رفتار اتنی سُست اور خاموش ہو اور کچھ ایسے ڈھنگ سے کہ تبدیلیاں سیدھے سادے لوگوں کو نظر نہ آئیں، خواہ یہ تبدیلیاں "اتحاد پسندوں" کی نظر میں "انقلابی" اور بلند بانگ ہی کیوں نہ ہوں۔ قادرِ مطلق پر عقیدہ رکھنے والے فلسفوں کی سب سے بڑی کمزوریوں میں سے ایک عام طور پر اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اوپر والوں اور نیچے والوں میں "سیدھے سادے لوگوں" اور دانشوروں میں نظریاتی اتحاد و آہنگ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ مغربی تمدن کی تاریخ میں یہ بات اس وقت ثابت ہوگئی جب یورپی پیمانے پر نشاۃ ثانیہ ناکام ہوا اور کسی حد تک اس وقت بھی جب رومن چرچ کے مقابلے میں اصلاحی تحریک کو منہ کی کھانی پڑی۔ یہ کمزوری

اسکولوں میں نمایاں ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ قادرِ مطلق پر عقیدہ رکھنے والے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا ہی تصور مرتب کر لیں، جو بچوں کی تعلیم میں مذہب کی جگہ لے لے۔ اس لیے محض نام کی تاریخی صوفیت، جس کے طفیل غیر مذہبی (غیر پیشہ ور) استاد بھی، جو دراصل مذہب کو نہیں مانتے، مذہب کی تعلیم کی اجازت دے دیتے ہیں کیوں کہ مذہب بنی نوعِ انسان کے عہدِ طفلی کا فلسفہ ہے جس کی تجدید ہر تشکیلی طفل میں ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ آدرش وادنے ہمیشہ "عوام کے درمیان جانے" کی تحریک کی مخالفت کی ہے۔ مثلاً نام نہاد عوامی درس گاہوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں میں جانے کی مخالفت کی ہے۔ اور ایسا صرف اس وجہ سے نہیں ہوا کہ ان میں انحطاط پیدا ہو رہا تھا کیوں کہ اس صورت میں آدرش وادنے ان اداروں کو صرف سدھارنے کی کوشش کی ہوتی۔ بہرحال، یہ تحریکیں تو جطلب نہیں اور نہ قابلِ مطالعہ۔ جس حد تک وہ مخلصانہ خلوص دکھاتے، جس حد تک وہ سیدھے سادے لوگوں، مضبوط قوتِ ارادی پیدا کر سکتے ——— ان کی نشو و نما کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ اس طرح وہ ایسے تہذیب اور تصورِ عالم کی اعلیٰ شکل کی سطح تک بلند کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے یہاں، فلسفیانہ فکر ہو یا منظم قوتِ اور تہذیبی مرکزیت کی نامیاتی شکل ——— دونوں کی کمی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انگریز سوداگروں اور افریقہ کے نیگروں کے درمیان پہلے رابطوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ وہ سونے کی مچھلیوں کے بدلے میں انھیں دوسرے درجہ کی چیزیں دے رہے تھے۔ دوسری طرف فکر کی نامیاتی شکل اور تہذیبی یگانگت پیدا ہو سکتی تھی اگر دانشوروں اور سیدھے سادے لوگوں کے درمیان وہ اتحاد ہوتا جو نظریے اور عمل کے درمیان ہونا چاہیے تھا یعنی، اگر دانشور نامیاتی معنوں میں عام لوگوں کے دانشور ہوتے اگر انھوں نے ان اصولوں اور مسائل کی تشریح و تاویل کی ہوتی، جو عام لوگ اپنی عملی سرگرمیوں میں سامنے لاتے تھے۔ تب ایک تہذیبی اور سماجی بلاک قائم ہو سکتا تھا۔ اب یہ گفتگو اس سوال کی طرف لوٹتی ہے جس پر زور دیا جا چکا ہے: کیا کسی فلسفیانہ تحریک کے لیے یہ کافی ہے کہ یہ دانشوروں کے محدود گروہوں کی مخصوص تہذیب کی نشو و نما کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے اور اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ ایسے خیال و فکر کی نشو و نما کرتے ہوئے جو عقلِ سلیم سے برتر اور سائنسی طور پر مربوط و مضبوط ہو، کبھی یہ نہ بھولے کہ سیدھے سادے لوگوں سے ناتا قایم رہے۔ اور اس کے علاوہ، ان رابطوں میں اُن مسائل کے سوتوں کی تلاش کرنی چاہیے جن کا مطالعہ کرنا ہے اور جن کا حل ڈھونڈنا ہے۔ اسی رابطے یا ناتے کے ذریعہ فلسفہ "تاریخی" بنتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ اپنے آپ کو انفرادی طینت کے دانشورانہ عناصر سے پاک کرتا ہے اور "زندگی" کی رگوں میں سرایت ہوتا ہے۔

مارکسزم اپنے آپ کو شروع میں صرف مذاکرے اور تنقید کی شکل میں پیش کر سکتا ہے، ایک ایسے نظامِ علم کی حیثیت سے جو پچھلے طریقۂ فکر اور واقعی موجود خیال و فکر (یا موجود تہذیبی دُنیا) پر عبور حاصل کرے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ "عقلِ سلیم" کی تنقید کی صورت میں نشو و نما پائے۔ (یعنی اس مرحلے کے بعد کہ یہ عقلِ سلیم کو بنیاد بنا کر یہ دکھائے کہ "ہر شخص ایک فلسفی ہے اور یہ سوال اس کا نہیں ہے کہ ایک بالکل نئی سائنس کو "ہر شخص" کی انفرادی زندگی میں داخل کیا جائے، بلکہ سوال اس کا ہے کہ اس فلسفے میں جو موجود ہے، ایک نئی جان ڈال دی جائے اور اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے) اور دانشوروں کے فلسفوں کی تنقید کی حیثیت سے بھی، جن سے فلسفے کی تاریخ کی ترکیب ہوتی ہے اور جس کو انفرادی طور پر، (اور نہ درحقیقت، خاص طور پر ہونہار اور ذکاوت سے مالا مال افراد کی سرگرمی سے نشو و نما پاتا ہے) عقلِ سلیم کی ترقی کے "ارفع نکتوں" میں شمار کیا جا سکتا ہے، کم از کم سماج کے مہذب حلقوں کی عقلِ سلیم کے "ارفع نکتوں" میں شمار کیا جا سکتا ہے یہ ان کے ذریعہ عام لوگوں کی عقلِ سلیم کے "ارفع نکتوں" میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے فلسفے کے مطالعے کے لیے تعارف میں ان مسائل پر مجموعی بحث ضروری ہے جو مجموعی تہذیب کے ارتقا میں پوشیدہ ہیں، لیکن جس کا اظہار فلسفے کی تاریخ میں جزوی طور پر ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر عقلِ سلیم

کی تاریخ کی غیر موجودگی میں حوالے کا سب سے بڑا وسیلہ رہتا ہے ——— اس حوالے کی بدولت ان پر غور و خوض کرنے میں، ان کی زندہ اہمیت و مقصودیت کو ظاہر کرنے میں (اگر وہ اب تک زندہ ہے) اور ماضی میں اس کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کرنے میں اور نئے موجودہ مسائل اور پرانے مسائل کی موجودہ ترکیب کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اعلیٰ فلسفے اور عقلِ سلیم کے درمیان رشتے کو "سیاست" متعین کرتی ہے، ٹھیک جس طرح سے دانشوروں کی آفاقیت اور "سیدھے سادے لوگوں" کی آفاقیت کے درمیان رشتہ سیاست قائم کرتی ہے۔ یہ حقیقت کہ چرچ کو "سیدھے سادے لوگوں" کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ثابت کرتی ہے کہ "معتقدوں" کی برادری کے اندر ہی دراڑ پڑ گئی ہے۔ یہ ایسی دراڑ ہے جس کو "سیدھے سادے لوگوں" کو دانشوروں کی سطح پر لاکر نہیں پاٹا جا سکتا۔ (چرچ اس قسم کا بیڑا اٹھاتا بھی نہیں کیونکہ یہ بیڑا اس کی حقیقی قوتوں کے لیے آدرش کے نقطۂ نظر سے اور معاشی طور پر بہت ہی عظیم الشان ہے) یہ کام صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ دانشوروں پر آہنی نظم و ضبط لاگو کیا جائے تاکہ وہ تفریق کی خاص حدوں سے آگے نہ نکل سکیں اور اسے تباہ کن اور ناقابلِ تلافی نہ بنا سکیں۔ ماضی میں معتقدوں کی برادری کے اندر "دراڑوں" کو زبردست عوامی تحریکوں سے پاٹا گیا تھا یا جن کو طاقتور شخصیتوں (فرانسیس، ڈومینیک) کے گرد نئے مذہبی نظام کی تشکیل کر کے جذب کر لیا گیا تھا۔

لیکن ردِ اصلاح نے عوامی قوتوں کی نمو کی صلاحیتوں کو ختم کر دیا یسوع مسیح کی انجمن آخری بڑا مذہبی نظام ہے، جس کی بنیاد رجعت اور اختیار و عمل داری پر ہے، جس کا کردار جابرانہ اور "مدبرانہ" ہے جس کے آغاز نے کیتھولک تنظیم و تشکیل کے اندر درشتی اور سختی کی غمازی کی۔ نئے نظام، جو اس کے بعد ابھرے ان کی مذہبی اہمیت بہت مختصر تھی لیکن معتقدوں کے عام حلقوں میں "ضبط و اثر" کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بہت تھی۔ یہ یسوع مسیح کی انجمن کی شاخیں اور دھارے ہیں یا بن گئے ہیں ——— اس سیاسی پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے جو حاصل ہو چکی ہے "مزاحمت" کے حربے ہیں۔ یہ تجدید ارتقا کی قوتیں نہیں ہیں۔ آفاقیت "یسوع پرستی" میں بدل چکی ہے۔ نئے عہد نے "مذہبی نظاموں" کی تشکیل کا نظارہ نہیں کیا ہے۔ نئے عہد نے سیاسی پارٹی کی پیدائش کا نظارہ کیا ہے۔ مثلاً کرسچین ڈیماکریٹس۔

مارکسزم اس کیتھولک پوزیشن کی ضد ہے: مارکسزم "سیدھے سادے لوگوں" کو زمانہ قدیم کے فلسفے میں جو عقلِ سلیم کا فلسفہ ہے، مبتلا رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کو زندگی کے اعلیٰ و ارفع تصور کی سطح پر لے جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اس ضرورت پر اصرار کرتا ہے کہ دانشوروں اور سیدھے سادے لوگوں کے درمیان ربط و تعلق پیدا ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مارکسزم عام لوگوں کی نچلی سطح پر سائنسی سرگرمی کو محدود کرنا چاہتا ہے یا اسی سطح پر اتحاد برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ نہیں، اس کا قطعی مقصد یہ ہے کہ ایک دانشورانہ اخلاقی بلاک (محاذ) بنایا جائے جو سیاسی طور پر صرف دانشوروں کے چند گروہوں کی نہیں بلکہ عوام کی دانشورانہ نشو و نما کو ممکن بنائے۔

عوام کا سرگرم آدمی عملی کام کرتا ہے۔ لیکن اسے اپنے حرکت و عمل کا نظریاتی شعور نہیں ہوتا۔ یہ شعور دنیا کا علم بھی ہے اس حد تک جس حد تک وہ اس کو بدلتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا نظریاتی شعور تاریخی طور پر اس کے حرکت و عمل کے عین منافی ہو سکتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دو شعور ہوتے ہیں (یا ایک متضاد شعور) ایک وہ جو اس کے حرکت و عمل میں مضمر ہوتا ہے جو حقیقت کو عملی طور پر بدلنے میں اس کو اپنے رفقائے کار سے متحد کرتا ہے اور دوسرا وہ جو سطحی طور پر نمایاں ہوتا ہے جس کا اظہار زبانی ہوتا ہے اور جو اس کو ماضی سے ورثے میں ملا ہے اور جس کو وہ بنا چون و چرا قبول کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود، یہ (سطحی) "زبانی" تصور بے نتیجہ یا بے اثر نہیں ہے۔ یہ تصور اس کو ایک خاص سماجی گروہ سے وابستہ کر دیتا ہے، اس کے اخلاقی رویے اور عمل کو متاثر کرتا

ہے اور اس کے عزم و ارادے کے رُخ کو خاصی شدت سے متعین کرتا ہے اور یہ اس نقطے پر پہنچ سکتا ہے جہاں اس کے ضمیر کا تضاد اس کے عمل کا راستہ مسدود کر سکتا ہے۔ اس کے فیصلے اور انتخاب کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ تصور ایک قسم کی اخلاقی اور سیاسی بے حسی اور بے عملی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے تنقیدی خود آگہی سیاسی "غلبوں" کی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے، جن کی سمتیں مخالف ہوتی ہیں، پہلے تو یہ جدوجہد اخلاقیات کے میدان میں ہوتی ہے، اس کے بعد سیاست میں اور اس کا خاتمہ ہوتا ہے حقیقت کے خود اپنے تصور کی اعلیٰ تر تشریح پر۔ ایک پُرعزم غالب قوت کا حصہ ہونے کا احساس و شعور آگے کی اور زیادہ ترقی پسند خود آگہی کی طرف پہلا قدم ہے جس میں انجام کار نظریہ اور عمل مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نظریے اور عمل کا اتحاد بھی ایک طے شدہ میکانکی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کے رونما ہونے کا سلسلۂ عمل ہے، جس کے اپنے ابتدائی اور قدیم مرحلے ہیں، —— "امتیاز" اور "علیحدگی" کے معنوں میں، جبلّی خود مختاری کے معنوں میں! یہ سلسلہ ترقی کر کے اس نقطے تک پہنچا ہے جہاں دنیا کا مربوط و مبسوط تصور سچے معنوں میں مکمل طور پر حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ غلبے یا قیادت کا تصور فلسفے میں اگلے قدم کی نمائندگی کرتا ہے، فلسفے میں اور عملی سیاست میں بھی، کیوں کہ اس کے معنی ہیں دانشورانہ اتحاد اور ایک ایسی اخلاقیات کی ترویج جو حقیقت کے تصور سے ہم آہنگ ہو۔ ایک ایسا تصور جو عقلِ سلیم کی حدوں سے آگے جا چکا ہے اور اب تک محدود فیصلوں کے اندر اسیر رہنے کے باوجود ایک تنقیدی رویہ اختیار کر چکا ہے۔

بہرحال، حال میں مارکسزم کی جو نشوونما ہوئی ہے، اس میں نظریے اور عمل کے اتحاد کے تصور میں گہرائی اور گیرائی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے: میکانکیت کی باقیات اب تک موجود ہیں۔ اسی لیے کہ اب تک نظریے کا ذکر ایک "تکملہ" کی حیثیت سے، عمل کے معاون کی حیثیت سے، عمل کے منسلکہ جزو کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس سوال کو بھی تاریخی طور پر پیش کیا جائے، یعنی یہ سوال بھی دانشوروں کے سیاسی سوال کے ایک پہلو کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ تنقیدی خود آگہی، تاریخی اور سیاسی طور پر دانشور عملے کی تشکیل کی نمائندگی کرتی ہے: ایک انسانی ہجوم اپنے آپ کو "نمایاں" نہیں کرتا اور "بذاتِ خود" مختار نہیں ہوتا جب تک کہ وسیع معنوں پر منظم نہ ہو، یعنی منظم کرنے والوں اور رہنماؤں کے بغیر، نظریۂ عمل کے نظریاتی پہلو کے بغیر "نمایاں" اور "بذاتِ خود" خود مختار نہیں ہوتا۔ یہ ٹھوس طریقے سے ایسے لوگوں کے ممتاز گروہ کی شکل میں نمایاں اور ممیز ہوتا ہے جو اس کی تصوراتی اور فلسفیانہ تشریح و تاویل میں "خاص مہارت" رکھتے ہیں، لیکن دانشوروں کی نشوونما کا یہ سلسلہ ایک لمبا اور مشکل سلسلہ ہے۔ تضادات سے پُر، جس میں قدم آگے بھی بڑھتے ہیں اور پیچھے بھی ہٹتے ہیں، جن میں شیرازہ بکھرتا بھی ہے اور نئی شیرازہ بندیاں بھی ہوتی ہیں۔ جس میں عام لوگوں کی "وفاداری" کو ("وفاداری" اور نظم و ضبط ابتدا میں ایسی شکلیں ہیں جو عوام سے وابستگی اور وفاداری کی بنا پر اور تہذیبی مظہر کے ارتقا میں ان کی شرکت کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔) بعض مرتبہ بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی کا سلسلہ دانشوروں اور عوام کے مابین جدلیاتی رشتے کا پابند ہوتا ہے۔ دانشوروں کا حلقہ تعداد اور کیفیت دونوں میں نشوونما پاتا ہے لیکن ایک نئی "بالیدگی" اور پیچیدگی کی طرف دانشوروں کی جست سیدھے سادے تجمِ غفیر کی ملتی جلتی تحریک سے وابستہ رہتی ہے۔ یہ سیدھے سادے عام لوگ وہ ہیں جو تہذیب کی اعلیٰ سطح تک اُٹھتے ہیں اور ساتھ ہی خاص مہارت و دانش رکھنے والے دانشوروں کی سطح کی طرف بڑھتے ہوئے کم و بیش اہم افراد یا گروہوں کی پیش قدمی کے طفیل اپنا حلقۂ اثر بڑھاتے ہیں۔ لیکن اس پورے سلسلے میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب عام لوگوں اور دانشوروں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے (یا تو بعض افراد کے درمیان یا ان کے ایک گروہ کے درمیان) ناتا ٹوٹ سا جاتا ہے۔ اور اسی لیے (نظریے کے متعلق) یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ایک تکملہ ہے، ایک

تابع " جزو " نظریے اور عمل کے باہمی رشتے میں " عمل " کے عنصر پر اصرار جب نظریے اور عمل کی تفریق ہو چکی ہو، جب دونوں الگ ہو چکے ہوں یعنی جب دونوں عناصر محض امتیاز کی سطح پر نہ ہوں، (مطلب یہ کہ جب ان کی سطح محض میکانکی اور روایتی ہو) تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نسبتاً قدیم تاریخی دور سے گزر رہے ہیں، جو اب تک معاشی اور جماعتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، جہاں " ڈھانچے " کا چوکھٹا موٹے موٹے طور پر تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی کمیت کی تبدیلی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مناسب کیفیاتی بالائی عمارت ابھی اُبھر رہی ہے، لیکن اس کی نامیاتی تنظیم و تشکیل مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں اس اہمیت و معنویت پر زور دینا چاہیے جو جدید دُنیا میں سیاسی پارٹیاں تصورِ عالم کی تشریح و تبلیغ کے سلسلے میں رکھتی ہیں۔ اس معنی میں کہ یہ پارٹیاں اپنے لیے موافق اخلاقی کسوٹی اور پالیسی مرتب کرتی ہیں۔ اس لیے معنی یہ ہیں کہ یہ پارٹیاں تقریباً تاریخی " تجربہ ساز " کا کام کرتی ہیں جو ان تصورات پر تجربہ کرتی ہیں۔ پارٹیاں انفرادی طور پر محنت کش عوام کو چنتی ہیں یہ انتخاب عملی میدان میں بھی ہوتا ہے اور نظریاتی میدان میں بھی۔ ان کے یہاں عمل اور نظریے میں زیادہ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ان کے تصورات زیادہ گہرے اور بنیادی طور پر جدت طلب ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا رویہ پرانے خیال و فکر کی طرف معاندانہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیاں نئے متحدہ اور ہمہ گیر دانشورانہ نظاموں کے شارح کا کام کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیاں حقیقی تاریخی سلسلۂ عمل کے مفہوم میں عمل اور نظریے میں اتحاد پیدا کرنے والی قوت کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ ضروری ہے کہ پارٹیاں انفرادی رکنیت کی بنیاد پر بنائی جائیں ——— " لیبر پارٹی " کی طرح نہیں (یعنی مسلمہ رکنیت کی بنیاد پر) کیوں کہ اگر مقصد یہ ہے کہ " تمام معاشی طور پر سرگرم " عام لوگوں " کی تنظیمی طور پر رہنمائی کی جائے، تو پھر پرانی اسکیم کے مطابق نہیں بلکہ نئی اسکیموں کی تشکیل کر کے ان کی رہنمائی ہونی چاہیے۔ اس سلسلۂ عمل کے ابتدائی دور میں عام لوگوں کی شمولیت محض عملے کی حیثیت سے ہوتی ہے، جن کے اندر انسانی سرگرمی میں پوشیدہ تصور کسی حد تک واقعی مربوط . . . اور باضابطہ شعور کی شکل اختیار کر چکا ہے، قطعی اور فیصلہ کن ارادے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ان مرحلوں میں سے ایک اس بحث میں زیرِ مطالعہ آ سکتا ہے جہاں مارکسزم کی تازہ ترین نشوونما نے جم کر اپنا اظہار کیا ہے۔ یہ وہ بحث ہے جو اختصار کے ساتھ د۔ س۔ میرسکی کے مضمون میں سمٹ آئی ہے جو کلتور کے مدود و معاون ہیں۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک میکانکی اور مطلق تصور کی منزل سے نکل کر وہ کس طرح عمل کا تصور بن گیا ہے۔ جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے، اس میں فکر و عمل کے اتحاد کا قریب قریب صحیح تصور اُبھرتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ ابھی یہ تصور اتحاد و آہنگ کی مکمل اہمیت و معنویت کی سطح پر نہیں پہنچا ہے۔

جب جدوجہد میں پیش قدمی کی عنان ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ اور جب جدوجہد انجام کار ہزیمتوں کے ایک پورے سلسلے سے جڑ کر رہ جاتی ہے، تو میکانکی تعین پسندی، اخلاقی مزاحمت کی عظیم الشان طاقت بن جاتی ہے، صبر و تحمل کی ہٹ دھرم کوشش و کاوش : " بس اس وقت ایک آن کو مجھے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے، لیکن آخر بلّا صورتِ حال میرے حق میں ہوگی " وغیرہ۔ اصل ارادے پر عقیدے نے پردہ ڈال دیا ہے۔ اسے تاریخ کا نا قابلِ گریز عقلی نباہ کہہ لیجیے، جو انجام کاری کی قدیم اور آزمائشی علم پرستی کی شکل ہے، جو عاقبت اندیش یا مرضیِ خدا وغیرہ کی جگہ لے لیتی ہے، جو اقبالِ گناہ والے مذہبوں کی ایک شکل ہے۔ ہمیں اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ ان صورتوں میں بھی، درحقیقت، ایک مُنہ زور ارادے کو دخل ہے، جو " صورتِ حال " پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے، لیکن بلاشبہ یہ ایک مضمر اور پوشیدہ شکل ہے، اپنے آپ سے منفعل۔ اس لیے اس کا شعور متضاد ہوتا ہے۔ اس میں تنقیدی اتحاد وغیرہ کی کمی ہوتی ہے۔ لیکن جب " تابع " رہنما بن جاتا ہے اور جب وہ عام لوگوں کی معاشی سرگرمی کا ذمہ دار

بن جاتا ہے تو میکانکیت ایک خاص لمحے میں لازمی خطرہ بن کر نمودار ہوتی ہے، تب ہوے انداز فکر پر نظر ثانی کی منزل آتی ہے کیوں کہ اس وقت تک سماجی طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر "صورت حال" کی طاقت کی حدیں کیوں متعین ہو جاتی ہیں؟ اس لیے کہ اس کی تہہ میں حقیقت پوشیدہ ہے کہ اگر کل تک تابع ایک شے تھا تو آج وہ اب شے باقی نہیں رہا بلکہ ایک تاریخی شخص بن چکا ہے۔ اگر کل تک وہ غیر ذمہ دار تھا کیوں کہ وہ خارجی مرضی کے خلاف "مزاحمت" کر رہا تھا تو آج وہ ذمہ دار ہے کیوں کہ اب وہ مزاحمت نہیں کر رہا ہے بلکہ آلۂ کار بن چکا ہے۔ اس لیے لازمی طور پر سرگرم اور پُرانا امکان ہے۔ لیکن کیا کل بھی وہ محض "شے" تھا، محض "غیر ذمہ داری"؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ مقدر پرستی کمزوروں کے لیے سرگرم اور اصلی ارادے پر پردہ ڈالنے کا ایک حیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ یہ ضروری ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ میکانکی تعینیت پرستی کس قدر بیکار ہے جو عام لوگوں کے بھولے بھالے فلسفے کو نمایاں کرتی ہے۔ اور صرف اس طرح طاقت کے فطری عنصر کی حیثیت سے، بے عملی کا، بتدریج خود کفالت کا سبب اس وقت بن جاتی ہے جب دانشور اس کو فعال اور مربوط فلسفے کی شکل دے دیتے ہیں۔ اور یہ سب اس بات کی توقع کیے بغیر کہ تابع بدل کر ممیز اور ذمہ دار کی جگہ لے سکتا ہے۔ تابع عوام کا ایک حصہ تو ہمیشہ ممیز اور ذمہ دار رہتا ہے۔ اور جزو کا فلسفہ کل کے فلسفے کے پیش رو کا کام کرتا ہے۔ صرف نظریاتی پیش بینی کے طور پر نہیں بلکہ حقیقی ضرورت کے طور پر۔

یہ حقیقت کہ میکانکی تصور تابع کے مذہب کی شکل اختیار کرتا رہا ہے، کرسچین مذہب کے ایک تجزیے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ بعض زمانوں میں اور خاص تاریخی حالات میں یہ ایک "لازمہ" رہا ہے اور لازمہ ہے۔ ایک لازمی شکل جو اس نے عام لوگوں کی مرضی سے اختیار کی ہے، دنیا کی اور زندگی کی عقلیت کی ایک متعینہ شکل کی حیثیت سے۔ اور اسی نے حقیقی عملی سرگرمی کے لیے عملہ فراہم کیا ہے۔ اس مختصر سے اقتباس میں لا سیویلتا کیتھولیکا (۵ مارچ ۱۹۳۲ء) سے لیا گیا ہے، کرسچین مذہب کا یہ رول نمایاں ہو جاتا ہے:

"نیک عاقبت پر عقیدہ، سرشاری نصیب روح کی ابدیت پر عقیدہ، نشاطِ جاوداں سے ہم کنار ہونے کے تصور پر عقیدہ، زبردست باطنی تکمیل اور روحانی بالیدگی کے لیے فکر و عمل کا سرچشمہ تھا۔ سچی کرسچین انفرادیت پرستی تو اس سے اپنی فتوحات کے لیے حوصلہ نصیب ہوئی۔ اسی نیک مقصد کے گرد ہی کرسچین کی تمام طاقتیں مجتمع تھیں۔ قیاس آرائیوں کے مد و جزر سے نجات پاکر، جو روح کو مجروح و مضمحل کرتی تھیں، لافانی اصولوں سے بصیرت حاصل کر سکے۔ انسان کو احساس ہوا کہ اُمید نے نیا جنم لیا ہے، اس یقین سے لیس ہو کر کہ کوئی کبریائی قوت ہے جو شر کے خلاف جد و جہد میں اس کی یاوری کرتی ہے، اس نے اپنے آپ کو تشدد کا شکار بنایا اور اس طرح دنیا کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔" لیکن اس سلسلے میں بھی مراد بھولے بھالے کرسچین مت سے ہے۔ اس سے مراد یسوعی کرسچین مت نہیں ہے جو عوام کے لیے افیون بن گیا ہے۔

کالوین ازم، پیش تقدیر اور خدا کی رحمت کے تصور کی بنا پر جس نے تسخیر و توسیع کے جذبے کو جگایا (یا اس تحریک کی شکل بن گیا) اب تک بہت پُرمعنی اور اہم ہے۔

مقبول عام بننے کے دوران، دُنیا کے نئے تصورات پنپتے اور پھیلتے ہیں۔ توسیع و تبلیغ کے اس سلسلۂ عمل میں (جو بیک وقت پُرانے کا نعم البدل ہے اور اکثر پرانے اور نئے کا امتزاج) اس عقلی شکل کا (کس طرح اور کس حد تک) اثر پڑتا ہے۔ اس عقلی شکل کا جس میں نئے تصور کی نشو و نما ہوتی ہے اور جس شکل میں یہ تصور سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ کام مبلغ کے اثر و اختیار سے ہوتا ہے یا ان مفکروں اور عالموں کے ذریعہ جن کو شارح اپنی حمایت اور مدد کے لیے آمادہ کرتا ہے اور اس تنظیم کی کیفیت کے ذریعہ بھی جو نئے تصور کی حمایت کرتی ہے (لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ تنظیم میں شمولیت دوسرے مقاصد کی بنا پر ہوئی ہو ——— یعنی جو

نئے مقاصد تصور میں محض شرکت کے مقصد سے مختلف ہوں) یہ عناصر درحقیقت، سماجی گروہ کی نوعیت کے مطابق ادلتے بدلتے رہتے ہیں ——— سماجی گروہ کی نوعیت کے مطابق اور اس گروہ کی تہذیب کے مطابق۔ لیکن تحقیق و جستجو خاص طور پر عام لوگوں میں بہت دلچسپ ہوجاتی ہے، جو اپنے عقاید اور خیالات زیادہ مشکل سے بدلتے ہیں۔ اور جو ہر حال میں، ان عقاید و خیالات کو اس طرح نہیں بدلتے کہ ان کی جگہ نئے خیالات کو خالص شکل میں قبول کرلیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ نئے خیالات کو کم و بیش ایک عجیب و غریب معجون کی شکل میں قبول کرتے ہیں۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی منطقی طور پر مربوط و ہموار شکل، منطق و مذاکرے کی جامعیت، جو مثبت یا منفی دلائل کو، خواہ وہ وزنی ہوں، نظر انداز نہیں کرتی، اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کن ہونے کی منزل سے بہت دور ہے۔ یہ فیصلہ کن ہوسکتی ہے، اگرچہ چھوٹے طور پر۔ ایسے میں جب ایک خاص شخص دانشورانہ بحران کی حالت میں ہو، جب وہ پرانے اور نئے کے درمیان بھٹک رہا ہو، جب پرانے پر سے اُس کا عقیدہ اُٹھ تو گیا ہے لیکن ابھی اُس نے نئے کے حق میں فیصلہ نہیں کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مفکروں اور عالموں کے اثر کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے۔ عام لوگوں پر اُن کا اثر زبردست ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر تصور کے اپنے مفکر اور عالم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا اثر و رسوخ و اختیار بٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مفکر تجزیہ کرسکتا ہے، خود اس نے جو کچھ کہا ہے اُس پر شک کرسکتا ہے، وغیرہ۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ نئے تصورات کی تبلیغ و توسیع کا سلسلۂ عمل سیاسی اسباب کی بنا پر یعنی آخر میں، سماجی اسباب کی بنا پر رونما ہوتا ہے۔ لیکن منطقی ربط و آہنگ اثر و اختیار اور تنظیم کے ہیئتی عناصر، افراد میں بھی اور گروہوں میں بھی، اس سلسلۂ عمل میں بہت بڑا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عام لوگوں میں فلسفے کا وجود صرف ایک عقیدے کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ، عوام کے آدمی کی دانشورانہ پوزیشن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اُس آدمی کی تشکیل ہوتی ہے اس کے خیالات و تصورات، عقیدوں سے، امتیاز و تفریق کے معیاروں اور طور و طریق کے معمولات سے۔ کوئی بھی شخص جو اس کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اس وجہ سے کہ وہ دانشورانہ طور پر برتری رکھتا ہے، اُس سے بہتر دلائل پیش کرسکتا ہے اور اپنی منطق سے اس کو دوڑا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا، اس لیے عوام کا آدمی اپنے عقائد بدل دے؟ صرف اس لیے کہ وہ وقتی بحث میں اپنا لوہا منوانے میں ناکام رہا؟ لیکن تب تو صورتِ حال کچھ اور ہوجائے گی۔ تب تو اسے روزانہ اپنے خیالات بدلنا پڑیں گے۔ یا جب بھی کسی ایسے نظریاتی حریف سے پالا پڑے جو دانشورانہ برتری کا مالک ہے تو اس صورت میں اپنے خیالات سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ تو پھر کن عناصر پر اس کا فلسفہ قایم ہے؟ خاص طور پر فلسفے کی اس خاص شکل میں جس میں فعل و عمل کے معمول کی حیثیت سے وہ متعلقہ شخص کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟ بلا شبہ سب سے زیادہ اہم عنصر ہے ایک غیر عقلی عنصر یعنی عقیدہ۔ لیکن کس پر عقیدہ، کس چیز پر عقیدہ؟ خاص طور پر اس سماجی گروہ پر عقیدہ جس سے اس کا واسطہ ہے، اس حد تک جس حد تک وہ موٹے موٹے طور پر سوچتا ہے۔ عوام کا آدمی یوں سوچتا ہے کہ اتنی اہم چیز کے بارے میں، اتنے سارے لوگ اتنے غلط نہیں ہوسکتے جتنا کہ میرا حریف اپنے دلائل کے زور سے ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں خود اپنے خیال کی تائید میں اتنے زوردار ڈھنگ سے اپنے دلائل نہیں پیش کرسکتا جس طرح میرا حریف کرسکتا ہے لیکن میرے اپنے گروہ میں ایسے لوگ ہیں جو اتنے ہی زوردار ڈھنگ سے اپنے دلائل پیش کرسکتے ہیں، بلکہ میرے حریف سے زیادہ اچھی طرح یہ کام کرسکتے ہیں۔ اس کو یاد آتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے حق میں مکمل طور پر مدلل تفسیرات سن چکا ہے، جو بڑے مربوط ڈھنگ سے پیش کی گئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے عقیدے پر قائم رہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اب اگر اصلی دلائل اس کو یاد نہیں رہے اور وہ ان کو پیش نہیں کرسکتا، تو بے چارا کیا کرے۔ یہ حقیقت کہ وہ ایک بار قایل ہوچکا ہے۔ اور عقیدے کو اپنا چکا ہے، جیسے کوئی بجلی چمکی ہو اور اس پر سب کچھ عیاں ہوگیا ہو، اس کو راسخ العقیدہ بنانے میں بنیادی عنصر کا کام کرتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اب اپنے عقیدے کے حق میں قایل کن دلایل پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام لوگ نئے عقاید کے معاملے میں صد درجہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر یہ عقاید اکثر عقاید (خواہ وہ نئے ہی کیوں نہ ہوں) سے ٹکراتے ہوں۔ اور یہ عقاید وہ ہیں جو حکمراں طبقوں کے عام مفادات سے سماجی مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ بات مذاہب اور کلیسا کی تاریخ میں اس کے زیر و بم میں نظر آجائے گی۔ کوئی مذہب یا چرچ اس حد تک معتقد لوگوں کی اپنی آبادی کو برقرار رکھتا ہے (عام تاریخی ارتقائی ضرورت کی خاص حدوں کے اندر) جس حد تک وہ اپنے عقیدے کو مستقل اور منظم طور پر زندہ رکھتا ہے۔ اور انتھک طور پر معذرت خواہوں کے دلایل اور بیانات کو دہراتا رہتا ہے، ایک قسم کے دلائل سے لڑتا رہتا ہے اور دانشور حامیین کے ایک بالائی حلقے کو برقرار رکھتا ہے، وہ دلائل جو عقیدے میں خیال و فکر کا ایک خاص بھرم قائم کرتے ہیں۔ جب کبھی سیاسی وجوہ کی بنا پر یہ متبادل رشتہ شدت سے مجروح ہوا ہے یا ٹوٹا ہے، جیسا کہ فرانسیسی انقلاب کے وقت ہوا تو کلیسا کو بے اندازہ صدمہ پہنچا ہے۔ اور اگر وہ حالات، جن میں مروجہ معمولات پر عمل درآمد مشکل ہے بعض حدوں سے زیادہ طول کھینچے تو اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں یہ زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوتا اور ایک نیا مذہب ابھرتا، جیسا در حقیقت فرانس میں ہوا ہے۔ نیا مذہب تہذیبی آفاقیت کے امتزاج سے ابھرا۔ ہر وہ تہذیبی تحریک، جو عقلِ سلیم کی جگہ اور عام طور پر سابقہ تصوراتِ عالم کی جگہ لینا چاہتی ہے بعض بنیادی نتائج اخذ کرسکتی ہے (۱) اپنے دلائل کو دہرانے کا سلسلہ کبھی بند نہ کر۔ ہاں اس کی ہیئت بدلی جاسکتی ہے ——— کسی خیال کو بار بار دہراتا عام لوگوں کو متاثر کرنے کا بہت ہی کارآمد اور بصیرت افروز حربہ ہے (۲) مستقل پھیلتے ہوئے عوام کے حلقے کی دانشورانہ سطح کو اوپر اٹھانے کے لیے انتھک کام کیا جائے یعنی بے ہنگم ہجم غفیر میں شخصیت ساز خط و خال ابھارے جائیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک نئی قسم کا دانشوروں کا عملہ تیار کیا جائے جو براہِ راست عوام کے درمیان سے ابھرے ہوں۔ اب بھی ان کا رابطہ عوام سے قائم ہو اور جو "اندرونی ٹیک" کا کام کرے۔ یہ دوسرا لازمہ اگر پورا ہو جائے تو پھر یہ وہ عنصر بن جاتا ہے جو ایک عہد کے "نظریۂ کائنات" کو واقعی بدل دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ عملے اس وقت تک تشکیل و نشو و نما نہیں پاسکتے "جب تک کہ ان کی صفوں میں رسوخ و اختیار کا بالائی ادارہ تشکیل نہ پائے، ایسا ادارہ جس میں دانشور اور پرکاری ہو جو غیر منظم منفرد فلسفی میں مرکوز و عیاں ہوسکے۔ جو یہ سمجھ سکے کہ عام لوگ ایک انفرادی ذہن کی تیزی اور چستی نہیں رکھتے اور اس طرح ایک ایسے ڈھنگ سے اجتماعی نظریے کی باضابطہ توضیح میں کامیاب ہوں جو ایک اجتماعی مفکر کے خیال کے سانچوں سے زیادہ سے زیادہ قریب اور مطابق ہو۔

یہ بات صاف ہے کہ ہجم غفیر کے پیمانے پر ترکیب و تشکیل کسی نظریے کے پرچم تلے "مطلق العنان" ڈھنگ سے نہیں ہوسکتی کسی ایک شخصیت یا گروہ کے رسمی تعمیری عزم کے اظہار سے، جو محض اپنے فلسفیانہ یا مذہبی عقاید سے مجنونانہ وابستگی کی بنا پر سرگرمِ عمل ہے۔ کسی بھی نظریۂ حیات کی موافقت یا مخالفت ایک ایسا وسیلہ ہے جس کی مدد سے فکر کے پیمانوں کی عقلیت یا تاریخیت پرکھی تنقید اپنے آپ کو آشکار کرتی ہے۔ من مانے نظریات کم و بیش تیز رفتاری سے تاریخی مقابلے کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان کو کسی حد تک جو مقبولیت نصیب ہوتی ہے اس کے باوجود ایسا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے فوری حالات کے موافق امتزاج کی بدولت۔ لیکن، دوسری طرف، ایسے نظریات جو ایک پیچیدہ اور منظم تاریخی عہد کے مطابق ہوں ہمیشہ حاوی ہوتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ ہاں ممکن ہے کہ ان کو پہلے چند عبوری مرحلوں سے گزرنا پڑے جن میں وہ انجام کار عجیب و غریب آمیزشوں کے باوجود اپنا وزن اور برتری منوا لیتے ہیں۔

یہ حالات و واقعات بہت سے مسائل پیدا کرتے ہیں، جن میں اہم ترین مسئلہ وہ ہے جو مختلف نوع کے دانشور حلقوں کے درمیان رشتے کی نوعیت اور کیفیت کے عنوان کے تحت آتا ہے، یعنی، اس عملی حصے کی اہمیت جو اوپر کے

گروہوں کی تخلیقی دین ہوتا ہے اور جو تنظیمی تاب و تواں کے سلسلے میں مباحث اور دانشورانہ طور پر تابع طبقے کی خاطر نئے تنقیدی تصورات کو اجاگر کر کے ادا کرتے ہیں۔ اس لیے نکتہ یہ ہے کہ بحث و تمحیص اور تبلیغ و اشاعت کی حدیں مقرر کی جائیں ایسی آزادی جس کو تادیبی نظم و ضبط کی نظر سے اور طاقت و اختیار کے آلۂ کار کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے بلکہ خود عائد کردہ حدوں کے روپ میں دیکھا جائے۔ ایسی حدیں جو رہ نما خود اپنی سرگرمی پر عائد کرتے ہیں یا زیادہ مناسب الفاظ میں، تہذیبی پالیسی کا رُخ متعین کرنے میں اپنے اُوپر عائد کرتے ہیں: دوسرے الفاظ میں: "علم و فضل کے قوانین" کون طے کرے گا، کون سائنسی چھان بین کی حدیں مقرر کرے گا، اور کیا یہ قوانین اور ان کی حدیں مناسب ڈھنگ سے متعین ہو سکتی ہیں؟ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نئی صداقتوں کی تلاش اور خود صداقتوں کی بہتر، زیادہ مربوط اور واضح ترتیب و ترکیب کا کام انفرادی عالموں کی پیش قدمی پر چھوڑ دینا چاہیے، خواہ وہ بحث و تمحیص کے دوران میں بظاہر بہت ہی بنیادی اصولوں کی جگہ دوسرے اصولوں کی ترتیب کریں۔ اس کے علاوہ اس بات کی وضاحت مشکل نہیں ہوگی کہ کب اس قسم کی بحث و تمحیص میں مفاد پرست رجحانات و مقاصد شامل ہو جاتے ہیں جن کا کوئی تعلق سائنسی کردار سے نہیں ہوتا۔ یہ تجویز پیش کرنا نا ممکن نہیں ہے کہ انفرادی خیالات منظم اور منضبط ہو سکتے ہیں اور ان کا طرح طرح کے اخلاقی اور تہذیبی اداروں کی چھلنی میں چھان کر صاف کیا جا سکتا ہے۔ صرف اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ان کو منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

صاف صاف اور جچے تلے انداز میں اس بات کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ ہر ملک کے لیے اپنے سانچے ہوں گے۔ اپنی تہذیبی تنظیم جو نظریاتی دُنیا کو متحرک رکھے گی۔ صرف اس معنی میں اس کے عملی کام کو پیش نظر رکھا جائے۔ مختلف ملکوں کی آبادی کے ساتھ ایسے عملے کے تنظیمی رشتے کا مطالعہ جو اپنے پیشے کے لحاظ سے سرگرم تہذیبی کام میں منہمک ہے، کافی مفید ہوگا۔ ساتھ ہی اس کی آزاد قوتوں کا اندازہ لگانا بھی کارآمد ثابت ہوگا۔ اسکول ہر سطح پر، اور چرچ، ہر ملک میں، دو بڑے تہذیبی ادارے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی تعداد کو پیش نظر رکھیں جو یہاں سرگرم عمل ہیں، ان کے علاوہ ان کے اخبار ہوتے ہیں، تبصرے اور کتابیں ہوتی ہیں، نجی علمی ادارے ہوتے ہیں، خواہ وہ ریاستی اسکول سے منسلک ہوں یا "پاپولر یونیورسٹیوں"، جیسے ادارے ہوں دوسرے پیشے بھی اپنی خاص الخاص سرگرمیوں میں ایسی تہذیبی سرگرمیوں کو شامل کرتے ہیں جن کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، قانون داں اور دیگر حکام وغیرہ۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہونی چاہیے کہ تمام ملکوں میں، مختلف حدوں تک ہی سہی، جمِ غفیر اور دانشور گروہوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل رہتی ہے۔ جن میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو قوم سے قریب ترین واسطہ رکھتے ہیں۔ مثلاً استاد اور پادری۔ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ جہاں حکمراں افراد زبانی طور پر اس کا اعادہ کرتے ہیں، ریاست کے پاس کوئی وحدت الوجود، مربوط اور یکساں تصور نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے دانشور مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور پھر گروہ اندر ہی اندر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کچھ ملکوں کو چھوڑ کر کسی قسم کا اتحاد پیدا کرنے والا اثر نہیں ڈالتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آزاد مفکر پوری یونیورسٹی سے زیادہ اثر و انداز تاثر انگیز ہوتا ہے۔

مارکسزم کی ایسی تاویل کے سلسلے میں جس میں مقدر پرستی کی چھاپ ہوتی ہے، عرض ہے کہ ایسی تفسیر و تاویل کو دُور سے سلام، کیوں کہ اس کی افادیت ایک خاص تاریخی دَور میں کسی قدر ہوتی ہے مگر اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی مقدر پرستانہ تاویل کو جلد از جلد نہایت احترام و ادب کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ اس کی مثال تقدیر و رحمت و شفاعت کی نظریے سے دی جا سکتی ہے۔ جدید دُنیا کی شروعات کی تان بہرحال کلاسیکی جرمن فلسفے پر ٹوٹی جس کی آزادی کا تصور دراصل ضرورت کا ادراک ہے۔ یہ فضول عام نعرہ ہے جس نے "خدا کی مرضی" کی جگہ لے لی ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اپنی ابتدائی اور

دنیا اوسی سطح پر بھی، یہ اس تصور کا آدرش تھا جو "خدا کی مرضی" یا خدا کی رحمت والے تصور سے زیادہ جدید اور شاداب و زرخیز تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نیا تصور اپنے آپ کو گنواروں کے عامیانہ لب و لہجے کے علاوہ کسی اور پیرہن میں ڈھال کر اپنے ظہور کا اعلان کرے؟ پھر بھی یہ طے ہے کہ مورخ تمام پیش بینیوں اور مستقبل کی بصیرت سے لیس ہو کر، ایک نئی دنیا کی شروعات کے ادراک و عرفان میں ناکامیاب ہوتا ہے۔ ایک ایسی نئی دنیا کی شروعات میں ہمیشہ کمزوری اور سنگلاخ ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ یہ اس زوال آمادہ دنیا کے مقابلے میں برتر و مبارک ہے جو چراغِ سحر کی طرح لو پھٹنے سے پہلے جھلملاتی ہے اور کبھی کبھی بھڑک کر خس و خاشاک کو روشن بھی کر دیتی ہے۔

بے حسی : انتونیو گرامچی

بے حسی حقیقتاً ایک موثر تاریخی قوت کی حیثیت رکھتی ہے، مگر منفی معنی میں۔ جو کچھ پیش آتا ہے، چاہے وہ ایسی بدی ہو، جو کبھی پرِ اثر انداز ہوتی ہے یا چاہے وہ ایسی ممکنہ نیکی ہو، جو کسی عمومی جرأت مندانہ اقدام کا نتیجہ ہو ——— وہ چند فعال افراد کی پہل قدمی کا اتنا نتیجہ نہیں ہوتا، جتنا کہ وہ کثیر افراد کی بے حسی، عدم شرکت کا حاصل ہوتا ہے۔ جو کچھ پیش آتا ہے، اس کا بڑا سبب یہ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں، بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شہریوں کی بڑی اکثریت اپنی ذمہ داری کو تج دیتی ہے اور جو کچھ ہوتا ہے، اُسے ہونے دیتی ہے۔ وہ ایسی گتھائیں پڑنے دیتے ہیں، جنھیں وقت گزرنے کے بعد تلوار سے ہی کاٹا جاسکتا ہے؛ وہ ایسے افراد کو اقتدار پر قابض ہونے دیتے ہیں، جنھیں وقت گزرنے پر صرف بغاوت کے ذریعے ہی ہٹایا جاسکتا ہے۔ تاریخ پہ جو قسمت پرستی حاوی نظر آتی ہے، دراصل وہ اسی بے حسی، اسی عدم شرکت کا پرتو ہے۔ واقعات سائیوں میں پروان چڑھتے ہیں۔ چند ہاتھ جو کسی کے بھی سامنے جواب دہ نہیں ہوتے، اجتماعی زندگی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ عوام النّاس کو ان واقعات کی اصلیت کا کبھی علم نہیں ہو پاتا۔ ایک عہد کی قسمت کا فیصلہ نہایت تنگ مفادات کے افق کو، فعال افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے فوری مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کیا جاتا ہے اور عوام النّاس اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ مگر جو واقعات سائیوں میں پروان چڑھتے ہیں، وہ سامنے آجاتے ہیں؛ سائیوں میں بُنا گیا پارچہ تکمیل پاتا ہے اور ہر سُو ہر فرد پر یہ احساس طاری ہو جاتا ہے کہ بس یہی ہونا تھا اور یہی ہو کر رہا۔ اس وقت ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ تاریخ ایک مافوق الفطرت قدرتی وقوعہ ہے، ایک اُبال ہے، ایک زلزلہ ہے اور ہم سب اس کے صید لاچار ہیں، وہ بھی جو اس وقوعہ کے خواہش مند تھے اور وہ بھی جو اس کے آرزومند نہیں تھے۔ وہ بھی جو فعال تھے اور وہ بھی جو بے حس تھے۔ اور پھر وہی بے حس لوگ برافروختہ ہوتے ہیں اور نتائج سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ان کی قطعی یہ خواہش نہیں تھی کہ ایسا ہوتا، اس لیے وہ اس کے لیے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ کچھ لوگ بڑی بیچارگی کے عالم میں ماتم کرتے ہیں اور کچھ لوگ اونچے سُروں میں آہ و بکا کرتے ہیں مگر ایسے افراد کم ہی ہوتے ہیں، جو خود سے یہ دریافت کریں: 'اگر میں نے فرد کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیا ہوتا، اگر میں نے اپنی آواز بلند کی ہوتی، اپنی رائے کا اظہار کیا ہوتا تو کیا وہ ہوتا، جو ہوا ہے؟' لیکن ایسے افراد کم ہی ہوتے ہیں، جو اپنی بے حسی، اپنی قنوطیت کو موردِ الزام گردانیں، ان سیاسی اور معاشی گروہوں کو اخلاقی اور مادّی مدد دینے میں اپنی ناکامی کو ذمہ دار تسلیم کریں، جو کسی مخصوص بدی سے بچنے یا کسی مخصوص نیکی کو فروغ دینے کے لیے کوشاں تھے۔ اس کے برعکس، ایسے لوگ نظریات کی ناکامی، منصوبوں کی ناگزیر شکست اور ایسی ہی باتوں سے اپنا دل بہلانے لگتے ہیں۔ ان کی بے حسی اور قنوطیت بدستور جاری و ساری رہتی ہے۔ کل سے وہ ایک بار پھر واقعات کے لیے براہِ راست یا بلاواسطہ ذمہ داری

سے دست بردار رہنے کی زندگی جینے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حالات سے لاعلم ہوتے ہیں یا وہ سنگین ترین مسائل کے نہایت شاندار حل پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مگر یہ حل شاندار طریقے سے بانجھ ہی رہتے ہیں۔ اخلاقی حس کی کوئی چنگاری ان لوگوں کو اجتماعی زندگی میں حصہ لینے پر آمادہ نہیں کرتی، بلکہ یہ لوگ اجتماعی زندگی کو ذہنی عیاشی کا محض ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان میں تاریخی ذمہ داری کے احساس کا قطعی فقدان ہوتا ہے، جو افراد کو زندگی میں فعال کردار ادا کرنے پر انگیخت کرتا ہے، جو کسی قسم کی بے یقینی یا بے حسی کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ، ہر شخص نہ صرف اس کے لیے جواب دہ ہے، جو اس نے کیا ہے، بلکہ خصوصی طور پر اس کے لیے بھی جواب دہ ہے، جو اس نے نہیں کیا۔

——— ”اوانتی“، تورین ایڈیشن

۲۶ اگست ۱۹۱۶ء

عبقریوں کے وجود کا سلسلۂ عمل

کیا عبقری ایک خود مختار اور آزاد سماجی گروہ ہوتے ہیں یا ہر ایک سماجی گروہ کا اپنا الگ اور مخصوص عبقریوں کا گروہ ہوتا ہے؟ یہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہے، کیونکہ تاریخی طور پر عبقریوں کی مختلف اقسام آج تک نہایت مختلف اشکال میں وجود میں آئی ہیں۔

ان میں سے دو اشکال نہایت اہم ہیں:

۱۔ ہر ایک سماجی گروہ، جو معاشی پیداوار کی دنیا میں بنیادی فریضہ ادا کرتے ہوئے عالمِ وجود آتا ہے، اپنے ساتھ ساتھ organically —— عبقریوں کا ایک یا ایک سے زیادہ گروہ وجود میں لاتا ہے، جو اسے ربط عطا کرتے ہیں اور نہ صرف معاشی، بلکہ سماجی اور سیاسی شعبوں میں بھی اسے اس کے مقام کا شعور عطا کرتے ہیں۔ سرمایہ دار، کارخانے دار —— اپنے ساتھ صنعتی ٹیکنیشین کو، سیاسی معیشت (Political Economy) کے ماہر کو، ایک نئی ثقافت کے تنظیم کار کو اور ایک نئے قانونی نظام کے تنظیم کار کو بھی وجود میں لاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سرمایہ دار، کارخانے دار بھی سماج کے فروغ کی ایک اعلیٰ ترین سطح کا ترجمان ہوتا ہے، جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی حد تک اس کی پہلے سے عملداری قائم ہو چکی ہوتی ہے اور وہ ٹیکنیکل (دوسرے لفظوں میں دانشورانہ) صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے؛ اس کے لیے ایک حد تک ٹیکنیکل صلاحیت حاصل کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے، صرف اپنی سرگرمی اور پہل کے محدود شعبہ میں ہی نہیں، بلکہ دوسرے شعبوں میں بھی، کم سے کم ان شعبوں میں، جو معاشی پیداوار کے شعبے سے قریبی علاقے رکھتے ہیں؛ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عوام کے جم غفیر کو منظم کرے؛ اپنی تجارت میں سرمایہ لگانے والوں کے اعتماد کا تنظیم کار بنے، لوگوں میں اپنی مصنوعات کے لیے اعتماد منظم کرے وغیرہ۔

اگر سبھی سرمایہ دار کارخانے دار نہیں تو کم سے کم ان میں سے ایک سربرآوردہ طبقہ میں عام سماج کو منظم کرنے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے، جس میں خدماتِ عامہ کا پیچیدہ نظام اور ریاستی نظام بھی شامل ہے، کیونکہ ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے طبقہ کی توسیع و ترقی کے لیے سازگار ترین حالات پیدا کریں؛ یا کم سے کم ان میں ایسے نمائندوں (خصوصی مہارت رکھنے والے ملازمین) کو چننے کی صلاحیت ہونی چاہیے جو تجارت سے خارج کی دنیا میں تعلقات کے عام نظام کو منظم کرنے کا کام انجام دے سکیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ "organic" —— عبقری، جنھیں ہر ایک نیا طبقہ اپنے ساتھ تخلیق کرتا ہے اور فروغ کے دوران جس کے خدوخال وضع ہوتے ہیں، وہ اکثر ان ابتدائی مراحل کی سرگرمیوں کے جزوی پہلوؤں پر ہی مہارت رکھتے ہیں، جو نئے طبقہ کے ساتھ عالمِ وجود میں آتی ہیں۔

جاگیردار، نواب تک بھی خصوصی ٹکنیکل (فوجی) صلاحیت رکھتے تھے اور ٹھیک اس لمحے سے جبکہ طبقہ اشرافیہ

تکنیکی، فوجی صلاحیت پر اپنی اجارے داری سے محروم ہوتا ہے، جاگیردارانہ نظام کے بحران کی شروعات ہو جاتی ہے مگر جاگیردارانہ دنیا میں عبقریوں کا وجود میں آنا اور ان کا اس سے قبل کی کلاسیکی دُنیا میں وجود میں آنا، ایک ایسا سوال ہے جس کا الگ سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ تعداد کسان اگرچہ پیداوار کی دُنیا میں ایک بنیادی فریضہ انجام دیتے ہیں، مگر وہ اپنے " نمائندہ " عبقریوں کو وجود میں نہیں لاتے اور نہ کسان روایتی عبقریوں کے کسی حصّہ کو اپنے اندر " جذب " ہی کرتے ہیں، حالانکہ دوسرے سماجی گروہ کسان طبقہ سے متعدد عبقریوں کو نکال کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور روایتی عبقریوں کی ایک بڑی تعداد دہقان الاصل ہی ہوتی ہے۔

۲ - ہر ایک " اساسی " سماجی گروہ، جو سابقہ معاشی ڈھانچہ سے تاریخی طور پر فروغ پا کر ظہور پذیر ہوتا ہے، اور اس ڈھانچہ میں تبدیلی کے اظہار کے طور پر، عبقریوں کی مختلف اشکال کو پہلے سے موجود پاتا ہے (کم سے کم تاریخ میں اب تک تو یہی ہوتا آیا ہے) تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک ایسا تاریخی تسلسل ہے، جس کی سیاسی اور معاشرتی اشکال میں نہایت پیچیدہ اور دُور رس تبدیلیاں بھی حارج نہیں ہوتیں۔

عبقریوں کی ان اقسام کی سب سے اہم مثال پادری، پجاری ہیں، جن کی تاریخ کے ایک طویل دَور میں، کئی اہم خدمات پر اجارے داری رہی ہے: مذہبی نظریہ یعنی عہد کے فلسفہ اور سائنس اور اس کے ساتھ مدارس، تعلیم، اخلاق، انصاف، خیرات، رفاہی کاموں وغیرہ پر ان کی اجارے داری رہی ہے۔ ان مذہبی ہادیوں کو ایسے عبقری سمجھا جا سکتا ہے، جو زمیندار طبقہ، اشرافیہ سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان عبقریوں کو قانونی سطح پر طبقہ اشرافیہ کے برابر کا درجہ حاصل تھا، جس کے اشتراک میں عبقریوں کے طبقہ کو وہ عام ریاستی امتیازات بھی حاصل تھے، جو جائداد کی دین ہوتے ہیں۔ (زمانہ قدیم کے معاشروں میں ثانوی طور پر علاج معالجہ کرنے والوں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بھی یہ امتیازات حاصل رہے ہیں) مگر پادریوں، پجاریوں کی اس اجارے داری کو مزاحمت یا تحدید سے بھی دوچار ہونا پڑا اور پادریوں، پجاریوں کی نئی اقسام کو فروغ حاصل ہوا جنھیں بادشاہ کی مرکزی طاقت کی سرپرستی حاصل تھی، یہاں تک کہ شہنشاہ طاقتِ مطلق کے مالک بن گئے۔ اس طرح خلقی ہادی، سرکاری کارندوں کی ایک نئی قسم محقق اور سائنس داں، نظریہ ساز اور غیر مذہبی فلسفی عالم وجود میں آئے۔

یہ سبھی روایتی عبقری اپنے تاریخی تسلسل اور اپنے مخصوص علم کی بنا پر خود کو غالب سماجی گروہ سے الگ، آزاد اور خود مختار گروہ سمجھنے لگتے ہیں۔ خود اپنی قدر و قیمت کا یہ تعین نظریاتی اور سیاسی شعبوں میں کئی اہم اور دُور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ پورے آدرش وادی فلسفہ میں اس موقف کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، جو اس قسم کے عبقری اختیار کرتے رہے ہیں اور اس معاشرتی اٹوپیا کے اظہار کے طور پر اس کی تشریح کی جا سکتی ہے، جس کے زیر اثر یہ عبقری خود کو " آزاد "، " خود مختار "، اور خود کو مخصوص کردار سے بہرہ ور سمجھنے لگتے ہیں۔ . .

. . . " عبقری " کی اصطلاح کی انتہائی حدود کیا ہیں؟ کیا ہم کوئی ایسا پیمانہ تلاش کر سکتے ہیں جس کا عبقریوں کی نہایت مختلف النوع اور متضاد سرگرمیوں پر یکساں طور پر اطلاق ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے سماجی گروہوں کی سرگرمیوں سے بنیادی طور پر انھیں ممیز کیا جا سکے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت عام غلطی رہی ہے کہ دانشورانہ سرگرمیوں کی ماہیت میں ہی اس امتیاز کے پیمانہ کو تلاش کیا جاتا رہا ہے، جبکہ یہ پیمانہ تعلقات کے اس نظام میں تلاش کیا جانا چاہیے، جس کے معاشرتی تعلقات کے پیچیدہ جال کی حدود میں یہ سرگرمیاں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ مثال کے لیے ایک کاریگر یا دستکار کی امتیازی خصوصیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ ہاتھوں یا اوزاروں سے کام کرتا ہے، بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ

خاص حالات میں اور مخصوص معاشرتی تعلقات کے چوکھٹے میں کام کرتا ہے۔ (علاوہ ازیں خالص جسمانی مشقت کوئی وجود نہیں رکھتی۔ . . جسمانی مشقت کے کسی بھی کام میں چاہے وہ ارذل ترین اور نہایت میکانکی ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ تیکنیکی مہارت درکار ہوتی ہے اور یہ تخلیقی دانش ورانہ سرگرمی کا ہی نتیجہ ہوتی ہے) اور جیسا کہ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ سرمایہ دار، کارخانے دار کے لیے اپنی سرگرمی کے طفیل، کسی حد تک دانشورانہ خوبیوں کا حامل بننا ضروری ہے، حالانکہ معاشرہ میں اس کے کردار و حیثیت کا تعین ان سے نہیں ہوتا، بلکہ ان عمومی معاشرتی تعلقات سے ہوتا ہے، جو میدان صنعت میں سرمایہ دار، کارخانے دار کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سبھی انسان عبقری ہوتے ہیں، مگر سماج میں سبھی آدمی عبقریوں کا کردار ادا نہیں کرتے۔ (مثلاً ہر آدمی کبھی نہ کبھی انڈے تل لیتا ہے یا پھٹے ہوئے جیکٹ کو سی لیتا ہے، مگر ضروری نہیں ہوتا کہ ہم اس آدمی کو باورچی یا درزی سمجھنے لگیں)

جب ہم دانشور اور غیر دانشور میں امتیاز کرتے ہیں تو درحقیقت ہمارے ذہن میں عبقریوں کی پیشہ ورانہ معاشرتی سرگرمی کا خیال ہی جاگزیں ہوتا ہے یعنی ہمارے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ ان کی مخصوص پیشہ ورانہ سرگرمی کا جھکاؤ کس طرف ہے، ذہنی کدوکاوش کی طرف یا عضلاتی - اعصابی کدوکاوش کی طرف - اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم عبقریوں کا تذکرہ تو کر سکتے ہیں، مگر غیر عبقریوں کا تذکرہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ غیر عبقریوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ پھر ذہنی، دماغی کدوکاوش اور عضلاتی، اعصابی کدوکاوش کے درمیان رشتہ ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے مخصوص دانشورانہ سرگرمیوں کی اقسام مختلف ہوتی ہیں۔ انسانی سرگرمی کی کوئی ایسی شکل اپنا وجود نہیں رکھتی، جس سے ذہنی کدوکاوش کو یکسر خارج کیا جا سکے ——— آلات ساز انسان (Homo Fabre) کو مفکر انسان (Homo Sapiens) ——— سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ حتمی طور پر ہر ایک انسان، اپنی پیشہ ورانہ سرگرمی کے علاوہ، کسی نہ کسی دانشورانہ سرگرمی میں حصہ لیتا ہے یعنی وہ "فلسفی" ہوتا ہے، ایک فنکار ہوتا ہے، ذوقِ سلیم رکھنے والا فرد ہوتا ہے، وہ دنیا کے ایک خاص تصور میں حصہ دار ہوتا ہے، وہ شعوری طور پر اخلاقی برتاؤ کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے اور چنانچہ، وہ دنیا کے ایک تصور کو جاری و ساری رکھنے یا اس میں تبدیلی لانے میں مدد دیتا ہے، یعنی وہ فکر کے نئے انداز وجود میں لاتا ہے۔

عبقریوں کے ایک نئے گروہ کو وجود میں لانے کا مسئلہ دراصل اس میں مضمر ہے کہ اس دانشورانہ سرگرمی کو جو سب میں ترقی کے کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہوتی ہے، انتقادی طور پر کس طرح فروغ دیا جائے اور عضلاتی، اعصابی کدوکاوش سے اس کے رشتے کو بدل کر اس میں کس طرح ایک نیا توازن لایا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ عضلاتی، اعصابی کدوکاوش جہاں تک وہ اس عمومی عملی سرگرمی کے ایک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، جو مادی اور معاشرتی دنیا میں مسلسل تغیرات لاتی ہے ——— دنیا کے ایک نئے اور ہمہ گیر تصور کی بنیاد بن جائے۔ خود کو محض ادیب، خالص فلسفی یا فنکار سمجھنے والے دراصل عبقریوں کی روایتی اور بھونڈی مثال ہیں۔ چنانچہ صحافی بھی، جو ادیب، فلسفی، فنکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، خود کو "حقیقی" عبقری سمجھتے ہیں۔ جدید دنیا میں تکنیکی تعلیم ہی جو چاہے نہایت غیر ترقی یافتہ اور غیر مہارتی سطح کی صنعتی محنت سے ہی کیوں نہ جڑی ہوئی ہو، نئی قسم کے عبقری کے وجود کی اساس ہونی چاہیے۔

(اقتباس)

"عبقریوں کے وجود کا سلسلۂ عمل"

طبقہ، ریاست، پارٹیاں : انتونیو گرامچی

سوشلسٹ نقطۂ نظر سے، ریاست کس کی ترجمانی کرتی ہے؟ ریاست بورژوا طبقہ کی معاشی، سیاسی تنظیم ہوتی ہے۔ ریاست بورژوا طبقہ کا جدید، ٹھوس مظہر ہے۔ ریاست سے باہر بورژوا طبقہ ایک متحد جماعت نہیں ہوتا۔ آزاد مسابقت کے نتیجہ میں نظام کی معاشی صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لیے سرمایہ داروں کے نئے گروہ مسلسل وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ان میں ہر ایک گروہ خون آشام مسابقت سے خود کو الگ کرنے اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا کوشاں ہوتا ہے۔ ریاست کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اندرونی طبقاتی قضیوں اور مخالف مفادات کی آویزشوں کا قانونی تصفیہ و حل تلاش کرے اس طرح ریاست مختلف گروہوں کو متحد کرتی ہے حکراں طبقہ کو ایک ٹھوس اور متحد خارجی رُوپ عطا کرتی ہے۔ گروہوں کے درمیان مسابقت حکومت کے نکتہ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ سب سے طاقتور بورژوا پارٹی یا اُن کی گروہ بندی حکومت پر قابض ہوتی ہے، موخرالذکر کی طاقت کی وجہ سے اُسے ریاستی اقتدار کو استعمال کرنے، اُسے کسی خاص سمت میں موڑنے اور اپنے معاشی اور سیاسی پروگرام کے مطابق اسے کسی وقت بھی آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

بورژوا پارٹیاں پیداواری مفادات کی ترجمان ہوتی ہیں یا وہ ایسی مکھیوں کا غول ہوتی ہیں، جو گاڑی سے چمٹے رہنے کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ گاڑی اُن کی طاقت کے بل بوتے پر ہی پہاڑی پر چڑھ رہی ہے۔ مکھیوں کا یہ غول، ریاست کے ڈھانچے پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہوتا لیکن مکھیوں کا یہ غول خوب الفاظ بھنبھناتا ہے اور خویش پروری کا شہد چوستا ہے۔

سوشلسٹ پارٹی گروہی نہیں، بلکہ ایک طبقاتی تنظیم ہوتی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی دوسری پارٹیوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ریاست کو، جو بورژوا طبقہ کے اقتدار کا ڈھانچہ ہوتی ہے، اپنا مخالف مماثل ہی سمجھ سکتی ہے۔ وہ خود کشی کیے بغیر، اپنی ماہیت سے محروم ہوئے بغیر، ایک ایسا سیاسی گروہ ہے بغیر، جو پرولتاریہ کی تاریخی کردار سے بیگانہ ہو چکا ہو، ایسی مکھیوں کا غول بنے بغیر، جو شیرہ کے طشت سے چپکنے اور اس میں جان دینے کے لیے بے قرار ہو ——— ریاستی اقتدار جیتنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ مسابقت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ سوشلسٹ پارٹی ریاستی اقتدار کے حصول کے لیے کوشاں نہیں ہوتی؛ وہ اس کی جگہ لینے کی کوشاں ہوتی ہے، یہ حکومت کو بدلتی ہے، پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کرتی ہے اور آزادانہ مسابقت کی جگہ پیداوار اور تبادلے کی تنظیم نو کو عمل میں لاتی ہے۔

——— الگرید ویل پوپولو

۱۸ رمئی ۱۹۱۸ء

عضویاتی بحران کے ادوار میں سیاسی پارٹیوں کے چند پہلوؤں کا جائزہ

اپنے تاریخی وجود کے کسی مرحلہ پر معاشرتی طبقات اپنی روایتی پارٹیوں سے الگ تھلگ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان روایتی پارٹیوں کو . . . خود اُن کا طبقہ یا اس کا ایک حصّہ اپنا نمائندہ تصور کرنا ترک کر دیتا ہے۔ جب ایسا بحران پیدا ہوتا ہے تو فوری صورت حال نازک اور خطرناک بن جاتی ہے، کیونکہ پُرتشدد حلوں کے لیے راہ کھُل جاتی ہے اور راہ کھُلتی ہے ایسی نامعلوم طاقتوں کی سرگرمیوں کے لیے، جن کی ترجمانی کوئی "کرشماتی شخصیت" کرتی ہے۔

"نمائندوں کو چننے والوں اور چنے جانے والے نمائندوں" کے درمیان آویزش کی یہ صورت حال پارٹیوں کی صفوں میں بھی پھوٹتی ہے (پارٹی تنظیموں میں، پارلیمانی انتخابی میدان میں، اخباری تنظیم کے معاملے میں) اور پورے ریاستی نظام کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، جو نوکر شاہی (شہری اور فوجی) اعلیٰ سطح کی سرمایہ کاری، چرچ اور عمومی طور پر ان سبھی اداروں کی نسبتی قوت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے، جو رائے عامہ کے اُتار چڑھاؤ سے نسبتاً محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ ہر ایک ملک میں یہ سلسلۂ عمل مختلف ہوتا ہے، مگر اس کی ماہیت یکساں ہوتی ہے۔ اور یہ ماہیت ہوتی ہے برسرِ اقتدار طبقہ کی عملداری کا بحران جو اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ کسی ایسے بڑے سیاسی فریضہ کی انجام دہی میں ناکام رہا ہے، جس کے لیے اس نے عوام الناس کی رضامندی حاصل کی ہے یا انہیں زبردستی یہ رضامندی دینے پر مجبور کیا ہے (مثلاً جنگ کے لیے) یا عوام الناس (خصوصاً کسان اور پیتی بورژوا دانشور) سیاسی عدمِ تحرک کی حالت کو ترک کر کے اچانک سرگرمِ عمل ہو گئے ہیں اور وہ ایسے مطالبات کرنے لگے ہیں جو ربط و آہنگ سے ملو صورت گری سے محروم ہونے کے باوجود، انقلاب کا سا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ "حاکمیت کے بحران" کی چرچا ہونے لگتی ہے! یہ درحقیقت عملداری کا بحران ہوتا ہے یا ریاست کا عمومی بحران۔

یہ بحران ایسے حالات کو جنم دیتا ہے، جو فوری طور پر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، کیونکہ عوام کے مختلف طبقات تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق اپنے رویّہ میں اتنی ہی تیزی کے ساتھ تبدیلی لانے یا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اپنی تنظیم نو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ روایتی برسرِ اقتدار طبقہ، جس کے پاس متعدد تربیت یافتہ کارندے ہوتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ رہنماؤں اور پروگراموں کو بدلتا ہے، جتنی تیزی کے ساتھ مغلوب طبقات اپنے رویّہ میں تبدیلی نہیں کر پاتے اور برسرِ اقتدار طبقہ عنانِ حکومت پر اپنی گرفت کو پھر مضبوط کر لیتا ہے، جو ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے یہ برسرِ اقتدار طبقہ کچھ قربانیاں دینے کے لیے بھی تیار ہو جائے اور عوام الناس کو خوش کرنے کے لیے لمبے چوڑے کھوکھلے وعدے بھی کر ڈالے، مگر طاقت اس کے ہی ہاتھ میں رہتی ہے اور فی الوقت برسرِ اقتدار طبقہ اس طاقت میں اضافہ بھی کرتا ہے اور وہ اس طاقت کو اپنے مخالف کو کچلنے اور ممتاز کارکنوں کو تتر بتر کرنے کے

لیے بھی استعمال کرتا ہے، جو بہرحال کثیر التعداد یا اعلیٰ تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ مختلف پارٹیوں کے لوگ ایک ہی پارٹی کے پرچم تلے جمع ہو جاتے ہیں، جو اپنے طبقہ کی نمائندگی بہتر طور پر کرنے لگتی ہے اور اس پورے طبقہ کی ضروریات کی ایک بار پھر تکمیل کرنے لگتی ہے۔ یہ ایک عضوی اور نارمل صورت حال ہی کہی جا سکتی ہے، حالانکہ تبدیلی کی رفتار نہایت تیز ہوتی ہے۔ پرسکون ادوار کے مقابلے میں اس تبدیلی میں بجلی کی سی سرعت ہوتی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی ترجمان ہوتی ہے کہ ایک پورا معاشرتی طبقہ "واحد لیڈرشپ کے تحت مرتکز ہو گیا ہے"، تنہا جسے اس طبقہ کے وجود کو درپیش مسائل کو حل کرنے اور اس کو درپیش سنگین خطرہ کا سامنا ہونے کا اہل سمجھا جانے لگا ہے۔ جب بحران کا یہ عضوی حل نہیں نکلتا بلکہ بحران کا حل "واحد کرشماتی لیڈر" کی صورت میں نکلتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے ایک منجمد توازن پیدا ہو گیا ہے (جس کے عناصر مختلف النوع ہو سکتے ہیں، مگر جن میں فیصلہ کن عنصر ترقی پسند قوتوں کی ناپختگی ہوتی ہے) اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بھی گروپ، نہ قدامت پرست اور نہ ہی ترقی پسند، اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کو زیر کر سکے اور یہ کہ قدامت پرست گروہ کو بھی ایک ماسٹر کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ دیکھیے[1]:

[1] Karl Marx : The Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte

شعور
ایک سو چھیاسی

بریخت

انور عظیم

آئینہ در آئینہ : منظر پس منظر اور بریخت سے پہلی ملاقات : انور عظیم

○

ایک مکالمہ : بریخت اور ہمعصر

○

بریخت کا تھیٹر : زندگی کا ڈرامہ اور الیوژن کی شکست : انور عظیم

○

کالے جنگلوں کا مسافر : امریکی ہاؤس کمیٹی کی سماعتوں سے اقتباس

○

رنگ منچ : زوال کا عروج : بریخت

ترجمہ : انور عظیم

○

گیارہ نظمیں : بریخت

ترجمہ : بلراج کومل، منیر الدین احمد

آئینہ
در
آئینہ

منظر، پس منظر

اور

ہمرنگت سے پہلی ملاقات

کالی داس کے اس دیس میں برہنیت کا نام میں نے پہلی بار کب سُنا؟

کچھ کچھ یاد آتا ہے ——— اس صدی کی پانچویں دہائی تھی۔ ہٹلر کی چھیڑی ہوئی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فاشزم ظلم اور بربریت کے سیاہ علَم سرنگوں تھے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے آسمان میں ایٹمی چھتریاں مکمل کر بند ہو چکی تھیں۔ آگ کے بادل چھٹ چکے تھے۔ جن کو مرنا تھا، مر چکے تھے۔ جن کو نہ جینا تھا نہ مرنا تھا، کراہ رہے تھے، خون اور پیپ میں لتھڑے ہوئے۔ اور جن کو جینا تھا جی رہے تھے کچھ زنداں میں، کچھ زنداں کے باہر ——— اور زنجیروں کی جھنکار گونج رہی تھی۔ قریب بھی اور دُور بھی۔

تب میں کلکتے میں تھا، اپنی صحافتی زندگی کے آغاز کے شہر میں ——— ادبی زندگی پہلے ہی شروع ہو چکی تھی، بہار کے ایک چھوٹے سے شہر میں جہاں گوتم بدھ کا مندر ہے، جو ناگاساکی اور ہیروشیما سے بہت دُور ہے، جہاں گوتم بدھ کے بہت سے ماننے والے جل کر راکھ ہو گئے۔ اس پراچین سنسکرتی کے دیس میں جہاں آج بھی شکنتلا کی ہرن جیسی زخمی آنکھوں کو وہ نہیں پہچانتا جس نے ان کو زخمی کیا ہے۔ جہاں آج بھی نہ جانے کتنے رام سچ کو اندھیرے کی زنجیروں سے چھڑانے کے لیے بن باس کاٹ رہے ہیں۔ جہاں آج بھی جھوٹ اور مکّاری اور جہالت کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ سُورج کب نکلا اور کب ڈوب گیا۔ جہاں، جہاں . . .

تب میں کلکتے میں تھا ——— اور تب دن کتنے کالے تھے اور راتیں کتنی اُجلی!

ان ہی دنوں کی بات ہے جب شہر کا دل . . . تجارت کے ملبے تلے، کولتار سے چمکتی ہوئی سڑکوں تلے چمکتی ہوئی دکانوں اور دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں تلے، پٹریاں بدلتی ہوئی ٹراموں کے پہیوں تلے، زندگی کا منوں بوجھ اُٹھائے ہوئے ننگے بدن سیاہ انسانوں کے تھکے تھکے قدموں تلے، ہگلی کے میلے پانی میں بہتی ہوئی کشتیوں اور گیتوں کے بوجھ تلے . . . شہر کا دل پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور دھوپ میں نہائی ہوئی ہوا میں اُڑنے کو بیقرار تھا۔

ہاں، یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب تھیٹر کا جادو مجھ پر چلنا شروع ہوا۔

یہ جادو ویسے شروع ہوا تھا برسوں پہلے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور آغا حشر کے کسی ڈرامے میں مجھے بدنصیب شہزادے کا رول ملا تھا۔ تفصیلات ذہن سے نکل چکی ہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اسٹیج کی روشنی میں کردار شاہی زرق برق لباسوں میں آتے تھے، بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی۔ ان کے قدم جب اُٹھتے اور پڑتے تھے تو دل دہل کر رہ جاتا تھا۔ سب چیخ چیخ کر بات کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ ہوا میں اُڑتے تھے، بات بات پر میان سے تلواریں نکل جاتی تھیں۔ ماں اپنی ممتا کی دہائی دیتی تھی اور سینے پر دوہتڑ مارتی تھی۔ گلے میں پڑے ہوئے ہار کے موتی چمکتے تھے اور کبھی کبھی ہار ٹوٹ جاتے تھے اور موتی بکھر جاتے تھے۔ آواز میں طوفان کی تیزی ہوتی تھی اور الفاظ پہاڑ کی بلندیوں سے (جو کرداروں جتنے اونچے ہوتے تھے) چٹانوں کی طرح لڑھکتے تھے۔ شہزادیاں روتی تھیں اور اپنی پاکبازی کا یقین دلاتی تھیں۔ کوئی گرفتار ہوتا تھا۔ کسی کا سر قلم ہوتا تھا، کوئی پکڑ کر شیر کے پنجرے میں ڈال دیا جاتا تھا ——— جو کچھ ہوتا تھا، زور و شور سے ہوتا تھا۔ خوب گانا ہوتا تھا، خوب باجا بجتا تھا۔ لوگ ٹکٹ خرید کر تماشا دیکھتے تھے۔ جہاں ہنسنا چاہیے وہاں روتے تھے اور جہاں رونا چاہیے وہاں ہنستے تھے ——— یہ میں اب کہہ رہا ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ جو کچھ تھا احساس کی جبلّی سطح پر تھا۔ جو چیز مجھے کھینچ کر وہاں لے جاتی تھی، وہ اس احساس کی تلاش

تھی کہ آخر اسٹیج کا پردہ ہٹتے ہی سب کچھ بدل کیسے جاتا ہے ——— جو لوگ پاس بیٹھے ہیں، ٹوٹی ہوئی چرخ چوں کرتی ہوئی کرسیوں پر، ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اصل چیز وہ ہے جہاں روشنی ہے اور جہاں سُرخ ہرے کاسٹیوم میں چمکتے ہوئے تاج پہنے لوگ آتے ہیں اور دہاڑتے ہیں، تلواریں چمکاتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ——— کون لوگ ہیں یہ؟ کوئی بھی ہوں، ہیں بڑے زوردار ——— کہیں تو ہوتے ہوں گے ایسے نیک لوگ جو سچ اور انصاف کے لیے سر کٹا لیتے ہیں ——— اتنی سی بات تھی کہ تھوڑی دیر کو دنیا بدل جاتی تھی۔ اور میں اپنی دُنیا سے اس بدلی ہوئی دُنیا میں چلا جاتا تھا ——— یہی تبدیلی وہ جادو تھی جو کھینچ کر مجھے وہاں لے جاتی تھی۔ ان دنوں باہر سے تھیٹر کمپنیاں بھی آتی تھیں اور مقامی کلب بھی رات دن ایک کرکے ناٹک کرتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میرے ایک ماسٹر صاحب مجھے اسٹیج کے پیچھے لے گئے۔ انھوں نے مجھ سے دو تین جملے رٹوائے، کچھ "کٹ جاؤں گا، مر جاؤں گا" قسم کے جملے۔ اور جب میں نے جملے رٹ لیے تو انھوں نے کہا کہ اب ادھر سے آؤ اور اُدھر جاؤ۔ یوں نہیں، یوں چلو، مڑو تو یوں مُڑو کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تمھاری پیٹھ نہیں، تمھارا چہرہ نظر آئے۔ اور اب وہ جملے جو میں نے تمھیں سکھائے ہیں، بولو ——— اور جو میں نے منہ کھولا تو آواز نکلی ہی نہیں۔ کچھ چوں چوں کی آواز آئی اور بس۔ جیسے کوئی رس گلے گلے میں پھنس گئے ہوں ——— سو، ماسٹر صاحب کو آگیا تاؤ۔ وہ گرجے تو لگا پاس کے تمام درختوں سے کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُڑ گئے ہیں۔ میرا چہرہ تمتما اٹھا۔ کانوں سے آنچ نکلنے لگی ——— اور اب میرے منہ سے الفاظ یوں نکلے جیسے بندوق سے گولیاں نکلتی ہیں ——— ماسٹر صاحب نے مجھے گلے لگا لیا۔

رات کو دیر سے گھر پہنچا تو میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ ساری رات پپوٹوں میں آگ بھری رہی اور میرے سامنے رنگین لباسوں، لڑھکتی چٹانوں اور بدلتی ہوئی روشنیوں کے جلوس گزرتے رہے۔

آخر ڈرامہ ہوا ——— شہزادیوں اور شہزادوں کی تکرار میں ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے اسٹیج پر دھکیل دیا گیا۔ میرے کان جلنے لگے۔ میں نے کسی بڑے ایکٹر کا پان کھا لیا تھا۔ اس کی پیک گلے میں پھنس رہی تھی۔ بادشاہ نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا تھا۔ اس کی ناک پر ایک دھبہ تھا۔ مجھے لگا اس کی ناک پر ایک مکھی بیٹھی بھنبھنا رہی ہے۔ وہ بول بول کر جب چپ ہو گیا تو میں نے میان سے تلوار نکال لی، دو تین قدم بھی اسٹیج پر بڑھائے اور پھر جو اس کی طرف مُڑا تو بھونچکا رہ گیا۔ اس کی ناک پر سے مکھی اڑ چکی تھی۔ وہ منہ کھولے کھڑا تھا۔ یکایک اس نے تلوار کے دستے پر ہاتھ مارا اور مجھے سب یاد آ گیا۔ اور پھر میرے مُنہ سے وہ الفاظ گولیوں کی طرح نکلے جو ماسٹر صاحب نے مجھے رٹائے تھے ——— پردہ گرا تو میرے ہاتھ میں تلوار تالیوں کی طرح چمک رہی تھی۔

کھیل ختم ہونے اور پسینہ ختم ہونے کے بعد سب اسٹیج کے پیچھے جا کر کاسٹیوم اتارنے لگے اور میک اپ دھونے لگے۔ ——— لباس چھلکوں کی طرح گر رہے تھے اور اسٹیج کی دُنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی ——— مونچھوں، بالوں، تلواروں کے الگ ہوتے ہی اندر سے بالکل آدھے ادھورے، چھلے چھلائے، اکھڑے، مریل قسم کے لوگ نکل آئے۔ اور یہ سب مجھے بہت بُرا لگا۔

شہزادے کا لباس تو میں نے بھی اتار دیا لیکن میک اپ اتارے بنا، چپکے سے اکیلا اندھیرے میں نکل گیا جہاں سے راستہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ میرے محلے کی طرف جاتا تھا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں خوش ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ میں نے دروازے کے پاس والی دیوار گھوڑ سوار کی طرح پار کی اور اوپر چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے اپنی اماں کو جگایا۔ انھوں نے اتنی دیر

سے آنے پر پہلے ہی بھرکے ڈانٹ پلائی، پھر کھانا لے آئیں۔ وہ میرے کھلنڈرے پن اور لاابالی حرکتوں کی عادی ہو چکی تھیں، اور وقتاً فوقتاً ابا کے سامنے میری صفائی پیش کرتی رہتی تھیں۔ وہ سمجھیں کہ اور راتوں کی طرح اس رات بھی میں فلم کا آخری شو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اماں نے سوتے سوتے پوچھا، کھانا کیوں نہیں کھا رہا ہے پاجی؟ میں نے کہا اندھیرے میں کیسے کھاؤں؟ روز کیسے کھاتا ہے بدتمیز؟ پھر اٹھ کر انھوں نے روشنی جلا دی اور میری طرف دیکھے بنا سو گئیں۔ میں دل ہی دل میں بہت کڑھا۔ میں نے سوچا، یہ تو ساری محنت اکارت جا رہی ہے۔ میں نے کہا، دال میں نمک زہر ہے۔ اماں غصے میں میری طرف مڑیں اور میری صورت دیکھتے ہی اٹھ بیٹھیں۔ یہ کیا، تجھے شہزادہ کس نے بنایا؟ میں کیا کہتا: . . . تھیٹر نے! میری بہنوں کو جگا کر شہزادے کا چہرہ دکھایا گیا۔ ابا بھی آ گئے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بولے، یہ نالائق زندگی بھر ڈرامہ کرتا رہے گا ——

جب سب سو گئے تو میں نے میک اپ دھونے سے پہلے بڑے کمرے میں جا کر موم بتی جلائی اور آئینے میں اپنا چہرہ غور سے دیکھا جس کو سفیدی اور سرخی نے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا —— میں نے اسی وقت طے کیا، اب میں کبھی شہزادہ نہیں بنوں گا۔ اب میں کبھی اسٹیج پر نہیں جاؤں گا . . .

اور آج، جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، جب میں پچاس کی سرحد پار کر چکا ہوں، یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی قسم نہیں توڑی۔ میں کبھی اسٹیج پر نہیں گیا: "یہ نالائق زندگی بھر ڈرامہ کرتا رہے گا!" ابا کو پھر یہ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ —— لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے ڈرامہ نہیں کیا۔

ڈرامہ پہلے زندگی میں ہوتا ہے، پھر اسٹیج پر۔

ہاں تو بات شروع ہوئی تھی یہاں سے کہ بریخت کا نام پہلی بار میں نے کب سنا؟

ذکر تھا کلکتے کا جہاں نگر نگر کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے اور پورب دیس کے بھوکے قلی مال اتار اتار کر تھک جاتے تھے —— یہ وہ دور تھا جب آئے دن مظاہرے ہوتے تھے۔ روز پولیس سے ٹکر ہوتی تھی۔ روز لوگ پکڑے جاتے تھے اور ستائے جاتے تھے اور سلاخوں کے پیچھے بند کر دیے جاتے تھے —— کبھی کبھی بم بھی پھٹتے تھے، لاٹھیاں بھی برستی تھیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا جاتا تھا —— یہ وہی دور تھا جب کرشن چندر نے "برہم پترا" جیسا افسانہ لکھا تھا اور میں نے لکھا تھا "میں زندہ ہوں!" (یہ افسانہ میرے زیرِ طبع افسانوی انتخاب "اجنبی فاصلے" میں شامل ہے)۔

میں لکھتا تھا افسانے اور کرتا تھا اخبار "استقلال" کی ایڈیٹری اور کھنچتا تھا ان لوگوں کی طرف جو کلکتے میں نئے تھیٹر کی مہم چلا رہے تھے —— ان لوگوں میں جہاں شمبھو مترا اور اُتپل دت جیسے لوگ تھے، وہاں دوسری طرف ڈیوڈ کوہن، رنجن سین اور سلیل چودھری جیسے ابھرتے ہوئے فنکار بھی تھے۔ کچھ ادیب بھی تھے جیسے زہری کویراج اور سوشیل جانا۔ چھیالیس دھرم تلہ اسٹریٹ میں جہاں وشنو ڈے، ہیرن مکرجی، مانک بنرجی اور گوپال ہلدار، چن موہن سہانوبیس، سبھاش مکرجی جیسے سرکش دانشور جمع ہوتے تھے، میں تھیٹر کی دنیا کے قریب آیا۔ ڈیوڈ کوہن کی وجہ سے کئی ایسے لڑکے اور لڑکیاں، جن کی زبان انگریزی تھی نئے تھیٹر کی تحریک کے قریب آ گئے تھے۔

انڈین پیپلز تھیٹر کے پرچم تلے جو شیڈو پلے اور ڈرامے پیش کیے جا رہے تھے، ان میں صدیوں کے کچلے ہوئے ہندوستان کے نقوش ہی نہیں ابھرتے تھے بلکہ سماجی معنوں میں اجتماعی مستقبل کی تلاش کے راستے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس اسٹیج پر معنوی اجتہاد اور تکنیکی اختراع کے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے اور اس کا سب سے شاندار پہلو یہ تھا کہ نئی حسیت کے اظہار میں لوک گیت اور لوک ناچ کی روایات سے بے دھڑک فائدہ اٹھایا جا رہا تھا —— اننا بھاؤ ساٹھے، امر شیخ اور گوانکر کی ——

stage presence اپنی dynamism کی وجہ سے آج بھی میرے ڈرامائی شعور کا مسحور کن حصہ ہے ——— جو لوگ پرانے تھیٹر کو بدل رہے تھے، وہی نئے تھیٹر کو جنم دے رہے تھے - یہ بڑا جری قدم تھا جس نے پارسی تھیٹر اور نوٹنکی کی روایات کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی بریخت کی۔ کسی بھی غیر ملکی فنکار کا ذکر کسی دوسرے ملک کی تہذیبی اور سماجی زندگی کے context میں ہوتا ہے تو اس کے فن کی معنویت اور اہمیت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کی relevance کیا ہے - ایک خاص سماجی صورتحال میں، جو اس وقت پورب دیس کے دھڑکتے ہوئے شہر کلکتہ کی تھی، بریخت کے ذکر کے معنی کیا ہوتے ہیں - اس کو سمجھنے کے لیے ہی میں نے ان جزئیات کا ذکر کیا ہے جو ایک طرح سے گریز معلوم ہوتی ہیں۔

ہوا یوں کہ کلکتے کے مضافات میں اپٹا کو اپنا شو پیش کرنے کی دعوت دی گئی ——— ڈیوڈ کوہن نے کہا، تم بھی چلو۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ہم ٹرین سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد شہر کی چمنیاں دور رہ گئیں اور آنکھوں کے سامنے ہریالی ہی ہریالی پھیل گئی - دھان کے کھیت لہرا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کے آگے چھوٹے چھوٹے تالاب چمک رہے تھے جن میں پانی اور دھوپ کی فراوانی تھی - تالابوں میں عورتیں نہا بھی رہی تھیں اور کیلے کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر برتن بھی مانجھ رہی تھیں۔ ان کے نیم عریاں جسم آہنگ سے لرز رہے تھے۔ گاڑی آگے اڑی جا رہی تھی اور یہ مناظر پیچھے ——— راستے میں ڈیوڈ کوہن نے پبلو نرودا کی نظم Let the rail-splitter awake سنائی۔ پھر لوئی آراگاں کی دو تین نظمیں۔ راستہ گاتے بجاتے کٹ گیا ——— شام کو کھلے میدان میں ڈرامہ ہوا۔ بڑی بھیڑ تھی۔ جو کچھ ٹوٹے پھوٹے اسٹیج پر پیش کیا گیا اسے structurally ملا جلا پروگرام کہنا چاہیے، ڈرامہ نہیں۔ لیکن اس پروگرام میں ڈرامے کا ایک عنصر ضرور تھا اور وہ عنصر تھا، زبان اور حرکت و سکنات سے زمان و مکان کے فوری context میں تغیر۔ یہ فن کا حیرت انگیز تجربہ تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں کلاسیکی تھیٹر کے در و دیوار نہیں تھے، جہاں ونگ اور لائٹ کا کوئی انتظام نہیں تھا، محض پٹرومکس کی روشنی میں ڈرامائی پیش کش تھوڑے سے میک اپ اور لباس کی تبدیلی اور الفاظ کی معنویت کی بدولت، دلوں کو دھڑکانے اور ایک نیا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب تھی - یہ ایک طرح سے خود رو قسم کا ماحولی تھیٹر تھا جس میں ہدایت اور اداکاری کے بندھے ٹکے کتابی اصول کند چھری کا کام کرتے تھے ——— جب اداکار گا گا کر اور ناچ ناچ کر تھک گئے، جب تماشائیوں کے چہرے تمتما اٹھے اور ہوا سانس کی طرح گرم ہو گئی تو کھیل ختم ہوا۔ تماشائی کھیتوں اور پگڈنڈیوں کے درمیان کہیں کھو گئے اور ہم سب آدھی رات کے بعد پھونس کے چھپر تلے ڈھیر ہو گئے، لیکن کسی کو نیند نہیں آئی ——— جب نیند نہیں آتی تو باتیں شروع ہو جاتی ہیں ——— پھونس کے چھپر تلے تھیٹر کے فنکار اور مچھر بھرے ہوئے تھے اور بڑی ڈھٹائی سے فنکاروں کو کاٹ رہے تھے اور فنکار ننگے ہاتھ پاؤں پر ہاتھ مار رہے تھے اور ہنستے ہنستے باتیں کر رہے تھے۔ باہر چاندنی میں نہلائے کھیت سرسرا رہے تھے۔ جھینگروں نے آسمان کو، چاند سمیت، سر پر اٹھا لیا تھا ——— اسٹیج پر خنک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں شیکسپیرین تھیٹر کے کرداروں پر گفتگو چھڑ گئی۔ ہیملٹ، اوتھیلو، کنگ لیئر، جولیئس سیزر ——— ان سب کی المناکیوں کا تلاطم، انسانی قسمت کی نیرنگیاں، خیر و شر کا تصادم۔ تخت و تاج۔ بے وفائیاں اور غداریاں۔ حق اور انصاف کی لڑائیاں۔ رشک اور اقتدار پرستی۔ عشق اور حسن کاری، دوستیاں اور وفاداریاں۔ کردار اور الفاظ۔ چڑھتے دریا کی طرح موجزن اور ان کی فلسفیانہ تہ داریوں میں زندگی کے راز کھلتے ہوئے۔ گتھیاں پڑتی ہوئی۔ تاریخی مد و جزر میں انسان تنکوں کی طرح بہتے ہوئے اور تصادموں کے پیچھے وقت کی سماجی محرکات کا ناقابلِ شکست ہاتھ۔ جو کبھی دکھائی دے اور کبھی دکھائی نہ دے!

پھر ابسن اور چیخوف کے ڈرامے کا نیا موڑ ——— ایک طرف ابسن کے ڈرامے "گڑیا گھر"، "بھوت" اور "سماج کے ستون" اور دوسری طرف چیخوف کے ڈرامے "تین بہنیں"، "ماموں وانیا"، "چیری کے باغ" اور "سمندری بگلا"[1]۔ پھیلی مہندی کی ٹھہری ہوئی، تھکی ہوئی زندگی کی ڈرامائیت کے نقیب ہیں جو بوسیدہ اخلاقی قدروں اور جابر سماجی ضابطوں کے اندرونی تصادم اور تضادات سے جلا پاتے ہیں۔ بظاہر سیدھی سادی حقیقت پسندی، لیکن انسان کی خودشکستگی کی المناک بےبسی کا بھرپور اظہار جس میں خود اپنی آگ میں جل کر بجھ جانے والی چنگاریاں چمکتی ہیں اور احساس و شعور میں جذب ہو جاتی ہیں ——— لیکن تھیٹر کو صاف ستھرے طبقوں کے اس حصار سے نکلنا ہے جنھوں نے جمالیاتی حظ کو بھی، تمام تہذیبی قدروں اور ثروتوں کو بھی اپنا اجارہ بنا لیا ہے۔ سیدھی منطق ہے جس کے پاس قوتِ خرید ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ جس کی جیب خالی ہے، اس کا دل و دماغ بھی خالی ہے۔ لیکن کیا ایسا ہی ہے؟ دو اور دو چار؟ سفیدی کہاں ختم ہوتی ہے اور سیاہی کہاں شروع ہوتی ہے ——— کیا لکیر کھینچ کر یہ دکھایا جا سکتا ہے؟

اور باتوں باتوں میں یکایک کسی نے ایک نام لیا۔ شروع میں میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کوئی نام ہے یا دُور جنگلوں سے آتی ہوئی ڈھول کی گمک۔

برتولت برخیت! کیا؟ برتولت برخیت! یہ ایک جرمن شاعر کا نام ہے جس کے زیادہ تر شاندار ڈرامے جلاوطنی میں لکھے گئے۔ لیکن جلاوطنی کیوں؟ جب فاشزم کی سیاہ آگ جرمنی کے طول و عرض میں پھیلی تو برخیت کے پاؤں تلے وہ زمین جلنے لگی جس کے دریاؤں اور کھیتوں کی ہواؤں میں، سڑکوں اور ریستورانوں کی گہما گہمی میں اس نے گوئٹے اور ہیگل کے فلسفیانہ تجزیے کیے تھے اور جدلیات کے سماجی معنی تلاش کیے تھے۔ اسی تلاش نے اسے مارکسزم تک پہنچایا تھا۔

بات چیت میں بار بار ایک ہی ڈرامے کا نام گونج رہا تھا: MOTHER COURAGE ——— صبح ہوئی تو درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور دھوپ دھان کے کھیتوں پر پُرشکھا رہی تھی۔

واپسی پر گاڑی میں کسی نے پوچھا: "برخیت کو پندرہ سولہ سال جلاوطنی میں کیوں گزارنا پڑے؟"

"MOTHER COURAGE پڑھو، معلوم ہو جائے گا؟"[2]

بہت تلاش کے بعد، ایک مدت بعد، مجھے یہ ڈرامہ پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ذہنی شش جہات سے گزرنے کا یادگار تجربہ ثابت ہوا ——— پھر میں نے وہ جرمن فلم دیکھی جو اس ڈرامے کے تھیٹر ورژن کو جوں کا توں پیش کرتی ہے۔ اس کا گہرا اور تیز visual impact دراصل کرداروں اور واقعات کے اتصال باہم سے نکھرتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ جاڑے کی رات میں سورج کی طرح طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ یہ تاریکی اور روشنی کا ہیجان پرور تجربہ ہے جس میں دل بھی سورج کی طرح طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی انسانی مقدر کی تاریخ جمالیاتی خودآگہی کا افق بن جاتی ہے۔ جبر و تشدد کی وہ تمام قوتیں، جو انسانی اخلاقیات کی پُرفریب قدروں کا سانچہ تیار کرتی ہیں، بھیڑیوں کی طرح بےبس اور کمزور انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہیں۔

---

[1]: افسوس یہ ہے کہ اردو میں چیخوف کے جو ڈرامے منتقل ہوئے ہیں، ان میں اکثر اس لافانی فنکار کی لسانی معجزہ کاری مجروح ہوئی ہے۔ چیخوف کی زبان، جو اپنی ساخت میں زندگی کی طرح زنگار رنگ اور مزاج میں بےساختہ ہے، اپنی تخلیقی سحرکاری سے محروم کر دی گئی ہے۔ چیخوف کی ڈرامائی نثر سادہ ہے لیکن اس کی نثری غنائیت، ڈرامائی اظہار و تصادم میں بنیادی حصہ ادا کرتی ہے۔ جگہ جگہ مرصّع اور مسجّع کتابی زبان نے چیخوف کی لسانی ڈرامائیت کو بےبصیرت ترجمے کے بھاری پتھر کے نیچے دبا دیا ہے۔

THE CAUCASIAN یا THE GOOD WOMAN OF SETZUAN ہو یا MOTHER COURAGE
CHALK CIRCLE یا THREE PENNY OPERA یا "آرتورو اوئی" یا "گلیلیو" ——— برخیت کی رزمیہ بصیرت انسان کے مقدر اور مستقبل کو، ماضی کے آئینہ خانے میں رکھ کر، اپنے زمانے کی تاریخی اور سماجی معنویت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اس کی شہادت اس کی زندگی کے سفر سے بھی ملتی ہے اور اس کے ثانی سفر سے بھی۔ یہی معنویت اسے ہمارے لیے اتنا relevant بناتی ہے اور اتنا پُر کار بھی۔

ت : آخر ۱۹۷۴ء میں میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ میں MOTHER COURAGE کا اُردو ترجمہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ دلی کے ایک تھیٹر گروپ نے ریہرسل کی مہم شروع کی۔ اُردو میں ڈرامے کا نام تھا "جیالی ماں"۔ نادرہ ظہیر نے جیالی ماں کا رول سنبھالا اور منوہر سنگھ نے باورچی کا۔ (یہی جوڑا THREE PENNY OPERA میں برختین تھیٹر کے نہ جانے کتنے پیچیدہ پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا)۔ ریہرسل میں ہی ڈرامے کے گہرے نقوش اُبھرنے لگے ——— منوہر سنگھ کی اداکاری کا جوہر القاضی کے پروڈکشن "تغلق" یا "آدھے ادھورے" اور LOOK BACK IN ANGER میں جن بلندیوں کو چھو چکا تھا، اس کے پیشِ نظر دلی تھیٹر کی دنیا دم سادھے اس نئی پروڈکشن کی منتظر تھی۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے ڈائریکٹر ابراہیم القاضی ریہرسل میں آنے لگے ——— اس کے گیت نیاز حیدر نے لکھے تھے۔ لیکن آخری لمحے میں مجھے ڈرامے کا اسکرپٹ پروڈکشن فلور سے واپس لینا پڑا۔ ڈائریکٹر سے میرا اختلاف اصولی تھا ——— تب سے یہ اسکرپٹ نیشنل اسکول آف ڈرامہ کی تحویل میں ہے۔ اس عرصہ میں ہندوستان کو جدید تھیٹر کا افق دینے والا ڈائریکٹر ابراہیم القاضی حکام کی مصلحت پسندیوں سے زچ ہو کر نیشنل اسکول آف ڈرامہ کو چھوڑ چکا ہے ——— "جیالی ماں" کو اپنے ہی جیسے جیالے ہدایت کار کا انتظار ہے ——— سب جانتے ہیں، کام کس جوکھم کا ہے۔

ت : میں نے اس ڈرامے کو ہندوستانی سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کا نام ہے: "بھلی عورت بنارس کی"

بریخت: ..... آجکل ڈرامے کے بعض دھند میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اداکار تماشائیوں کے سیل میں بہا چلا جاتا ہے۔ جن کرداروں کو وہ پیش کرتا ہے، وہ دیکھنے والوں پر مسلّط کر دیے جاتے ہیں۔ اس چکر میں کردار بھی مسخ ہو جاتے ہیں۔ موجودہ چلن کے برعکس ضرورت اس کی ہے کہ کرداروں کو بڑے دھیرج سے، کلاسیکی ضبط سے اور خارجیت کے ساتھ پیش کیا جائے کیونکہ یہ دوسروں کے اندر گھس کر ان کے تجربوں کو اپنا لینے کا امتحان نہیں ہے۔ وہ اسٹیج پر اس لیے ہیں کہ ان کو سمجھا جائے۔ احساسات ذاتی تجربہ ہیں اور محدود۔ اس کے برخلاف عقل و منطق کہیں زیادہ جامع اور بھرپور ہے اور معتبر۔

ہم عصر: یہ تو خالص دانش پرستی ہے۔ میرے خیال میں یہ بڑی بات ہے کہ پچھلے چند برس میں ردّ دانش کی جو رو چلی ہے، اس کے آگے ہتھیار نہ ڈالے جائیں۔

بریخت: ہو سکتا ہے۔ بہر حال، میں اتنے گئے گزرے معنوں میں بکھرا ہوا انسان نہیں ہوں، جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنے ڈراموں کو کچھ مسالے (بنیادی مواد) تک محدود رکھتا ہوں لیکن میں دکھاتا وہی ہوں جو ٹپیکل ہے۔ میں انتخاب کرتا ہوں۔ یہیں سے ڈسپلن کا دخل شروع ہوتا ہے۔ اس وقت بھی جب کوئی کردار اپنے متضاد حرکت و عمل کے ذریعے آشکار ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی بھی دو یکساں لمحوں میں بالکل یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے ظاہر میں تبدیلیاں اس کے باطن میں نیرنگیاں پیدا کرتی ہیں۔ ایگو کا اٹوٹ تسلسل محض متھ ہے۔ انسان ایک آٹم ہے جو مستقل ٹوٹتا رہتا ہے، بکھرتا رہتا ہے اور نئے روپ میں اجاگر ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں چیزوں کو اسی طرح پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہیں۔

بریخت
کا
تھیٹر

زندگی کا رزمیہ
اور
الیوژن کی شکست

بریخت ہماری صدی کا وہ ڈرامہ نگار ہے جس نے اپنی تخلیقی کاوشوں کا ایک پورا نظریاتی نظام مرتب کیا ہے۔ یہ ڈرامے کا جمالیاتی نظام ہے جس کی dynamics کو سمجھنے کے لیے اس کے ذہن کے فکری اور تاریخی سوتوں کی تلاش ضروری ہے۔ یہ سوتے محض اس کی ڈرامہ نگاری کے عبارتی اظہار سے نہیں پھوٹتے بلکہ اس اظہار کا عملی تجربہ، جس میں رزمیہ یلغار و فتح کی کیفیت ہے، کئی دہائیوں پر پھیلی ہوئی تھیٹریکل جدوجہد کا تجربہ ہے۔ کیا یہ تجربہ محض اس تھیٹر کے مطالعے اور جائزے تک محدود ہے جس کا سماجی عمل، اخلاقی اور روحانی دائروں میں پھیل رہا ہے یا سکڑتا جا رہا ہے؟ کیا یہ عمل صرف اپنے وقت کے روایتی اور رسمی تقاضوں کی تسکین کرتا ہے؟ بریخت کا تھیٹر، جو سماجی وابستگی اور معاشرتی تبدیلی کی شناخت کے لیے ہمہ گیر اور آفاقی ردّ و قبول کا مرحلہ طے کر چکنے والے فن پاروں سے اپنے جواز کی منطق حاصل کرتا ہے، بہت سے نئے زاویوں اور پہلوؤں کا انکشاف کرتا ہے —— یہ زاویے اور پہلو ایک تاریخی دور کی دین بھی ہیں اور اس خاص عہد کی پہچان بھی۔

بریخت کی ڈرامائی نظر اپنے وقت کی ان ڈرامائی کاوشوں کو، جو محض ہیئتی تجربوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا پھر پرانی لکیروں کو پیٹنے والی مہم بن جاتی ہیں، مسترد کرتی ہے۔ اس قسم کی "فنی" مہم بازیاں، جو ڈرامہ ہال "entertainment emporia" کا درجہ رکھتی ہیں، اپنے ابتذال کی آخری منزل میں پہنچ کر تفریح اور تہذیبی ثروت اندوزی کے نام پر بورژوا افیون خوری کا دلفریب ritual بن جاتی ہیں۔

اسٹیج پر سماجی زندگی کی غیر مستند ترجمانی نے ایک ردِّ عمل پیدا کیا۔ بد ذوقی سے پُر کھوکھلے نظاروں کی مدد سے "روحانی رزق" فراہم کرنے کی کوشش کا ردِّ عمل وہی ہوا جو ہونا تھا۔ زندگی کے حالات و واقعات کو بے کم و کاست پیش کرنے کا مطالبہ بڑھا جس کا مبتذل انجام نیچرل ازم کی شکل میں ہوا۔ حسن پرستی کی تحریک کے بطن سے علم و آگہی اور افادیت کی طرف حقارت کا رویہ پیدا ہوا۔ اس کا ایک اور ردِّ عمل ہوا۔ خود جمالیاتی حس اس کی زد پر آگئی۔ اس کی بنیادی منطق یہ تھی کہ اگر حسن پرستی سے زندگی میں حسن پیدا نہیں ہوتا تو پھر ایسی حسن پرستی کس کام کی۔

اصل میں صنعتی دور کے لیے، جس پر سائنسی دریافت و انکشاف کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا، ایک سائنسی تھیٹر کی تلاش تھی۔ ظاہر ہے، سائنسی عہد کے اپنے جمالیاتی تصورات پیدا ہو رہے تھے۔ ان تصورات کو ایک طاقتور پس پھیلا رہا تھا جس کی اپنی جمالیات تھی۔ خطرہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ تفریح و لطف اندوزی کا سامان کہیں "ذریعۂ تعلیم" میں نہ بدل جائے۔ گویا تھیٹر نہ ہوا، "رسل و رسائل" کا ذریعہ ہو گیا —— اسی طرح ادب کو بھی پند و نصائح کا صحیفہ بنانے کی کوشش کی جا چکی تھی —— لیکن دراصل تھیٹر کو ارتقائی مرحلوں سے گزر کر، تفریح محض کے زنداں سے نکل کر، زندگی کا گہرا رازداں بننا تھا۔ یہ ایک طرح کے ذہنی اور جمالیاتی سفر کا اہم موڑ تھا۔ یہ سفر اپنے وقت کی تاریخی حدوں کے اندر اندر طے ہونا تھا۔ جمالیات، جو اب تک ایک انحطاط زدہ اور دوسروں کا خون پی کر جینے والے طبقے کی رکھیل تھی، تھیٹر کی سطح پر ایک نیا رُخ اختیار کر رہی تھی۔ سائنسی دور کا تھیٹر بہر حال تھیٹر رہا —— تھیٹر سائنس کی جگہ لے بھی نہیں سکتا تھا —— نازی غلبے کے دور میں، اور جنگ کے دوران بھی، جب زندگی کا مظاہرہ اسٹیج پر ناممکن ہو گیا تھا، اس تھیٹر کو جمالیاتی پس منظر میں پناہ لینی پڑی۔ بریخت نے اس عمل کو Theatrical alienation کا نام دیا ہے۔ اس صورت حال اور پس منظر کی وضاحت خود بریخت کے الفاظ میں یوں ہوتی ہے:

آج متعین سائنسوں (علوم) کی جمالیات مرتب کی جا سکتی ہے۔ گیلیو نے بعض کلیات

کہ بانکپن اور ایک تجربے کے مکھنے کی بات کی ہے۔ آئنسٹائن نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سائنسی دریافتوں میں حسن اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ایسی ما بعد طبیعیات اوپن ہائمر اس سائنسی رویے کی تحسین کرتا ہے جس میں اپنا حسن ہے اور اس دھرتی پر بسنی نوعِ انسان کی پوزیشن سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے لطف و تفریحِ محض کے دیار سے کوچ کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے، آئیے، اس کو ترک کر کے ایک عام مایوسی پیدا کریں اور اس بات کا اعلان کر کے ان کو اور بھی زیادہ بددل گرفتہ کریں کہ ہم نے دوبارہ اسی دیار میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آئیے، ہم تھیٹر کو ایک تفریح گاہ کی طرح دیکھیں —— ایک جمالیاتی بحث میں یہی رویہ مناسب ہے —— اور پھر دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ کون سی تفریح ہمارے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

تھیٹر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں —— بحث اس پر نہیں ہو رہی ہے۔ بات اس پر ہو رہی ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو تھیٹر کو تھیٹر بناتی ہیں۔ مطلب یہ کہ تھیٹر کیا پیش کرتا ہے اور ہم تھیٹر میں کیا دیکھتے ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ کس چیز سے متعین ہوتا ہے —— انسان اور انسان کے درمیان رشتہ باہمی ردِ عمل کا ہے۔ یہی ردِ عمل اپنے سماجی context میں ایک صورتِ حال پیدا کرتا ہے۔ ہر عمل اور ردِ عمل سے صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، جو دراصل خارجی اور داخلی ردِ عمل سے رونما ہونے والی اندرونی تبدیلی کا خارجی اظہار ہے۔ برخیت نے صاف صاف کہا ہے، انسان ایٹمی ذرّہ ہے جس کا انتشارِ پیہم اور انکشافِ نو ہی اس منظر کے اسرار و رموز کے تانے بانے بنتا ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں —— انسانی زندگی! کیا ہم وہی دیکھتے ہیں جو تھیٹر پیش کرتا ہے یا ہم کچھ اور بھی دیکھتے ہیں؟ کیا تھیٹر وہی پیش کرتا ہے جو ہم دیکھتے ہیں یا تھیٹر کچھ اور بھی پیش کرتا ہے؟ —— میرے خیال میں برخیت کا تھیٹر انہی بنیادی سوالات کا جواب ہے۔

جو کچھ "ہوتا ہے" (واقعہ)، وہی اصل رشتہ ہے، انسانوں کے درمیان اور خدا اور انسان کے درمیان (خدا ایک عقیدہ ہے یا خود زندگی، یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ بحث کی یہ توسیع الجھنیں پیدا کرے گی)۔

تھیٹر کا کام، بقول برخیت، سب سے پہلا کام لوگوں کے لیے لطف و تفریح کا سامان مہیا کرنا ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہی کام تمام فنونِ لطیفہ کا رہا ہے۔ اس بنیادی خصوصیت کو از کار رفتہ کہہ کر حقارت سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی فنی ذریعۂ اظہار کی آفاقیت پر زور دینے سے اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اسی سے فن کا بنیادی وقار جاگتا ہے اور اس کے تخلیقی سوتوں میں ابال آتا ہے۔ کچھ لوگ اسے اخلاقیات کا نقیب بنا کر پیش کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے تھیٹر کا فنی قد اونچا ہوتا ہے۔ بڑا مغالطہ ہے یہ۔ یہ تصور دراصل فن کے ابتذال کا تصور ہے جہاں تک زندگی کی اعلیٰ تر قدروں کا تعلق ہے، خود اخلاقیات کو لطف و انبساط سے محروم کرنا زندگی کی بے حرمتی ہے۔ حواسِ خمسہ کو ان کا رزق ملنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس سے اخلاقیات پر جلا ہوتی ہے۔ حیات، لطف و انبساط سے، جسمانی اور روحانی دونوں معنوں میں، طہارت اور بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ ارسطو کے بعد زمانۂ قدیم کے مفکر المیے سے یہی مطالبہ کرتے رہے کہ اس میں لوگوں کو لطف و انبساط سے آشنا اور ہمکنار کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے —— اگرچہ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ قدیم میں تھیٹر ritual کا ہی حصہ تھا، لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ تھیٹر اسی وقت تھیٹر بنا جب وہ ritual سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ اور اگر تھیٹر کی فضا میں ritual کے اسرار

سمٹ کر آگئے تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس وقت بیاسار لطف و انبساط کا سرچشمہ تھے لطف و انبساط کیسے یا تزکیۂ نفس ——— ارسطو نے اسے کتھارسس کا نام دیا ہے۔ ——— وہ طہارت جس کے سوتے خوف اور ترحم سے پھوٹتے ہیں ——— اس کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے، یعنی ترحم اور خوف سے۔ بریخت نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے کہی ہے: "تطہیر کا یہ کام صرف یہی نہیں کہ لطف اندوزی کے ذریعے پورا ہوتا ہے بلکہ لطف و انبساط کے لیے بھی پورا ہوتا ہے۔"

اسی خیال کی مزید وضاحت بریخت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: "اس وقت بھی جب لوگ اعلیٰ تر اور پست تر لطف کی بات کرتے ہیں تو فن سکتے کے عالم میں ان کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے کیونکہ فن بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتا ہے اور پستیوں میں اترنا چاہتا ہے، بے روک ٹوک! جب تک فن لوگوں کو لطف و انبساط دے سکے، سب ٹھیک ہے۔ لیکن تھیٹر سیدھے سادے اکہرے نشاط کی بھی تخلیق کر سکتا ہے اور پیچیدہ اور تہہ دار انبساط کی بھی۔ اور یہی پیچیدہ اور تہہ دار انبساط بڑے ڈرامے کی جان ہوتا ہے۔ اس کے "نقطۂ عروج" میں وہی بات ہوتی ہے جو اس وصل میں ہوتی ہے جس کا وسیلہ عشق ہوتا ہے۔

ہر عہد کے لطف و انبساط کے پیمانے اپنے ہوتے ہیں اور اپنے تقاضوں، قدروں اور قوانین کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ بریخت نے اس کی وضاحت ایک تاریخی موازنے کی مدد سے کی ہے۔ یونانی سرکس کے "ڈیموس" کی تفریح کا طریقہ وہی نہیں تھا جو لوئی چہارم کے سامنتی دربار کا تھا۔ تھیٹر کا کام یہ تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح زندگی گزارتے ہیں، اس کی تمثیل پیش کرے: "ایک مختلف زندگی کی محض تمثیل نہیں بلکہ ایک مختلف قسم کی تمثیل بھی۔"

زندگی جیسی ہوتی تھی اسی کے مطابق کرداروں کے طرق و توازن میں بھی فرق ہوتا تھا اور ظاہر ہے، مختلف نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے مختلف situations پیش کی جاتی تھیں۔ ساری کہانیاں ایک ہی طرح تو کہی نہیں جاتیں۔ یونانی ڈرامے کے ارتقا میں اسی سلسلۂ عمل کا ہاتھ تھا۔ یونان کے شہری ناگزیر غلائی قوانین کے شکنجے میں بشر کی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے، جرم و سزا کی داستانیں یونانیوں کے دل بھی دہلاتی رہیں اور ان کے دلوں میں لطف و انبساط کی کلیاں بھی چٹکاتی رہیں ——— پھر فرانسیسی اور انگریزی ڈرامے کے ارتقا کا پورا سلسلہ ہے ——— مختلف ممالک، مختلف قومیں، مختلف تاریخی حالات، مختلف رسم و رواج، مختلف عقاید، عروج و زوال کی مختلف سطحیں، سب ڈراموں میں الگ الگ رنگ بھرتے رہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ تجربات کی اس رنگارنگی کے باوجود، غرض صرف اس بات سے تھی کہ جو داستان اسٹیج پر پیش کی جا رہی ہے، اس میں تماشائیوں کو مسحور کر لینے کی قوت ہو۔ اس کے لیے بہت سے شاعرانہ ڈھب اور تھیٹریکل "ہتھکنڈے" فراخدلی سے کام میں لائے جاتے تھے۔ ایسے میں بھلا زندگی بے کم و کاست اسٹیج پر کیسے پیش کی جا سکتی تھی۔ گریز و انحراف کے سلسلے یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ کبھی پیشکش کی شکلیں مسخ ہو جاتی تھیں، کبھی بے شناخت۔ "آج بھی ہم خوش خوش ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ہاں اگر سوفوکلیس کی روحانی تطہیر سے یا راسین کی قربانی کی تقریب سے یا شیکسپیئر کی بے مہار جنوں اندیشیوں سے کچھ ہاتھ آئے تو ——— رویہ ہوتا ہے کہ ان داستانوں کے خاص کرداروں کے شدید یا شاندار احساسات کے گھروندوں میں پناہ لے لی جاتی ہے۔" لیکن اس سے قطع نظر آج بھی یہ کاوشیں اپنے انحراف و گریز یا تسیخ و فروگذاشت کے باوجود کشش اور لطف کا مخزن ہیں۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماضی کے ان تفریحی وسائل نے اس عہد کے تھیٹر کو اپنے دور کی حیثیت سے پیدا ہونے والے تفریحی وسائل سے محروم کر دیا ہو؟ کیا حسنِ بیان خوبی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ یہ تو ماضی کے کارناموں کی فنی خوبیاں ہیں۔ اصل بات تو وہ ہے جو الفاظ اور اندازِ بیان میں چھپی ہوئی ہے۔ اس بات کا آج کے تجربات اور ردِ عمل سے کتنا واسطہ ہے؟ اور اگر یہ بات آج کے زمانے کے دل کی دھڑکن نہیں بن سکتی تو پھر ڈرامے میں بات آگے کیسے بڑھے گی جس کے تماشائی آج کی دنیا میں جیتے ہیں۔ پھر ارسطو کے اس خیال کا کیا ہوگا

کہ یہی بات ڈرامے کی روح ہے۔ آج کے انسان کی اجتماعی زندگی اسٹیج پر کتنی مسخ ہوگئی ہے اور اس کی وجہ بریخت کی نظر میں یہی ہے کہ آج کی زندگی کی ڈرامائی تشکیل پرانے نسخوں کے مطابق کی جاتی ہے۔

زندگی کا ایک وہ تصور تھا جس پر مقدرات کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ سب پہلے سے طے ہے۔ خدا کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اس تصور کے سائے میں جو تھیٹر پنپے گا، اس میں جرم و سزا کا وہی کھیل کھیلا جائے گا جو صدیوں کھیلا گیا، جس نے ہماری پوری نفسیات کو متعینہ اخلاقیات کے ایک خاص ڈھانچے میں مقید رکھا ——— لیکن صنعتی دور کی دہائیوں میں جب محنت کی واضح تقسیم ہوئی اور جس نے انسان کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی اور اخلاقی تصورات کے پرخچے اڑانا شروع کیے تو ہجوم میں فرد کی تنہائی اور نفسیاتی کنارہ کشی کے نئے زاویے پیدا ہوئے۔ تبدیلی کے اس سلسلے پر بریخت نے اپنے خیالات یوں قلمبند کیے ہیں:

> ایسا لگا جیسے بنی نوع انسان نے اب پہلی بار اس کرۂ ارض کو ایک ایسا گھر بنانے کے لیے، جو قابلِ رہائش ہو، ایک شعوری اور مربوط کوشش و کاوش شروع کی ——— اس زمین کی بہت سی مشتملات (اجزائے ترکیبی)، مثلاً کوئلہ، پانی، تیل، ذخیرے بن گئے۔ بھاپ سے گاڑی چلانے کا کام لیا جانے لگا۔ چند چنگاریوں اور مینڈک کی ٹانگوں کی حرکتوں نے ایک قدرتی قوت کو آشکار کیا جس نے روشنی پیدا کی اور آوازوں کو ایک برِّاعظم سے دوسرے برِّاعظم تک پہنچایا، وغیرہ وغیرہ۔ انسان نے ہر سمت میں ایک نئی بصیرت کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اس بصیرت کے پیچھے یہ خیال تھا کہ ان تمام مانوس مظاہر یا چیزوں کو جن کو اب تک کام میں نہیں لایا گیا تھا، کس طرح انسان کی سہولت اور خدمت کا تابع بنایا جائے ——— انسان کا ماحول بدلا، ایک دہائی سے دوسری دہائی تک، سال بہ سال، اور پھر یہی رفتار بڑھتے بڑھتے روز بروز پر آگئی ——— میں جو یہ سب لکھ رہا ہوں، ایک مشین (ٹائپ رائٹر) سے لکھ رہا ہوں جو میری پیدائش کے وقت ایک انجانی چیز تھی۔ میں گاڑیوں پر جس تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوں، میرے دادا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ——— میں نے اپنے والد سے دو برِّاعظموں کے درمیان بات کی لیکن جس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے پہلی بار ہیروشیما کے دھماکے کی متحرک تصویریں دیکھیں، وہ تھا میرا بیٹا . . .

اس پیچیدہ سلسلے نے جو پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا، انسانوں کے باہمی رشتوں کو، داخلی بکھراؤ کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا کہ ان کا ٹوٹنا پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا۔ صنعتی دور میں محنت اور پیداوار کے عظیم الشان اشتراک نے لوگوں کو موٹے طور پر دو گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ زندگی کے دو دھارے سے بن گئے۔ ایک طرف پیداوار بڑھتی گئی اور دوسری طرف افلاس و بدحالی۔ یہی صورتِ حال آج بھی ہے۔ ایک طرف تسخیرِ قدرت سے ایک چھوٹی سی اقلیت کو فائدہ پہنچتا ہے اور وہ اپنے اس مشن میں اس لیے کامیاب ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو لوٹنے میں، یا دوسرے ہم نفسوں کو اپنی لوٹ کا وسیلہ بنانے میں کامیاب ہے۔ پیداواری دائرے میں مزدور اور کسان کی محنت کا یہ وسیلہ ہے اور سیاسی دائرے میں پولیس، فوج اور عدل و انصاف کے ادارے۔

اب ایسے میں تھیٹر کس قسم کی زندگی کی تمثیل پیش کرے؟

یوں دیکھا جائے: ــــــ جب تسخیرِ قدرت کی مہم میں انسان کے راستے میں دریا آجاتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے؟ بند بنائے جاتے ہیں، پل بنائے جاتے ہیں، رکاوٹ پر عبور حاصل کیا جاتا ہے۔ درخت میں کیڑے لگتے ہیں تو اس پر کیڑے مارنے والی دواؤں کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ اگر دوڑ وقت کے ساتھ ہو اور فاصلہ طویل ہو تو تیز سے تیز گاڑیاں بنائی جاتی ہیں، فولاد کے طیور ہوا میں اُچھال دیے جاتے ہیں۔ خشک سالی ہو تو کنویں کھود دیے جاتے ہیں اور ندی نالوں کے رُخ موڑ دیے جاتے ہیں۔ پہاڑ راستہ روک کر کھڑا ہو جائے تو فلیتہ لگا کر اس میں سے سُرنگیں نکالی جاتی ہیں ــــــ یہ تو جب ہوتا ہے، جب سامنا قدرتی رکاوٹوں سے ہو لیکن جب پورا سماج راستہ روک کر کھڑا ہو جائے تو کیا ہو؟ تاریخ کیا بتاتی ہے؟ جب کبھی معاشرہ بڑھتی ہوئی زندگی کے راستے میں آتا ہے تو زندگی اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیتی ہے۔ جو لوگ زندگی کو شطرنج کی بساط بنا کر اس پر مہروں کی طرح چلتے ہیں، ان کی بساط وقت اُلٹ دیتا ہے۔ اسی لیے ہم انسان کی سماجی زندگی کی تمثیل پیش کرتے ہیں تو اس میں وہ بھی ہوتے ہیں جو دریاؤں پر بند ڈالتے ہیں، جو پھلوں کے درخت اُگاتے ہیں، گاڑیاں بناتے ہیں اور وقت آتا ہے تو سماج کی بساط اُلٹ کر رکھ دیتے ہیں ــــــ بریخت ان ہی کو تھیٹر کے اندر بلاتا ہے اور ان کو یاد دلاتا ہے کہ ان کی زندگی یہی ہے جو وہ جیتے ہیں۔ ان کی دُنیا اپنی تمام مسرتوں اور حسرتوں کے ساتھ ان کو لوٹا دی جاتی ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے، جیسے چاہیں وہ اس دنیا کو بدلیں۔

مگر تھیٹر کو اپنے وجود اور تاریخی مشن کا شعور ہے اور اگر یہ تھیٹر اپنے دور کی مُنہ زور لہر کے ساتھ ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تھیٹر ان لوگوں کے ساتھ ہے جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور وہ سماجی تبدیلیوں کے لیے بے چین ہیں۔ اور اگر یہ خواہش سچی ہے تو پھر ان کو اپنا تھیٹر لے کر elitist فصیلوں سے باہر نکلنا ہوگا جہاں تھیٹر قید ہے۔ پھر ان کو ایک ایسے فن کی آبیاری کرنا ہوگی جو اپنے زمانے کی ہوا میں سانس لیتا ہے۔ اس کو باہر وادیوں میں نکل کر لوگوں کے لطف و انبساط کا سامان بننا ہوگا، جن کی زندگی جوکھم ہے اور جن کے خون پسینے سے اتنا زیادہ پیدا ہوتا ہے، جس سے وہ آخر میں allenate ہو جاتے ہیں۔ یہ تھیٹر کے بعید پیچیدہ مسائل کا تھیٹر ہوگا۔ کیا ہمارا تھیٹر ایسا تھیٹر ہے؟ بریخت نے جو تھیٹر ہمارے لیے چھوڑا ہے، وہ اس سوال کا بھی جواب ہے: جو اگر تھیٹر حقیقت کی موثر تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی جڑیں حقیقت میں پیوست کرنا ہوں گی، مطلب یہ کہ آئینہ کتنا ہی بڑا اور روشن کیوں نہ ہو، اگر اس کا رُخ چاند کی طرف ہے تو اس میں جو عکس دکھائی دے گا، وہ زمین کا نہ ہوگا اور نہ ان کا جو اس پر بستے ہیں۔

لیکن کیا ایسا ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی دُنیا کی اصطلاح میں نئی دُنیا کو ایک ایسی دُنیا بنا دیتی ہیں جس میں پرانی دُنیا کا کچھ نہ ہو؟ سماجی تبدیلی کا عمل خواہ ارتقائی ہو یا انقلابی، تاریخی پس منظر سے اس طرح نہیں کٹتا کہ اس میں ماضی کا کچھ نہ ہو۔ چونکہ یہ تبدیلی انسان لاتا ہے، اس لیے اس کی تاریخ کا تہذیبی عمل وقت کی چھلنی سے چھن کر بہت کچھ نئی دنیا کے نئے انسان کی نفسیات اور جذبات میں یوں جذب کر دیتا ہے کہ اس کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اڈیپس آج بھی دلوں پر اثر کرتا ہے کیوں کہ taboos کا وجود آج بھی ہے اور آج بھی قانون کے سامنے لاعلمی ناقابلِ معافی ہے۔ اوتھیلو آج بھی دیکھنے والوں کو دم بخود کر دیتا ہے کیونکہ رشک و حسد کی گرفت آج بھی مضبوط ہے اور ہر چیز کا انحصار ملکیت کے احساس پر ہے۔ خاص تاریخی حالات خود انسان کے عمل سے وجود میں آتے ہیں اور چونکہ زندگی میں اسرار و توہمات کا خالق انسان ہوتا ہے، اس لیے اسٹیج پر بھی ان کی تمثیل کو برقرار رکھنے میں اور قابلِ قبول بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی لیے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان تھیٹر کی رفتار پر نظر ڈالتے ہوئے بریخت نے برلن میں شیف باردام

تھیٹر کہا جا سکتا ہے۔ اس تھیٹر میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں ان کے متضاد رویوں اور باتوں سے ایسی تمثیلی شبیہیں اُبھری ہیں جو پس منظر سے متصادم ہیں۔ اسے بریخت نے allenation effect کا نام دیا ہے۔ اس تاثر کی خصوصیت ایک ایسی تمثیل ہے جس میں موضوع کی شناخت تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی حرکات و سکنات سے ایک قسم کی اجنبیت یا بیگانہ پن کی فضا بھی پیدا ہوتی ہے۔ کلاسیکی یا ازمنہ وسطیٰ کے تھیٹر نے اپنے کرداروں کو allenate کرنے کے لیے انسان یا جانوروں کے ماسک کا استعمال کیا: "اس قسم کی اُپج سے یقیناً کرداروں سے مکمل بیگانگت پیدا ہونے میں کچھ تو رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، لیکن ساتھ ہی اس قسم کی تکنیکی جدت طرازی hypnotic ترغیب کا کام کرتی تھی۔ بریخت کے الفاظ میں "ان پرانی تدابیر کے سماجی مقاصد ان مقاصد سے بالکل مختلف تھے جو ہمارے اپنے ہیں"۔

آج کا دور قدرت کو طرح طرح سے بدل رہا ہے۔ اس کے لیے قدرت کے مظاہر کو سمجھنا ضروری ہے۔ کسی چیز کو بدلنے کے لیے اس کو جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کو سماجی معنی میں جاننا ضروری ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ آج وہ جو ہے، کل بھی وہی ہو ویسا ہی۔ اسی لیے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جیسا وہ آج ہے، ممکن ہے، کل وہ ویسا نہ رہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ تھیٹر کی تمثیل اس کو صرف ویسا ہی پیش کرے جیسا وہ تھا یا جیسا وہ ہے بلکہ ڈرامائی بصیرت تو اس کو ویسا بھی پیش کر سکتی ہے جیسا وہ کل ہوگا۔ اور اس کا ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کو، ماضی اور حال کے عمل کو ٹھیک ٹھاک سمجھا جا سکے۔ اس کی مثال ایک سائنسی دریافت سے دی جا سکتی ہے۔ عظیم گلیلیو نے ان قوانین کی دریافت بھی اسی طرح کی تھی جو ایک پنڈولم کے نیچے تلے آہنگ اور رفتار کی تہہ میں کام کرتے ہیں۔

کسی بھی کردار کو پیش کرتے ہوئے اس کردار سے تھوڑی سی علیحدگی ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کردار پر اس آدمی کا دھوکا ہو جس کی وہ صرف تمثیل پیش کر رہا ہے۔ "وہ لیئر کا پارٹ ادا کر رہا تھا" ایک بات ہے اور "وہ لیئر تھا" بالکل دوسری بات ہے۔ مشاہدہ اداکاری کا بہت بڑا جوہر ہے۔ اسی لیے وہ جس کردار کو پیش کرتا ہے، اس کو وہ اپنی ایک ایک رگ سے، ایک ایک بُن مو سے محسوس کرتا ہے۔ یہ عمل محض جسمانی نہیں بلکہ بیک وقت ذہنی بھی ہے۔ ایک اداکار اپنے کردار پر پورا عبور حاصل کرنے کے لیے اس کی مختلف نوع باتوں کی طرف تنقیدی توجہ کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی رویہ اس کا اس خاص کردار کے مدِ مقابل کی طرف بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ شریکِ عمل دوسرے کرداروں کی طرف بھی۔

ایک کہانی کہنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ allenation کا ہے لیکن کیا allenate کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے، اس کا تمثیلی تجزیہ خود بریخت یوں کرتا ہے: "اس کی مثال کے لیے، آئیے ہم پرانے ڈرامے ہملٹ کو لیں۔ میں ایک تاریک اور خون آشام دور میں یہ سب لکھ رہا ہوں۔ مجرم حکمران طبقے ہیں، عقل و منطق کی قوت کے خلاف پھیلا ہوا شبہ ہے، عقل و منطق جس کا مسلسل غلط استعمال ہوتا ہے۔ میں ایسے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اس کہانی کو یوں دیکھ سکتا ہوں: یہ شمشیر زن سپاہیوں کا دور ہے۔ ہملٹ کا باپ، جو ڈنمارک کا بادشاہ ہے، ملک گیری کی کامیاب جنگ میں ناروے کے بادشاہ کو تہہ تیغ کر دیتا ہے جبکہ آخر الذکر کا بیٹا فورٹن براس تازہ لشکر کشی کی تیاری کر رہا ہے۔ ڈنمارک کا بادشاہ بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اپنے بھائی کے ہاتھوں۔ مقتول بادشاہوں کے بھائی جواب خود بادشاہ ہیں، جنگ سے اس طرح جان بچاتے ہیں کہ وہ منصوبہ طے کر لیتے ہیں کہ ناروے کی فوجیں ڈنمارک کی سرزمین کو پار کر کے پولینڈ کے خلاف ایک غاصبانہ جنگ چھیڑ دیں گی۔ اسی اثنا میں نوجوان ہملٹ کے مقتول شمشیر زن باپ کا بھوت اسے للکارتا ہے کہ میرے خلاف کیے گئے جرم کا انتقام لو۔ پہلے تو اسے ایک بعد دیگرے خوں ریزی کے خیال سے جھجک ہوتی ہے اور وہ جلاوطنی کی تیاریاں بھی کر لیتا ہے لیکن اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ اس کی مڈبھیڑ ساحل پر نوجوان فورٹن

ہو اس سے ہو جاتی ہے جو اپنے لشکر کے ساتھ پولینڈ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ اس کی سپاہیانہ مثال سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہیں سے لوٹ جاتا ہے اور وحشت و بربریت کے جنون میں اپنے چچا، ماں اور اپنے آپ کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے اور ڈنمارک کی عنان ناروے کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ واقعات دکھاتے ہیں کہ وہ نوجوان، جو کافی جری اور مضبوط ہو چکا ہے، اس عقل و منطق کی طرف ایک نئے رویے کا استعمال، جو اس نے وٹین برگ کی یونیورسٹی میں اپنایا ہے نہایت غیر مؤثر ڈھنگ سے کرتا ہے۔ وہ جس سامنتی فضا میں لوٹ کر آیا ہے وہاں عقل و منطق اس کا راستہ روکتی ہے۔ جب اس کا واسطہ پڑتا ہے غیر عقلی معمولات سے، تو اس کی عقل و منطق عمل سے عاری ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی عقل و منطق اور اس قسم کے عمل کے درمیان خلیج کا المناک شکار ہو جاتا ہے —— ڈرامے کو اس طرح دیکھا جائے، جو ایک سے زیادہ طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے، تو اس سے دیکھنے والوں کو دلچسپی ہوگی۔

Alienation کے ذریعے قصے کو پیش کرنا اور دیکھنے والوں تک پہنچانا تھیٹر کا خاص مقصد ہے۔ ہر چیز کا دار و مدار اداکار پر نہیں ہے۔ کسی بھی ڈرامائی پیش کش میں اداکار کے علاوہ اسٹیج پر ڈیزائنر ہوتا ہے، ماسک بنانے والے ہوتے ہیں، کاسٹیوم تیار کرنے والے ہوتے ہیں، موسیقی اور رقص ترتیب دینے والے ہوتے ہیں۔ سب مختلف فنون کو مشترکہ کام کے لیے یکجا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے، اس عمل میں ان کی اپنی اپنی آزادی برقرار رہتی ہے۔

بریخت نے آرٹ کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے آئینے والی تشبیہ کا سہارا لیا ہے اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ اگر آرٹ زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے تو پھر اس کے آئینے خاص قسم کے ہیں۔ آرٹ کے آئینے۔ آرٹ تناسب و توازن کے بدل دینے سے غیر حقیقی نہیں ہو جاتا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ stylisation اس طرح نہیں ہونی چاہیے کہ فطری عنصر غائب ہو جائے۔ بلکہ اس کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، اس میں شدت اور رفعت پیدا ہو۔ اس کے لیے تمام فنونِ لطیفہ کا تعاون اور اشتراک ضروری ہے۔ ان سب کو تھیٹریکل پیش کش میں کھو جانا چاہیے مگر اس طرح کہ وہ اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنے مشترکہ ڈرامائی مقصد کو پورا کریں۔ بقول بریخت، ان کا رشتہ اس بات میں مضمر ہے کہ "وہ باہمی علاحدگی کی طرف لے جاتی ہیں"۔

بریخت نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ جو کچھ تماشائیوں کے سامنے پیش کیا جائے، اس طرح پیش کیا جائے جس طرح بنا بنایا مال گاہک کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ تماشائی کے سامنے وہ چیز پیش ہو رہی ہے جسے بار بار ریہرسل میں جانچا اور پرکھا جا چکا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات شامل نہیں جو مسترد کی جا چکی ہے —— جو کچھ پیش کیا جائے، آنکھیں کھول کر پیش کیا جائے "تاکہ دیکھنے والے جو کچھ بھی دیکھیں، آنکھیں کھول کر دیکھیں"۔

ہمارے ڈرامہ نگار کی نظر میں پیش کش یا تمثیل کی حیثیت ثانوی ہے۔ اولیت اس چیز کو حاصل ہے جو پیش کی جا رہی ہے اور وہ ہے انسان کی زندگی سماج میں۔ اور اس کی اکملیت سے لطف و انبساط کے چشمے پھوٹیں تو اس طرح پھوٹیں کہ اس کو اعلیٰ تر لطف و انبساط میں بدلا جا سکے۔ یہی اعلیٰ تر سطح وہ نظر عطا کرتی ہے جو پیش کردہ زندگی کے قوانین اور ضابطوں کے نقص اور کمزوری کو دیکھ لیتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو زندگی سامنے دکھائی دے رہی ہے، وہ تشنۂ تکمیل ہے اور ادھوری ہے۔ صرف اس طرح تماشائی تھیٹر سے باہر اپنی تشنگی کی تسکین چاہے گا اور جو تھیٹر میں نہیں ملا، اسے زندگی میں تلاش کرے گا —— ذہنی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ اس سے زندگی اور تھیٹر کی باہمی توسیع ہوگی۔

بریخت کے ڈرامائی فکر و نظر کی بنیاد دریافت کرنے کے لیے آخر میں ڈرامہ نگار کے ان الفاظ کو بار بار پڑھنا ضروری ہے اور اگر ایک ہی بار میں اس کی معنویت واضح ہو جائے تو اس کی یاد بار بار تازہ کرنا ضروری ہے:

لوگ ہم سے کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں صرف وہ نہیں پیش کرنا چاہیے جو عوام مانگتے ہیں

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی فنکار اگر وہ آنے والی نسلوں کے لیے دقیق ڈھنگ سے انتہائی خلوت نشینی کے عالم میں کام کرتا ہے، اس وقت تک کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا بادبان ہر قسم کی ہوا سے خالی ہے اور ضروری ہے کہ یہ ہوا اسی موڑ کی ہو جس میں وہ جی رہا ہے۔ مستقبل کی ہوا سے کام نہیں چلے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی خاص سمت میں سفر کرنے کے لیے بادبان میں ہوا کے بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے (ہاں، اگر ہوا ہو تو آدمی مخالف رخ میں کشتی کھینے کے جتن کر سکتا ہے۔ نامکنات کی سرحد صرف اس وقت آتی ہے جب ہوا سرے سے ہو ہی نہیں یا اگر ہو تو صرف مستقبل کی)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر کوئی فنکار صرف آج کی ہوا سے کشتی کھینے کی کوشش کرے گا تو اس کے عمل سے کمال اثر انگیزی ہرگز پیدا نہیں ہوگا۔ کسی بھی ڈرامے کی عضوی معنویت و ربط کا فیصلہ موجودہ اثر انگیزی کی بنیاد پر کرنا سرے سے غلط ہوگا۔ تھیٹر اس طرح نہیں چلتا۔ ایسا تھیٹر جو عوام سے رابطہ قائم نہیں کرتا، محض بکواس ہے۔

تخلیق کار کس زمانے میں رہتا ہے؟ ماضی میں یا حال میں یا مستقبل میں؟
بریخت کی زندگی کچھ عجیب طرح سے اس کا جواب دیتی ہے، جو واضح بھی ہے اور مبہم بھی ——— دھوپ چھاؤں کی کیفیت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اس کی زندگی بہت پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہے۔ بے چین اور فشار آمادہ! اور اس کے پیچھے ہے تاریخ اور حالات کا ہاتھ۔ خود بریخت اس کی تصدیق کرتا ہے:

میں شہروں میں تب آیا جب
بدامنی اور افراتفری منہ کھولے ہوئی تھی
میں لوگوں کے جلو میں تب پہنچا جب
بغاوت سر اٹھا رہی تھی
اور ان کے ساتھ میں بھی باغی ہو گیا
ویسے جو میرے دن بیت گئے، میری زندگی
جو اس زمین پر مجھے بخشی گئی تھی

پندرہ سال کی عمر میں بریخت نے ایک نظم لکھی تھی، "جلتا درخت" اس کی گرمی اور روشنی ایک ایسے دہکتے ہوئے ذہن کا

اور ایک شخص سے جس کو بعد میں عالمی کلاسیک کا لازوال سرچشمہ بننا تھا۔

شام کے جھلملاتے دھندلکے میں، گرد آلود فضاؤں میں
ہم نے دیکھے، سرخ آسمان کی طرف لپکتے شعلے
امڈتے ہوئے اور بپھرتے ہوئے سیاہ آسمان کی طرف
کھیتوں میں، رستی ہوئی خاموشی میں
ایک جلتا ہوا درخت
چٹختا ہوا

اکڑی ہوئی، خوف زدہ شاخیں
سیاہ پڑتی ہوئی تڑپتی ہوئی
چنگاریوں کی جنون خیز بارش میں
آشفتہ سر

شعلے ہند میں موجزن
اسپتے سوزاں و منوحنہ کمان*
رقص کرتے ہیں، وحشت زدہ
کچھ سر نگاسے، آزاد و بے زنجیر
جھپٹتے ہیں کہنہ بوسیدہ تنے کو جلا کر پھونک دیں

پرشکوہ اور خاموش
رات کو منور میں نہلاتا ہوا
بوڑھے سپاہی کی طرح، تھکا ہارا، جاں بلب
لیکن شاہانہ وقار سے سرشار
درخت شعلوں میں جلتا رہا

اور یکایک وہ کھڑا ہو جاتا ہے، سیدھا بے لچک
اور اب، سرخ فلک بوس شعلے اٹھتے ہیں
ایک نیزے کو وہ اسی طرح، بلند و بالا، تھامے ہیں
بجھ چکی چنگاریوں کا دھواں چھوٹتا ہے اور پھیل جاتا ہے ہوا میں

اور درخت کا تنا آگ میں کھو جاتا ہے

ایک لڑکے کی رُوح میں پوشیدہ فطری ڈرامائیت کا یہ جوہر شاعری کے لباس میں چھپائے نہیں چھپتا۔ لیکن تب وہ شاعر بن رہا تھا، ڈرامہ نگار نہیں۔

پندرہ سال سے بیس سال تک کی عمر کا سفر ہماشما کے لیے صرف پانچ سال کا سفر ہے لیکن ایک جینئس کے ذہن کے لیے یہ سفر صدیوں کا سفر بن جاتا ہے —— بریخت کا ذہن ایسا ہی ذہن تھا —— رات کے طوفانی اندھیرے میں روشنی کا مینار!

تاریخ کے ویرانوں اور آبادیوں میں میونخ کا نام بار بار گونجتا ہے —— جہاں نوجوان بریخت جی رہا تھا، اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر میونخ کے پاس بغاوتوں کا لاوا پھوٹا۔ بویریا میں سوویت حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ بڑے ہیجانی طوفان کی زد پر یہ چراغ جلایا گیا تھا۔ ظاہر ہے، بجھنے میں کتنی دیر لگ سکتی تھی۔ بغاوتوں کی آگ جتنی تیز تھی، اس سے کہیں زیادہ گہری رات تھی۔ اس کے خون آلود پنجے کہیں زیادہ تیز تھے۔ بڑا خون خرابہ ہوا۔ ظلم و ستم کی رات اس انقلابی تلاطم کے بعد پھر آسمان کی طرح چھا گئی۔ طوفان کے بعد سناٹے میں بریخت کی رُوح کس طرح چیخی ہوگی، اس کا اندازہ اس کی بعد کی تخلیقی زندگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ تریتاکوف سے بریخت نے ان دنوں کے تجربے کا حال ان الفاظ میں بیان کیا تھا :

> ۱۹۱۹ء میں میونخ کے پاس لیونن نے سوویت اقتدار کا پرچم لہرایا۔ آگس برگ نے سُرخ آتشیں روشنی میں لبیک کہا اور میونخ کی آگ کا آشنا بن گیا۔ آگس برگ میں ما بعد فوجی یونٹ تھا ایک ہسپتال ۔ ۔ ۔ ہمارے یہاں ایک بھی سُرخ محافظ نہیں تھا۔ ہمارے پاس ایک فرمان جاری کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ نہ کسی بنک کو قومی ملکیت قرار دینے کا وقت تھا، نہ کسی گرجا گھر پر قفل ڈالنے کا —— دو دن بعد جنرل ایپس کا ایک فوجی دستہ، جو گویا مسلح جو فوج کا دستہ تھا، سیل کی طرح شہر میں داخل ہوا۔ انقلابی کمیٹی کا ایک رکن میرے کمرے میں اس وقت تک چھپا رہا جب تک کہ فرار کا راستہ نہیں ملا —— اور تب بویریا ماضی میں کھو گیا۔

۲۲ فروری، ۱۹۱۹ء کو کرٹ ایسنر کے قتل کے خلاف بڑا اُبال آیا۔ آگس برگ ہل گیا۔ انجام ۹ ہلاک، چالیس گرفتار ہوئے اور انھیں سزا ہوئی۔ ان بھیانک واقعات نے بریخت کے دل میں ہیجان برپا کر دیا۔ یہی حال بریخت کا اس وقت بھی ہوا تھا جب روزا لکسمبرگ اور کارل لیب نیخت کو ہلاک کیا گیا تھا۔

ایک طوفان وہ ہے جو سروں پر سے گزر جاتا ہے۔ ایک طوفان وہ ہے جو دلوں میں بھپرتا رہتا ہے —— بریخت نے وقت اور تاریخ کے اس طوفان کو اپنے گیتوں اور ڈراموں میں ڈھال دیا اور اس کو پہلی شاندار گونج سنائی دی اس کے ڈرامے "رات کے ڈھول" میں۔ بریخت کے اندر ڈرامہ نگار اپنے پورے قد کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اُٹھنے کا یہ عمل اتنا اضطراری تھا کہ تعمیر کے زمان و مکاں کا توازن بگڑ سا گیا۔ اس تلاطم میں بہت سے معیار و پیمانے بکھر سے گئے۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے زمین کے اندر اندر اس تنا ور درخت کی جڑوں کو کاٹنا شروع کیا جو چوہوں کی طرح (یہ چوہے ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ تب بھی تھے،

اب بھی ہیں۔ ادیان کو صرف ان کی بزدلی، حقارت کے پیلے زرد دانتوں سے پہچانا جا سکتا ہے) ۔ برخیت کے وہ ہمعصر جو پٹی ہوئی ڈگر پر چلنے کے عادی تھے اس کی نئی آواز سے بہت برہم ہوئے اور انھوں نے برخیت کے خلاف پھنکارنا شروع کر دیا۔

برخیت کی زندگی میں ایسے ہی ہیجان کی کیا کمی تھی کہ اسی زمانے میں جب مقدرات کے ڈھول، میونخ کے تھیٹر کا سرکس پہلے ہی پیش کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا، وہ ماریان زوف کے عشق میں گرفتار ہو گیا جو اس کے ایک ادیب دوست کی بہن تھی۔ ایک طرف عشق اور دوسری طرف مخالفتوں کے دریا میں اپنے ڈرامائی فن کے لیے دنیا بنانے کی کوشش! ہر طرف ریت ہی ریت یا پانی ہی پانی۔ قدم ٹھہریں تو کہاں ٹھہریں! ایسے میں برخیت نے سوچا کم از کم ایک دوست تنقید نگار تو ہو ہال میں۔ اس نے یورپین کوریر کے تنقید نگار ہربرٹ جیرنگ کو دعوت دی۔ وہ پہلے ہی میونخ آنے پر برخیت کا خیر مقدم کر چکا تھا۔ اپنی تلاش، اپنی شناخت اور اپنے وجود کا اعلان ہر فنکار کا مقدر ہے۔ اس تخلیقی اعلان کے بعد وہ کسی کو کہاں تلاش کریں؟ اس کی شناخت کے لیے خدوخال کا تعین کس طرح ہو؟ برخیت نے جیرنگ کو لکھا: "میں جانتا ہوں، آپ سے کیا طلب کر رہا ہوں۔ لیکن اس پر میرے لیے بہت کچھ کا انحصار ہے۔ جب سے برلن نے کسی نئی چیز کو آزمانا چھوڑ دیا ہے، کسی نئے آدمی کے لیے اچھا ایڈیشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں حالانکہ اس وقت کسی کو اس جوئے شیر کی بے حد ضرورت ہے۔"

وہ شام آ ہی گئی، جب تماشائیوں سے بھرے ہال میں پہلا شو شروع ہوا۔ ہانس اوتو منسٹر نے اس شام کی کیفیت کچھ یوں بیان کی ہے:

"جمعہ، ۲۹ ستمبر۔۔۔ پورا تھیٹر کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ہم سب بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ پردہ اٹھنے میں دیر ہو رہی تھی۔ برخیت بڑے ہیجان کے عالم میں تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ برلن کے تنقید نگار سب پہنچ گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جیرنگ آیا ہے —— برخیت کا پورا خاندان تھیٹر میں موجود تھا۔ باپ، بھائی والٹر، گھر کا نگہبان ڈکرٹ اور بابی (برخیت کی معشوقوں میں سے ایک)۔ مجھے بھی برخیت کا بھائی سمجھا جاتا تھا۔۔۔ پھر آخر وہ وقت آ ہی گیا۔ پردہ ہٹا۔ اور قسمت کا کھیل شروع ہوا۔۔۔ اچھا ریہرسل اور برا آغاز۔ یہ تھیٹر کا پرانا اصول ہے۔ ایسا لگا کہ وہ سچ ہو گیا ہے۔ اس شب پچھلی ریہرسل میں وہ ساری باتیں جو اتنی خوبی سے جڑی تھیں، بکھرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی ڈرامہ بہت کامیاب رہا۔ شاندار۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس میں اپنی زبردست اندرونی قوت تھی اور پھر برخیت کی زبان —— ایک ایسی زبان جو کسی نے جرمن اسٹیج پر سالہا سال سے نہیں سنی تھی۔"

جیرنگ کے قلم نے اعلان کیا:

"چوبیس سالہ شاعر برخیت نے راتوں رات جرمنی کی ادبی روپ ریکھا بدل دی ہے۔ برخیت ایک نیا لہجہ، ایک نیا آہنگ، ایک نئی بصیرت لے کر ہمارے زمانے میں داخل ہوا ہے۔۔۔ اس کے پیکر گوناگوں ہیں۔ وہ انتشار اور بکھراؤ کا تجربہ بالکل جسمانی طور پر کرتا ہے۔۔۔ وہ برہنہ انسانی ہیولوں کی زبان کو آواز بخشتا ہے اور وہ ایک ایسی زبان میں بولتے ہیں جو ہم نے سالہا سال سے نہیں سنی۔ ڈرامے کے پہلے ہی الفاظ سے اس بات کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ: المیہ شروع ہوتا ہے۔"

یہ "المیہ" تب شروع ہوا اور برخیت کی زندگی پر چھا گیا۔ برخیت نے جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے، اس میں بنی نوع انسان کے اسی المیے کی گونج ہے۔ شاعروں نے شہروں کو پھیلتا ہوا جنگل کہا ہے۔ کیا چیز شہروں کو جنگل بناتی ہے؟ اس کے قوانین، اسی کی رفتار، اس کی دوڑ یا اس کا روشن اندھیرا؟ برخیت کو ایسفالٹ کے یہ شہر اپنا گھر معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک ایسی قوم کا فرزند اور فنکار تھا جس کے کردار اور مزاج کا احاطہ فریڈرک نیطشے نے اپنے خاص انداز میں کیا تھا۔ اس کی نظر میں "جرمن روح میں راہ گزر ہیں اور گلیارے بھی۔ خندقیں ہیں اور پناہ گاہیں بھی۔ روپوشی کے لیے پناہ گاہیں! اس کی بدنظمی میں پُراسرار اور ظاہر کی بڑی کشش ہے۔ جرمن ان

گزرگاہوں سے خوب مانوس ہیں جو آشوب و انتشار کی طرف لے جاتی ہیں۔

یہ جرمنی جتنا نیطشے کا تھا، اتنا ہی گوئٹے، ہیگل، مارکس اور اینگلز کا بھی تھا۔ برخیت اسی گزرگاہ سے گزر رہا تھا جو جرمنی کو اس صدی کے موڑ اور پہلی عالمگیر جنگ تک لے آئی تھی۔ اور اس وقت جرمنی کی تہذیبی شخصیت پر جدید رومانیت کی چھوٹ پڑ رہی تھی، اب بھی ایڈوارڈ موریکے اور تھیوڈر استورم کی شاعری، رابرٹ شوماں کی موسیقی اور اسپٹز ویگ اور رختر کی مصوری جرمن قوم کے مزاج پر چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں کو بوجھل بنا رہی تھی لیکن پہلی عالمگیر جنگ کے بعد تصورِ حیات کی پرانی سرحدیں مٹنے لگیں۔ فوق البشر کا تصور تھا جس کی ضرورت تھی کیونکہ اس کے بغیر جرمنی اپنی خودی کی تکمیل نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے، ایسے میں جرمنی کا کوئی شاعر اور ادیب، فنکار اور دانشور ایسا نہیں تھا جو نیطشے کے جارحانہ اثباتِ ذات سے متاثر نہ ہو۔ تب اس کے اصرار میں سب کو، بقول ہنرخ مان (جو تامس مان کا بھائی تھا) اپنی اپنی ذات کی تکمیل کا ”جواز“ ملتا تھا ———— جب نیطشے نے اعلان کیا تھا ”میں انسان نہیں، میں ڈائنامائٹ ہوں . . .“ تو اس کی گونج جرمن روح میں عرصہ تک ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ لیکن یہ گونج کب عقل و دانش کی آواز دبا سکتی تھی۔ کب تک یہ آواز دھند کی طرح تلاش و دانش کو اپنے اس وژن سے محروم رکھ سکتی تھی جو انسان کے مقدر کو الیوژن اور خود پرستی کی منزل سے آگے لے جاتی ہے۔ تامس مان سے اس کے عہد کے نئے شعور نے لکھوایا: ”اس روح پر انتہائی گہری، انتہائی ٹھٹھری ہوئی تنہائی . . . ایک مجرم کی تنہائی مسلط کر دی گئی۔ یہ تھا وہ ذہن جو شروع سے احترام و تعظیم کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، مقدس روایات کی طرف جذبۂ عبودیت کا پابند۔ ذرا دیکھیے، اسی دماغ کو قسمت نے پکڑا اور گویا اس کو بال سے پکڑ کر یوں گھسیٹا اور پھر ایک ایسے انداز سے سامنے کھڑا کر دیا کہ اس کے چہرے سے وحشت اور بربریت ٹپکے۔ پھر وہ ہر احترام و تعظیم سے باغی ہو گیا۔ اس دماغ کو خود اپنی فطرت کی خلاف ورزی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کو ننگی درندہ صفت طاقت کا ترجمان اور نقیب بننے پر مجبور کر دیا گیا ———— تب وہ خود شر کا سفاک ضمیر بن گیا۔“

۱۹۳۹ء میں ہنرخ مان نے اس خیال کی توسیع یوں پیش کی: ”نیطشے کی تصنیف دہشت انگیز ہے۔ یہ کام ایک خطرہ بن گیا ہے۔ وہ دن گئے جب ہم چند سال پہلے اس کی رو میں بہہ گئے تھے۔“ یہ نیطشے پرستی کے خلاف عقل و دانش کا ابتدائی احتجاج تھا جس کو بعد کی تاریخ نے کچل کر رکھ دیا۔

یورپ میں انیسویں صدی کے آخر میں تھیٹر کے نشاۃ ثانیہ نے تھیٹر کو ایک نیا رخ دیا جس کے مشعل بردار تھے ناروے کے ابسن اور سویڈن کے اسٹرنڈ برگ۔ اس کی تاریخی قوت نے انگلستان، فرانس اور آخر میں ”آزاد“ تھیٹر قائم کیا۔ اس تھیٹر کی روایت میں شیکسپیئر، گوگول، مولیئر، چیخوف، تالستائی اور شا کے ڈراموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ گورکی کے ڈراموں نے اس تھیٹر کو ایک اور رخ دیا جس کا سرچشمہ ”پاتال“[1] ہے۔ ان کے احتجاج کی دھار جرمن ڈرامہ نگاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز تھی۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کا زمانہ برخیت کے فنی ظہور کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیصر ولیم ثانی کے اس قول کا کھوکھلا پن جرمن قوم پر واضح ہو چکا تھا: ”یاد رکھو کہ جرمن قوم کو خدا نے چنا ہے۔ مجھ پر، جرمن شہنشاہ پر، خدا کا نور نازل ہوا ہے۔ میں اس کا آلۂ کار ہوں۔ اس کی شمشیر اور اس کا نبی ———“ اور اسی کا ردِ عمل تھا کہ قومی خودی کا اعلان کرنے کے لیے ایک نئی عسکریت سر اٹھا رہی تھی جس کا دوسرا نام ہٹلری فاشزم ہے، جس کے ”سیاہ“ کارنامے ”تاریخ کے سیاہ ترین اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تاریخ کے اس سیاہ دور

---

[1] ”پاتال“ گورکی کے شہرۂ آفاق ڈرامے LOWER DEPTHS کا اردو ترجمہ ہے۔ اور یہ ڈرامہ گورکی کے ان پانچ ڈراموں میں شامل ہے جن کا ترجمہ میں نے کوئی بیس سال پہلے کیا تھا اور جو کتابی شکل میں منظرِ عام پر، عرصہ ہوا، آ چکے ہیں۔

ہے برخیت کی تخلیقی زندگی کا، جس پر پھیلی ہوئی جلاوطنی اور خانہ بدوشی کا گہرا واسطہ ہے۔ جرمن قوم کی جارحیت کی فلسفیانہ بنیادیں نیطشے کے وسوسوں میں سے فراہم کردی تھی۔ ہٹلر نے اس زمین پر بہیمیت اور قتل وغارت کی جو فصل اگائی، اس سے سب واقف ہیں۔
لیکن برخیت کی زندگی وہاں سے شروع نہیں ہوتی، جہاں اس وقت ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔

برخیت پچھلی صدی کے ۹۸ ویں سال میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا شہر تھا آگس برگ۔ شہر پناہ کی دیواروں نے پہلی بار اس کی آواز سنی اور اس کی نظر کو جن دیواروں نے روکا، ان کا ردعمل اس کی پوری زندگی میں رچ بس گیا۔ اس کا کرسچین نام رکھا گیا تھا ——— یوگن برتولد فریڈرک برخیت!

اس کے ماں باپ جن کی جڑیں "کالے جنگل" میں تھیں، کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان کی تمباکو کی خاندانی دکان آج بھی موجود ہے اور اس کے چچا زاد بھائی اپنا کاروبار کرتے ہیں ——— برخیت کے والد نے آگس برگ کے کاغذ کے ایک کارخانے میں نوکری کر لی اور بعد میں خود اس کے ڈائرکٹر بن گئے۔ یہ بات ۱۹۱۴ء کی ہے جب برخیت کی عمر سولہ سال تھی۔ برخیت کے والد عقیدے کے اعتبار سے پیدائشی کیتھولک تھے۔ ماں، جن کا نام تھا صوفی بریزنگ، پروٹسٹنٹ عقیدے کی تھیں۔ بیٹے کی تربیت میں ماں کے عقیدے ہی کا ہاتھ تھا۔ برخیت کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا، والتھر (یہ نام پہلے کہیں والتر لکھا گیا ہے) — وہ اپنے باپ کے پیشے ہی سے جڑا رہا۔ اور بعد میں کاغذ سازی کی ٹکنولوجی کے پروفیسر کی حیثیت سے معروف ہوا۔

اس وقت کے جو تاثرات ملتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ برخیت کے والد نے، ۱۹۲۰ء میں اپنی بیوی کی موت کے بعد، بحیثیت باپ، سخت گیری، ہٹ دھرمی اور رعب اور دبدبے کو اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ برخیت نے اپنے باپ سے اپنے رشتے کے بارے میں بہت کم لکھا ہے، اس لیے صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس رشتے میں کوئی گرمی اور گہری وابستگی نہیں تھی۔ ہاں البتہ یہ بات برخیت کے مزاج پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور شاید برخیت کی گھریلو صورت حال پر بھی کہ برخیت نے کبھی کوئی "باپ دشمن" قسم کا ڈرامہ نہیں لکھا اور نہ کوئی نظم ایسی چھوڑی جس سے باپ کے خلاف نفسیاتی اجتناب یا بیزاری کا سراغ ملے، حالانکہ اس دور کے بہت سے جرمن ادیبوں کے یہاں اس نفسیاتی رویے کی جھلک ملتی ہے ——— ماں کی موت پر برخیت کا رویہ بہت واضح تھا۔ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو برخیت نے اپنی ماں کا سوگ منایا اور کہا: "ایسا کیوں ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی زندگی میں ان کے بارے میں اہم باتیں نہیں کہتے؟" برخیت کی گہری وابستگی کا شاعرانہ اظہار ان مصرعوں میں آج بھی محفوظ ہے:

جب وہ چلی گئی تو وہ آئے اور اُنھوں نے اس کو دفن کر دیا
اب قبر پر پھول کھلتے ہیں اور بھنورے لہراتے ہیں
اتنی ہلکی اور سبک تھی وہ کہ بمشکل زمین اس کا بوجھ محسوس نہ کر سکی
کتنا درد سہا ہوگا اس نے!
کیسا درد ہوگا وہ جس میں ڈھل کر

وہ اتنی کومل ہو گئی تھی
اتنی لطیف، اتنی شبنم نفس!

اس سے پہلے اسکول کی ابتدائی تعلیم نے برخت کی طفلی پر بہت ظلم ڈھائے۔ اس کی اپنے استادوں سے کبھی نہیں بنی۔ اس کے نو سال، جو اسکول کی نذر ہو گئے، ان میں سے چار سال کے بارے میں برخت نے لکھا ہے کہ "بہت بد ہوا!"، اسی سلسلے میں اسی زمانے کے بارے میں اس نے ڈرامے کے تنقید نگار اور اپنے دوست ہربرٹ جیرنگ کو لکھا تھا: "آگس برگ کے جمنازیم میں گزارے ہوئے نو سالوں میں، میں اپنے استادوں کو تعلیم دینے میں ناکام رہا۔ مجھ میں کترانے اور پیچھا چھڑانے کا جو رجحان تھا، اس کو وہ مستقل تقویت پہنچاتے رہے۔ یونیورسٹی میں طب کی تعلیم پا رہا اور ساتھ گٹار بجانا بھی سیکھا۔ کھیل کود میں ضرورت سے زیادہ محویت نے میرے دل پر بڑا اثر ڈالا۔ اس کی بدولت مابعد الطبیعات کے اسرار و رموز کا دروازہ مجھ پر وا ہو گیا۔"

اسکول کی زندگی کے سخت اور یکساں معمولات، استادوں کی سخت گیری اور تنگ نظری اور عام طور پر نصابی کتابوں کی بے رنگی نے برخت کی طبیعت کو اُچاٹ کر دیا۔ اس نے ان دنوں کے تجربوں کا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ اس سے اس کے کردار اور رویے کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "ہمارا سب سے اچھا استاد ڈراکیم تھیم آدمی تھا، حیرت ناک حد تک بدصورت۔ اس نے اپنی جوانی ہی میں پروفیسر بننے کے خواب دیکھے تھے لیکن بات بنی نہیں۔ اس مایوسی نے اس کی تمام پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو پوری طرح اُبھار دیا ——— اچانک ہمارا امتحان لینے میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ اور جب ہم جواب دینے میں ناکام رہتے تھے تو اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور وہ خوب چہکتا تھا۔ وہ اور بھی زیادہ مکروہ اور صبر آزما اس وجہ سے نظر آتا تھا کہ اس کی ایک عجیب عادت تھی۔ کلاس کے دوران وہ دو تین بار بلیک بورڈ کے پیچھے چلا جاتا اور اپنے کوٹ کی جیب سے پنیر کا کھلا پیکٹ نکالتا اور پڑھاتے پڑھاتے اس پر منہ مارتا جاتا۔ وہ ہمیں کیمسٹری پڑھاتا تھا۔ اگر وہ کنہائی کی کلاس بھی لیتا تو کیا فرق پڑتا . . . ہم نے اس سے کیمسٹری تو نہیں پڑھی لیکن ہم نے یہ ضرور سیکھ لیا کہ اس کا انتقام کیسے لیا جائے۔ سال میں ایک بار اسکول کمشنر آتا تھا۔ بظاہر اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ دیکھے ہماری پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ ایک بار جب وہ معائنے پر آیا تو ہم نے طے کیا کہ استاد کو سبق پڑھایا جائے۔ ہم نے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا اور اُلّو کی طرح بس گھورا کیے . . . یہ پہلا موقع تھا جب ہمارا استاد ہماری 'ناکامی' پر چہکا نہیں۔ اس کو یرقان ہو گیا۔ کچھ دنوں وہ بستر پر دراز رہا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی ساری 'پنیر خوری' ہوا ہو چکی تھی۔"

برخت کے طنزیہ لب و لہجے سے یہی اندازہ نہیں ہوتا کہ خاص حالات میں خاص استاد کے رویے کا کچے مگر متجسس ذہن پر کیا اثر پڑتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے جرمن اسکولوں کی فضا کیسی تھی، ایک خاص نظام میں استاد کیسے ہوتے تھے اور استادوں اور طلبا کا باہمی رشتہ کس سطح پر قائم ہوتا تھا۔ اسی ڈھانچے میں وسیع تہذیبی زندگی کا ڈھانچہ بھی نظر آتا ہے۔ اس کا سراغ بھی مل جاتا ہے کہ باغی ذہن کا ابتدائی احتجاجی مرحلہ کہاں شروع ہوتا ہے۔

یہ صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ابھی برخت کچی عمر کا لڑکا تھا کہ اسے فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ اس کو ایک ہسپتال میں تعینات کر دیا گیا۔ وہ زخموں کی مرہم پٹی کرتا، زخمیوں کو نہلا دیتا اور ان کی رگوں میں خون کی تھیلیاں انڈیلتا۔ اس دور کے بارے میں برخت کے تاثرات بہت معنی خیز ہیں۔ وہ کہتا ہے: "اگر ڈاکٹر مجھ سے کہتا کہ اس ٹانگ کو کاٹ دو تو میں جواب دیتا، جیسا آپ کا حکم حضور عالی! اور ٹانگ کاٹ دیتا ——— اور اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ برخت، ایک trepanning تیار کرو، تو میں کسی آدمی کی کھوپڑی چیر کر اس کے مغز سے کھیلنا شروع کر دیتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کیسی اپادھاپی مچتی ہے، کس طرح مارا ماری

کمک کے لوگوں کے زخم سیے جاتے ہیں تاکہ جلد از جلد ان کو جہازوں میں لاد کر پھر محاذ پر پہنچایا جا سکے ——— جہاں جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں، وہاں ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یہ ہے برخیت کی زندگی کا وہ مرحلہ جہاں باغی ذہن کا خلیہ جلنا شروع ہوتا ہے۔ جب اس کی نظر میں ان سماجی اور سیاسی رشتوں کے بخیے اُدھڑنا شروع ہوتے ہیں جو انسانوں کو غالب اور مغلوب میں تقسیم کرتے ہیں، جب فوجوں کے غاصبانہ عمل کی اصلیت کھلنا شروع ہوتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کی تقسیم، قوم کے اندر طبقوں کی تقسیم، پھر طبقوں کے اندر حقیر قسم کے روزمرہ کے تحفظ کی خاطر خود غرضیوں اور موقع پرستیوں کی پیدا کی ہوئی تقسیم۔ لوٹ اور لوٹے کا شکار ——— انسانوں کی یہی تقسیم ان قدروں کی تخلیق کرتی ہے جو اخلاقی بھی ہیں اور روحانی بھی، معاشی بھی اور سیاسی بھی۔ ریت رسم، اصول، وابستگیاں، یہ سب خاص سماجی سلسلۂ عمل سے جنم لیتے ہیں اور خاص زمان و مکان کے اندر خاص مقاصد کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان اصولوں اور قدروں میں وہ اصول اور قدریں شامل ہیں جو زندگی کو جیسی وہ ہے، ویسی ہی رکھنے کے لیے، بندوقوں اور توپوں میں ڈھل جاتی ہیں اور وہ اصول اور قدریں بھی جو جہاں گیری کی مہم کے خلاف کارزاروں اور میدانوں میں نہتی نکل آتی ہیں ——— آتش و آہن کا سیلاب ہو یا بلند آہنگ عقیدوں اور مقدر پرست اقتدار کے ٹھنڈے قلعے، یہ تصادم وہاں شروع ہوتا ہے جہاں انسان محنت کرتا ہے اور انسان کو زندہ رکھنے والی قدریں پیدا کرتا ہے، جو خود پیدا کرنے والے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہیں اور اس میں علیحدگی اور بیگانہ پن کا جذبہ پیدا کرتی ہیں ——— اگر یہ جذبہ مقدر پرستی کا اسیر ہے تو مجبوری اور غلامی کی داستان لمبی ہو جاتی ہے اور اگر یہ جذبہ غم و غصے کو جوابی یلغار پر اُبھارتا ہے تو صورت حال بدلتی ہے اور انفرادی علیحدگی تاریخ ساز اجتماعی وابستگی میں بدل جاتی ہے۔

"جنگل کے ڈھول" اور "بال" جیسے ڈراموں کے بعد برخیت نے مخالفتوں پر فتح پانا شروع کر دیا۔ اس کے ڈراموں میں allenation effect نے رزمیہ تھیٹر کی ایک ایسی طرح ڈالی جس نے تاریخ کی محرکات کے نئے زاویے واضح کر دیے۔ برخیت کی ڈرامائیت میں ایلیوژن کی بجائے یہ احساس دلانے کی کوشش ہے کہ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو، وہ زندگی کا ایک تجربہ ہے جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اب جو کچھ ہونا ہے، تھیٹر کے باہر ہونا ہے اور تم اس بڑے سماجی ڈھانچے کا حصہ ہو جو تھیٹر کے باہر ہے اور تم یہاں تھوڑی دیر کے لیے اپنی زندگی سے کٹ کر آئے ہو اور تمھیں وہیں واپس جانا ہے اور کچھ کرنا ہے تو وہیں کرنا ہے، یعنی تھیٹر بھڑاس نکالنے کی جگہ نہیں ہے، تھیٹر سیکھنے اور سمجھنے کی جگہ ہے اور جو کچھ تم یہاں سیکھو گے، وہ تمھارے ساتھ باہر جائے گا اور جو کچھ تمھارے ساتھ باہر جائے گا، وہ تمھارا ہوگا اور جو کچھ تمھارا ہوگا، وہ تمھارے کام آئے گا، اگر . . . اگر تم زندہ ہو اور زندوں میں زندوں کی طرح رہو گے، تب۔

ہربرٹ جیرنگ نے "بال" کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "اس ڈرامے میں انسان ایک دوسرے کا خون اژدہوں کی طرح پیتے ہیں۔ اس میں نیک کام تباہی لاتے ہیں . . . اور دلدل سے روشنی پھوٹتی ہے۔"

میونخ اور برلن کے بعد "بال" وِیَنا کے اسٹیج پر پہنچا۔ وِیَنا یورپ کا سب سے قدامت پسند شہر رہا ہے۔ یہی نہیں کہ وِیَنا میں "بال" جیسا ڈراما پیش کیا جا رہا تھا بلکہ آسٹریا کے سب سے بلند قامت شاعر ہیوگو وان ہوف مانستھل نے اس کا پرولاگ بھی لکھا اور خود ہی اسے پیش کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ یہ قدامت پرستی کے تہذیبی قلعے پر برخیت کے فن کی زبردست یلغار تھی۔ اس یلغار میں برخیت کا ڈرامہ مِتھ کی دنیا بن گیا۔ انسان کا وجود ہی سب سے بڑا مِتھ ہے۔ انسان تمام مظاہر کی گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔ ان مظاہر سے اُلجھ رہا ہے۔ جو کچھ ان میں ہے، اس کو پانی کی طرح پی رہا ہے ——— کیونکہ انسان ساری دولت سمیٹ کر پھر زمین کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔

"بال" کا کردار جھولتا کہتا ہے: "آج ہم جس شاعر کو پیش کر رہے ہیں، وہ بولتا نہیں . . . وہ ایک پُر آشوب دور کا شاعر

ہے . . . . ایسا شاعر اپنی دُور بیں یا پیش بیں آنکھوں سے مستقبل کی سیر کرتا ہے اور ایک انجانی دُنیا کا نقیب بن جاتا ہے۔

فریڈرک ایوین نے بریخت کے جینیس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے : رزمیہ تھیٹر بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک کلاڈل کا تھیٹر ہے اور دوسرا بریخت کا۔ ان میں مماثلت محض ظاہری ہے اور تکنیکی طریقۂ اظہار کی۔ اس مماثلت میں بھی فرق کے بہت سے زاویے پوشیدہ ہیں۔ بہر حال، سب سے مرکزی فرق ہے نظریاتی اور اس فرق کے نتائج۔ کلاڈل کا ڈرامہ تماشائی جامد ہے۔ اس کے ادبی اوصاف چاہے جو بھی ہوں، یہ ایک تبلیغی یا دراتی فن پارہ ہے۔ درست، لیکن بقول جیرنگ، یہ ایک ایسا تبلیغی یا دراتی فن پارہ ہے جو تماشائی کو متحرک کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے لیکن اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے دوبارہ جامد اور ٹھنڈا بنا دیتا ہے۔ کلاڈل اپنے ہیرو کو موت کے ذریعے منقلب کرتا ہے۔ بریخت قلب ماہیت پر یقین رکھتا ہے اور اسے ممکن بناتا ہے مگر بغیض حیات اور برائے حیات۔

جیسے جیسے جرمنی کے سیاسی حالات آزاد ذہن اور آزاد اظہار کے لیے خطرناک صورت اختیار کرتے گئے، ویسے ویسے بریخت کے فنی خط و خال زیادہ واضح اور قطعی ہوتے چلے گئے۔ بریخت اس منزل پر پہنچ کر یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور علم کا عملی اور قابلِ عمل استعمال کرے گا۔ بہت سے شاعر اور ادیب اور فنکار جو اب تک سیاست سے دامن کشیدہ رہے تھے، سیاست کی لہروں میں بہنے لگے ——— بریخت اور ہلن وائیگل، جس سے بعد میں بریخت نے شادی کی اور جس نے ہ جیالی ماں، میں ماں کا لافانی رول ادا کیا، گیتوں اور ڈراموں کے ہتھیاروں سے لیس میدان میں آگئے۔ تب یہ آواز صاف سنائی دینے لگی، " ہمیں بہت جلد کچھ کرنا ہوگا " لیکن تاریخ کب کسی کا انتظار کرتی ہے۔ وقت سوتے ہوؤں کو جگاتا بھی نہیں۔ وقت کے پاس اتنا وقت کہاں! جب جنون و وحشت کے دریا چڑھتے ہیں تو حق اور انصاف، دانش اور توازن کے سوتے سوکھ جاتے ہیں۔ تب حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے والے کتنے تنہا ہو جاتے ہیں ——— لیکن کیا بریخت تنہا تھا؟ فلم، اسٹیج، گیت، ادب، ہر ذریعۂ اظہار پر پہرے بٹھائے جا چکے تھے۔ چاہے فنکار کتنا ہی تنہا ہو جائے، اس کا بیدار ضمیر اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ ضمیر جاگ رہا تھا اور دہشت قریب آ رہی تھی۔ نظمیں اور گیت گونج رہے تھے۔ بہت سی تخلیقات ایسی تھیں جو صرف خلیے میں پڑھی جاتی تھیں۔ بہت سے گیت جرمنی کی سرحد سے پار چلے گئے لیکن جب بریخت جلاوطن تھا تو ان میں سے بہت سے گیت پھر اپنے وطن واپس پہنچ گئے اور شہروں اور قریوں میں گونجے۔ جو گیت لکھتا ہے، اس کے لیے سرحد پار کرنا آسان نہیں لیکن گیت سرحد پار کر لیتے ہیں ——— اس وقت بریخت ایک ہٹلر دشمن ڈرامے پر کام کر رہا تھا۔ اس کا نام تھا: "گول سر اور نوکیلے سر" یہ زمانہ تھا ۱۹۳۲-۳۳ء کا۔ وہ سیاہ دریا جس پر بند باندھنے کے خواب دیکھے جا رہے تھے، سارے بند توڑ چکا تھا ——— ۲۷ فروری، ۱۹۳۳ء کو صحافی لُدوگ مارکوس، برلن کے کورفوستن دیم پر ایک کیفے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ادیب جوزف روتھ اور ارنست واٹس تھے۔ خود مارکوس نے واقعہ اس طرح بیان کیا ہے : ویٹر ہماری میز کے پاس آیا اور بولا، "رِیش تاغ جل رہا ہے . . . " میں ٹیلی فون تک گیا اور میں نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے لائن ملائی جو میرا دوست تھا۔ میں چلایا، "رِیش تاغ جل رہا ہے . . . کس نے لگائی آگ ؟" دو میزوں سے جن کے درمیان میں کھڑا تھا، دو فقرے سنائی دیئے "نازیوں نے آگ لگائی . . . !" " . . . کمیونسٹوں نے آگ لگائی" ——— جواب عام طور پر سوالوں کو بھانپ لیتے ہیں۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ اگلے دن اوستیزکی، موشام اور بہت سے دوسرے دوست گرفتار کر لیے گئے۔"

۲۸ فروری کو جو لوگ فرار ہوئے، ان میں برتولت بریخت بھی تھا ——— دس مئی کو اس کی کتابیں، بہت سے جرمن اور غیر جرمن ادیبوں کی کتابوں کے ساتھ جلائی گئیں ——— بہت سے خواب، بہت سے نغمے، سب نذرِ آتش!

ٹ : پارلیمنٹ۔

فاشزم کا جہنم اپنے جبڑے پوری طرح کھول چکا تھا۔ چھ سال بعد ۱۹۳۹ء میں ساری دنیا کو ان جبڑوں کی خونخواری کا اندازہ ہوگیا۔

اس وقت اس دنیا میں برخت بھی موجود تھا، ہوا کے دوش پر سوار اور نغمہ خواں۔

بس، اب نہیں، میں انکار کرتا ہوں
ایک بار اس کی بدھنگی کو ڈھک دو، پھر دیکھو
وقار مجسّم ہو جائے گا!

(رشید: "وقارِ آدم")

پہلے پیٹ آتا ہے
پھر، فقط، اخلاقیات پر!

(برخت: "تھری پینی اوپیرا")

برخت کے ڈرامے "تھری پینی اوپیرا" کو سماجی چڑیا گھر بھی کہا گیا ہے۔

"رزمیہ تھیٹر" کا راستہ اسی چڑیا گھر سے ہو کر جاتا ہے۔

برخت کو اس چڑیا گھر سے گزرنے میں کبھی جھجک نہیں ہوئی۔ جھجک؟ یہ تو اس کا چنا ہوا راستہ تھا جو اس نے خود بنایا تھا۔
اس ڈرامے نے تماشائیوں کو صدمہ بھی پہنچایا، جھنجھوڑا اور چونکایا بھی۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ان کو سوچنے پر مجبور کیا ——— سوچنا مشکل کام ہے لیکن ایک بار کوئی سوچنا شروع کر دے تو یہ مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کام جتنا آسان ہو جاتا ہے، جینا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے ——— مگر یہ بھی سچ ہے کہ جو لوگ سچ مچ جیتے ہیں، وہ مشکل زندگی جیتے ہیں۔
برخت کا "جنگل کے ڈھول" سے "تھری پینی اوپیرا" تک ایک عہد آفریں اور بہت پیچیدہ جینئس کا سفر ہے ———

---

۲ : ہٹلر اور دوسرے نازی غنڈوں نے چیخ چیخ کر دنیا سے کہا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کی شرارت ہے ——— اور یں چند ہی دنوں میں لاکھوں کمیونسٹ جیلوں میں ٹھونس دیے گئے اور ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ——— دوسری عالمگیر جنگ میں ہٹلر اور نازیوں کی شکست کے بعد جو جرمن دستاویز ہاتھ لگیں، ان سے یہ تاریخی سچائی آخر سامنے آئی کہ کمیونسٹوں کو ختم کرنے کے لیے نازیوں نے خود جرمن پارلیمنٹ کو جلا ڈالا تھا ——— یاد رہے شمالی ویتنام پر بمباری کرنے کے لیے امریکی صدر نے ایسا ہی ایک بہانہ تراشا تھا ——— اور ابھی کل ہی خود ہمارے یہاں، ایمرجنسی کے اعلان کے لیے ایسا ہی بہانہ ڈھونڈا گیا تھا ——— اور یہی نہیں کہ آج فاشزم کا خطرہ ٹل گیا ہے۔
۳ : "زوال کا عروج" میں اس کا اشارہ پوری ڈرامائیت کے ساتھ موجود ہے۔

اس سفر کے شروع میں، "جنگل کے ڈھول" میں آخر میں یہ ہدایت نظر آتی ہے: "اس کا قہقہہ گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہے۔ وہ ڈھول کو چاند کے منہ پر دے مارتا ہے جو دراصل ایک لالٹین ہے۔ ڈھول اور چاند دریا میں لڑھک جاتے ہیں جس میں پانی نہیں ہے۔" آج بھی برخیت کے فن کے وسیع افق کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کی تخلیقی کاوشوں میں بعض تنقید نگاروں کو نمایاں طور پر ان میں Absurd Theatre کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ ابھی میں نے جس ہدایت کی عبارت نقل کی ہے، غالباً اس سے پڑھنے والا اسی نتیجے پر پہنچتا ہے لیکن اس زمانے میں جب "تھری پینی اوپیرا" اسٹیج پر پیش کیا گیا تو الفرڈ کانتورووائس نے کہا کہ اس میں دل ہلا دینے والی چیخیں بھی نہیں، اپنے آپ سے آگے نکل جانے کی اپیل بھی نہیں، وحشیانہ دل شکستگی بھی نہیں، باپ بیٹے کا تنازع بھی نہیں، نہ کوئی بغاوت ہوا، نہ کوئی بندھی ٹکی لنترانی ——— اس میں اور کچھ بھی نہیں، برہنہ ترین حقیقت پسندی اور حقیقت کے سوا ——— نہ بندھے ٹکے سکہ بند جواب، نہ خواہشات کی جانی بوجھی تکمیل اور نہ خوابوں کی من مانی تعبیر۔

لیکن اگر ڈرامے کے کردار کراگلر کے ان الفاظ کو ذہن میں رکھا جائے تو اس صورتِ حال کی المناکی دل کو دکھتی ہے جس کے بارے میں برخیت لکھ رہا ہے: "ہر شخص خود اپنی کھال میں سب سے اچھا رہتا ہے۔ . . میں مُستور ہوں، اور یہ سُور اب گھر جا رہا ہے . . . کل صبح رونا پیٹنا ختم ہو جائے گا۔ . . میں اپنے بستر میں ٹانگیں پھیلائے پڑا رہوں گا۔ تب میں آبادی بڑھاؤں گا تاکہ میرا نام و نشان نہ مٹے۔ . . مجھے یوں مت دیکھو پسوؤ! . . . لٹیرو! بدمعاشو!"

حقیقت یہ ہے، برخیت کے کراگلر اور بوشنر کے "وائزک" میں گہری مماثلت ہے۔ وائزک ایک غریب سپاہی ہے جس کی چولیں کسی ہوئی ہے۔ جو تمام ذلتوں اور مصیبتوں کو ٹھنڈے پانی کی طرح پی جاتا ہے لیکن وہ بالکل سچا ہے، قدرت کی طرح بے ریا جبلّی اور اس کی عقل میں ایک اپنا تیکھا پن ہے: "ہاں کپتان، مجھ میں کوئی اچھائی نہیں۔ . . دیکھو، ہم سیدھے سادے لوگ ہیں، جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم میں کوئی اچھائی نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے، نیچر کا دیا ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ . . لیکن اگر میں کوئی صاف ستھرا صاحب قسم کا آدمی ہوتا، اگر میرے سر پر ٹوپی ہوتی اور جیب میں گھڑی ہوتی اور زنجیر والی عینک۔ . . اور جو میں اونچی زبان میں چکنی چپڑی بات کر سکتا، تو پھر میں اچھا بننا چاہتا۔ اچھا بن کر کتنا اچھا لگتا ہوگا۔ . . مگر میں تو ایک غریب قسم کا آدمی ہوں۔ . ." وہی برخیت کی زبان، برخیت کا لہجہ ——— لیکن برخیت کا اپنا رنگ ہے، سب سے الگ!

پھر "گلیلیو" سے "جیالی ماں" تک کا سفر۔ پھر آگے "بھلی عورت شیزوان کی"، "آرتورو اوئی" اور "کاکیشین چاک سرکل" ——— برخیت کا انتھک ذہن ایک شاہکار کے بعد دوسرا شاہکار تخلیق کرتا چلا گیا۔ شاعری ہو یا ڈرامے یا مضامین، وہ زندگی کے بنیادی محرکات سے زندگی کے نئے نئے افق بناتا رہا، جو بھیانک اور سیاہ بھی ہیں، رنگا رنگ اور خیرہ کن بھی۔

اسکینڈینیوین ممالک اور امریکہ میں ہٹلری فاشزم کے عروج اور زوال کے دوران، اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال گزار کر زندگی کی دی ہوئی دولت زندگی کو لوٹا کر، بدترین سامراجی تہذیب دشمنی اور اخلاق سوزی کی عدالت کے کٹہرے کا عذاب سہنے کے بعد برخیت نے اپنے وطن کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا جس نے اسے تخلیقی زندگی کے کوئی آٹھ سال اور دیے جن کا ایک لمحہ بھی اس نے گنوایا نہیں۔ جرمنی کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے اس نے کچھ وقت سوئٹزرلینڈ میں گزارا جہاں ہٹلر شاہی کی سیاہ ترین رات میں زیورخ نے "جیالی ماں"، "گلیلیو" اور "بھلی عورت شیزوان کی" جیسے ڈرامے پیش کیے تھے۔

برخیت کی زندگی میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کھوئی ہوئی جنت کو پھر سے پا لینے کا دن تھا ——— جلاوطنی کی لمبی دوڑ ختم ہوئی اور وہ پھر ایک بار اس برلن میں تھا جہاں کوئی ربع صدی پہلے اس نے رزمیہ تھیٹر کا پرچم لہرایا تھا ——— ایسے ہزاروں اندھیروں میں امید کی ایک کرن نظر آئی تھی اور اس نے اس کرن کو دل میں چھپا لیا تھا۔ اب اس کا دل سورج کی طرح دہک رہا تھا۔

وقت کم تھا اور کرنے کے کام اب بھی بہت تھے۔
ہماری چھیڑی ہوئی جنگ کے شعلے کب کے بجھ چکے تھے لیکن جنگ کی بنائی ہوئی دیوار برلن کے سینے پر کھڑی تھی ——
برخیت تاریخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا جانتا تھا۔

اے برتیخت . . . ! شخصیت سے محروم برتیخت، اب تم اپنی چمڑے کی جیکٹ میں کیسے کیسے شہروں میں آوارہ پھرتے ہو جہاں کی تم نہ بولیاں سمجھتے ہو نہ کبھی سمجھو گے کیونکہ زبان اور روح دونوں اس اجنبی اناپ شناپ سے ہمیشہ بلند رہتی ہیں . . . یہ سچ ہے کہ تمہارے دل میں جہاں گشتی کے خواب ہمیشہ سے پل رہے تھے۔ وہی کیپلنگ اور گوگاں والی بات ! جنگل میں نکل جانے کی تڑپ، بمبئی کا رخ کرنے کا خبط۔ قدیم جنگل کی پکار، قصے کہانیوں کے ہندوستان اور علم و دانش کے گہوارے چین کا قصد۔ تمہارے دل میں "نوآبادکاروں" کا دل دھڑکتا ہے۔ لڑکپن کی رومانیت اور بھاگ جانے کی تڑپ نے کبھی تمہارے شاعری زدہ خون کو نہیں چھوڑا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ نہیں ہے جو تم چاہتے تھے . . . انھوں نے تم کو مہاجر بنا دیا . . . تمہاری حالت اس شکار کی ہے، شکاری جس کا پیچھا کر رہے ہیں . . . تم ایک ایسے آدمی ہو، جس کے خیالات، جس کے جذبات، جس کے منصوبے، سب جرمن دھرتی، جرمن عوام کے گرد گھومتے ہیں، جن کا مستقبل تمہارا مستقبل ہوگا، اس حقیقت کے باوجود کہ ان کا حال کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ اس وقت تک تلاش کرتے رہو، چاہتے رہو، جدوجہد کرتے رہو . . . اسی رنگ میں تم لندن کے کہرے میں ملے تھے، چمڑے کی جیکٹ کے اوپر اور انگلش ٹوپی کے نیچے، تمام جرمن چہروں سے زیادہ جرمن چہرہ تمہارا، شیلر کا سر، لیکن طوفان دیدہ اور تیکھا . . .

(برتھول ویدکی تحریر : ۱۹۳۸ء۔)

زندگی برخیت سے جتنا کھیلی، برخیت بھی زندگی سے اتنا ہی کھیلا۔ اس کے مزاج اور شخصیت میں جو تیکھا پن تھا، وہ بہت کم عمری میں ہی اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ اس کی جڑیں اس جینئس میں پیوست تھیں جو عہد آفریں تھا۔ وہ شکسپیئر، دستوئیفسکی، اور تالستائی کی صف کا جینئس تھا —— اس جینئس کو آشکار کرنے والی زندگی کب شروع ہوئی تھی اور کیسے ؟
ویون نشت وانگر نے ۱۹۲۸ء میں ۱۹-۱۹۱۸ء کے برخیت کا جو حال بیان کیا ہے، اس سے جہاں ایک بجید لاابالی

اور سرنجاں مرنج قسم کے نوجوان کے نقوش ملتے ہیں وہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پوری طرح سے آگ میں تپ رہا تھا۔ ——— لایون کے میونخ کے فلیٹ پر کسی نے دستک دی۔ یہ جرمن ابال کے بعد کے دن تھے۔ دروازہ کھلا تو ایک بہت دبلا پتلا نوجوان نظر آیا۔ ایک ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ نوجوان نے بڑے بے ہنگم انداز سے شیو کیا ہے۔ اس کے کپڑے بھی بڑے اول جلول قسم کے تھے۔ وہ پورے وقت دیوار کے قریب رہا۔ لہجہ اس کا سوبین تھا۔ اس نے کوئی ڈرامہ لکھا تھا۔ نام اس کا تھا برتولت برخیت اور ڈرامہ تھا "اسپارٹکس" یہ

زیادہ تر مصنفین اپنا کوئی مسودہ پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ چیز اپنے دل کے خون سے چھان کر نکالی ہے۔ لیکن اس نوجوان نے اس بات پر زور دیا کہ اس نے "اسپارٹکس" صرف پیسہ کمانے کے لیے لکھا تھا۔

وہ دور جرمنی میں انتہائی جذباتی قسم کے ڈراموں کا تھا۔ ان میں سماجی اداروں کی برائی کی جاتی تھی لیکن انسان کا بڑا گن گان ہوتا تھا ——— برخیت کے ڈرامے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

لایون نے ڈرامہ پڑھنے کے بعد خستہ حال نوجوان کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھلا ایسا ڈرامہ کوئی اپنی غربت سے مجبور ہو کر کیسے لکھ سکتا ہے ——— نوجوان ڈرامہ نگار کو بڑا تاؤ آیا اور وہ اس بری طرح برسا کہ اس کی بات سمجھنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ اس نے وہ ڈرامہ صرف پیسوں کے لیے لکھا ہے ——— ہاں، ایک اور ڈرامہ ہے اس کے پاس جو واقعی اچھا ہے۔

بات کا وہ دھنی تھا۔ پہلی ہی فرصت میں وہ دوسرا ڈرامہ لے کر آ گیا۔ اور یہ دوسرا ڈرامہ "بال" تھا ——— اپنی قسم کا بڑا ہی ہنگامہ خیز ڈرامہ ——— وہ بڑے خطرناک دن تھے۔ عارضی جرمن انقلاب کے بعد فوجیوں نے دوبارہ میونخ پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے تھے ——— ریوالور سے لیس سپاہی دانشوروں کے گھروں میں گھستے تھے اور تلاشی لیتے تھے۔ جب لایون کے گھر پر چھاپہ پڑا تو پہلی چیز جوان کے ہاتھ لگی وہ "اسپارٹکس" کا مسودہ تھا۔ "مجرم" کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ سینکڑوں موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے ——— چھاپہ مار دستے میں کچھ سپاہی ایسے تھے جو "مجرم" دانشور کو جانتے تھے۔ انھوں نے دانشور کو پہچان لیا اور اس طرح اس کی جان بچی ——— بعد میں جب "اسپارٹکس" اسٹیج پر پیش کیا گیا تو اس کا نام بدل دیا گیا ——— : "جنگل کے ڈھول"

اس سے بھی پہلے، ۱۹۱۵ء میں، جب پہلی عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، ان دنوں کی یادوں میں ولہم ہدسل کے یہاں یہ عبارت ملتی ہے: "تب میں آگس برگ کے ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا ——— ایک اسکول کا طالب علم میرے پاس آیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی کچھ نظمیں بھی لایا تھا۔ ان نظموں کا کچھ نہ کچھ واسطہ جنگ سے تھا۔ بڑا سحر انگیز آہنگ تھا ان کا، ہر قسم کی روایتی تک بندی سے پاک۔ ان میں بڑی آگ تھی۔ یہ جرمن شاعری کے لیے ایک نیا تجربہ تھا ——— کچھ وہی بات تھی ان میں، جو بودلیر فرانسیسی شاعری میں لے کر ابھرا تھا۔۔۔"

وہی جرمن شاعر اور ڈرامہ نگار جو جرمن سرزمین سے طلوع ہوا تھا، ۱۹۵۶ء میں ہیگل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا جس کی جدلیات نے زندگی بھر اس کا دل گرمایا اور جس کو مارکس کی تاریخی مادیت نے مستقبل کی راہ دکھائی ——— کہتے ہیں، برخیت کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ صرف اس کا نام ہے اور کچھ بھی نہیں ——— تغیر کی تاریخ کو اس سے زیادہ کی ضرورت کیا ہے۔

گوئٹے کے یہ الفاظ شاید اس کا سب سے معنی خیز کتبہ بنتے، کتبہ بھی اور ایک شکست نا آشنا تخلیق کار کی روح کے راز دال بھی۔

"میں خود کیا ہوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پایا، سب کو جمع کر دیا اور اس سے کام لیا۔ میرے قلم کی نشوونما ان گنت افراد کی دین ہے، احمقوں کی بھی اور دانش مندوں کی بھی، حساس لوگوں کی بھی اور کند ذہن ناتراش قسم کی ہستیوں کی بھی۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے، سب نے اپنے خیال و فکر، اپنی صلاحیتیں، اپنی امیدیں اور نقطۂ نظر مجھے دیے ہیں۔ میں نے اکثر وہ فصل کاٹی ہے جس کے بیج دوسروں نے بوئے تھے۔ میرا کام اس اجتماعی وجود کا کارنامہ ہے جس کا نام ہے گوئٹے۔"

اور اس کا دوسرا نام ہے بریخت!

چہرے : ۲۱۷

(میں، برتولت برخیت، آیا ہوں کالے جنگلوں سے)

○

ان کے قدموں تلے، نالے

ان کے درون کچھ بھی نہیں

اوپر ——— دھواں

اور ہم تھے ان میں اسیر

کچھ نہ تھا جس سے ہم دل سیر کرتے

ہم دیکھتے دیکھتے اوجھل ہو گئے، کھو گئے

وہ بھی یوں ہی کھو جائیں گے

ہماری طرح

○

چیرمین : مسٹر اسٹرلنگ، آپ کو کچھ اور سوال پوچھنا ہے؟

اسٹرلنگ : میں مسٹر برخیت سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیا انھوں نے وہ نظم، بلکہ وہ گیت لکھا ہے جس کا عنوان ہے "بڑھے چلو کہ ہم بھولے نہیں ہیں"

مکڈول : "بڑھے چلو . . ." کیا؟

اسٹرلنگ : "بڑھے چلو کہ ہم بھولے نہیں ہیں"

برخیت : مجھے کچھ دھیان نہیں آرہا ہے۔ شاید اس کی وجہ انگریزی عنوان ہو۔

اسٹرلنگ : کیا آپ ان کی خاطر اس کا ترجمہ جرمن میں کریں گے؟

(بام گاست جرمن میں ترجمہ کرتے ہیں)

برخیت : اوہ، اب میں سمجھا۔ ہاں!

اسٹرلنگ : کیا آپ اس کے الفاظ سے مانوس ہیں؟

برخیت : ہاں!

اسٹرلنگ : کیا کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ میں گیت پڑھ کر سناؤں؟

چیرمین : ہاں۔ کوئی اعتراض نہیں۔ پڑھیے!

اسٹرلنگ : (پڑھتا ہے)

بڑھے چلو کہ ہم نے اپنی طاقت نہیں بھلائی
جس کا مظاہرہ
ہم نے جیتی ہوئی لڑائیوں میں کیا تھا
جو کچھ ہونا ہے ہو، بجلی گرنا ہے تو گرے
بڑھے چلو کہ ہم نے نہیں بھلایا ہے کہ جب ہم ایک ہوں
تو ہماری طاقت کتنی بڑھ جاتی ہے
یہی، ہمارے ہاتھ کام کرتے ہیں
سڑکیں بناتے ہیں
دیواریں اور وہ مینار بھی
اور جو ہم اُن کو اپنا کہیں تو مجرم کیوں؟
("بڑھے چلو" والے ٹکڑے کی تکرار)
بڑھے چلو، مینار کی طرف، شہر کے کوچہ و بازار سے،
ساری دھرتی سے، ساری دنیا سے،
بڑھے چلو، بڑھے چلو، شہر یہ آخر کس کا ہے؟ دنیا یہ آخر کس کی ہے؟
بڑھے چلو کہ ہم بھولے نہیں کہ بھوک اور درد میں ہم کیسے ایک ہوئے
جو کچھ ہونا ہے ہو، بجلی گرنا ہے تو گرے، بڑھے چلو کہ ہم نے بھلایا نہیں ہے
جتنے کو پوری دنیا پڑی ہے
ہم دنیا کو آزاد کر دیں گے کالی پرچھائیوں سے
جب ہر دکان، ہر کمرہ، ہر سڑک، ہر مرغزار
گھن سے چھوٹ جائے گا
تب یہ دنیا اپنی ہوگی!
کیا یہ گیت آپ نے لکھا ہے، مسٹر برخیت؟

برخیت : نہیں۔ میں نے تو ایک جرمن نظم لکھی تھی لیکن وہ اس سے بہت مختلف تھی۔

(تبصرہ)

(غیر امریکی سرگرمیوں سے متعلق امریکی ہاؤس کمیٹی کی سماعتوں سے اقتباس : ۳۰ر اکتوبر، ۱۹۴۷ء)

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد امریکہ میں جو وچ ہنٹ شروع ہوا تھا، اس کی لپیٹ میں بڑے بڑے دانشور، فنکار، مفکر اور سائنسداں تک آگئے تھے۔ یہ امریکہ میں "انسانی حقوق" کا نقطۂ عروج تھا جس کی فصل وہائٹ ہاؤس میں کاٹی جاتی تھی۔ اس فصل کی قیمت صرف برگ جیسے ہی کو نہیں بلکہ چارلی چپلن اور پال رابسن کو بھی ادا کرنا پڑی۔ برخت سے، پیدائش سے لے کر کمیونزم سے وابستگی کے متعلق تک، سوالات کیے گئے ——— سماعت کے دوران ایک موقع پر برخت نے کہا: "نہیں میں کہوں گا . . . دیکھیے، ادیب کا یہ حق ہے اور فرض بھی کہ عوام کو اپنے زمانے کے تصورات وخیالات سے آگاہ کرے۔ اب اس ڈرامے میں ظاہر ہے . . . ، ہاں، میں نے کوئی بیس ڈرامے لکھے ہیں . . . اس ڈرامے میں میں نے ان جرمن مزدوروں کے احساسات اور تصورات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اس وقت ہٹلر کے خلاف لڑ رہے تھے . . . میں نے ساتھ ہی ایک نظم . . ." برخت کی بات کاٹ دی گئی اور پوچھا گیا: "ہٹلر کے خلاف لڑائی؟ یہی کہا تھا آپ نے؟" برخت نے جواب دیا: "ہاں!"

رنگ منچ

سلسلہ نمبر : ۲۲۲
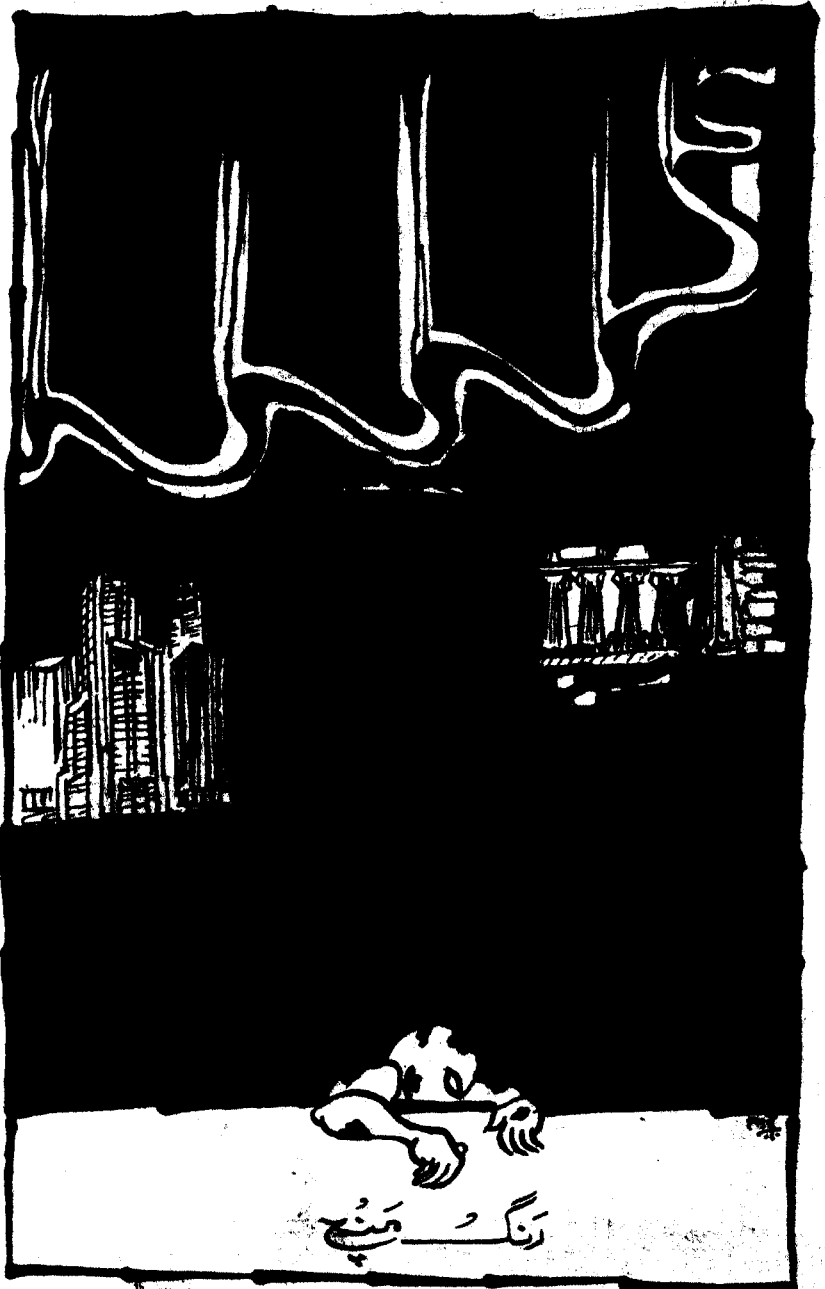
بریخت

زوال کا عروج

چند قابلِ ذکر باتیں

○

DER AUFHALTSAME AUFSTIEG DES ARTURO UI ، جرمن زبان میں بریخت کے اس ڈرامے کا نام۔

THE RESISTIBLE RISE OF ARTURO UI ، والف من ہیم کے انگریزی ترجمے میں اس ڈرامے کا نام۔

○

۱: بریخت نے یہ ڈرامہ ہٹلر کے انتہائی عروج کے زمانے میں، یعنی ۱۹۴۱ء میں لکھا تھا۔

۲: پہلی بار یہ ڈرامہ اسٹٹ گارٹ کے مقام پر دس نومبر ۱۹۵۸ء کو کھیلا گیا تھا۔ ہدایت کے فرائض پیٹر پالیتزش نے سرانجام دیے تھے۔

۳: پھر یہ ڈرامہ تئیس مارچ ۱۹۵۹ء کو برلن میں برلنر اینسیمبل نے کھیلا۔ ہدایت کے ذمہ دار تھے پیٹر اور مانفریڈ ویکورتھ۔ ایک ہانڈشیل نے اُوئی کا کردار ادا کیا۔

۴: برطانیہ میں یہ ڈرامہ پہلی بار ۱۹۶۷ء میں کھیلا گیا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مدتوں کھیلا جاتا رہا ——— اُوئی کے کردار میں لیونارڈ روزی تر کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔

۵: پھر بی بی سی نے اس ڈرامے پر ایک ٹی وی فلم بنائی جو بہت پسند کی گئی۔ فلم میں اُوئی کا کردار نکول ولیمسن نے ادا کیا تھا۔

۶: مانفورسپو ۔ ۱۹۷۰ء میں انور عظیم کے اُردو ترجمے میں یہی ڈرامہ نئی دلی کے بریختین ہیرو نے کھیلا ——— امی تابیہ اس گپتا نے اُوئی کا کردار بھی ادا کیا اور ہدایت کے فرائض بھی سرانجام دیے۔

کردار

اناؤنسر

فلیک
کاروتھر
بُچر
مل بیری
کلارک

} تاجر کولی فلاور ٹرسٹ کے مُنتظمین

شیٹ، جہازوں کے کارخانے کا مالک

بڈھا ڈاگس برو

نوجوان ڈاگس برو

آرتورو اُئی، داداؤں کا سردار

ارنستو روما، اُئی کا دستِ راست

ایمانوئل گری، دادا

گوزوپ جیوسیپ گی وولا، دادا

ٹیڈ ریگ، 'اسٹار' اخبار کا نامہ نگار

ڈوک ڈیزی

باؤل، شیٹ کا اکاؤنٹنٹ

گُڈول اور گیفلز، کونسل ہال کے ممبران

اوکیسی، محقق

ایک اداکار

ہُوک، سبزی فروش

مُلزم فِش

وکیلِ صفائی

جج

ڈاکٹر

سرکاری وکیل

ایک عورت

نوجوان اِنّا، روما کا ساتھی

ایک پست قد شخص

اگناتس ڈل فیٹ

بیٹی ڈل فیٹ، اگناتس کی بیوی

ڈاگس برو کا خانساماں

بہت سے باڈی گارڈ

بہت سے بندوقچی

شکاگو اور سیسرو کے سبزی ترکاری فروش

بہت سے نامہ نگار

ابتدائیہ

اناؤنسر پردے کی جانب قدم بڑھاتا ہے ـــــــ پردے پر بڑے بڑے پوسٹر چپکا دیے گئے ہیں۔

بندرگاہ سرکاری امداد اسکینڈل کا کچا چٹھا

ڈاگس بورو کی وصیت اور اعتراف کی سچی کہانی

گودام آتش زنی کیس میں ہنگامہ

ارنستو روما دادا کا قتل دوستوں کے ہاتھوں

سیسرو پر غنڈوں کا راج

اگناتس ڈل فیٹ کو بلیک میل کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا

بھدے نے لگتے ہیں مقبول زعم کی دھن۔

اناؤنسر : دوستو آج رات ہم آپ کے سامنے ———
او چھوکرو، بیٹھ جاؤ چپ چاپ پچھلی قطار میں!
اور محترمہ، آپ کا ہیٹ تو رکاوٹ بن رہا ہے!
——— تو آج رات ہم آپ کے سامنے
داداؤں کا عظیم تاریخی ڈرامہ پیش کریں گے
جس میں، پہلی بار، آپ دیکھیں گے
بندرگاہ سرکاری امداد اسکینڈل کے بارے میں سچائی۔
اور پھر ہم آپ کے بھلے کے لیے پیش کریں گے
ڈاگس بورو کا اعتراف اور وصیت نامہ۔
آرتورو اوئی کا عروج اور سٹہ بازار کا زوال۔
بدنام گودام آتش زنی مقدمہ ——— اس کو کہتے ہیں دھندا!
ڈل فیٹ کا قتل ——— یعنی انصاف کی آنکھوں پر پردہ!
داداؤں کی بھڑنت! ازستورو ما کا قتل!
——— اور ان تمام واقعات کی معراج۔ ۔ ۔ یا انتہا ہوگا
ہمارا غضب کا آخری تماشہ :
غنڈوں کا شہر سسرو پر قبضہ۔
آپ دیکھیں گے،
ممتاز اداکاروں کو
آج کے نمایاں داداؤں کے روپ میں۔
کچھ مردہ، کچھ زندہ۔ کچھ ایسے جو وقت کے ساتھ مٹ گئے،
کچھ جو زندہ ہیں
کچھ پیدائشی اور کچھ بنائے گھڑے دادا ———
مثلاً، جیسے یہ اپنا بھلا مانس ایماندار بڈھا ڈاگس بورو!

بڈھا ڈاگس بورو پردے کے سامنے آتا ہے۔

اس کے بال سفید ہیں، دل کالا۔
بڈھے بدچلن، اب تم پیچھے ہٹ سکتے ہو۔

ڈکنز سر جھکاتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

ہماری فہرست میں اگلی شے ہے گی دولا ——

گی دولا پردے کے سامنے آ چکا ہے۔

گل فروش گی دولا۔ اس کی زبان حد درجہ تیار ہے اور یہ جانتا ہے
کہ آپ کو گائے کے نام پر پیڑ کیسے بیچی جا سکتی ہے!
کہاوت ہے، جھوٹ کی ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں۔
ذرا اپنی آنکھوں کا استعمال کیجیے اور اس کی ٹانگوں پر نظر ڈالیے۔

گی دولا لنگڑاتے ہوئے پیچھے ہٹتا ہے۔

اور اب ایمانوئل گری، پہلے درجے کا مسخرہ۔
باہر آؤ، ذرا دیکھیں تو سہی تجھے، تو ہے کیا بلا!

گری پردے کے سامنے آتا ہے اور ناظرین کی طرف ہاتھ ہلاتا ہے۔

ہر زمانے کے جانے پہچانے بڑے قاتلوں میں سے ایک۔
ہشت، دفان ہو!

گری غصیلی نظروں سے دیکھتا ہے اور پیچھے ہٹتا ہے۔

اور اب آخر میں عوام کا دشمن نمبر ایک
آرتورو اُوئی!
کسی بھی زمانے میں اتنا بڑا دادا
نہیں ہوا ——
جسے قدرت نے ہم پر نازل کیا
ہمارے گناہوں کے کارن، ہماری کمزوریوں کے کارن،
ہماری حماقتوں کے کارن!

آدھا آدمی ایک طرف سے منچ کے سامنے آتا ہے اور فٹ لائٹس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسری طرف سے باہر چلا جاتا ہے۔

کیا یہ تمہیں رچرڈ دی تھرڈ کا دھیان نہیں دلاتا؟
جب سفید اور لال گلاب کے لیے
جنگیں لڑی جاتی تھیں ———
اس زمانے سے آج تک، اب تک،
کیا کسی نے سنی ہیں
خون کے بھیانک
اور بے اندازہ دریا بہانے کی کہانیاں؟
——— اسی کارن، تھیٹر قنطالیہ نے اخراجات کی پروا کیے بنا،
آرتورو اوئی کے نظر فریب شرمناک داؤ پیچ کو
شاندار طریقے سے پیش کرنے کا قصد
کیا ہے۔
ہاں، ایک بات اور، آج کی رات
آپ جو کچھ دیکھیں گے، سچ ہے۔
نہ کچھ گھڑا گیا ہے اور نہ کچھ نیا ہے
اور نہ ہی کسی کے کہنے پر آپ کے لیے کچھ تیار کیا گیا ہے۔
داداؤں کا یہ ڈرامہ،
جو ہم پیش کر رہے ہیں،
پورے برِ اعظم کے علم میں ہے۔

جیسے ہی دھن شدت سے ابھرتی ہے اور مشین گن کی آواز جیسے ہی دھن میں جذب ہوتی ہے، اناؤنسر اپنی اہمیت کے احساس سے پھولا ہوا پیچھے ہٹتا ہے۔

ایک

الف

ضلع مالیات : پانچ تاجر جو کولی فلاور ڈسٹ کے منتظمین ہیں، داخل ہوتے ہیں۔

فلیک : کیا بُرا زمانہ ہے!

کلارک : لگتا ہے، اپنی پیاری دیرینہ محبوبہ شکاگو کو مارکیٹ جاتے ہوئے اپنی جیب کے پھٹی ہونے کا احساس ہوا ہے اور اب وہ گندے نالے میں اپنے کھوئے ہوئے سکے ڈھونڈ رہی ہے۔

کالتھر : پچھلی جمعرات کو جوزنے مجھے اور اسّی دوسرے لوگوں کو ڈنر کی دعوت پر بلایا تھا، جو اس سوموار کے لیے طے تھی ——— اور جو ہم جاتے، وہاں نیلامیے کے علاوہ کوئی نہ ہوتا جو ہماری آؤ بھگت کرتا ——— کیا قیامت کہ بھرے پُرے لوگ کسی کنواری کے چہرے پر رنگ آنے جانے کی سی تیزی سے مفلس محتاج ہو گئے ——— اس شہر کے لیے ترکاریوں سے لدی کشتیاں اب بھی جھیلوں میں چلتی ہیں مگر گاہک کا کہیں کوئی نشان نہیں۔

مُولشر : جیسے ظلمتِ نیم روز ہو۔

مل بنیری : رابر اور کلائیو کے ہاں نیلامی ہو رہی ہے۔

کلارک : وہیلر جو باوا آدم کے زمانے سے پھل درآمد کرتا تھا، اب دیوالیہ ہے۔

فلیک : اور ڈک ہیولاک کے گراج بھی لد گئے۔

کالتھر : شیٹ کہاں ہے؟

فلیک : وہ؟ ارے وہ تو بینکوں کے دروازے کھٹکھٹاتا پھر رہا ہے۔

کلارک : کیا؟ شیٹ؟

وقفہ

دوسرے لفظوں میں یہی ناکہ پھول گوبھی کی تجارت اس شہر سے گئی۔

مُولشر : صاحبان، گردن اونچی کیجیے! ابھی ہم مرے نہیں ہیں۔

مل بیری : یہ کوئی زندگی ہے؟

مولشر : ارے یہ اداسی کس لیے؟ اس شہر میں پیداوار کی تجارت بنیادی طور پر تسلی بخش ہے۔ اچھا وقت ہو یا بُرا، چالیس لاکھ کی آبادی کے شہر کو تازہ ترکاریوں کی ضرورت رہتی ہے۔ غم نہ کرو۔ ہم مشکلوں سے بچ نکلیں گے۔

کالتھر : دوکانوں اور بازاروں کا کیا حال ہے؟

مل بیری : بہت خراب۔ گاہک آدھا کرم کلّہ خریدتے ہیں اور وہ بھی ادھار۔

کلاڈک : ہماری پھول گوبھیاں سڑ رہی ہیں۔

فلیک : سفو، برآمدے میں ایک شخص انتظار کر رہا ہے۔ میں نے صرف اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا نام ہے اُوئی . . .

کلاڈک : وہ دادا ؟

فلیک : ہاں وہی۔ اس نے نسٹر اندسو نگلی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مصیبت سے بچنے کا ایک راستہ ہے اور اس کا دست راست اُنستو ہوما کہتا ہے کہ وہ دوکانداروں کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اوروں کی پھول گوبھیوں کا دھندا کرنا اچھا نہیں ہے۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ ہماری آمدنی دوگنی ہو جائے گی کیونکہ، وہ کہتا ہے، دوکاندار کفن خریدنے کی جگہ پھول گوبھی خریدنا پسند کریں گے۔

سب بے دلی سے ہنستے ہیں۔

کاروتھر : یہ ظلم ہے۔

مل بیری : (بے تحاشا ہنستے ہوئے) بم اور مشین گنیں! اسے کہتے ہیں دھندے کا نیا فلسفہ! بس کام بن گیا۔ کولی فلاور ٹرسٹ میں نیا خون، نئی جان۔ انھوں نے سنا کہ ہماری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے، سو وہ ہماری کھوئی ہوئی نیندیں لیے آ گئے ہیں ——— تو ساتھیو، اب ہمیں انتخاب کرنا پڑے گا ——— ایک طرف اُوئی ہے اور دوسری طرف سالویشن آرمی کا خیرات گھر ——— بتاؤ، تمھیں اپنے پیالے میں کون سا شوربہ پسند ہے ؟

کلاڈک : مجھے تو لگتا ہے، اوئی کا شوربہ کچھ زیادہ ہی گرم ہے!

کاروتھر : میں کہتا ہوں، اس کو باہر نکال پھینکو!

مل بیری : پھینکو ضرور مگر ذرا آہستگی سے ——— کیا ہم جانتے ہیں ہم پر اور کیا بپتا پڑنے والی ہے ؟

سب ہنستے ہیں۔

فلیک : (ہوشہ سے) ڈاگس بورو اور میونسپل قرضے کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ (باقیوں سے) ہوشہ اور میں نے مل کر کھچڑی پکائی ہے کہ ہماری یہ پیسوں کی مصیبت ٹل جائے ——— شہر ہم سے ٹیکس لیتا ہے۔ لیتا ہے یا نہیں ؟ لیتا ہے۔ تو پھر ہمیں قرضہ بھی دو اور یہ قرضہ ہماری جیبوں میں تو جائے گا نہیں! ہم گودیاں بنوائیں گے کہ ترکاریاں سستی آ سکیں ——— ڈاگس بورو بارسوخ شخص ہے، وہ چاہے تو بیڑا پار ہو سکتا ہے۔ تم ڈاگس بورو سے ملے تھے ؟

ہوشہ : ہاں میں ملا تھا۔ وہ اس قصے کو چمٹے سے بھی چھونے کو تیار نہیں۔

فلیک : تیار نہیں ؟ لعنت ہے۔ بندرگاہ پر اس کا حکم چلتا ہے اور وہ ہماری مدد کرنے کو تیار نہیں!

کاروتھرز : میں تو برسوں سے اس کے الیکشن فنڈ میں چندہ دے رہا ہوں!

مل بیوری : لعنت بھیجو ——— تمھیں یاد ہے، وہ شیٹ کا بھٹیارخانہ چلایا کرتا تھا اور سیاست کو گھورا بننے سے پہلے وہ ٹرسٹ کی روٹیاں توڑتا تھا۔ اسے کہتے ہیں، گھٹیا نمک حرامی ——— ٹھیک، میں تم سے کیا کہتا تھا؟ یہی ناکہ وفا نام کی چیز اب نہیں رہی دُنیا میں۔ پیسے کی کمی تو ہے ہی، وفاداری اس سے بھی کم ہے ——— چوہے ڈوبتے جہاز سے کس طرح بھاگ رہے ہیں۔ دوست دشمن ہو گئے ہیں۔ ملازم مالکوں کی چھاتیوں پر سوار ہیں اور ——— اور وہ ہمارے پُرانے بھٹیارخانے کا بھٹیارا جو ہمیں دیکھ کر کھل اُٹھتا تھا، اب ہمیں دیکھتا تک نہیں۔

ہاں بھئی، اندھیری رات میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

کاروتھرز : مجھے ڈاگس بورو سے یہ امید نہیں تھی۔

فلیک : آخر اس نے بہانہ کیا بنایا ہے؟

ہُوشَر : وہ کہتا ہے، ہمارے منصوبے میں کچھ گول مال ہے۔

فلیک : گودیاں بنوانے کے منصوبے میں گول مال؟ ذرا ان لوگوں کے بارے میں سوچو جنھیں ہم اس کام پر لگائیں گے۔

ہُوشَر : وہ کہتا ہے، اسے ہمارے گودیاں بنوانے کے بارے میں ہی شبہ ہے۔

فلیک : شرمناک!

ہُوشَر : کیا؟ گودیاں نہ بنوانا؟

فلیک : نہیں، اس کے شبہات!

کلارک : تو پھر کسی اور کو پکڑو اور قرضہ حاصل کرو۔

مل بیوری : ہاں، قرضہ دینے والے اور بھی لوگ ہیں۔

ہُوشَر : درست! لیکن کسی میں ڈاگس بورو والی بات نہیں ——— ذرا سی دھیرج ——— آدمی اچھا ہے وہ۔

کلارک : اچھا؟

ہُوشَر : وہ ایماندار ہے اور بڑی بات یہ ہے، وہ ایماندار سمجھا جاتا ہے۔

کلارک : بکواس!

ہُوشَر : نہیں، اسے اپنے نام، اپنی شہرت کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے اور یہ صاف ظاہر ہے۔

فلیک : میں ہزار لعنت بھیجتا ہوں۔ ہماری ضرورت میونسپلٹی سے قرضہ حاصل کرنے کی ہے۔ اس کا نام اس کی شہرت اس کا درد سر ہے۔

ہُوشَر : تم یہ سمجھتے ہو؟ میں تو سمجھتا ہوں یہ ہمارا درد سر ہے۔ اس قسم کا قرض وہی لے کر دے سکتا ہے جس کی ایمانداری کی لوگ قسم کھاتے ہوں۔ اس سے ثبوت اور ضمانتیں مانگنے کی کوئی ہمت کرے گا؟ مانگتے شرم نہیں آئے گی انھیں؟ اس قسم کا آدمی ڈاگس بورو ہے۔ بڈھا ڈاگس بورو ہی ہمارے قرض کی ضمانت بن سکتا ہے۔ میں بتاتا ہوں ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ ان سب کو اس پر بھروسہ ہے۔ خدا سے ان کا بھروسہ اٹھ سکتا ہے، ڈاگس بورو

سے نہیں۔ کنجوس سے کنجوس آدمی بھی، جو کوڑی کوڑی دانت سے پکڑتا ہے، اپنی آخری کوڑی بھی اس کے یہاں امانت رکھوانے میں نہیں ہچکچائے گا۔ وہ ایمانداری کا پتلا ہے۔ اسّی برس میں کیا مجال ہے، جو وہ ایک بار بھی ڈگمگایا ہو۔ ایسا آدمی تو سونے میں تلنے کے قابل ہے، خاص طور پر ایسے لوگوں کی نظر میں جو گودیاں بنوانے کا منصوبہ رکھتے ہوں اور وہ بھی ڈھیر ڈھیر۔

فلیک : اچھا بوشر! یہی سہی کہ وہ سونے میں تلنے کے قابل ہے۔ وہ جس سودے کی حامی بھر لے، وہ طے ہو جاتا ہے لیکن وہ ہمارے سودے کی حامی تو بھرتا نہیں ہے۔

کلارک : نہیں، نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ شہر کا خزانہ لنگر خانہ تو نہیں!

مل ہیری : اور سب کچھ شہر کے لیے اور شہر اپنے لیے!

کاروتھر : شرمناک! رتی بھر ذرا بھی تو نہیں ہے اس میں۔

مل ہیری : اس نے اپنا دل پکا کر لیا ہے۔ بھونچال بھی آ جائے تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوگا۔ اس کی نظر میں شہر مٹی گارے کا شہر نہیں جہاں لوگ رہتے ہیں جو چونگی محصول دیتے ہیں، کرایہ دیتے ہیں۔ شہر تو اس کے لیے کاغذ پر پھیلے ہوئے بائبل کے لفظوں کی طرح مقدس ہے۔ اُف، وہ آدمی! وہ ہمیشہ میرے اعصاب پر سوار رہا ہے۔

کلارک : وہ کبھی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اسے بھلا پھول گوبھی اور مال کی ڈھلائی کے دھندے سے کیا لینا دینا؟ شہر میں ترکاری پڑی سڑتی ہے تو اس کی بلا سے! کیا مجال جو وہ اپنی چھنگلی بھی ہلا دے! انیس برس ہو گئے ہیں، نہیں، بیس برس، اور ہم اس کے چناؤ فنڈ میں پیسہ بھرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس تمام عرصے میں اگر اس نے کبھی پھول گوبھی دیکھی ہے تو وہ دیکھی ہے سالن میں، اپنی رکابی میں۔ رہی بات گراج کی تو اس نے کبھی کسی گراج میں قدم رکھا ہی نہیں۔

بوشر : تم ٹھیک کہتے ہو۔

کلارک : اس سے تو بس شیطان سمجھے!

بوشر : نہیں، اسے تو ہم ہی سمجھیں گے!

فلیک : لیکن کلارک تو کہتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو ہمیں ٹکا سا جواب دے دیا ہے۔

بوشر : سو تو ہے۔ لیکن کلارک نے یہ بھی تو بتایا ہے ایسا کیوں ہوا؟

کلارک : حرام زادے کو یہ نہیں معلوم کہ دُم کدھر ہے۔

بوشر : درست۔ آخر اس کے ساتھ چکّر کیا ہے؟ لاعلمی! اس کو ذرا برابر علم نہیں کہ مصیبت کس بلا کا نام ہے۔ سوال صرف اتنا ہے، اسے کیسے ہماری صورت حال کا احساس ہو؟ ہمیں اس کے دماغ کی کھڑکی کھولنی ہے۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔ سنو، یہ ہے ترکیب!

ایک علامت اُبھرتی ہے، جو ماضی قریب کے بعض واقعات کی طرف اشارہ ہے۔[1]

---

۱ : اس ڈرامے کے اختتام پر تاریخ وار واقعات کا سلسلہ دیکھیے۔

ب

میدان سبزی منڈی : فلیک اور شیٹ محو گفتگو۔

شیٹ : میں نے شہر کے پورب پچھم ایک کر دیے۔ اُف اپنے شہر کی توبہ! ایک توپ شہر میں نہیں تھی اور دوسری تھی غسل خانے میں ـــــــ پرانے دوست مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی سے چیتھڑے پہن کر ملتا ہے، کہیں ایک بھائی دوسرے بھائی سے قرض نہ مانگ لے۔ پُرانے ساجھے دار نام بدل کر ملتے ہیں۔ ہر شخص اپنی جیبوں کے مُنہ سی رہا ہے۔

فلیک : تو میری تجویز کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

شیٹ : نہیں بھئی، یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ تم کوڑیوں کے مول پورا خزانہ خریدنا چاہتے ہو۔ تم دال پانی کے دام دے کر مرغ مصالحہ اُڑانا چاہتے ہو اور پھر یہ بھی چاہتے ہو، تمھارا شکریہ بھی ادا کیا جائے نہیں جو میں نے تمھیں تمھارے بارے میں کچھ کہا تو تمھیں اچھا نہیں لگے گا۔

فلیک : کوئی بھی تمھیں اس سے زیادہ نہیں دے گا۔

شیٹ : اور دوستوں کی مٹھیاں بھی دوسروں کی طرح کسی ہوئی ہیں۔

فلیک : ان دنوں پیسہ گاڑھا ہو گیا ہے۔ آسانی سے بہتا نہیں۔

شیٹ : خاص طور پر ضرورت مندوں کے لیے۔ اور دوست کی ضرورت کو دوست سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟

فلیک : کچھ بھی ہو، تمھارا جہازوں کا کارخانہ تو تمھارے ہاتھ سے نکل ہی جائے گا۔

شیٹ : کارخانہ ہی نہیں، میری بیوی بھی مجھے چھوڑ چل دے گی۔

فلیک : اور جو تم اسے بیچ دو تو . . .

شیٹ : تو وہ ایک برس اور ٹک رہے گی، بس۔ لیکن میں حیران ہوں، تم یہ کارخانہ کیوں خریدنا چاہتے ہو؟

فلیک : تمھارے ذہن میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ ہم، میرا مطلب ہے ٹرسٹ، تمھارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے؟

شیٹ : نہیں، یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہیں آئی۔ واقعی میں احمق ہوں کہ سوچ رہا ہوں، تم میری جائیداد پر پنجہ گاڑنے کے چکر میں ہو اور تم ہو کہ مدد کرنے کی فکر میں مرے جا رہے ہو۔

فلیک : اس تلخی سے شیٹ ڈیئر، کام نہیں چلے گا۔ سر پر جو آ پڑنے والا ہے، وہ تو آ ہی پڑے گا۔

شیٹ : ہاں فلیک پیارے، آ پڑنے والے کو غرض کیا۔

تین آدمی قریب سے گزرتے ہیں : دادا، آرتورو اوئی، ان کا دست راست ارنستو روما اور ان کا باڈی گارڈ۔ قریب سے گزرتے سمے اوئی فلیک پر نظر پڑ جاتا ہے، جیسے یہ امید کر رہا ہو کہ اس سے کچھ کہا جاتا ہے، اور قریب سے رخصت ہوتے ہوئے، روما مڑ کر گھماتا ہے اور فلیک پر ایک ناراضگی کا نگاہ ڈالتا ہے۔

شیٹ : کون ہے وہ ؟

فلیک : دادا آنندوادؤنی . . . بولو، کیا کہتے ہو؟ بیچ رہے ہو . . . ؟

شیٹ : کہتا تھا، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔

فلیک : (ناراضگی سے ہنستے ہوئے) ہاں، وہ تو چاہتا ہے۔ وہ طرح طرح کے سودے لیے ہمارے پیچھے پڑا ہے۔ وہ شین گنوں کے سہارے ہماری پھول کو بسیاں بیچنا چاہتا ہے۔ شہر اس کی طرح کے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جیسے ہمارے شہر کے بدن پر کوڑھ پھوٹ بہا ہو، انگلیاں جھڑ رہی ہوں، پھر بازو اور کندھے۔ کوئی نہیں جانتا یہ عذاب آتا کہاں سے ہے لیکن ہم سب یہ شک کرتے ہیں، یہ عذاب جہنم کے پیٹ سے نکل باہر آتا ہے۔ اغوا، قتل، دھمکیاں، زور زبردستی، بلیک میل، خون خرابہ :

'ہینڈز اپ!' 'مال دو یا جان دو!' شرمناک! اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے . . .

شیٹ : (تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اور فوراً۔ یہ تو چھوت کی بیماری ہے۔

فلیک : تو پھر! بتاؤ؟ بیچ رہے ہو؟

شیٹ : (پیچھے ہٹتے ہوئے اور اسے دیکھتے ہوئے) ذرا برابر شک نہیں مجھے۔ یہ مشابہت ان میں سے جو ابھی قریب سے گزرے ہیں کوئی اعلانیہ مشابہت نہیں لیکن جو کسی نہ کسی طور ہے جو محسوس کی جا سکتی ہے، دیکھی نہیں جا سکتی . . . تالاب کے پانی میں، تہہ میں، کبھی کبھی کوئی ہری ٹہنی نظر آتی ہے، چکنی اور لچکتی ہوئی۔ یہ تو سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن نہیں، سچ مچ یہ تو ٹہنی ہے۔ ہے یا نہیں؟ اسی طرح سے تم روہلے سے ملتے جلتے نظر آتے ہو۔ بُرا نہ ماننا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا ابھی تھوڑی دیر پہلے اور پھر تمہاری طرف، یوں لگا مجھے، میں نے یہ ملتی جلتی جھلک تم میں اور دوسروں میں پہلے بھی دیکھی ہے، بنا جانے بنا سمجھے۔ ذرا کہو تو ایک بار پھر فلیک : 'بولو، کیا کہتے ہو؟ بیچ رہے ہو؟' تمہاری آواز تک، میں سمجھتا ہوں . . . خیر چھوڑو، مناسب ہے تم یہ کہو، 'ہینڈز اپ!' کیونکہ تم یہی تو کہنا چاہتے ہو۔

(اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیتا ہے)

ٹھیک ہے فلیک، جاؤ کارخانہ لے لو! قیمت؟ لگاؤ میرے پیٹ میں دو چار گھونسے اور مارو ٹھوکر بس قیمت ادا ہو گئی۔ لیکن، ذرا رکو! میں کچھ زیادہ قیمت چاہتا ہوں۔ دو چار گھونسوں سے بھلا کیا ہوتا ہے!

فلیک : تم پاگل ہو!

شیٹ : کتنا اچھا ہوتا جو یہ سچ ہوتا!

دو

ڈاگس بورو کے ریسٹوران کے پچھواڑے ایک حصہ ۔ ڈاگس بورو اور اس کا بیٹا گلاس دھو رہے ہیں ۔
مُوشَر اور فلیک داخل ہوتے ہیں ۔

ڈاگس بورو : تمھیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں میرا جواب 'نہیں' ہے ۔ تمھارے منصوبے سے سڑی ہوئی مچھلی کی بو آتی ہے ۔
نوجوان ڈاگس بورو : میرے ابا انکار کرتے ہیں ۔
مُوشَر : چلو چھٹی ہوئی ۔ ہم نے تم سے پوچھا ۔ تم نے کہا، 'نہیں'، تو پھر نہیں سہی !
ڈاگس بورو : کہیں کچھ گول مال ہے ۔ میں تمھاری گودیوں کے بارے میں خوب جانتا ہوں ۔ میں ان کو ہاتھ بھی نہیں [illegible] لگاؤں گا ۔
نوجوان ڈاگس بورو : ابا ان کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے ۔
مُوشَر : تو پھر بھول جاؤ اس قصے کو ۔
ڈاگس بورو : یارو! تم لوگ غلط راہ پر چل رہے ہو ۔ شہر کا خزانہ اس لیے تو ہے نہیں کہ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا آئے اور اس میں ہاتھ ڈال کر جتنا بھی چاہے نکال لے جائے ۔ خیر چھوڑو، مارو گولی اسے ۔ ویسے میرے خیال میں، تمھارا دھندا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ۔
مُوشَر : میں نے کیا کہا تھا، فلیک ؟ تم لوگ بیکار منہ لٹکائے پھرتے ہو ۔
ڈاگس بورو : منہ لٹکائے ؟ نا امیدی وطن سے غداری ہے ۔ تم لوگ خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کر رہے ہو ۔ میں تو یہ سب کچھ یوں دیکھتا ہوں : تم لوگ کیا بیچتے ہو ؟ پھول گوبھی ۔ اور پھول گوبھی، گوشت اور نان سے کچھ کم تو نہیں ۔ آدمی صرف گوشت اور نان پر تو جیتا نہیں، وہ سبزی ترکاری بھی کھاتا ہے ۔ ذرا سوچو، اگر میں تمھیں قورمہ بنا پیاز کے کھلاؤں یا سلاد کی جگہ ابلا ہوا گوشت تمھارے آگے رکھوں، تو تمھیں کیسا لگے گا ؟ پھر تو کوئی عقل کا اندھا ہی اس ریستوراں میں قدم رکھے گا ۔ ہاں یہ تو صحیح ہے، کچھ لوگ تنگدست ہیں ۔ سوٹ خریدنا ہو تو وہ دس بار سر کھجاتے ہیں مگر ترکاری کے لیے ان کی جیب سے دمڑی نکل ہی آتی ہے ۔ مزے میں ہو تم لوگ ! تمھاری جگہ میں ہوتا تو بالکل پریشان نہ ہوتا ۔
فلیک : تمھاری بات سن کر دل کتنا بڑا ہو جاتا ہے، ڈاگس بورو ! قدم بڑھانے کے لیے کتنا حوصلہ ملتا ہے ۔
مُوشَر : ڈاگس بورو، پھول گوبھی کے مستقبل کے بارے میں تمھارا اٹل بھروسہ دیکھ کر تو مجھے ہنسی آتی ہے ۔ خیر، جانے دو اسے ۔ صاف بات یہ ہے کہ، ہم یہاں ایک کام سے آئے ہیں ۔ نہیں نہیں ۔ پریشان مت ہو ۔ وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو ۔ وہ قصہ تو دفن ہوا ۔ اور وہ کام ؟ خوشگوار کام ہے، کم از کم ہم یہی سمجھتے ہیں میرے بزرگ، ہمیں یکایک دھیان آیا کہ اس جون کو ٹھیک تئیس برس ہوئے جب تم شہر کی بھلائی کی خاطر ہم سے الگ ہوئے تھے اور ہم جانتے

ہیں، تین دہائیوں سے اور وقت ہوا، تم ہماری ہی ایک جگہ پر بھٹیار خانہ چلا رہے ہو۔ تم نہ ہوتے تو یہ شہر آج وہ نہ ہوتا جو ہے۔ اور نہ ہی ٹرسٹ، شہر ہی کی طرح ترقی کر پاتا کہ جو اس نے کی ہے۔ ٹرسٹ کا کاروبار تسلی بخش ہے، تمھارے منہ سے یہ سُن کر مجھے خوشی ہوئی ہے اور ابھی کل ہی، اس خوشی کے موقع پر ہم نے فیصلہ کیا تھا، ہم جو تمھاری قدر کرتے ہیں اور شہرت کے طور پر کہ ہم اب بھی تمھیں اپنے میں سے ایک سمجھتے ہیں، ہم نے فیصلہ کیا تھا، تمھیں شیٹ کے جہازوں کے کارخانے کے اسٹاک کا بڑا حصہ صرف بیس ہزار ڈالر کے عوض پیش کیا جائے جو اپنی قیمت کے آدھے سے بھی کم ہے۔

وہ شیئر کا پیکٹ میز پر رکھتا ہے۔

ڈاگس بورو : میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔

مُوشنڈ : بات بالکل صاف ہے، ڈاگس بورو۔ کوئی غلاو ٹرسٹ کی شہرت نرم دلی کی تو نہیں ہے لیکن کل جب ہم نے . . .
ہاں تو کل جب ہم نے قرضے کے لیے احمقانہ درخواست دینے کا فیصلہ کیا اور تمھارا جواب سُنا، ایماندار، سراپا ایمان بزرگ ڈاگس بورو کا جواب تو، اور یہ کہنا کوئی اتنا آسان نہیں، ہم میں سے کچھ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ہاں، ہم میں سے ایک نے کہا ——— فلیک، مجھے کو کو نہیں، میں نہیں کہوں گا کون ——— "خدا کی پناہ" اس نے کہا، "ڈاگس بورو نے خود ہمیں اپنے آپ سے بچا لیا!" کچھ وقت تک تو ہم میں سے کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ اور پھر یہ تجویز خود بخود سامنے آ گئی۔

ڈاگس بورو : میں نے تمھاری بات سُن لی ہے، دوستو۔ لیکن اس کے پیچھے کیا ہے؟

مُوشنڈ : اس کے پیچھے کیا ہو سکتا ہے؟ بس یہ ایک پیش کش ہے۔

فلیک : اور ایسی پیش کش، جس سے ہمیں بیحد خوشی ہو رہی ہے۔ تم یہاں اپنے بار کے پیچھے کھڑے ہو، قوت کا مینار بنے۔ تمھارا نام، سونے میں تُلنے کے قابل۔ اونچی گردن والے شہری کی مثال۔ اور ہم تمھیں گلاس صاف کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ تم نے ہماری روحوں تک کو مانجھ دیا ہے مگر پھر بھی تم اپنے غریب گاہکوں سے زیادہ غریب ہو۔ اور یہ دیکھ کر ہمارا دل کڑھتا ہے۔

ڈاگس بورو : میں نہیں جانتا، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

مُوشنڈ : ایک لفظ تک نہ کہو۔ بس یہ چھوٹا سا پیکٹ قبول کر لو۔ ایماندار آدمی ہی اس کا صحیح استعمال کر سکتا ہے، کیوں؟ پانی کب ہمیشہ سیدھا بہتا ہے؟ اب اپنے اس چھوکرے ہی کو لے لو: میں جانتا ہوں، ایک نیک نام بینک اکاؤنٹ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں اسے بینک اکاؤنٹ سے گھن نہیں آئے گی۔ بس، تم یہ پیکٹ لے لو اور ہمیں امید ہے، تم بات کا بتنگڑ نہیں بناؤ گے۔

ڈاگس بورو : اور شیٹ کے جہازوں کا کارخانہ!

فلیک : دیکھو، یہاں سے صاف نظر آ رہا ہے۔

ڈاگس بورو : (کھڑکی پر) میں اسے بیس برس سے دیکھ رہا ہوں۔

فلیک : یہی ہم نے سوچا تھا۔

ڈاگس بورو : اور شیث کیا کرے گا؟

فلیک : وہ بئیر کا دھندا شروع کر رہا ہے۔

بوشر : تو ٹھیک ہے نا؟

ڈاگس بورو : تمھارے پرانے تعلقات کے جذبات، مَیں ان کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن کوئی بھی جہازوں کا کارخانہ ایسے ہی تو کسی کی جھولی میں نہیں ڈال دیتا۔

فلیک : ہاں، کچھ تو ہے ہی۔ قرضے کا قصہ تو پاک ہو گیا، شاید یہ بیس ہزار کسی کام آسکیں۔

بوشر : اور اس وقت کھلے بازار میں اپنے اسٹاک شیئر پھینکنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔

ڈاگس بورو : یہ بات تو ٹھیک جان پڑتی ہے۔ اور سودا، وہ بُرا نہیں ہے اگر اس میں کوئی پھندا نہیں ہے۔

فلیک : نہیں، کوئی پھندا وندا نہیں ہے۔

ڈاگس بورو : تم نے قیمت بیس ہزار بتائی نا؟

فلیک : کیا یہ بہت زیادہ ہے؟

ڈاگس بورو : نہیں۔ اور ذرا سوچو، یہ وہ جہازوں کا کارخانہ ہے، جہاں برسوں پہلے مَیں نے اپنا پہلا بھٹیارخانہ کھولا تھا۔ اور وہ جو کہتے ہیں نا، لکڑیوں کے انبار میں کوئی بھوت چھپا بیٹھا ہو تو . . . سچ بتاؤ، قرضہ تو نہیں مانگو گے نا؟

فلیک : بالکل نہیں۔

ڈاگس بورو : تب مَیں غور کر سکتا ہوں۔ اے، ادھر دیکھو بیٹے، یہ بالکل تمھارے کام کی چیز ہے۔ مَیں سوچ رہا تھا تم لوگ مجھ پر جال پھینک رہے ہو اور تم یہ پیش کش لے کر آئے ہو۔ دیکھتے ہو بیٹے! ایمانداری کیسی مُرغی ہے؟ یہ مرغی کبھی کبھی سونے کے انڈے بھی دیتی ہے۔ آدمی کبھی کبھی اپنے آپ سے کہتا ہے: آج آنکھ بند ہو جائے تو کل بیٹے کو ورثے میں کیا ملے گا؟ نام اور بس۔ مَیں نے خود ان آنکھوں سے دیکھا ہے، غربت کی زمین پر کیسی کالی، زہریلی فصل اُگتی ہے!

بوشر : اگر تم ہماری پیش کش قبول کر لو تو ہمیں چین آئے۔ وہ غلیظ اکڑواہٹ دُور ہو جائے گی جو قرضے کے ارادے سے پیدا ہو گئی تھی۔ مستقبل میں ہم تمھاری صلاح سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ تم ہمیں بتا سکو گے کہ بازار کا مندہ کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے، ایمانداری کے راستے پر چل کر کہ تب ہمارا کاروبار تمھارا کاروبار ہوگا اور پھر تم بھی تو پہلے گوبھیوں کے آدمی ہو گے، ڈاگس بورو! اور تم چاہو گے کہ کوئی فلاور ٹرسٹ کی جیت ہو۔

ڈاگس بورو اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

ڈاگس بورو : بوشر اور فلیک، مَیں تمھارے ساتھ ہوں۔

نوجوان ڈاگس بورو : ابا تمھارے ساتھ ہیں۔

ایک علامت اُبھرتی ہے۔

تین

۱۲۲ ویں سٹرک پہ ایک سٹے باز کا دفتر۔ آرتورو اُوئی، اس کا دستِ راست ارنستو روما اور ان کے باڈی گارڈ ریڈیو پہ گھوڑ دوڑ کی خبریں سُن رہے ہیں۔ روما کی بغل میں ٹومک لے پڑی ہے۔

روما : میں چاہتا ہوں، آرتورو، تم یہ اُداسی کی سیاہی دل سے دھو ڈالو۔ یہ بے عمل، بے معنی خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ سارا شہر ایک ہی بات کر رہا ہے۔

اُوئی : (تلخی سے) بات کر رہا ہے؟ کون بات کر رہا ہے؟ کوئی اب میرے بارے میں بات نہیں کرتا۔ اس شہر کی یادوں کا خزانہ خالی ہے۔ یہاں شہرت کا چراغ شام کو جلتا ہے اور صبح کو بجھ جاتا ہے۔ بنا قتل کیے دو ماہ گزر جائیں تو لوگ بھول جاتے ہیں۔

وہ اخباروں پہ تیزی سے نظر دوڑاتا ہے۔

ڈنڈا نہ بجے تو اخبار میں نام نہیں چھپتا۔ اگر درجن بھر بھی قتل کر ڈالوں، تب بھی سالوں کے کان پر جوں نہیں رینگے گی۔ کارنامے تو کسی شمار میں ہی نہیں۔ یہاں تو بس رسوخ چلتا ہے جس کا انحصار پیسے پر ہے۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے سارا دھندا چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں۔

روما : بنا پیسوں کے چھوکرے بھی مُنہ بنا رہے ہیں۔ ان کا حوصلہ پست ہے۔ یہ بیکاری انہیں کاٹ رہی ہے۔ تاش کے پتّے پھینٹنے کے سوا انہیں کوئی کام ہی نہیں۔ مجھے تو ان چھوکروں پر بڑا رحم آتا ہے۔ آرتورو، مجھے ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ جب یہ مجھے آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو میری یہ بات کہ "کل تماشہ کریں گے" گلے میں پھنس جاتی ہے۔ تمہارا سبزی ترکاری والا چکر خوب تھا۔ ہم فوراً اسے شروع کیوں نہیں کرتے؟

اُوئی : نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا۔

روما : "ابھی وقت نہیں آیا!" خوب، بہت خوب۔ چار مہینے ہو گئے ہیں، یاد ہے تمہیں؟ چار مہینے جب تمہیں کونی فلاور ٹرسٹ نے ہٹا کر ایک طرف کیا تھا تب سے تم بیکار بیٹھے بس سوچتے رہتے ہو۔ منصوبے، منصوبے! اِدھر، اُدھر! ایک دھکا کیا لگا، تمہاری تو ریڑھ کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی۔ اور پھر وہ معمولی سا حادثہ ——— ہاربر بینک پہ سپاہیوں والا قصہ ——— تم اب تک اس سے نکل نہیں پائے ہو، یار!

اُوئی : انھوں نے گولی چلائی تھی!

روما : ہاں، لیکن وہ ہوائی فائر تھے۔ اور ان کی یہ حرکت غیر قانونی تھی۔

اُوئی : پھر بھی، گولی مجھے لگ بھی سکتی تھی۔ اور اگر وہ گواہ ان کے ہتّھے چڑھ جاتا تو میں مارا جاتا۔ اور وہ جج، اس کے دل

یہ تو رتی بھر رحم نہیں۔

رومنا : بنیے کی دوکان کے لیے تو سپاہی گولی نہیں چلاتے لیکن بنیکوں کے لیے تو وہ چلاتے ہیں۔ ہاں تو آر تورو! دیکھو، ہم گیارہویں سڑک سے کام شروع کرتے ہیں، دو چار کھڑکیاں توڑتے ہیں، فرنیچر برباد کرتے ہیں، سبزی ترکاریوں پر مٹی کا تیل چھڑکتے ہیں اور یوں ساتویں سڑک کی طرف بڑھتے ہیں۔ اور پھر تین دن بعد وہ بُن بچہ گری جاتا ہے اور مناسب معاوضے کے بدلے ہماری حفاظت انھیں بچپاہے۔ معاوضہ کچھ زیادہ نہیں، بس بکری کا کچھ حصہ۔ کیوں؟

اُوئی : نہیں۔ پہلے مجھے اپنی حفاظت کا انتظام کرنا ہے، سپاہیوں سے، ججوں سے۔ پھر میں دوسروں کی حفاظت کے بارے میں سوچوں گا۔ ہمیں یہ کام اوپر سے شروع کرنا پڑے گا۔

(مایوسی سے)

جب تک میں جج کے ہاتھ گرم کرکے اسے اپنی جیب میں نہیں ڈال لیتا، قانون میرے خلاف ہے۔ میں تو بنیک بھی نہیں لُوٹ سکتا کہ کوئی بھی دو کوڑی کا سپاہی مجھے ٹھنڈا کر سکتا ہے۔

رومنا : تمھاری یہ بات صحیح ہے لیکن ——— ہاں، اب ہماری اکیلی امیدگی وولا کا پلان ہے۔ اس کی ناک بڑی تیز ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ کوئی فلاور ٹرسٹ میں کچھ سڑ رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور اُڑتی پڑتی یہ بھی سُنی گئی ہے کہ ڈاگس بورو کی سفارش پر شہر نے انھیں وہ قرضہ دے دیا ہے جس سے گودیاں بنی تھیں اور یہ بھی سُنا گیا ہے، اب وہ نہیں بن رہی ہیں۔ پھر بھی ڈاگس بورو نے سفارش کی۔ کیوں اس جیسا شریف آدمی گڑبڑ گھوٹالے میں پڑا؟ لو، وہ دیکھو، 'ننھے' والا ریگ ادھر آرہا ہے۔ ایسی بات کی خبر صرف یہی رکھتا ہے۔ اے ٹیڈ!

ریگ : (خمار نشے میں) اے یارو! اے روما، اے آرتورو! کاپوا میں کیسا ہے؟

اُوئی : یہ کیا کہہ رہا ہے؟

ریگ : اے، کچھ خاص نہیں۔ وہ تو ایک گھوڑے والے قصبے کی بات ہے جہاں پوری فوج کو سالی عیاشی اور حرام خوری گھن کی طرح کھا گئی۔

اُوئی : تم جہنم میں جاؤ!

رومنا : (ریگ سے) کوئی جھگڑا نہیں۔ تم ہمیں کوئی فلاور ٹرسٹ کے قرضے کا قصہ سُناؤ۔

ریگ : تمھیں اس قصے سے کیا لینا دینا؟ بتاؤ! کیا تم بھی ترکاریوں کے دھندے میں پڑ رہے ہو؟ میں سمجھ گیا! تم خود قرضے کے چکر میں ہو، جاؤ، ڈاگس بورو سے ملو۔ وہ حساب کتاب ٹھیک کر دے گا۔

(بڈھے کی نقل اُتارتے ہوئے)

'کیا ہم ایسے کاروبار کو برباد ہونے دیں، اُجڑنے دیں، جو بنیادی طور پر تسلی بخش ہے؟' اور میونسپل ہال میں سب کی آنکھیں بھر آئیں گی۔ پھول گوبھیوں کے لیے سب کے دل کانپنے لگیں گے جیسے پھول گوبھیاں ان ہی کی ذات کا ایک حصہ ہوں۔ بُری بات ہے نا آرتورو! بندوقیں تو آنسوؤں کو نہیں رلاتیں۔

دوسرے گھونٹ ہنستے ہیں۔

روما : مت چھیڑو اسے، ریڈ۔ یہ بہت پریشان ہے۔

ریگ : میں ذرا حیران نہیں ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ وولا، کاپون کے ہاں کام مانگنے گیا تھا۔

ڈوک ڈیزی : مکّار، فریبی! تم جو سیپ کو اس میں مت گھسیٹو!

ریگ : ارے، ڈوک ڈیزی! لنگڑے کی وولا کے حرم میں اب بھی تمھاری جگہ ہے؟
(ڈیوک ڈیزی کا تعارف کراتے ہوئے) دوسرے درجے کے ٹوٹے ہوئے ستارے کے تیسرے درجے کے صاحب کے حرم کا جھلملاتا چراغ! واہ ری قسمت!

ڈیوک ڈیزی : کوئی تو اس سڑے حرام زادے کا منہ بند کرے!

ریگ : آنے والی نسلیں بیتے گزرے زمانے کے دادائوں کا احترام نہیں کرتیں! نئے ہیرو، نئے دادا تغیر پسند ہجوم پر چھا جاتے ہیں۔ کل کے ہیرو کب کے بھلائے جا چکے ہیں۔ ان گمنام کی فائلوں پر گرد کی موٹی تہہ جم چکی ہے۔
'کیا تمھیں یاد نہیں، لوگو، وہ گھاؤ جو میں نے تمھیں دیے؟' 'کب؟' 'ایک زمانہ ہوا۔ ۔ ۔' 'وہ گھاؤ تو کب کے بھر چکے۔ ۔ ۔' آہ! زبردست گھاؤ بھی برداشت کے پانی سے دُھل جاتے ہیں۔
'کیا ایسا ہے کہ دنیا میں جہاں اچھے کام آنکھوں سے اوجھل سے رہتے ہیں، بُرے کاموں کی بھی کوئی یادگار باقی نہ بچتی ہو؟' 'ہاں، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے!' 'آہ! یہ ذلیل دُنیا۔ ۔ ۔!'

اوٹی : (چنگھاڑتا ہے) اس کا منہ بند کرو!

باڈی گارڈ ریگ کی طرف بڑھتے ہیں۔

ریگ : (ڈر کر پڑتے ہوئے) سنبھل کے، اوٹی! اخبار والوں کو ذلیل مت کرو۔

دوسرے گھوڑ دوڑیے گھبراہٹ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

روما : بس، بس، ریڈ! تم بہت بک چکے۔ اب تم جاؤ!

ریگ : (جواب نہیں ملتا دیکھ کر، پیچھے ہٹتے ہوئے) تو یارو، پھر ملیں گے!

کمرہ (یعنی دفتر) بہت جلد خالی ہو جاتا ہے

روما : آرتورو، تمھارے اعصاب بہت کمزور ہیں۔

اوٹی : یہ حرام زادے مجھے نالی کا کیڑا سمجھتے ہیں!

روما : تمھاری لمبی خاموشی کے کارن۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

اوٹی : (بجھی ہوئی آواز میں) اسے بتاؤ نا، گری اور وہ کولی فلاور ٹرسٹ کا اکاؤنٹنٹ کیوں نہیں آیا ابھی تک؟

ریتا : انھیں تین بجے آنا تھا۔
اُوڈی : اور گی وولا ؟ اور میں نے کیا سنا ہے کہ وہ کالون کے ہاں گیا تھا ؟
ریتا : ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی پھولوں کی دکان چلا رہا ہے، بس۔ اور کالون وہاں تعزیت کے پھول خریدنے آتا ہے۔
اُوڈی : تعزیت کے پھول ؟ کن کے لیے ؟
ریتا : ہمارے لیے نہیں۔
اُوڈی : مجھے یقین نہیں آتا۔
ریتا : تمھیں تو ہر طرف گہری سیاہی دکھائی دے رہی ہے۔ کسی کو ہم سے کوئی دلچسپی نہیں۔
اُوڈی : درست۔ ان کے دل میں کیچڑ کی بھی ہم سے زیادہ عزت ہے۔ گی وولا ہی کو لو۔ ایک دھکا اور وہ چیت۔ خدا قسم، وقت آنے دو، اس کا حساب صاف کر دوں گا۔
ریتا : گری !

ایمانوئل گیری ایک خستہ حال شخص باؤل کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

گیری : باس، میں اسے لے آیا ہوں۔
ریتا : (باؤل سے) سنا ہے تم کولی فلاورز سٹ میں شیٹ کے اکاؤنٹنٹ ہو۔
باؤل : تھا۔ پچھلے ہفتے تک وہ حرام زادہ . . .
گیری : وہ تو پھول گوبھی کی باس سے بھی نفرت کرتا ہے۔
باؤل : ڈاگس بورو . . .
اُوڈی : (تیزی سے) ڈاگس بورو ! اس کا کیا لینا دینا ؟
ریتا : ڈاگس بورو سے تمھیں کیا غرض ہے ؟
گیری : اسی لیے تو میں اسے یہاں لایا ہوں۔
باؤل : ڈاگس بورو نے ہی تو مجھے نوکری سے نکال باہر کیا ہے۔
ریتا : اس نے تمھیں نکالا ہے ؟ شیٹ کے جہازوں کے کارخانے سے ؟
باؤل : نہیں، اپنے کارخانے سے۔ پہلی ستمبر سے کارخانے پر اسی کا قبضہ ہے۔
ریتا : کیا مطلب ؟
گیری : شیٹ کے جہازوں کا کارخانہ اب ڈاگس بورو کے پاس ہے۔ یہ باؤل اس وقت وہاں موجود تھا جب، کولی فلاورز سٹ کے بٹ شر نے اسے اکاون فی صد حصہ دیا تھا۔
اُوڈی : اس سے کیا ہوا ؟
باؤل : اس سے کیا ہوا ؟ یہ شرمناک ہے . . .

گریگ : باس، تمھاری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی؟

باؤل : . . . کہ ڈاگس بورو نے وہ قرضہ کولی فلاور ٹرسٹ کو دلوایا۔ . .

گریگ : . . . جبکہ وہ خود کولی فلاور ٹرسٹ کا چھپا ممبر تھا۔

اوٹ : (جواب دوستی دیکھنا شروع کرتا ہے) ہاں، تو یہ شرمناک ہے۔ خدا قسم، بڈھے کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے ہیں۔

باؤل : قرض کولی فلاور ٹرسٹ کے نام تھا لیکن یہ کام انھوں نے جہازوں کے کارخانے کے ذریعے کیا۔ میرے ذریعے کیا۔ میں نے ڈاگس بورو کی طرف سے دستخط کیے تھے، شیٹ کی طرف سے نہیں، جیسا کہ لوگ سمجھے۔

گریگ : باپ قسم، غضب ہے یہ بڈھا ڈاگس بورو۔ ایمان اور بھروسے کا اشتہار! بھلا مانس اور ذمہ دار! جس سے ہاتھ ملانا عزت کی بات تھی، جس سے ہاتھ ملانا قسم کھانے کے برابر تھا! وہ ارادے کا مضبوط اور بددیانتی کا دشمن بڈھا!

باؤل : حرام زادے کو اس کی قیمت چکانا پڑے گی۔ ذرا سوچو؟ اس نے مجھ پر غبن کا الزام لگا کر نکال دیا اور خود۔ . .

روما : بس، بس، اب ذرا ٹھنڈے ہو جاؤ۔ اس کی کمینہ بدمعاشی پر صرف تمھارا خون ہی نہیں کھول رہا ہے۔ آرتورو، تم کیا کہتے ہو؟

اوٹ : (باؤل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا یہ گواہی دے گا؟

گریگ : ہاں، یہ گواہی دے گا۔

اوٹ : (رشان سے تخصیص کے لیے اٹھتے ہوئے) تو پھر یارو، اس پر نظر رکھنا۔ روما، آؤ چلیں۔ مجھے کچھ راستہ دکھائی دے رہا ہے۔

وہ تیزی سے باہر نکل جاتا ہے، پھر روما، اور پھر باڈی گارڈ۔

گریگ : (باؤل کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے) باؤل، مجھے محسوس ہو رہا ہے، تم نے ایک بڑے کام کے لیے راستہ کھولا ہے، جو . . .

باؤل : مجھے امید ہے، اس کا معاوضہ مجھے ملے گا، کسی بھی نقصان . . .

گریگ : گھبراؤ نہیں اس بارے میں۔ میں باس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

چار

ڈگلس ہمدرد کا مضافاتی مکان ۔ ڈگلس ہمدرد اور اس کا بیٹا۔

ڈگلس ہمدرد : مجھے ہرگز یہ جاگیر نہیں لینی چاہیے تھی۔ البتہ تحفے کے طور پر اس قسم کا شیئر لینا اعتراض کی گنجائش سے پرے ہے۔

نوجوان ڈگلس ہمدرد : ہاں! بھلا اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے!

ڈگلس ہمدرد : اور وہ قرضہ، اسے دلانا کوئی بد دیانتی نہیں تھی۔ جب میں نے جانا، مجھے تکلیف ہوئی کہ اچھا خاصا کاروبار پیسے کی کمی کے کارن برباد ہو رہا ہے تو ——— لیکن جب میں نے جان لیا کہ جہازوں کے کارخانے سے اچھا خاصا منافع ہوگا، اور قرضہ دلانے سے پہلے ہی یہ گھر قبول کر لیا، اپنے فائدے کی نیت چھپاتے ہوئے، یہ بات غلط ہوئی ہے مجھ سے!

نوجوان ڈگلس ہمدرد : ہاں آبا، یہ تو ہے۔

ڈگلس ہمدرد : یہی فیصلہ غلط ہوا ہے یا کم از کم ایسا سمجھا جا سکتا ہے بیٹے، مجھے یہ جاگیر نہیں لینی چاہیے تھی۔

نوجوان ڈگلس ہمدرد : بالکل نہیں لینی چاہیے تھی۔

ڈگلس ہمدرد : ہم جال میں پھنس گئے ہیں۔

نوجوان ڈگلس ہمدرد : ہاں آبا۔

ڈگلس ہمدرد : وہ جو مجھے اسٹاک شیئرز پیش کیے گئے تھے، وہ وہ نمکین تھا جو شراب کے ساتھ مفت دیا جاتا ہے، گاہک کی گھٹیا بھوک مٹانے کے لیے لیکن جو گاہک کی پیاس تیز کرتا ہے۔

(وقفہ)

اور گودیوں کے بارے میں میونسپل ہمدرد دفتر کی تحقیقات نے تو مجھے باندھ دیا ہے۔ قرضے کا تو کام تمام ہوا۔ کلارک نے اپنا تو سیدھا کر لیا اور کاروتھرز نے بھی۔ فلیک اور بوشر نے بھی بہتے دریا میں ہاتھ دھوئے اور، مجھے رنج ہے، میں نے بھی وہی کیا۔ ابھی تک سیمنٹ بھی نہیں خریدا گیا ہے، مٹھی بھر تک نہیں! بس اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ میں نے شیٹ کی درخواست پر سارا سودا ادبار رکھا ہے۔ کوئی نہیں جانتا، جہازوں کے کارخانے سے میرا تعلق کیا ہے؟

خانساماں : (داخل ہوتا ہے) ٹیلی فون، جناب! کوئی فلاور ٹرسٹ کے مسٹر بوشر یاد کر رہے ہیں۔

ڈگلس ہمدرد : بیٹے، تم ذرا جا کر سنو!

نوجوان ڈگلس ہمدرد خانساماں کے ساتھ باہر جاتا ہے۔ گرجا گھر کی گھنٹیاں مدھم سے سنائی دیتی ہیں۔

ڈگلس ہمدرد : اب بوشر کیا چاہتا ہے مجھ سے؟

(کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے)

اوہ، وہ بھل سڈول اونچے پیڑ، ان کے چکر میں مَیں اس جگہ کے جال میں پھنس گیا۔ وہ پیڑ اور وہ نیچے جھیل جیسے کہ الروں میں ڈھلنے سے پہلے پگھلی چاندنی۔ اور ہوا کیسی ہیر کے جھکوں سے پاک صاف۔ سرو کے درخت دیکھنے لائق خاص طور پر ان کی پھننگ۔ کچھ مٹیالی سبز کچھ دھندلی۔ پھر ان کے تنے ———— بٹیر کی دھار درست رکھنے کے لیے ملکوں کے گرد جو چپڑا مرام لپیٹ دیتے تھے۔ ویسا ہی ان تنوں کا رنگ۔ ہائے، ان پیڑوں کا جادو! ہاں، ان ہی پیڑوں کا مایا جال۔۔۔ آج اتوار ہے گرجا گھر کی گھنٹیوں میں کتنا سکون ہے جیسے دنیا برائیوں، خرابیوں سے بھری ہوئی نہ ہو۔ لیکن اتوار کو گوشر مجھ سے کیا چاہ سکتا ہے؟ مجھے ہرگز، ہرگز نہیں۔۔۔

نوجوان ڈگلس بورو : (لوٹتے ہوئے) ابا، گوشر کا کہنا ہے کہ کل رات میونسپل کونسل نے بذریعہ ووٹ فیصلہ کیا ہے کہ کولی فلاور ٹرسٹ کے گودیوں والے منصوبے کی چھان بین کی جائے۔ ابا، کیا گڑبڑ ہے؟

ڈگلس بورو : میری نسوار!

نوجوان ڈگلس بورو : (اسے نسوار دیتے ہوئے) یہ رہی۔

ڈگلس بورو : گوشر کیا چاہتا ہے؟

نوجوان ڈگلس بورو : وہ یہاں آنا چاہتا ہے۔

ڈگلس بورو : یہاں؟ نہیں، مَیں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ میرا جی اچھا نہیں ہے۔ میرا دل۔۔۔

وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ٹھاٹ سے۔

مجھے اس جھنجھٹ سے کچھ نہیں لینا دینا۔ سب جانتے ہیں، میں ساٹھ برس تک تنگ نیک راستے پر چلتا رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے چکروں میں نہیں پھانس سکتے۔

نوجوان ڈگلس بورو : نہیں، ابا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

خانساماں : (داخل ہوتا ہے) جناب! کوئی مسٹر اوئی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ڈگلس بورو : وہ دادا!

خانساماں : جی وہی۔ مَیں نے اخباروں میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔ کہتا ہے، اسے کولی فلاور ٹرسٹ کے مسٹر کلارک نے بھیجا ہے۔

ڈگلس بورو : اسے باہر نکال پھینکو! اسے کس نے بھیجا ہے، کلارک نے؟ خدا کی پناہ! کیا اب وہ دادا لوگ بھیج کر مجھے دھمکانا چاہتا ہے؟ مَیں اس کو۔۔۔

مسٹر اوئی اندر آہستہ سے داخل ہوتے ہیں۔

اوئی : مسٹر ڈگلس بورو!

ڈگلس بورو : نکل جاؤ۔

روما : اتنی جلدی بھی کیا ہے کی۔ آج اتوار ہے۔ ذرا صبر . . .

ڈگلس بورو : میں نے کہا تا، نکل جاؤ!

نوجوان ڈگلس بورو : آبا کہتے ہیں : نکل جاؤ!

روما : دوسری بار ایک ہی بات کہنے سے بات تو نہیں بنتی نا!

اُودی : (بنا کسی گھبراہٹ کے) مسٹر ڈگلس بورو!

ڈگلس بورو : نوکر کمبخت کہاں مر گئے؟ پولیس کو بلاؤ۔

روما : اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو بیٹے، کمرے سے کبھی باہر نہ جاتا۔ باہر دالان میں کہیں تمھاری مڈبھیڑ ایسے ویسے جیب کتروں سے نہ ہو جائے جو کچھ سمجھتے نہیں۔

ڈگلس بورو : اوہ! مار پیٹ!

روما : نہیں، میں اسے یہ نہیں کہوں گا۔ بس ذرا سا اک اشارہ، شاید۔

اُودی : مسٹر ڈگلس بورو، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ مجھے نہیں جانتے ہیں بلکہ بدتر بات یہ ہے کہ آپ مجھے سُنی سُنائی باتوں سے جانتے ہیں۔ مسٹر ڈگلس بورو، مجھے بہت بدنام کیا گیا ہے، حاسدوں نے میرے نام پر کالک ملی ہے، میری نیت پر دھول ڈالی ہے۔ جب، کوئی چودہ برس پہلے، یہ ناچیز جو اُن دنوں ایک معمولی اور بیکار شخص تھا، آپ کے اس شہر کے دروازے پر نئی زندگی شروع کرنے کے لیے آیا تھا، جو کوئی ایسی بُری بھی نہیں نکلی، اس وقت میرے ساتھ سات نوجوان تھے، میری ہی طرح مفلس لیکن میری ہی طرح ہمت والے اور میری ہی طرح ارادے کے مضبوط کہ ہر گائے سے اپنے حصے کا دودھ حاصل کریں گے جو خدا نے پیدا کی ہے۔ اب میرے پاس اسی تیس گئے ہیں اور اور بھی ہو جائیں گی۔ لیکن آپ اب حیران ہیں: آخر آرتورو اودی مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کچھ زیادہ نہیں۔ بس اتنا۔ مجھے چڑ ہے تو اس بات سے کہ لوگ مجھے حقیر کیوں سمجھتے ہیں، عیار اور خدا جانے کیا کچھ۔

گلا صاف کرتا ہے۔

اور خاص طور پر یہ بات تو مجھے اور بھی بری لگتی ہے کہ پولیس والے بھی اسی طرح سوچتے ہیں جبکہ میں ان کی عزت کرتا ہوں اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ میری عزت کریں۔ اس لیے میں گزارش کرنے آیا ہوں —— اور سچ یہ ہے مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ آسان کام نہیں —— کہ آپ علاقے کے تھانے میں میرے بارے میں چند لفظ کہہ دیں۔

ڈگلس بورو : (بے یقینی کے انداز میں) تمھارا مطلب ہے میں تمھاری ضمانت لوں؟

اُودی : اگر ضرورت ہو تو۔ اور پھر اس کا دارومدار تو اس بات پر ہے کہ سبزی فروشوں سے ہمارا معاملہ دوستانہ طور پر طے ہوتا ہے یا نہیں۔

ڈگلس بورو : سبزی ترکاری کے کاروبار سے تمھارا کیا واسطہ ہے؟

اُودی : میں اسی کی طرف ہی آ رہا ہوں۔ سبزی ترکاری کے کاروبار کو حفاظت کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت آن پڑے

تو طاقت کا استعمال بھی۔ اور یہ میں تنہا کروں گا، یہ میں نے طے کرلیا ہے۔

ڈاگس مورد : جہاں تک میں جانتا ہوں، اس کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اُوڈی : شاید نہیں۔ ابھی تو نہیں ہے۔ لیکن میں دُور تک دیکھتا ہوں۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں : آخر کب تک بیچارے سبزی فروش ہماری بددیانت بے ایمان پولیس کی موجودگی میں اپنی سبزی ترکاری آرام سے بیچ سکیں گے ؟ ہو سکتا ہے، کل ایک ظالم ہاتھ اُٹھے اور ان کی چھوٹی سی دوکان توڑ پھوڑ دے اور ان کا گلہ لے چلتا بنے۔ کیا وہ یہ نہیں چاہیں گے کہ جھگڑے فساد سے پہلے ہی، ذرا سے خرچ کے ساتھ مضبوط حفاظت کا انتظام کرلیں ؟

ڈاگس مورد : نہیں، مجھے تو، اس میں شک ہے۔

اُوڈی : اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ انھیں پتہ ہی نہیں ہے، ان کی بھلائی کس بات میں ہے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔ یہ معمولی اور چھوٹے چھوٹے سبزی فروش، ایماندار مگر کم نظر، محنتی مگر خود اپنے مفاد سے لاعلم، ان لوگوں کو مضبوط لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ اور پھر کولی فلاور ٹرسٹ جس کے سبب یہ لوگ زندہ ہیں، یہ لوگ اسی ٹرسٹ کے لیے ذرا سی بھی ذمّہ داری محسوس نہیں کرتے۔ یہاں پھر میری ضرورت ہے۔ کولی فلاور ٹرسٹ کی بھی اسی طرح حفاظت ہونی چاہیے۔ حرامی ادھاریے! ادھار چکاؤ، میں کہوں گا، یا پھر دوکان بند کرو۔ کمزور بھاگ جائیں گے۔ بھاگ جائیں، یہ قدرت کا اصول ہے۔ مختصر یہ کہ ٹرسٹ کو میری خدمات کی ضرورت ہے۔

ڈاگس مورد : لیکن کولی فلاور ٹرسٹ سے مجھے کیا لینا دینا ؟ تم یہ حیرت ناک ترکیب لے کر میرے پاس کیوں آئے ہو ؟

اُوڈی : ہاں، وہ بھی بتاتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتاؤں گا، آپ کی ضرورت کیا ہے ؟ کولی فلاور ٹرسٹ کو کڑیل ہاتھ پاؤں کی ضرورت ہے۔ اسے پٹھے چاہئیں پٹھے۔ تیس تگڑے آدمی میری سرداری میں۔

ڈاگس مورد : اب ٹرسٹ اپنے ٹائپ رائٹروں کو مشین گنوں میں بدلنا چاہتا ہے یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ دیکھو، ٹرسٹ سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اُوڈی : ہم اس کی بھی بات کریں گے۔ آپ سوچ رہے ہیں : ہتھیاروں سے مسلح تیس آدمی ہمارے گھروں کے باہر جمے ہوں گے، تو ہم خود ان سے کیسے محفوظ ہوں گے ؟ جواب سیدھا سادا ہے۔ جس کے پاس پیسے ہیں، اس کے پاس طاقت ہے۔ اور یہ آپ ہوں گے جو ہمیں پیسے دیں گے۔ پھر میں چاہوں بھی تو آپ کے خلاف نہیں جا سکتا، وہ عزت جو میرے دل میں آپ کے لیے ہے، نہ ہو تب بھی۔ آخر میں ہوں کیا ؟ میرے پیچھے کتنے لوگ ہیں ؟ مٹھی بھر۔ اور ان میں سے بھی کچھ ٹوٹ رہے ہیں۔ اس وقت ان کی تعداد صرف بیس ہے، شاید اس سے بھی کم۔ آپ کی مدد کے بغیر میں ختم ہو جاؤں گا۔ آپ کا یہ فرض ہے، انسانی فرض ہے کہ مجھے میرے دشمنوں سے بچائیں (اور صاف گوئی سے کہوں تو) میرے لوگوں، میرے ساتھیوں کو بھی۔ میرا چودہ برس کا کام داؤ پر آن پڑا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ ایک انسان سے ایک انسان کی درخواست ہے یہ۔

ڈاگس مورد : ایک انسان سے ایک انسان کی طرح میں تم سے یہ کہتا ہوں، میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں پولیس کو بلا رہا ہوں۔

اُوڈی : کیا ؟ پولیس ؟

ڈاگس مورد : بالکل، پولیس!

اُوڈی : کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ ایک انسان کے ناطے میری مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں ؟ (چنگھاڑتا ہے) تب

ایک مجرم کے طور پر کہ تم مجرم ہی ہو، میں تم سے مطالبہ کرتا ہوں۔ میں تمھیں بے نقاب کر دوں گا! میرے پاس تمام ثبوت ہیں! گودیوں کے بارے میں ایک اسکینڈل کھڑا ہو جائے گا اور تم اس میں ملوث ہو! شیٹ کے جہازوں کا کاروبار ــــــــ یہ اب تمھارا ہے۔ میں تمھیں وارننگ دیتا ہوں! مجھے ضرورت سے زیادہ مت رگڑو! اور پھر بذریعہ ووٹ فیصلہ ہو چکا ہے کہ تحقیقات ہوں گی!

ڈاگس بورو : (بالکل زرد پڑ جاتا ہے) نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ میرے دوست۔ ۔ ۔

اُوئی : اب تمھارا کوئی دوست نہیں۔ کل کچھ لوگ تمھارے دوست تھے۔ آج تمھارا کوئی دوست نہیں اور کل تمھارے صرف دشمن ہوں گے۔ اگر تمھیں کوئی بچا سکتا ہے تو وہ میں ہوں، آرتورو اوئی! میں! میں!

ڈاگس بورو : کوئی تحقیقات نہیں کرے گا۔ دیکھیے نہیں، میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔

اُوئی : ڈاگس بورو، بالوں کے علاوہ تمھاری اور کوئی چیز سفید نہیں ہے۔

اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔

خدا کے بندے، ذرا سوچو، اب نہیں تو پھر کبھی نہیں! میں تمھیں بچا سکتا ہوں! بس تمھاری طرف سے ایک لفظ، صرف ایک اور پھر جو تمھارے سفید بالوں کی طرف ہاتھ بڑھائے گا، میں اس حرام زادے کی دھنائی کر دوں گا! ڈاگس بورو، اس وقت تم میری مدد کرو۔ میں درخواست کرتا ہوں۔ ایک بار! صرف ایک بار! کہو، ایک لفظ، صرف ایک، نہیں تو میں اپنے لوگوں، اپنے ساتھیوں کو یہ مُنہ نہ دکھا سکوں گا۔

روتا ہے۔

ڈاگس بورو : نہیں، کبھی نہیں! تمھارے چکر میں پڑنے سے پہلے میں مر جانا چاہوں گا!

اُوئی : میں جانتا ہوں، میں ختم ہو چکا ہوں۔ چالیس کے پیٹے میں ہوں اور کچھ نہیں ہوں۔ تمھیں میری مدد کرنا پڑے گی۔

ڈاگس بورو : کبھی نہیں، کبھی نہیں!

اُوئی : میں پھر تمھیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میں تمھیں کچل کر رکھ دوں گا۔

ڈاگس بورو : جب تک میں سانس لے سکتا ہوں، تم اس سبز کاروبار کا جال نہ بچھا سکو گے! کبھی نہیں!

اُوئی : (تن کر کھڑا ہوتا ہے) مسٹر ڈاگس بورو، میں صرف چالیس برس کا ہوں اور آپ کی عمر ہے اسّی برس۔ خدا نے چاہا تو میں آپ کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ اور، ہاں ایک بات جو میں جانتا ہوں: ان سبز چیزوں کے کاروبار میں میرا داخلہ یقینی ہے!

ڈاگس بورو : یہ نہیں ہو سکتا!

اُوئی : روما، آؤ، یہاں سے چلتے ہیں۔

بڑے ہی انکسار سے گردن جھکا کر آداب بجا لاتا ہے اور روما کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

ڈاگس بورو : میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرے سانس! ہوا، ہوا! اف، میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ مجھے یہ گھر قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خیر، ان میں اتنی ہمت تو نہ ہوگی۔ اگر انھوں نے تحقیق کی تو میں دب جاؤں گا، لیکن نہیں، ان میں اتنی ہمت نہیں ہوگی۔

خانساماں : (داخل ہوتا ہے) میونسپل کونسل کے مسٹر گڈول اور گیفلز تشریف لائے ہیں۔

گڈول اور گیفلز داخل ہوتے ہیں۔

گڈول : ہیلو، ڈاگس بورو!

ڈاگس بورو : ہیلو، گڈول اور گیفلز! کوئی نئی بات؟

گڈول : ہاں، بہت سی باتیں اور اچھی بھی نہیں —— خیر، لیکن کیا وہ آرتورو اُوئی نہیں تھا جو ابھی ہال میں ہمارے پاس سے گزرا تھا؟

ڈاگس بورو : (زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے) ہاں، بذاتِ خود۔ وہ اس مضافاتی گھر کے کسی گہنے کے قابل بھی نہیں۔

گڈول : نہیں، وہ کسی گہنے کے قابل بھی نہیں۔ جس کام کی وجہ سے ہم یہاں آئے ہیں، وہ کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ کام اسی قرضے کے سلسلے میں ہے جو ہم نے گودیاں بنوانے کے لیے ٹرسٹ کو دیا تھا۔

ڈاگس بورو : (سختی سے) قرضے کا کیا قصہ ہے؟

گیفلز : ہاں تو، کونسل کے کچھ ممبروں کا کہنا ہے —— پریشان ہونے کی ضرورت نہیں —— کہ کہیں کچھ گھپلا ہے۔

ڈاگس بورو : گھپلا؟

گڈول : فکر مت کرو! ہوا یہ کہ اکثریت آپے سے باہر ہوگئی۔ گھپلا! ہماری تو ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

گیفلز : ڈاگس بورو کا کانٹریکٹ گھپلا ہے! وہ چلائے۔ اور بائبل؟ کیا بائبل بھی گھپلا ہے؟ بس ڈاگس بورو، یوں سمجھو کہ سارا ہال تمھارے لیے تالیوں سے گونجنے لگا۔ . . جب تمھارے اپنے دوستوں نے تحقیقات کی مانگ رکھی، تو ان لوگوں نے جنھوں نے پہلے یہ تجویز کیا تھا اور جو ہمارے بھروسے میں تھے، انھوں نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ اب وہ یہ چاہتے تھے، سارا معاملہ دبا دیا جائے لیکن اب اکثریت یہ چاہتی تھی کہ تمھارے نام سے شک کی دھول کا ہر ذرہ صاف کیا جائے۔ وہ چلائے: ڈاگس بورو محض ایک نام نہیں، نام سے کچھ زیادہ ہے، جو ایک انسان سے کچھ زیادہ ہے، جو اپنے آپ میں ایک ادارہ ہے۔ اور شدید شور و غل میں انھوں نے تحقیقات کی تجویز منظور کر دی۔

ڈاگس بورو : تحقیقات!

گڈول : ہاں، او کیسی اس کا انچارج ہے۔ کولی فلاور کے لوگوں کا صرف اتنا کہنا ہے کہ قرضہ سیدھے سیدھے شیٹ کے جہازوں کے کارخانے کو دیا گیا ہے۔ اور گودیوں کے معماروں کے ساتھ ٹھیکے کی بات چیت شیٹ کے کارخانے

کو کرنا تھی۔

ڈگلس ہمدرد : شیشے کے کارخانے کو۔

گڈول : تمھارے حق میں اچھا یہ ہوگا کہ تم کسی ایسے آدمی کو بھیجو جس کا نام بے داغ ہو، جو غیر جانب ہو اور جو تمھارے بھروسے کا ہو اور جو اس جھوٹ اور پاکھنڈ کے بارے پر کچھ روشنی ڈال سکے۔

ڈاگلس ہمدرد : یہ تو خیر میں کروں گا ہی۔

گیفلن : ہاں، تو پھر یہ طے ہو گیا نا۔ اچھا اب تم ہمیں اپنا یہ مشہور گھر تو دکھاؤ کہ ہم اپنے دوستوں کو اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔

ڈاگلس ہمدرد : تو آؤ پھر۔

گڈول : کتنی پُرسکون جگہ ہے! اور پھر گرجا گھر کی گھنٹیاں! اس سے زیادہ آدمی اور کیا چاہ سکتا ہے۔

گیفلن : (ہنستے ہوئے) لیکن دُور دُور تک گودیوں کا کوئی نشان نہیں۔

ڈاگلس ہمدرد : تو پھر میں ایک آدمی بھیجوں گا۔

وہ دھیرے دھیرے باہر نکل جاتے ہیں۔

ایک علامت اُبھرتی ہے۔

پانچ

کونسل ہال۔ بوشر، فلیک، کلارک، مل بیری، کاروتھر۔ ان کے مقابل ڈاگس بورو، جس کا رنگ زرد ہے
اوکیسی، گیفلن اور گڈوِل۔ نامہ نگار۔

بوشر : (دبی آواز میں) اسے آنے میں دیر ہوگئی کافی۔

مل بیری : وہ شیٹ کو ساتھ لا رہا ہے۔ عین ممکن ہے، وہ سمجھوتہ نہ کر سکے ہوں۔ میرا خیال ہے، وہ تمام رات اس بارے میں بات کرتے رہے ہیں۔ شیٹ کو تو یہی کہنا ہے کہ جہازوں کا کارخانہ اب تک اس کا اپنا ہے۔

کاروتھر : دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ شیٹ کو یہاں محض یہ کہنے کے لیے آنا پڑے کہ وہ لچا لفنگا ہے۔ یہ زیادتی ہے۔

فلیک : وہ کبھی نہیں آئے گا۔

کلارک : اسے آنا پڑے گا۔

فلیک : آخر وہ یہاں آکر یہ کیوں کہے کہ اسے پانچ برس کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے؟

کلارک : خاصے بڑے پیسے کا قصہ ہے یہ۔ اور مے بل شیٹ کو عیش آرام کی بھی ضرورت ہے۔ وہ اب تک مے بل کے عشق میں دیوانہ ہے۔ وہ یقیناً یہ کھیل کھیلے گا۔ کچھ بھی ہو، وہ سزا نہیں کاٹے گا کہ بڈھا ڈاگس بورو کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔

اخبار فروش لڑکوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ ایک نامہ نگار ایک اخبار لاتا ہے۔

گیفلن : شیٹ کی لاش ملی ہے، ہوٹل میں۔ اس کی جیب میں سان فرانسسکو کے لیے ٹکٹ تھا۔

بوشر : شیٹ مر گیا؟

اوکیسی : (پڑھتے ہوئے) قتل کر دیا گیا۔

مل بیری : او میرے خدا!

فلیک : (دبی آواز میں) وہ نہیں آیا۔

گیفلن : کیا ہوا، ڈاگس بورو؟

ڈاگس بورو : (بمشکل بولتے ہوئے) کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اوکیسی : شیٹ کی موت . . .

کلارک : بیچارا شیٹ۔ لگتا ہے، اس کی غیر متوقع موت سے تمھاری تحقیقات ہی ٹھپ ہو گئی . . .

اوکیسی : کبھی کبھی غیر متوقع باتیں بالکل متوقع لگتی ہیں۔ ہاں، کچھ لوگ غیر متوقع باتوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ زندگی

ایسی ہی ہے۔ اب میں خاصی مشکل میں آن پھنسا ہوں اور مجھے اُمید ہے، تم مجھے اور میرے سوالوں کو شیٹ سے الگ رکھو گے، اور شیٹ خود، اس اخبار کے کہنے کے مطابق پچھلی تمام رات خاموش تھا۔

مس بیلی : تمہارے سوالات ؟ تم جانتے ہی ہو، قرض جہازوں کے کارخانے کو دیا گیا تھا۔ کیا یہ تم نہیں جانتے ؟

اوکیفی : درست۔ لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہتا ہے : جہازوں کا کارخانہ کس کا ہے ؟

فلیک : (زیرلب) انوکھا سوال ہے ! اس کی تہہ میں یقیناً کچھ ہے۔

کلارک : (اسی طرح) جانے کیا بات ہے۔

اوکیفی : کچھ ٹھیک نہیں کیا، ڈاگس بورو ؟ گھٹن تو نہیں محسوس کر رہے ؟

دوسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے۔

میرا مطلب یہ ہے : ممکن ہے، کچھ لوگ یہ سوچ رہے ہوں کہ شیٹ پر کچھ مٹھی بھر مٹی ڈالنا کافی نہ ہو، کچھ تھوڑی بہت گندگی بھی شامل کر دینا ضروری ہے۔ مجھے شک ہے . . .

کلارک : مناسب تو یہ ہے، تم کچھ زیادہ نہ کرو اوکیسی۔ ہتک عزت کے بارے میں کبھی سُنا ہے ؟ ہمارے ہاں اس کے خلاف قوانین موجود ہیں۔

مس بیلی : ایسی بے بنیاد باتوں کا فائدہ ؟ میں نے سُنا ہے، ڈاگس بورو نے یہ تمام قصہ نبٹانے کے لیے کسی کو پکڑا ہے۔ آو، اس کے آنے کا انتظار کریں۔

اوکیفی : اسے آنے میں دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے، جب وہ آئے گا، وہ صرف شیٹ ہی کی باتیں نہیں کرے گا۔

فلیک : ہمیں امید ہے، وہ جو کہے گا، سچ کہے گا۔ نہ زیادہ نہ کم۔

اوکیفی : تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ ایماندار آدمی ہے ؟ میرے لیے تو یہ اچھا ہی ہے۔ شیٹ چونکہ کل رات تک زندہ تھا، اس لیے صاف ہو جانا چاہیے۔ میں تو یہ . . . (ڈاگس بورو سے) اُمید کرتا ہوں کہ تم نے کوئی شریف آدمی چُنا ہو گا۔

کلارک : (تیکھی آواز میں) وہ جیسا ہے، ویسا ہے اور تمہیں اسے ویسا ہی لینا پڑے گا۔ ہاں، دیکھو وہ آ رہا ہے۔

آرتورو اُوئی اور ارنستو روما باڈی گارڈوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔

اُوئی : ہائی، کلارک ! ہائی ڈاگس بورو ! (سب سے) ہائی ! ہائی !

کلارک : ہائی، اُوئی !

اُوئی : ہاں تو، لگتا ہے تم لوگ کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہو ؟

اوکیفی : (ڈاگس بورو سے) کیا یہ شخص تمہارا آدمی ہے ؟ کیا تم نے اسے چنا ہے ؟

کلارک : درست۔ کیا یہ شخص اچھا نہیں لگتا ؟

گُڈوِل : ڈاگس بورو، کیا تم . . . ؟ (نامہ نگاروں میں ہلچل سی مچ جاتی ہے)

اوسیئی : خاموشی، بھئی وہاں خاموش رہیے!

ایک نامہ نگار : وہ تو اُودی ہے!

قہقہہ۔ اوسیئی میز کی تپائی پر خاموشی کے لیے کاٹھ کا ہتھوڑا مارتا ہے۔ پھر باڈی گارڈوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اوسیئی : کون ہیں یہ لوگ ؟

اُودی : میرے ساتھی۔

اوسیئی : (روہانسے) اور تم ؟

اُودی : ارنستو روما، میرا اکاؤنٹنٹ۔

گیفلن : ذرا رکو! کیا تم سنجیدگی سے یہ سب کر رہے ہو ڈاگس بورو ؟

ڈاگس بورو خاموش رہتا ہے۔

اوسیئی : مسٹر اُودی، ڈاگس بورو کی خوش بیان خاموشی سے ہم سمجھتے ہیں، آپ کو ان کا اعتماد حاصل ہے اور آپ ہمارے اعتماد کے بھی خواہاں ہیں۔ اچھا تب، خیر! کانٹریکٹ کہاں ہیں ؟

اُودی : کیسے کانٹریکٹ ؟

کلارک : (یہ دیکھتے ہوئے کہ اوسیئی، گُڈوِل کی طرف دیکھ رہا ہے) وہی کانٹریکٹ جن پر، ظاہر ہے، جہازوں کے کارخانے نے گودیوں کے معماروں کے ساتھ دستخط کیے تھے، وہی کانٹریکٹ جو گودیوں کی توسیع کے لیے کیے گئے تھے۔

اُودی : میں نے تو کبھی کسی کانٹریکٹ کے بارے میں نہیں سنا ہے۔

اوسیئی : واقعی ؟

کلارک : تمھارا مطلب یہ ہے کہ کوئی کانٹریکٹ نہیں ہیں ؟

اوسیئی : (جلدی سے) کیا تم نے شیٹ کے ساتھ بات کی تھی ؟

اُودی : (سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔

کلارک : اوہ۔ تم نے شیٹ کے ساتھ بات نہیں کی تھی ؟

اُودی : (غصے سے) جو یہ کہتا ہے، میں نے شیٹ کے ساتھ بات کی تھی، وہ جھوٹا ہے۔

اوسیئی : اُودی، میں نے سمجھا تھا کہ مسٹر ڈاگس بورو نے آپ کو اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے کہا ہے ؟

اُودی : ہاں، میں نے جانچ پڑتال کی ہے۔

اوحیشی : اور آپ کی جانچ پڑتال کا کوئی نتیجہ نکلا ؟

اُوئی : ہاں، نتیجہ تو نکلا ہے —— سچائی کی تہہ تک پہنچنا آسان نہ تھا اور سچائی بھی ایسی خوشگوار نہیں —— جب مسٹر ڈاگس بورو نے مجھے جانچ پڑتال کے لیے کہا، اس شہر کے مفاد کی خاطر، اس پیسے کی جانچ پڑتال جو آپ کے اور میرے جیسے ٹیکس ادا کرنے والوں کے خون پسینے کی کمائی ہے اور جو اس شہر کے ایک جہازوں کے کارخانے کو دیا گیا تھا اور جس کے بارے میں علم نہیں تھا، وہ کہاں گیا ہے اور جب میں نے پتہ لگایا تو یہ جان کر میں سکتے میں آگیا کہ اس کا تو غبن ہو گیا ہے۔ یہ پہلی بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ غبن کس نے کیا ہے۔ خیر میں اس بات کا بھی جواب دیتا ہوں۔ یہ بتاتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے کہ مجرم . . .

اوحیشی : ہاں، تو مجرم کون ہے ؟

اُوئی : مجرم شیٹ ہے۔

اوحیشی : اوہ، شیٹ ! خاموش، چپ شیٹ جس کے ساتھ تم نے بات تک نہیں کی !

اُوئی : مجھے اس طرح کیوں تک رہے ہو ؟ مجرم شیٹ ہے۔

کلارک : شیٹ مر چکا ہے۔ کیا تمھیں یہ معلوم نہیں ؟

اُوئی : مر چکا ہے، کیا ؟ میں کل رات سفر میں تھا۔ شاید اسی لیے میں نے یہ خبر نہیں سنی۔ یہ روما بھی میرے ساتھ تھا۔

(وقفہ)

روما : یہ کمال عجیب بات ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو، یہ محض اتفاق ہے کہ . . .

اُوئی : صاحبان، یہ کوئی حادثہ نہیں ہے۔ شیٹ کی خودکشی کا کارن غبن ہے۔ شرمناک ہے یہ !

اوحیشی : لیکن یہ خودکشی نہیں تھی۔

اُوئی : پھر کیا تھی ؟ ہاں، یہ روما اور میں تو کل سفر میں تھے۔ ہم کیسے جان سکتے ؟ ہاں یہ ہم جانتے ہیں اور ہمیں اتنی بھر شک نہیں : شیٹ جو اوپر سے ایماندار کاروباری نظر آتا تھا، دراصل بدمعاش تھا۔

اوحیشی : میں تمھاری چال سمجھ گیا ہوں، اُوئی۔ شیٹ کے ساتھ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ تمھارے لفظوں کی بوچھار بیکار ہے، خیر۔ تو ڈاگس بورو، اب ہم تمھاری طرف آتے ہیں۔

ڈاگس بورو : میری طرف ؟

ممونشد : (اٹکی آواز میں) ڈاگس بورو سے کیا بات ہو سکتی ہے ؟

اوحیشی : جیسا کہ میں مسٹر اُوئی کی بات سمجھا ہوں —— اور میرا خیال ہے، میں ان کی بات خوب سمجھا ہوں —— کہ ایک جہازوں کا کارخانہ تھا جس نے کچھ پیسے قرض لیے جو غائب ہو گئے۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے : جہازوں کا یہ کارخانہ کس کا ہے ؟ تم کہتے ہو، یہ کارخانہ شیٹ کے نام ہے۔ لیکن نام میں بھلا کیا رکھا ہے ؟ اس وقت ہماری دلچسپی اس بات میں نہیں ہے کہ یہ کس کے نام پر ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ یہ کارخانہ کس کا ہے ؟ کیا یہ شیٹ کا تھا ؟ ظاہر ہے، اس کا جواب شیٹ ہی دے سکتا تھا لیکن جب سے اُوئی نے سفر میں رات کاٹی ہے شیٹ کی زبان سل چکی ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے جب اس گول مال کا پردہ فاش ہوا تو کارخانے کا مالک کوئی اور تھا۔

تمھاری کیا رائے ہے ڈاگس بورو؟

ڈاگس بورو : میری ؟

اوعیسی : ہاں کہیں ایسا تو نہیں، جب تم شیٹ کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے تو کانٹریکٹ . . . ہاں یعنی اگر ہم یہ کہیں، کانٹریکٹ تیار نہیں کیا جا رہا تھا ؟

گڈ ول : اوکیسی !

گیفلر : (اوکیسی سے) ڈاگس بورو ؟ پاگل ہوگیا کیا !

ڈاگس بورو : میں . . .

اوعیسی : اور اس سے پہلے، کونسل ہال میں، جب تم نے ہمیں کہا : پھول گوبھی والوں پر کتنا بُرا وقت آن پڑا ہے اور کس بُری طرح سے انہیں قرض کی ضرورت ہے ——— تمھاری وہ آواز کہیں تمھاری ذاتی شمولیت کی وجہ سے تو نہیں تھی ؟

بوشر : کیا تمھیں ذرا برابر شرم نہیں آتی ؟ دیکھو تو سہی، اس کا جی اچھا نہیں ہے۔

کاروتھر : ذرا اس کی بڑی عمر کا تو خیال کرو !

فلیک : اس کے برف سے سفید بال تمھارے گرے ہوئے شکوک کو خاک میں ملاتے ہیں۔

روما : تمھارے پاس ثبوت ہیں ؟

اوعیسی : ثبوت ہیں . . .

اوئی : خاموش، پلیز ! ذرا سی خاموشی، بس ذرا سی، دوستو !

گیفلر : (تیز آواز میں) خدا کے لیے، ڈاگس بورو، کچھ تو کہو !

ایک باڈی گارڈ : (یکایک گرجتا ہے) باس خاموشی چاہتا ہے ! خاموش !

یکایک خاموشی چھا جاتی ہے۔

اوئی : اگر مجھے کچھ کہنا ہے، اس آن، اس شرمناک گھڑی میں، اس شرمناک جگہ پر جہاں ایک آدمی کو ذلیل کیا جا رہا ہے جس کے بال سفید ہو چکے ہیں اور جس کے دوست خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے ہیں، تو یہ کہنا ہے : مجھے تم پر بھروسہ ہے، مسٹر ڈاگس بورو۔ اور میں پوچھتا ہوں : کیا یہ دغا باز چہرہ ہے ؟ کیا یہ آنکھیں اس کی ہو سکتی ہیں جو بے ایمانی کے راستے پر چلتا ہے ؟ کیا تم سفید اور سیاہ میں تمیز نہیں کر سکتے ؟ اگر ایسا ہے تو ہم مشکلوں میں آن پھنسے ہیں !

کلارک : ایک بے داغ آدمی پر رشوت کا الزام لگایا جا رہا ہے !

اوعیسی : صرف یہی نہیں : جعلسازی کا الزام بھی۔ اس لیے کہ وہ ناپاک جہازوں کا کارخانہ جس پر شیٹ کی ملکیت کے زمانے میں ہزار لعنت ملامت ہوتی رہی، ڈاگس بورو کا تھا جب اسے قرضہ دیا گیا۔

مل بیری : ایک غلیظ جھوٹ !

کاروتھر : میں ڈاگس بورو کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتا ہوں۔ شہر کے تمام لوگوں کو بلاؤ ! میں چیلنج کے ساتھ کہتا ہوں،

ایک آدمی بھی ڈھونڈ نکالو جو ڈاکس بورو پرشک کرتا ہو۔

ایک نامہ نگار ، (دوسرے نامہ نگاروں سے جو ابھی ابھی آیا ہے) ڈاکس بورو پر شک کیا جا رہا ہے!

مستقل نامہ نگار : ڈاکس بورو پر؟ ابراہم لنکن پر کیوں نہیں؟

مل ہیف اینڈ ملیک ، گواہ لاؤ، گواہ!

ابو حسینی : اوہ، تو تمھیں گواہوں کی ضرورت ہے؟ اے ے، ہمتو، ہمارا گواہ کہاں ہے۔ . . ؟ ہے وہ یہاں؟

ہاں، میں دیکھ رہا ہوں، وہ یہیں ہے۔

ان کے آدمیوں میں سے ایک نے دروازے میں قدم رکھا ہے اور اشارہ کیا ہے۔ سب دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مختصر وقفہ۔ پھر یکے بعد دیگرے گولیاں چلنے اور شور و غل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شورش، ہنگامہ۔ نامہ نگار باہر کی طرف لپکتے ہیں۔

نامہ نگار : گولیاں۔ مشین گن۔ باہر تو گولیاں چل رہی ہیں ——— تمھارے گواہ کا نام کیا ہے، اوکیسی؟ ——— بری بات، برا چکر ——— اے اوئی!

ابو حسینی : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) باؤل! (دروازے سے باہر پکارتا ہے) اندر آؤ، اندر!

کالم نگار سکنگ : یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ——— کسی کو گولی ماردی گئی ہے ——— سیڑھیوں پر ——— خدا کی پناہ!

مہوشد : (اوئی سے) پھر وہی وحشیوں کا کھیل؟ اوئی، بس یہ سمجھ لو ہمارے بیچ سب کچھ ختم اگر۔ . .

اوئی : ہاں؟

سپاہی ایک لاش اندر لاتے ہیں۔

ابو حسینی : ارے یہ تو باؤل ہے۔ میرا گواہ، صاحبان، میرا خیال ہے، ایسی حالت میں نہیں ہے کہ اس سے کچھ پوچھا جا سکے۔

وہ تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ سپاہیوں نے باؤل کی لاش ایک کونے میں رکھ دی ہے۔

ڈاگز برو : گیفلز، خدا کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالو!

بنا جواب دیے گیفلن اس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

اُوِش ؛ (بازو پھیلا کر، گمن بورک کی طرف بڑھتے ہوئے) مبارک، ڈاکس بورو۔ یقین رکھو۔ اس طرح یا اُس طرح، میں سب ٹھیک کر دوں گا!

ایک علامت ابھرتی ہے۔

چھ

ہوٹل میمتھ۔ اُوئی کا کمرہ۔ دو باڈی گارڈ چیتھڑے پہنے ہوئے ایک اداکار کو اُوئی کی طرف لے جاتے ہیں۔ پس منظر میں گی وولا ہے۔

پہلا باڈی گارڈ : یہ ایک اداکار ہے، باس۔ آج کل خالی خولی بیکار ہے۔

دوسرا باڈی گارڈ : غریب لباس تک نہیں خرید سکتا۔ شراب خانے کے لوگ گاہکوں کو کھینچنے کے لیے کبھی کبھی اسے پیسے دیتے ہیں۔ اس وقت چڑھائے ہوئے ہے۔ میں نے سُنا ہے یہ اچھا اداکار ہے۔ وہ جو کلاسیکی تھیٹر کے اداکار ہوتے ہیں نا، یہ ان میں سے ایک ہے۔

اُوئی : تب ٹھیک ہے۔ ہاں تو میری دقت یہ ہے: میرے ذہن میں یہ بات ڈال گئی ہے کہ میرا تلفظ کچھ ڈھنگ کا ہونا چاہیے۔ مجھے یوں جان پڑتا ہے، کچھ موقعوں پر خصوصاً جب میں سیاست کے میدان میں قدم رکھوں گا، مجھے چند ایک الفاظ تو بہر صورت بولنا پڑیں گے۔ تو میں نے طے کیا ہے کہ بولنا سیکھ لوں اور حرکات و سکنات بھی۔

اداکار : بہت خوب۔

اُوئی : آئینہ لاؤ۔

ایک باڈی گارڈ ایک قدِ آدم آئینہ لے کر اسٹیج کے اگلے حصے میں آتا ہے۔

اُوئی : تو پہلے چال۔ تم لوگ تھیٹر یا اوپیرا میں کس طرح قدم اُٹھاتے ہو؟

اداکار : آپ کیا چاہتے ہیں، میری سمجھ میں سب آگیا ہے۔ ٹھاٹ طمطراق۔ جولیس سیزر، ہیملٹ، رومیو ــــــ یعنی کہ شیکسپیئر مسٹر اُوئی، آپ نے صحیح آدمی کو چنا ہے۔ یہ بوڑھا ماہونی، یعنی میں آپ کو دس منٹ میں کلاسیکی سج دھج سکھا سکتا ہوں۔ صاحبان، آپ اپنے سامنے ایک المیہ شخصیت دیکھ رہے ہیں، شیکسپیئر کے ہاتھوں برباد۔ ایک انگریز شاعر۔ اگر شیکسپیئر وجہ نہ ہوتا تو آج اس وقت میں براڈوے کے اسٹیج پر ہوتا۔ ایک کردار کا المیہ۔ 'جب تم ابسن کھیل رہے ہو تو شیکسپیئر مت کھیلو، ماہونی! کیلنڈر پر نظر ڈالو! جناب، یہ ۱۹۱۲ء ہے!' ــــــ 'فن کوئی کیلنڈر نہیں جانتا، جناب!' میں کہتا ہوں۔ 'اور فن میری زندگی ہے۔' افسوس۔

گی وولا : میرے خیال میں آپ نے غلط آدمی پکڑ لیا ہے، باس۔ یہ اپنے وقتوں کا آدمی نہیں۔

اُوئی : یہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔ تم ذرا ادھر اُدھر چلو جس طرح شیکسپیئر کے ہاں چلتے ہیں۔

اداکار چند قدم اُٹھاتا ہے۔

اوڈی : خوب!

گمشلا : پہول کوبھی والوں کے سامنے آپ اس طرح نہیں چل سکتے۔ یہ قدرتی چال نہیں ہے۔

اوڈی : قدرتی چال نہیں ہے، کیا مطلب ہے تمہارا؟ آج اور اس زمانے میں کوئی قدرتی نہیں ہے۔ جب میں چلوں، لوگوں کو علم ہو، میں چل رہا ہوں۔

وہ اداکار کی چال کی نقل اُتارتا ہے۔

اداکار : سر ذرا پیچھے کی طرف۔ (اوڈی سر کو پیچھے کی طرف جھکا دیتا ہے) پاؤں اس طرح زمین پر پڑے کہ ایڑی پہلے زمین کو چھوئے۔ (اوڈی کا پاؤں زمین پر پڑتا ہے، ایڑی پہلے زمین چھوتی ہے) خوب۔ لاجواب۔ اسے کہتے ہیں خداداد فن! البتہ ذرا بازو۔ وہ کچھ صحیح نہیں ہیں۔ ذرا سخت رہتے ہیں۔ شاید یوں بہتر ہوگا۔ آپ دونوں بازوؤں کو سامنے کی طرف اس جگہ سے ملائے رکھیں، جہاں سے دھار چھوٹتی ہے: (اوڈی دونوں بازوؤں کو سامنے کی طرف اس جگہ سے ملاتا ہے، جہاں سے دھار چھوٹتی ہے) کوئی برا نہیں۔ ڈھیلے مگر ذرا مضبوط انداز میں۔ لیکن سر ذرا پیچھے کی طرف۔ خوب۔ یہ ہے آپ کے کام کی چال، میرے خیال میں، مسٹر اوڈی۔ اس کے علاوہ آپ اور کیا سیکھنا چاہتے ہیں؟

اوڈی : لوگوں کے سامنے کیسے کھڑا ہونا چاہیے۔

گی مولا : آپ اپنی پشت پر بانس کی دو کھپچیاں لگوالیں، پھر آپ صحیح کھڑے ہوں گے۔

اوڈی : بکواس۔ میں جب کھڑا ہوں، میں نہیں چاہتا، لوگ کھپچیوں کی طرف دیکھیں۔ میں چاہتا ہوں، وہ مجھے دیکھیں۔ سکھاؤ مجھے!

وہ ایک خاص ڈھنگ سے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بازو چھاتی پر بندھے ہوئے ہیں۔

اداکار : ایک ممکن لیکن عامیانہ حل یہ ہے۔ آپ حجام کی صورت تو نظر آنا نہیں چاہتے، مسٹر اوڈی۔ اپنے بازو یوں باندھیے۔ (وہ اپنے بازوؤں کو اس انداز سے باندھتا ہے کہ ہاتھوں کی پشت دکھائی دیتی رہتی ہے۔ اس کی ہتھیلیاں کندھوں سے ذرا نیچے بازوؤں پر پڑی ہیں) اک ذرا سی بات اور قیامت کی تبدیلی۔ ذرا آئینے میں فرق تو دیکھیے، مسٹر اوڈی۔

اوڈی آئینے میں نئی طرز جانچتا ہے۔

اوڈی : برا نہیں۔

گی مولا : یہ سب کیا ہے، باس؟ ٹرسٹ کی ان دکھاوے کی تپلونوں کے لیے؟

اُوڈی : نہیں، لعنت بھیجو ان پر! یہ سب تو معمولی چھوٹے لوگوں کے لیے ہے۔ مثلاً، اچھا تم ہی بتاؤ، وہ کلارک بھلا آنی ترک بھڑک کیوں دکھاتا ہے؟ اپنے برابر کے لوگوں کو نہیں۔ اس کے لیے تو اس کا بنیک کھاتہ ہی کافی ہے، جس طرح بعض اوقات میرے گھونسے باز میرے لیے کام کرتے ہیں۔ تو کلارک چھوٹے آدمیوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنی ترک بھڑک دکھاتا ہے۔ میں خود ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

گی وڈلا : لیکن کچھ لوگ یہی کہیں گے، یہ رنگ ڈھنگ پیدائشی نہیں ہیں اور بعض لوگوں کی یہی ضد ہو جائے گی۔

اُوڈی : ہاں، میں جانتا ہوں، کچھ لوگ ایسا کہیں گے۔ میں یہ سب پروفیسروں یا شاطر تپلونوں کے لیے نہیں کر رہا ہوں میرا مقصد تو چھوٹے معمولی لوگوں کی نظروں کو ان کے مالک کا تصور دینا ہے۔

گی وڈلا : مالک کو آسنانہ کھینچیے، باس۔ ایک جمہوریت پسند، ایک دوست کے تصور سے آگے نکلیے، جو چاہے اپنی قمیض کی آستین میں ہو لیکن انھیں بھروسہ دے سکے۔

اُوڈی : اس کے لیے تو میرے پاس ڈاگس بورو ہے۔

گی وڈلا : اس کے نام کا تو حلیہ بگڑ چکا ہے۔ کتابوں میں اس کی ساکھ اب بھی موجود ہے، ایک قدیم پاک شے کی طرح لیکن اب لوگ اسے مثال کے طور پر پیش کرنے کو تیار نہیں ہیں جیسے کہ کبھی تھے۔ انھیں اب اس کے کھرا ہونے کا یقین نہیں۔ وہ تو اس خاندانی بائبل کی طرح ہے جسے اب کوئی کھولتا نہیں اور برسوں پہلے تبرک سے دوستوں کے ہمراہ جس کے پیلے ورق الٹتے ہوئے انھیں اس میں سے سوکھا مرا ہوا کھٹمل ملا تھا۔ ہاں، ہو سکتا ہے، وہ کولی فلاور ٹرسٹ کے کام کا اب بھی ہو۔

اُوڈی : کون باعزت ہے، اس کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔

گی وڈلا : یقیناً، باس۔ ڈاگس بورو میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ہم اب بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ میونسپل کونسل نے ابھی اسے برطرف نہیں کیا ہے کیونکہ اس طرح دھماکہ زبردست ہوگا۔

اُوڈی : ہاں تو اب مجھے بیٹھنا سکھاؤ!

اے اکار : بیٹھنا۔ بیٹھنا ہی تو سب سے مشکل کام ہے، مسٹر اُوئی۔ ایسے لوگ ہیں جو چل سکتے ہیں، ایسے لوگ ہیں جو کھڑے ہو سکتے ہیں، لیکن ایک ایسا بتائیے جو بیٹھ سکتا ہو۔ یہ ٹیک والی کرسی لے لیجیے، مسٹر اُوئی۔ ہاں، لیکن پشت مت ٹیکیے، ہاتھ زانو پر، پیٹ سے زانو تک، کہنیاں بدن سے ذرا الگ۔ اس طرح آپ کتنی دیر تک بیٹھ سکتے ہیں، مسٹر اُوئی؟

اُوڈی : جتنی دیر تک میں چاہوں۔

اے اکار : تب تو بس سب ٹھیک ہے، مسٹر اُوئی۔

گی وڈلا : آپ جانتے ہیں، باس، جب بڈھا ڈاگس بورو چل بسے گا تو گری اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ لوگوں کو شیشے میں اتارنے والی بات اس میں ہے۔ وہ خوب مسخرہ بن جاتا ہے اور وقت آنے پر اتنے زور سے ہنستا ہے کہ چھت کا پلاسٹر چھڑنے لگتا ہے۔ ہاں، کبھی کبھی وہ یہ سب بے وقت بھی کرتا ہے مثلاً جب آپ ہارنکس کے ہاسی کے ایک معمولی بیٹے کا جو کہ آپ تھے، اور سات باہمت نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ . . .

اُوڈی : تو وہ ہنستا ہے؟

گی وڈلا : پلاسٹر تک چھت سے جھڑنے لگتا ہے۔ یہ اسے نہ بتائیے گا کہ میں نے یہ سب کہا ہے ورنہ وہ یہ سمجھے گا کہ میں نے اس

کے خلاف آپ کو بھڑکایا ہے مگر اتنا تو آپ کر ہی سکتے ہیں کہ اسے واہیات ہیٹ بیچنے سے روک دیں۔

اُوڈی : کس قسم کے ہیٹ ؟

گی ملا : لوگوں کے ہیٹ جو اس نے جبراً اتارے ہیں۔ اور وہ انھیں پہن کر لوگوں میں گھومتا بھی ہے۔ یہ سب شرمناک ہے۔

اُوڈی : بھول جاؤ اسے۔ میں ایسے بیل کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جو میری فصل پر منہ نہیں مارتا۔ میں اپنے ماتحتوں کے معمولی عیبوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ (اداکار سے) اور اب ذرا بولنا سکھاؤ! میرے لیے ذرا ایک تقریر کرو!

اداکار : شیکسپیر۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ جولیس سیزر۔ رومن ہیرو۔ (جیب میں سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالتا ہے) مارک انتونی کی تقریر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سیزر کی لاش کے سامنے۔ بروٹس کے خلاف۔ سیزر کے قاتلوں کا سرغنہ۔ لفاظی کا نمونہ۔ شہرت یافتہ۔ ۱۹۰۸ء میں زینتہ تھیٹر میں میں نے انتونی کا رول ادا کیا تھا۔ اسی کو آپ کو ضرورت ہے، مسٹر اُوڈی۔ (وہ ایک خاص ڈھنگ سے کھڑا ہوتا ہے اور لفظ بہ لفظ مارک انتونی کی تقریر پڑھتا ہے) دوستو، روم نواسیو، ہم وطنو، میری بات دل کے کانوں سے سنو!

اُوڈی چھوٹی سی کتاب میں سے پڑھتے ہوئے سطر کے بعد سطر اداکار کی آواز کے پیچھے پیچھے دہراتا ہے کبھی کبھی اداکار اسے درست کرنے کو کہتا ہے لیکن زیادہ تر اُوڈی کی ادائیگی کھردری اور غیر مسلسل رہتی ہے۔

اداکار : میں سیزر کو دفن کرنے آیا ہوں، اس کی توصیف کرنے نہیں۔
آدمی جو بدی کرتے ہیں، ان کے بعد بھی زندہ رہتی ہے؛
نیکی ان کی ہڈیوں کے ساتھ دفن ہوتی ہے؛
یہی سیزر کے ساتھ ہونے دو۔ نیک بروٹس نے
تم سے کہا ہے، سیزر بوالہوس تھا۔ اگر ایسا تھا تو
یہ اس کی بھیانک بھول تھی، اور سیزر کا انجام بھی بھیانک ہوا۔

اُوڈی : (اپنے آپ جاری رکھتا ہے)

یہاں، بروٹس کی اور دوسروں کی اجازت سے
——— کہ بروٹس ایک باعزت انسان ہے!
اسی طرح اور سب بھی، تمام باعزت انسان ———
میں آیا ہوں سیزر کے جنازے میں شریک ہونے، کچھ کہنے۔
وہ میرا دوست تھا، وفادار اور میرے نزدیک عدل پسند؛

لیکن بروٹس کہتا ہے وہ بوالہوس تھا،
اور بروٹس ایک باعزت انسان ہے۔
وہ بہتوں کو قیدی بنا کر اپنے روم لایا،
جن کی رہائی کے تاوان سے تجوریاں بھر گئیں،
کیا یہ سیزر کی بوالہوسی جان پڑتی ہے؟
جب مفلس نادار چلائے، سیزر رو دیا،
بوالہوس تو سخت کرخت شے کے بنے ہوتے ہیں۔
لیکن بروٹس کا کہنا ہے وہ بوالہوس تھا،
اور بروٹس ایک باعزت انسان ہے۔
تم سب لوگوں نے دیکھا ہے لوپرکال میں تین بار
میں نے سیزر کو شاہی تاج پیش کیا
اور تینوں بار اس نے انکار کیا۔ کیا یہ بوالہوسی تھی؟
پھر بھی بروٹس کا کہنا ہے وہ بوالہوس تھا،
اور بلاشبہ بروٹس ایک باعزت انسان ہے۔
میں جو کہہ رہا ہوں اس کو جھٹلانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں
جو بروٹس نے کہا ہے، لیکن جو میں یہاں کہہ رہا ہوں وہی ہے
جو میں جانتا ہوں۔
تم سب نے کبھی اسے پیار کیا ہے، بے سبب تو نہیں؟
پھر کیا سبب ہے جو تمھیں اس کا سوگ منانے سے روکتا ہے؟

آخری سطروں کے دوران پردہ دھیرے سے گرتا ہے
ایک علامت اُبھرتی ہے۔

سات

کولی فلاور ٹرسٹ کے دفاتر۔ آرتورو اُوئی، ارنستو روما، جیوسیپ گی وولا، ایمانوئل گری اور باڈی گارڈ۔ چھوٹے سبزی فروشوں کا ایک گروہ اُوئی کو سن رہا ہے۔ بڈ ہاف ڈاگس برو، جو بیمار ہے، پلیٹ فارم پر اُوئی کے برابر بیٹھا ہے۔ پس منظر میں کلارک۔

اُوئی : (چنگھاڑتے ہوئے) قتل! استحصالِ زر! راہزنی! ہمارے شہر کی گلیوں میں آگ اُگلتی ہوئی مشین گنیں! اِدھر اُدھر کاروبار کرتے ہوئے لوگ، قانون کا احترام کرنے والے شہری۔ ان میں سے کوئی کونسل ہال میں بیان دینے جاتا ہے تو دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے! میں پوچھتا ہوں، ہمارے شہر کے امین کیا کر رہے ہیں؟ کچھ نہیں! یہ معزز لوگ جو اپنے کالے دھندوں میں بری طرح مصروف ہیں اور جو باعزت شہریوں پر کیچڑ اچھال رہے ہیں، انھیں خود اپنے بنائے ہوئے قوانین لاگو کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

گی وولا : واہ!

اُوئی : مختصر یہ کہ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر ہر شخص من مانی کرتا ہے، اگر ایک کتا بنا سوچے سمجھے دوسرے کتے کو کھا جاتا ہے، تو میں اسے افراتفری کہتا ہوں۔ ذرا سوچو! اگر میں چپ چاپ اپنے ترکاریوں کے گودام میں بیٹھا ہوں یا پھر اپنی پھول گوبھیوں کا ٹرک چلا رہا ہوں اور کوئی بھینسے کی طرح میرے گودام میں چلا آتا ہے: ہینڈز اپ! یا پھر وہ میرے ٹائر پنکچر کر دیتا ہے، ان حالات میں امن و امان کے بارے میں سوچنا ممکن نہیں۔ لیکن جو میں یہ جان لوں، سمجھ لوں کہ لوگ بے زبان بھیڑیں نہیں ہیں تو مجھے طے کرنا پڑے گا کہ کس طرح ان لوگوں کو اپنی دوکان میں گھسنے سے روکا جائے۔ تب میں ان کے لیے اپنے ہاتھوں کا بہتر استعمال کر سکتا ہوں۔ لوگ اپنی خوشی سے اپنا مال اسباب اپنے سے الگ نہیں کرتے، نہ نیکی کے نام پر نہ کونسل ہال میں باتوں کے موتی بکھیرنے والوں کی شاباش کی خاطر۔ صورتحال کچھ یوں ہے: اگر میں گولی نہیں چلاتا، کوئی دوسرا شخص مجھ پر گولی چلا دے گا۔ یہی منطق ہے۔ تو پھر؟ اب تم پوچھو گے اب کیا کیا جائے؟ میں بتاتا ہوں۔ لیکن پہلے یہ بات صاف کر دوں: اب تک جو کچھ تم کرتے رہے ہو، تباہ کن ہے: اپنے اپنے کاؤنٹروں پر بیکار بیٹھے سوچتے رہنا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور آپسی پھوٹ اور تکرار، ایک مضبوط دفاع کی جگہ جو تمھیں داداؤں، بدمعاشوں کے حملوں سے بچائے۔ نہیں، میں کہتا ہوں، اس طرح کام نہیں چل سکتا۔ پہلی چیز جس کی ضرورت ہے، اتحاد ہے۔ دوسری چیز ہے قربانی۔ کیسی قربانی؟ تم پوچھو گے۔ کیا ہم ہر ڈالر میں سے تیس سینٹ محض تحفظ کی خاطر نکال دیا کریں؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پیسے بہت قیمتی ہیں۔ اگر تحفظ بنا قیمت ہو سکتا ہے، تب ٹھیک ہے اور ہم سب اس کے لیے تیار ہیں۔ تو میرے پیارے سبزی فروشو، یہ اتنا آسان اور سیدھا سادھا نہیں ہے۔ صرف موت سستی ہے: اس کے علاوہ ہر چیز پر پیسے خرچ ہوتے ہیں اور ہر چیز میں تحفظ، امن اور سکھ شامل ہے۔ یہی زندگی ہے، اور اس سے کبھی مختلف ہوگی بھی نہیں، اسی لیے ان صاحبان اور میں نے

(کچھ باہر بھی ہیں) فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔

گی دولا اور روما تالیاں بجاتے ہیں۔

لیکن یہ دکھانے کے لیے کہ ہم مضبوط تجارتی اصولوں پر عمل کرتے ہیں، ہم نے اپنے ساجھے دار، ان مسٹر کلارک کو جو تھوک کاروبار کرتے ہیں اور جنھیں آپ سب جانتے ہیں، یہاں آنے اور آپ سے خطاب کرنے کی دعوت دی ہے۔

روما، کلارک کو آگے کی جانب کھینچتا ہے۔ چند ایک سبزی فروش تالیاں بجاتے ہیں۔

گی دولا : مسٹر کلارک، میں اس جلسے کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مسٹر اوئی اس بات کو بڑا اعزاز سمجھتے ہیں کہ کولی فلاور ٹرسٹ ان کی پیش قدمی کی حمایت کر رہا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مسٹر کلارک۔

کلارک : خواتین اور حضرات، ہم کولی فلاور ٹرسٹ کے لوگ بڑی تشویش کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ سبزی فروشوں کے لیے کاروبار چلانا کتنا مشکل پڑ رہا ہے۔ کیونکہ، میں نے آپ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے، 'سبزی ترکاریاں بہت مہنگی ہیں' ہاں، لیکن یہ کیوں مہنگی ہیں؟ اس لیے کہ سبزی ترکاریوں کو باندھنے لپیٹنے والے، انھیں اٹھانے لے جانے والے، کچھ باہر والوں کے اکسانے پر زیادہ سے زیادہ دام مانگتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا خاتمہ کرنے کے لیے مسٹر اوئی اور ان کے دوست اٹھے ہیں۔

پہلا سبزی فروش : لیکن اگر چھوٹے معمولی آدمی کو کم سے کم پیسے ملے تو وہ ہماری ترکاریاں کیسے خریدے گا؟

اوئی : تمھارا سوال واقعی اچھا ہے۔ یہ رہا میرا جواب : یہ بات پسند ہو یا ناپسند، مزدور کو الگ کر کے ہماری اس ماڈرن دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا، مزدور جو ایک گاہک بھی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ایمانداری سے کام کرنا کوئی ذلت کی بات نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہے۔ منافع کے لیے یہ تعمیری بھی ہے اور معاون بھی ہے۔ ایک فرد کے ناطے ایک مزدور کے ساتھ میری تمام تر ہمدردیاں ہیں۔ لیکن جب وہ اکٹھا ہو جاتے ہیں، جب وہ سوچے سمجھے بنا ان معاملات میں دخل اندازی شروع کر دیتے ہیں، جیسے منافع کے معاملات، اُجرت کے معاملات وغیرہ وغیرہ تب میں کہتا ہوں : سنبھل کے قدم اٹھاؤ بھائی، مزدور وہ ہے جو مزدوری کرتا ہے۔ لیکن جب تم ہڑتال کرتے ہو جب تم کام بند کر دیتے ہو، تب تم مزدور کہاں رہے۔ تب تم سماج کے لیے ایک خطرہ ہو۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں میں قدم رکھتا ہوں۔

کلارک تالیاں بجاتا ہے۔

پھر بھی، آپ لوگوں کو یقین دلانے کے لیے کہ ہر چیز کھلی ہے، ڈھکی چھپی نہیں، میں آپ کی توجہ ایک اچھی طرح جانے پہچانے شخص کی موجودگی کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو، مجھے یقین ہے، یہاں موجود ہر شخص کے لیے شرافت اور اخلاق

کہتا ہے۔ اس شخصیت کا نام ہے ڈگس بوررو۔

سبزی فروش خوشدلی سے تالیاں بجاتے ہیں۔

مسٹر ڈگس بوررو، میں آپ کا ناقابلِ بیان حد تک شکرگزار ہوں۔ ہماری ملاقات خدائی نعمت ہے۔ میں کبھی بھول نہیں سکتا ——— سو سال بھی زندہ رہوں تب بھی ——— بالکل کے مجھ ناچیز کو کس طرح گلے سے لگایا، اپنے دوست کے طور پر چنا، نہیں، اس سے کہیں زیادہ، اپنا بیٹا بنایا۔

ڈگس بوررو کے جھولتے لٹکتے ہاتھ کو تھامتا ہے اور جوش سے ہلاتا ہے۔

گی وولا : (دبی آواز میں) کیا دل تڑپانے والا منظر ہے! باپ اور بیٹا!

گیسری : (قدم بڑھاتا ہے) اچھا تو لوگو، باس نے وہی کہا ہے جو ہم سب کے دل میں ہے۔ مجھے آپ کے چہروں پر کچھ سوالات لکھے نظر آ رہے ہیں۔ آپ انہیں پوچھیے! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو کھا تھوڑے ہی جائیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ سیدھا کھیل کھیلیں، ہم آپ کے ساتھ سیدھا کھیل کھیلیں گے۔ ہمیں خالی خولی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں، خاص طور پر ایسی باتوں سے جن کا مقصد بس ہر چیز میں کیڑے نکالنا ہو۔ ہم کھلے دل کے لوگ ہیں۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ کیا اور کیسے کرنا ہے، اس سلسلے میں آپ کی ہر صحت مند اور مثبت صلاح قابلِ قبول ہو گی۔ سو پھوٹیے جو پھوٹنا ہے!

سبزی فروش ایک لفظ تک نہیں کہتے۔

گی وولا : (چکنی چپڑی آواز میں) اور کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ لوگ مجھے بھی جانتے ہیں اور میری چھوٹی سی پھولوں کی دوکان کو بھی۔

ایک باڈی گارڈ : گی وولا، زندہ باد!

گی وولا : تو پھر، ٹھیک ہے نا۔ کیا آپ حفاظت چاہتے ہیں؟ یا پھر قتل، لوٹ مار اور راہزنی؟

پہلا سبزی فروش : پچھلے کچھ دنوں سے تو کافی امن چین ہے۔ میرے اسٹور میں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوا ہے۔

دوسرا سبزی فروش : میرے ہاں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ہے۔

تیسرا سبزی فروش : میرے ہاں بھی نہیں۔

گی وولا : عجیب بات ہے!

دوسرا سبزی فروش : یہ تو ہم نے سنا ہے کہ حال ہی میں شراب خانوں میں ایسی کچھ وارداتیں ہوئی ہیں جیسی کہ مسٹر اوئی ابھی ہمیں بتا رہے تھے۔ کچھ گلاس توڑ دیے گئے اور ان کی کچھ جن نالیوں میں بہا دی گئی جنھوں نے حفاظت حاصل کرنے سے انکار کیا۔ لیکن سبز چیزوں کے کاروبار میں امن و امان ہے۔ کم از کم ابھی تک، خدا کا شکر ہے۔

روما : اوشیٹ کے قتل کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور باؤل کی موت؟ اسی کو آپ امن وامان کہتے ہیں؟

خضرا سبزی فروش : لیکن کیا اس کا تعلق پھول گو بھیوں سے ہے، مسٹر روما؟

روما : نہیں۔ ذرا ایک منٹ۔

روما، اوئی کے پاس جاتا ہے جو اپنی لمبی تقریر کے بعد وہاں تھکا تھکا سا بے حس بیٹھا ہے۔ دو چار لفظوں کے بعد وہ گیری کو اشارے سے بلاتا ہے۔ گی ولا بھی دھیمی آواز کی اس بات چیت میں شامل ہو جاتا ہے۔ بیچگیری باڈی گارڈوں میں سے ایک کو اشارہ کرتا ہے اور تیزی سے اس کے ساتھ باہر چلا جاتا ہے۔

گی ولا : دوستو، مجھ سے کہا گیا ہے کہ آپ کو بتاؤں، ایک غریب ناخوش عورت آپ کی موجودگی میں مسٹر اوئی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔

وہ عقب میں جاتا ہے اور گکر سمیک اپ اور بھڑکیلا شوخ لباس پہنے ایک عورت ——— ڈوک ڈینوی کو ——— جس نے ایک چھوٹی بچی کا ہاتھ تھام رکھا ہے، لے کر آتا ہے۔ تینوں اوئی کے سامنے رک جاتے ہیں، جو کھڑا ہو چکا ہے۔

گی ولا : کہیے، مسز باؤل (سبزی فروشوں سے) یہ مسز باؤل ہیں۔ مسٹر باؤل کی نوجوان بیوہ۔ مسٹر باؤل جو کولی فلاور ٹرسٹ کے اکاؤنٹنٹ تھے، کل اپنا فرض ادا کرنے کونسل ہال کی طرف جاتے ہوئے کسی نامعلوم ہاتھوں مارے گئے۔ مسز باؤل!

ڈوک ڈینزی : مسٹر اوئی، اپنے شوہر کے سوگ میں جو اپنا ایک شہری کا فرض نبھانے کونسل ہال کی طرف جاتے ہوئے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، میں آپ کی دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لیے اور اس چھ سال کی بچی کے لیے جس کا باپ اس سے چھین لیا گیا ہے، پھول بھیجے۔ (سبزی فروشوں سے) صاحبان، میں ایک غریب بیوہ ہوں اور مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر مسٹر اوئی نہ ہوتے تو آج میں بے آسرا سڑکوں پر پڑی ہوتی اور اس بات کی گواہی میں ہمیشہ دوں گی۔ میری پانچ سال کی چھوٹی بچی اور میں ہمیشہ یہ یاد رکھیں گے، مسٹر اوئی۔

اوئی، ڈوک ڈینی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے اور بچی کی ٹھوڑی اٹھا کر دیکھتا ہے۔

گی ولا : زندہ باد!

گری، باؤل کا ہیٹ پہنے ہجوم کے بیچ میں سے گزرتا ہے۔ اس کے پیچھے کئی بدمعاش ہیں جن کے ہاتھوں

میز پہ پٹرول کے بڑے بڑے کنستر ہیں۔

وہ سب باہر کی جانب رُخ کرتے ہیں۔

ہوف : مسٹر پاؤل میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ بدامنی، جرائم کی یہ لہر رُکنی ہی چاہئیں کیونکہ . . .

گیسلا : (جیسے ہی سبزی فروش جھانک کر تیار ہوتے ہیں) رکو! ابھی میٹنگ ختم نہیں ہوئی ہے۔ ابھی بیچارے باؤل کی یاد میں ایک گیت گایا جائے گا جسے ہمارے دوست ہینز گرین وول گائیں گے اور پھر بیوہ کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے گا۔

باڈی گارڈوں میں سے ایک آگے بڑھتا ہے اور ایک جذباتی گیت گاتا ہے جس میں لفظ 'گھر' بار بار آتا ہے۔ اس عمل کے دوران تمام بدمعاش مستغرق ہیں، ان کے سر ہاتھوں میں ہیں، یا آنکھیں بند کیے پیچھے کو جھکے ہوئے ہیں۔ گیت کے اختتام پر ہلکی سی واؤں واؤں کرتی پولیس کا شور اور آگ لگنے کے سائرن کی آواز آتی ہے۔ پس منظر میں کھڑکی سے سرخ روشنی دکھائی دیتی ہے۔

معما : بندرگاہ میں آگ لگ گئی!

ایک آواز : کہاں؟

ایک باڈی گارڈ : کیا یہاں کوئی ہوک نام کا سبزی فروش موجود ہے؟

دوسرا سبزی فروش : ہاں، میں ہوں۔ کیا بات ہے؟

باڈی گارڈ : تمھارے گودام میں آگ لگ گئی ہے۔

سبزی فروش ہوک باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ کچھ اس کے پیچھے جاتے ہیں، کچھ کھڑکی کی طرف جاتے ہیں۔

معما : رکو! کوئی کمرے سے باہر نہ جائے!

باڈی گارڈ سے۔

کیا یہ آگ لگائی گئی ہے؟

باڈی گارڈ : یقیناً۔ وہاں پر پٹرول کے کچھ کنستر پڑے پائے گئے ہیں۔

تیسرا سبزی فروش : کچھ پٹرول کے کنستر یہاں سے لے جائے گئے تھے!

معما : (شدید غصے میں) کیا کہا؟ کیا کوئی یہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہ ہم نے کیا ہے؟

ایک باوردی گارڈ : (تیسرے سبزی فروش کی چھاتی میں اپنی آٹومیٹک چبھوتا ہے) یہاں سے کیا لے جایا گیا تھا؟ کیا تم نے کوئی پٹرول کا کنستر دیکھا تھا؟

دوسرے باوردی گارڈ : (دوسرے سبزی فروشوں سے) کیا تم نے کوئی پٹرول کا کنستر دیکھا تھا؟ دیکھا تھا؟

سبزی فروش : میں نے نہیں . . .

میں نے بھی نہیں۔

دوسرا : ہاں، یہ ہوئی نا بات۔

گن دوا : (سبزی سے) آہا ہا۔ وہی شخص جو تھوڑی دیر پہلے ہم سے یہ کہہ رہا تھا کہ سبز چیزوں کے کاروبار میں امن و امان ہے، اب خود ستم گروں کے ہاتھوں اپنا گودام جلتا ہوا مسسم ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے کیا تمہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا؟ کیا تم اندھے ہو؟ تم سب لوگوں کو ایک ساتھ اکٹھا ہونا پڑے گا۔ اور فوراً!

اُدئی : (چنگھاڑتے ہوئے) : اس شہر میں اب ہر چیز کالی بیمار نظر آ رہی ہے! پہلے قتل اور اب آتش زنی! لوگو، اس سے تو تمہیں پتہ لگ جانا چاہیے کہ اگلے وار سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے!

ایک علامت اُبھرتی ہے۔

آٹھ

کردار: گودام آتش زنی کیس۔ ملزم فنکار۔ جج۔ سرکاری وکیل۔ وکیل صفائی۔ نوجوان ڈاکٹر جوزف۔ گریش۔ گل وولا۔
محکمہ کا میئر۔ باڈی گارڈ۔ سپاہی گردش اور ملزم فنش۔

الف

اپیا نوئیل گریش گواہ کی کرسی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور ملزم فنش کی طرف انگلی اٹھاتا ہے جو نہایت بیچارگی اور بدحالی سے بیٹھا ہے۔

گریش : (چلاتے ہوئے) وہ رہا مجرم جس نے آگ لگائی! میں نے جب اسے للکارا، اس وقت وہ گلی میں سے نکل رہا تھا۔ پٹرول کا کنستر اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ حرام زادے! جب میں تجھ سے بات کر رہا ہوں، تجھے کھڑا ہونا چاہیے۔

فنش کو کھینچ کھانچ کر کھڑا کیا جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑا رہا ہے۔

جج : ملزم، ذرا خود کو سنبھالو۔ یہ عدالت ہے۔ تم پر آتش زنی کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے، یہ بات ہرگز مت بھولو!
فنش : (گھگھیاتی آواز میں) ار لار لارل۔
جج : پٹرول کا وہ کنستر تم کو کہاں ملا؟
فنش : ار لارل۔

جج کے اشارے پر کچھ بہت ہی زیادہ نفیس لباس پہنے ہوئے ایک ڈاکٹر جس کے چہرے سے خباثت ٹپکتی ہے، فنش پر جھکتا ہے اور گریش کے ساتھ آنکھوں آنکھوں میں بات کرتا ہے۔

ڈاکٹر : جناب یہ بن رہا ہے!
وکیل صفائی : ہماری تجویز ہے کہ دوسرے ڈاکٹروں کا بھی مشورہ لیا جائے۔
جج : (مسکراتے ہوئے) تجویز نامنظور!

وکیلِ صفائی : مسٹر گری، آپ وہاں کیسے موجود تھے جب یہ آگ، جس میں بائیس عمارتیں جل کر راکھ ہو گئیں، مسٹر ہوک کے گودام میں لگی؟

گری : میں کھانا ہضم کرنے کی غرض سے ٹہلنے نکلا تھا۔

کچھ باٹھی گارڈ ہنستے ہیں۔ گری بھی ان کے قہقہے میں شامل ہو جاتا ہے۔

وکیلِ صفائی : کیا آپ کو خبر ہے، مسٹر گری، کہ مسٹر فِش جو اب ملزم ہیں، ایک بے روزگار مزدور ہیں، اور کہ وہ اس سے پہلے کبھی شکاگو نہیں آئے تھے اور آگ کی واردات سے صرف ایک دن پہلے پیدل یہاں پہنچے تھے؟

گری : کیا؟ کب؟

وکیلِ صفائی : کیا آپ کی کار کا نمبر XXXXXXX ہے؟

گری : ہاں!

وکیلِ صفائی : کیا یہ کار آگ کی واردات سے پہلے کے چار گھنٹوں کے دوران ستاسیویں گلی میں ڈاگس بورو کے ریستوراں کے باہر کھڑی رہی تھی؟ اور کیا ملزم فِش کو بے ہوشی کے عالم میں ریستوراں سے باہر گھسیٹ نکالا گیا تھا؟

گری : میں کیسے جان سکتا ہوں؟ میں نے تو تمام دن کِسمرو میں سیر سپاٹے کے چکر میں گزارا تھا جہاں میں باون آدمیوں سے ملا تھا اور تمام لوگ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ انھوں نے مجھے دیکھا تھا۔

باڈی گارڈ ہنستے ہیں۔

وکیلِ صفائی : آپ کی پچھلی بات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ آپ کھانا ہضم کرنے کی غرض سے شکاگو بندرگاہ کے علاقے میں ٹہل رہے تھے۔

گری : کیا میں کِسمرو میں کھانا کھانے کے بعد اسے شکاگو میں ہضم نہیں کر سکتا؟ کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے؟

پرشور اور مسلسل قہقہے گونجتے ہیں، جن میں جج بھی شامل ہو جاتا ہے۔

اندھیرا۔

شوپاں کی ماتمی دھن، رقص کے آہنگ کی طرح آرگن پر بجتی ہے۔

ب

جشید دفتر لوٹتی ہے، سبزی فروش ہوک گواہ کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔

وکیل صفائی : کیا کبھی آپ کا ملزم سے جھگڑا ہوا تھا مسٹر ہوک؟ کیا آپ نے پہلے کبھی ملزم کو دیکھا تھا؟
ہوک : کبھی نہیں۔
وکیل صفائی : آپ نے کبھی مسٹر گری کو دیکھا ہے؟
ہوک : ہاں میں نے انھیں واردات کے دن کولی فلاور ٹرسٹ کے دفتر میں دیکھا تھا۔
وکیل صفائی : آگ لگنے سے پہلے؟
ہوک : آگ لگنے سے کچھ پہلے۔ وہ چار آدمیوں کے ساتھ کمرے میں سے گزرے تھے۔ ان کے پاس پٹرول کے کنستر تھے۔

نامہ نگاروں اور باڈی گارڈوں میں ہلچل۔

جج : نامہ نگار حضرات سے درخواست ہے، وہ ذرا خاموشی سے کام لیں۔
وکیل صفائی : مسٹر ہوک، آپ کے گودام کے آس پاس کس قسم کی عمارتیں ہیں؟
ہوک : شیٹ کے جہازوں کے سابق کارخانے کا احاطہ ہے وہاں۔ ایک راستہ ہے جو گودام کو کارخانے سے ملاتا ہے۔
وکیل صفائی : کیا یہ آپ کے علم میں ہے، مسٹر ہوک کہ مسٹر گری کارخانے میں رہتے ہیں، یعنی وہ گودام تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں؟
ہوک : ہاں۔ وہ اسٹاک گودام کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہیں۔

نامہ نگاروں میں مزید کھلبلی۔ باڈی گارڈ منہ چڑاتے ہیں، شور مچاتے ہیں اور ہوک، وکیل صفائی اور نامہ نگاروں کی طرف خود اپنے دھمکانے کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ نوجوان ڈاگس بورو جج کی طرف لپکتا ہے اور جج کے کان میں دھیمے سے کچھ کہتا ہے۔

جج : عدالت کا احترام لازمی ہے! گواہ کی طبیعت ناساز ہے۔ عدالت کی کارروائی ملتوی کی جاتی ہے۔

اندھیرا۔

آرگن پر سے جو رقص کے آہنگ کے اندر انھیں شوپاں کی ماتمی دھن بجتی ہے۔

ج

جب روشنی ہوتی ہے ہوک گواہ کی کرسی پہ بیٹھا نظر آتا ہے، بے دم اور نڈھال۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹی لڑکی ہے اور اس کے سر اور آنکھوں پہ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔

سرکاری وکیل : کیا تمھاری بینائی کمزور ہے، ہوک ؟
ہوک : (بمشکل) ہاں۔
سرکاری وکیل : بتاؤ، کیا تم آسانی سے اور یقین سے لوگوں کو پہچان سکتے ہو ؟
ہوک : نہیں۔
سرکاری وکیل : مثلاً، کیا تم اس آدمی کو پہچانتے ہو ؟

گری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہوک : نہیں۔
سرکاری وکیل : تم یہ کہنے کو تیار نہیں ہو کہ تم نے پہلے کبھی اس آدمی کو دیکھا ہے ؟
ہوک : نہیں۔
سرکاری وکیل : اور اب، ہوک، ایک بہت ہی اہم سوال - جواب دینے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لینا - کیا تمھارا گودام شیٹ کے سابق کارخانے سے ملا ہوا ہے ؟
ہوک : (ذرا سے وقفے کے بعد) نہیں۔
سرکاری وکیل : بس اتنا کچھ۔

اندھیرا۔
آرگن پہ پھر وہی دھن بجنے لگتی ہے۔

ے

جب روشنی ہوتی ہے، ڈمک ڈینی کو اُداکی کرسی پر بیٹھی نظر آتی ہے۔

ڈمک ڈینی : (مشینی آواز میں) میں ملزم کو صاف طور پر پہچانتی ہوں کیونکہ اس کے چہرے پر گناہ کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور کیونکہ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔ میری رشتے کی ایک بہن نے مجھے بتایا ہے کہ اس سہ پہر کو جب میرے خاوند پر گولی چلائی گئی تھی، یہ شخص کونسل ہال کے باہر دیکھا گیا تھا۔ اس کے پاس ایک مشین گن تھی اور یہ مشتبہ دکھائی دیتا تھا۔

اندھیرا۔

آنگن پر پھر وہی دُھن بجنے لگتی ہے۔

۶

جب روشنی ہوتی ہے، جوسیپ گی ووا گواہ کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ گرین ووڈ، اس کا ایک باڈی گارڈ، اس کے قریب کھڑا ہے۔

سرکاری وکیل : الزام لگایا گیا ہے کہ آگ لگنے سے پہلے کچھ لوگ کولی فلاور ٹرسٹ کے دفاتر سے پٹرول کے کنستر باہر لے جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

گی ووا : ہاں۔ یقیناً مسٹر گرین ووڈ کے علاوہ اور کوئی نہ ہوگا۔

سرکاری وکیل : کیا مسٹر گرین ووڈ آپ کی ملازمت میں ہیں؟

گی ووا : ہاں۔

سرکاری وکیل : آپ کا پیشہ کیا ہے، مسٹر گی ووا؟

گی ووا : میں گل فروش ہوں۔

سرکاری وکیل : کیا گل فروش بڑی مقدار میں پٹرول استعمال کرتے ہیں؟

گی ووا : (سنجیدگی سے) نہیں، ہاں کیڑے مارنے کے لیے کچھ تھوڑا بہت پٹرول استعمال کیا جاتا ہے۔

سرکاری وکیل : کولی فلاور ٹرسٹ کے دفاتر میں مسٹر گرین ووڈ کیا کر رہے تھے؟

گی ووا : وہ وہاں گیت گا رہے تھے۔

سرکاری وکیل : یعنی اس وقت وہ پٹرول کا کنستر ہوک کے گودام میں نہیں لے جاسکتے تھے۔

گی ووا : یہ ناممکن ہے۔ اور پھر آگ لگانا ان کے مزاج میں بھی نہیں ہے۔ وہ گلوکار ہیں۔

سرکاری وکیل : اگر عدالت کی اجازت ہو تو میں گواہ گرین ووڈ سے درخواست کروں گا کہ وہ وہی خوبصورت گیت یہاں گائیں جو وہ اس دن کولی فلاور ٹرسٹ کے دفاتر میں گا رہے تھے جبکہ گودام میں آگ لگائی جارہی تھی۔

جج : عدالت کی رائے میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

گی ووا : میں احتجاج کرتا ہوں۔

کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس عدالت کی یہ جانب داری افسوسناک ہے۔ شریف بھلے مانس لوگ جو دن کی روشنی میں بس یونہی ایک آدھ گولی داغ دیتے ہیں، تو ان کے ساتھ بدمعاشوں سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اور یہ شرمناک ہے۔

تغمغمہ۔ اندھیرا۔

آرگن پر پچرو جی ٹن بجنے لگتی ہے۔

ک د

جب روشنی ہوتی ہے، پوری عدالت بُری طرح تھکی دکھائی دیتی ہے

جج : اخبارات میں یہ اشارے کیے گئے ہیں کہ اس عدالت پر اِدھر اُدھر سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ عدالت یہ بات صاف کر دینا چاہتی ہے کہ اس کیس پر کسی بھی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا ہے اور اس مقدمے کی سماعت مکمل آزادی کی فضا میں ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے، اتنا کہنا کافی ہوگا۔

سرکاری وکیل : جناب! چونکہ ملزم فش مصنوعی دیوانگی کا بہانہ کیے ہوئے ہے، اس لیے سرکاری وکیل کا خیال ہے کہ ملزم سے مزید سوالات نہیں پوچھے جا سکتے۔ اس لیے ہم یہ تجویز رکھتے ہیں کہ

وکیل صفائی : جناب! ملزم ہوش میں آ رہا ہے۔

ہلچل۔

فش : (جیسے جاگتے ہوئے) اہلارل وارا مارلا و اڑلا۔

وکیل صفائی : ہاں! جناب! میں ملزم فش سے سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں!

شور و غل۔

سرکاری وکیل : مجھے اعتراض ہے! مجھے ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ فش ہوش و حواس میں ہے۔ یہ سب وکیل صفائی کی چالاکی ہے، گھٹیا سنسنی خیزی، لفاظی!

فش : پانی پی پی۔

وکیل صفائی کے سہارے کھڑا ہوتا ہے۔

وکیل صفائی : فش، کیا تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو؟

فش : آ۔۔۔ آ۔۔۔ آں ں!

وکیل صفائی : فش، عدالت کو یہ بتاؤ: کیا تم نے، پچھلے مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو، بندرگاہ پر ترکاریوں کے گودام کو آگ لگائی تھی؟ ہاں یا نہیں؟

فش : نہیں ں ں۔۔۔!

وکیل صفائی : تم شکاگو کب پہنچے تھے، فش؟

فِش : پانی ہی کی۔

وکیلِ صفائی : پانی!

ہلچل۔ نوجوان ڈاکس بورو جج کے پاس پہونچ چکا ہے اور جج کے ساتھ خدا جانے کیا بات کر رہا ہے۔

گیری : (کندھے اُچکاتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے اور چنگھاڑتا ہے) مکاری، پاکھنڈ! جھوٹ! سب جھوٹ!

وکیلِ صفائی : کیا تم نے پہلے کبھی اس شخص کو (گیری کی طرف اشارہ کرتا ہے) دیکھا ہے؟

فِش : ہاں ں۔ پانی ی۔

وکیلِ صفائی : کہاں؟ کیا بندرگاہ پر ڈاکس بورو کے ریستوراں میں؟

فِش : (مدھم آواز میں) ہاں ں۔

شور و غل۔ باڈی گارڈ بندوقیں تان لیتے ہیں اور شور مچاتے ہوئے منہ چڑاتے ہیں۔ ڈاکٹر پانی کا گلاس لیے دوڑتا آتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وکیلِ صفائی ڈاکٹر کے ہاتھ سے گلاس لے، ڈاکٹر فِش کے منہ میں گلاس میں جو کچھ بھی ہے، انڈیل دیتا ہے۔

وکیلِ صفائی : مجھے شدید اعتراض ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس گلاس کا معائنہ کیا جائے۔

جج : (سرکاری وکیل سے نظریں ملاتے ہوئے) درخواست نامنظور۔

ڈاک ڈیڈی : (فِش پر چیختے ہوئے) قاتل!

وکیلِ صفائی : جناب! سچائی کا منہ مٹی سے تو بھرا نہیں جا سکتا، اس لیے اب سچائی کا منہ کاغذ کے ایک ٹکڑے سے بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کاغذ کا ٹکڑا کہ جس پر سزا لکھی جائے گی اور پھر سنائی جائے گی کہ یہی ان لوگوں کی اُمید ہے۔ یہ کاغذ، یہ سزا کا پروانہ، اس کا مناسب عنوان تو یہ ہونا چاہیے، انصاف کی ہتک۔ یہ لوگ انصاف کو للکارتے ہیں: ہینڈز اپ ——— کیا یہ ہمارا شہر ہے جو سات دنوں میں سو برس بوڑھا ہو چکا ہے۔ غنڈوں، بدمعاشوں کے خوف اور دباؤ سے؟ کیا انصاف، قاتلوں سے بدتر ان درندوں کے سامنے سر جھکا دے گا؟ جناب! اس مقدمے کو معطل کر دیا جائے!

سرکاری وکیل : میں اعتراض کرتا ہوں!

گیری : کُتّے حرام زادے! تم جھوٹے بھونکتے ہوئے کُتّے ہو! تم تو خود زہریلے کُتّے ہو! آؤ! ذرا باہر تو آؤ! تمھاری کھال نہ ادھیڑ دی تو! بدمعاش!

وکیلِ صفائی : تمام شہر اس شخص کو جانتا ہے۔

گیری : (بپھرتے ہوئے) چُپ حرامی!

(جب جج اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے) تم بھی چپ رہو۔ جان پیاری ہے تو منہ بند رکھو!

ہانپنے لگتا ہے۔ اور جج کو بولنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جج : عدالت کا احترام لازمی ہے۔ وکیل صفائی پر عدالت کی ہتک کرنے کا مقدمہ چلایا جائے۔ مسٹر گری کے غم و غصے کو ہم سمجھتے ہیں۔ (وکیل صفائی سے) بیان جاری رہے۔

وکیل صفائی : فِش! کیا انھوں نے مڈاکس بورو کے ریستوراں میں تمھیں کچھ پینے کو دیا تھا؟ فِش! فِش!

مجمع : (چنگھاڑتے ہوئے) چیخو، چیخو، چلا کر پوچھو! اس کی تو ہوا ہی نکل گئی ہے! ہم بھی دیکھیں، اب اس شہر پر کس کا سکہ چلتا ہے!

شور و غل۔

اندھیرا۔

آرگن پہ پھر رقص کے آہنگ کے انداز میں شوپاں کی ماتمی دھن بجتی ہے۔

سن

جب آخری بار روشنی لوٹتی ہے تو جج کھڑا ہو جاتا ہے اور بے سُر آواز میں سزا سناتا ہے۔ ملزم کا رنگ مُردے کی زرد ہے۔

جج : چارلس فرش، آتش زنی کے جرم میں میں تمہیں پندرہ برس قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔

ایک علامت ابھرتی ہے۔

نو

انت

شہر سپرو۔ ایک گولیوں سے بھونے گئے ٹرک سے ایک عورت لپکتی اترتی ہے اور آگے کی جانب لڑکھڑاتی ہوئی بڑھتی ہے۔

عورت : بچاؤ! بچاؤ! بھاگو مت۔ مت بھاگو، پھر گواہی کون دے گا؟ میرا شوہر ٹرک میں ہے! انھوں نے اسے مار ڈالا ہے! بچاؤ! میرا بازو چھلنی ہوا پڑا ہے . . . اور ٹرک بھی۔ ارے مجھے بازو باندھنے کے لیے کچھ دو۔ انھوں نے ہمیں چوہوں کی طرح مار ڈالا ہے۔ او میرے خدا! ہماری کوئی کیوں مدد نہیں کرتا؟ قاتلو! ہائے میرا شوہر! میں جانتی ہوں، اس کے پیچھے کون ہے! اوئی! (چیختی ہے) بدمعاش! شیطان! غلیظ! تیرے سامنے تو غلاظت بھی شرمندہ ہے۔ ارے میں خون میں لت پت ہوئی پڑی ہوں! موری کے کیڑے! ہائے، اور لوگ سب کچھ سہہ رہے ہیں! سب کچھ جھیل رہے ہیں! اوئے اوئی کتے!

قریب ہی سے مشین گن کے غنے کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔
عورت لڑکھڑاتے ہوئے ڈھیر ہو جاتی ہے۔

اوئی، یہ سب تم نے کیا ہے!
کہاں گئے سب لوگ؟
ارے بچاؤ! ارے کون ان درندوں کو روکے گا؟

ب

ڈاگس ہورو کا مضافاتی مکان۔ دم بہ لب رات۔

ڈاگس ہورو اپنی وصیت اور اعتراف نامہ لکھ رہا ہے۔

ڈاگس ہورو : اس طرح میں نے، ایمان کے مجسمے ڈاگس ہورو نے، اسّی سال کی بے داغ زندگی کو غنڈوں بدمعاشوں کے گناہوں کے کالے دریا میں غرق کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا ہے، وہ جو مجھے ایک زمانے سے جانتے ہیں، یہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، مجھے اس کی خبر نہیں ہے اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر مجھے خبر ہوتی، میں کبھی ان کا ساتھ نہ دیتا۔ افسوس، صد افسوس، میں سب جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، کس نے ہُوک کے گودام میں آگ لگائی۔ میں جانتا ہوں، کون غریب فش کو ریستوراں میں کھینچ لایا اور کس نے اسے بے تحاشا شراب پلائی۔ میں جانتا ہوں، جب شیٹ کی خونی موت ہوئی تو اس کی جیب میں جہاز کا ٹکٹ تھا اور اُس وقت روما وہاں موجود تھا۔ میں جانتا ہوں، اس سہ پہر کونسل ہال کے باہر گری نے باؤل کو قتل کیا کیونکہ باؤل مجھ ایماندار بڈھے ڈاگس ہورو کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ میں جانتا ہوں، گری نے باؤل کو گولی ماری تھی اور پھر میں نے اسے باؤل کا ہیٹ پہنے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ گی وولا نے پانچ خون کیے ہیں جن کی فہرست یہاں درج ہے۔ میں آوئی کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آوئی کو علم ہے کہ میں شیٹ اور باؤل کی موت کے بارے میں، گی وولا کے پانچوں خون کے بارے میں اور آتش زنی کے بارے میں جانتا ہوں۔ آپ کے اس ایماندار بڈھے ڈاگس ہورو کے علم میں سب کچھ ہے۔ میں نے یہ سب برداشت کیا، سب جھیلا، محض ہوس اور موہ کے جال میں پھنس کر۔ میں ڈرتا تھا، میں کہیں آپ سب کا بھروسہ نہ کھو بیٹھوں، لیکن اب، اب۔ . .

دس

ہوٹل سے متصل۔ اُوڈی کا کمرہ۔

اُوڈی ایک گھومنے کرسی میں دھنسا بیٹھا ہے اور خلا میں گھور رہا ہے۔ گی وولا کچھ لکھ رہا ہے اور دو
باقی گماشتے اس کے کندھوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کھیسیں نکال رہے ہیں۔

گی وولا : اوراس لیے میں، ڈاگس بورو، اپنا شراب خانہ جفاکش گی وولا کے حوالے کرتا ہوں۔ اپنا مضافاتی مکان باہمت مگر ذرا گرم مزاج گری کو اور اپنا بیٹا ایماندار روما کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری درخواست ہے کہ روما کو پولیس چیف مقرر کیا جائے، گری کو جج اور گی وولا کو رفاہِ عام کے کاموں کا کمشنر۔ اور جو عہدہ، حیثیت میرے پاس ہے، اس کے لیے میں محبت سے آرتورو اُوئی کا نام تجویز کرتا ہوں جو، تمھارے اس ایماندار بڈھے ڈاگس بورو کی نظروں میں، اس کا بےحد مستحق ہے ——— بس، اتنا کافی ہے۔ میرا خیال ہے، بڈھا کوئی حیل حجت نہیں کرے گا۔ اس کا یہ وصیت نامہ جادو کی چھڑی کا کام کرے گا۔ اور اب کہ جیسا سب جانتے ہیں، بڈھا مر رہا ہے اسے جلد ہی زمین کے کسی صاف ستھرے ٹکڑے پر آخری آرام گاہ میں عزت سے سلانے کی امید کرنی چاہیے۔ ایک شاندار کتبے کی بھی ضرورت ہوگی۔ کچھ اس قسم کا کتبہ : پرانے زمانے کے کالے کوّوں نے کبھی ایک اُجلے شاندار کوّے کو نوچ نوچ کھایا تھا اور یہ منظر کبھی کسی نے کہیں دیکھا تھا۔ یہ بڈھا قدیم مُردہ وہی سفید کوّا ہے ——— میرے خیال میں اس سے زیادہ سفید کوّا ملنا مشکل ہے۔ ویسے باس، گری زیادہ تر اسی کے ساتھ رہتا ہے اور یہ بات نہ میری سمجھ میں آتی ہے اور نہ مجھے پسند ہے۔

اُوئی : (چونکتے ہوئے) گری! کیا کہا تم نے گری کے بارے میں؟

گی وولا : یہی کہ وہ بہت زیادہ وقت ڈاگس بورو کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس پر بھروسہ نہ کیجیے۔

گری اندر آتا ہے۔ وہ جوکی کا نیا ہیٹ پہنے ہوئے ہے۔

گی وولا : تم بھی نہیں۔ ارے گری، ہاں تو پھر ڈاگس بورو کی مرگیوں کا کیا حال ہے؟

گری : وہ ڈاکٹر کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔

گی وولا : ہمارا وہ بہترین ڈاکٹر جس نے فِش کی دیکھ بھال خوب محبت کے ساتھ کی؟

گری : دوسرا کوئی اور چلے گا بھی نہیں۔ بڈھا بہت بولتا ہے۔

اُوئی : یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی اور اس کے ساتھ بہت بولتا رہا ہو۔ . .

گری : یعنی؟ (گی وولا سے) تم کمینے، یہاں پر کیا زہر اُگلتے رہے ہو؟

گی وولا : (گھبراتے ہوئے) گری ڈیر، میں نے تو بس وصیت نامہ پڑھا ہے۔
گری : (وصیت نامہ اس کے ہاتھ سے چھینتا ہے) کیا؟ پولیس چیف؟ وہ؟ روما؟ پاگل تو نہیں ہوگئے؟
گی وولا : وہ تو یہی چاہتا ہے۔ میں تو اس کے خلاف ہوں۔ اس حرامی پر تو ایک آن کو بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

روما اندر آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے باڈی گارڈ ہیں۔

گی وولا : ارے روما، ذرا اس وصیت نامے پر ایک نظر تو ڈالو۔
روما : (اس کے ہاتھوں سے وصیت نامہ لیتا ہے) ہاں، ذرا دیکھوں تو سہی۔ تمھیں کیا علم اگری اور زج! امگریڈے کی تحریر کہاں ہے؟
گری : اس کے اپنے تکیے کے نیچے۔ وہ اسے کہیں باہر پہنچانے کی تاک میں ہے۔ میں پانچ بار اس کے بیٹے کو پکڑ چکا ہوں۔
روما : (اس کا ہاتھ تھامتا ہے) ہاں تو پھر اگری، بتاؤ مجھے۔
گری : کیا؟ کیا بتاؤں؟ مجھے کچھ علم نہیں۔
روما : ہاں ہاں، تمھارے علم میں ہے!

دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

روما : میں جانتا ہوں، سب جانتا ہوں، تمھارے من میں کیا ہے۔ کہیں کچھ ہے شیٹ کے بارے میں جس کا تعلق مجھ سے ہے۔
گری : اس میں باؤل کے بارے میں بھی ہے اور اس کا تعلق مجھ سے ہے۔
روما : اچھا، تو پھر ایسا ہی سہی لیکن یاد رکھو، تم دونوں ہیجڑے ہو اور میں ہوں مرد۔ میں تمھیں گری اور گی وولا تمھیں بھی خوب جانتا ہوں۔ میں تو یہ تک کہوں گا کہ تمھاری لنگڑی ٹانگ بکواس ہے۔ تم دونوں حرامی مجھے ہر وقت یہاں کیوں دکھائی دیتے ہو؟ تم کیا کھچڑی پکا رہے ہو؟ آرتورو، کس کس جھوٹ سے یہ لوگ تمھارے کان بھرتے رہے ہیں؟ چمگادڑو، ذرا سنبھل کر قدم اٹھانا۔ اگر میرے بارے میں تم نے کچھ الٹا سیدھا کیا اور میں نے تمھیں پکڑ لیا تو مسل کر رکھ دوں گا، حرامیو! سمجھے!
گری : روما، بہتر یہی ہے تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں تمھارا کوئی دو کوڑی کا بندوقچی نہیں ہوں۔
روما : (باڈی گارڈوں سے) سنا تم نے کیا کہا اس نے تمھیں! دو کوڑی کے بندوقچی۔ تو ہیڈ کوارٹر میں یہ لوگ تمھیں اس نام سے پکارتے ہیں! کولی فلاور ٹرسٹ کے ساتھ بھی ان کی ملی بھگت ہے اور ——

گری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

—— اور یہ قمیص جو یہ پہنے ہوئے ہے، کلارک کے درزی نے خاص حکم سے بنائی ہے —— اور تم

دوکوڑی کے بندو تم تو بس غلیظ واہیات کام کے لیے ہو ——— اور تم (اُرٹی سے) یہ سب چپ چاپ دیکھ رہے ہو۔

اُرٹی : (جیسے اب تیا گا ہو) چپ چاپ - کیا چپ چاپ ؟

گی وولا : کاروتھر کے ٹرک پر گولیاں داغنے کا قصہ ! کاروتھر جو ٹرسٹ کا ایک ممبر ہے !

اُرٹی : کیا تم نے کاروتھر کے ٹرک پر گولیاں چلائیں ؟

روما : مَیں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا - بس ایسے ہی کچھ لونڈے اس چکر میں پھنس گئے - بس یوں سمجھو، بے ساخت اشتعال - پھر ان کی سمجھ میں یہ بھی تو نہیں آتا کہ کیوں ہمیشہ چھوٹے معمولی سبزی ترکاری فروش ہی ان کا نشانہ بنیں جو خون اور پسینہ بہاتے ہیں - بڑے اور بھاری بھرکم لوگ کیوں نہیں ؟ لعنت ہے، آرتورو، میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا -

گی وولا : ٹرسٹ کے لوگ چپ ہیں لیکن بہت غصے میں ہیں -

گیری : کلارک کہتا ہے، بس ایک بار اور ایسا ہو جائے تو . . . اس نے ڈاگس بورو کو شکایت بھی کی ہے -

اُرٹی : (رُو کھے اور تیکھے لہجے میں) ارنستو، یہ سب نہیں ہونا چاہیے -

گیری : ذرا سختی سے کام لو، باس ! یہ لونڈے لپاڑے اپنے جامے سے باہر ہوتے جا رہے ہیں !

گی وولا : باس ! ٹرسٹ کے لوگ چپ تو ہیں لیکن بہت غصے میں ہیں -

روما : (اپنی پستول نکالتے ہوئے - گیری اور گی وولا سے) ٹھیک ہے - تو اب پھر ہینڈز اپ !

گیری اور گی وولا کے باڈی گارڈوں سے بھی -

اور تم سب چوہے بھی ! ہاتھ اوپر اٹھاؤ - ذرا سی بھی چالاکی نہیں ! چلو دیوار کی طرف - منہ دیوار کی طرف -

گی وولا، اس کے باڈی گارڈ اور گیری بے بسی سے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اور دیوار کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں -

اُرٹی : (لاتعلقی سے) یہ سب کیا ہے ؟ ارنستو انھیں تنگ نہ کرو - تم لوگ آخر کس بات پر جھگڑ رہے ہو ؟ اتنی سی بات ہی تو ہے نا کہ چند گولیاں سبزی ترکاری کے ٹرک کے چکر میں ضایع ہو گئیں ! تو اس قسم کی غلط فہمیاں تو دُور کی جا سکتی ہیں - دیکھو، سب کچھ کس خوبصورتی سے ہو رہا ہے - آگے کی کہانی خوب ہی - سبزی ترکاری فروش ہماری حفاظت کی قیمت چکا رہے ہیں، ہر ڈالر کے پیچھے تیس سینٹ - صرف پانچ دنوں میں تمام شہر نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں - کوئی انگلی ہمارے خلاف نہیں اٹھتی اور پھر میں نے تو اور بھی بڑے اور بہتر منصوبے بنا رکھے ہیں اور تم لوگ ہو کہ -

گی وولا : (تیزی سے) منصوبے ؟ مثلاً ؟

گیری : جہنم میں گئے تمھارے منصوبے - اس اُلو کے پٹھے کو کہو، مجھے ہاتھ نیچے کرنے دے -

روما : آرتورو، پہلا کام، خود اپنی حفاظت - ان حرامیوں کو اسی طرح رہنے دیا جائے تو اچھا ہے !

گی دولا : اگر میں حقیقت کلارک آ جائے اور ہمیں اس حالت میں دیکھے تو کیا سمجھے گا

اُدی : ارستو، پرے رکھو اس کھلونے کو!

روما : ایسا کوئی چکر نہیں! آنکھیں کھولو، آرتورو۔ کیا تم ان کی چال نہیں سمجھتے؟ یہ تمھیں کلارک اور ڈاگس بورو کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ اگر کلارک آ جائے اور ہمیں اس حالت میں دیکھ لے! میں تو پوچھتا ہوں، کارخانے کے فنڈ کہاں گئے؟ ہم نے تو کوڑی تک نہیں دیکھی ہے۔ لڑکے سبزی ترکاری کی دوکانیں لوٹیں، گودام کو آگ لگائیں اور پھر ٹھنڈی سانس بھریں: آرتورو آج جو کچھ ہے، ہمارے سبب بنا ہے اور اب وہ ہمیں جانتا ہی نہیں۔ اب تو وہ کارخانے کا مالک اور سپہ سالار بنا پھرتا ہے۔ آنکھیں کھولو، جاگو، آرتورو!

گیری : ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ ہاں تو جواب دو آرتورو، تم کہاں کھڑے ہو، ادھر یا اُدھر؟

اُدی : (لپک کر کھڑا ہو جاتا ہے) لونڈو، کیا تم بندوق کی دھمکی سے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو؟ ایسا نہ کرو تو اچھا ہے۔ میں تمھیں وارننگ دے رہا ہوں، میرے ساتھ یہ سب نہ چلے گا۔ نتائج کی تمام تر ذمہ داری تمھاری اپنی ہوگی۔ میں خاموش طبیعت آدمی ضرور ہوں لیکن میں دھمکیاں سننے کا عادی نہیں۔ یا تو اندھا دھند مجھ پر دشواش کرو یا جو جی چاہے کرو۔ میں کسی بھی بات کے لیے تمھارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ بس اپنا فرض نبھاؤ اور مکمل طور پر فیصلے کی بات مجھ پر چھوڑ دو کیونکہ پہلے فرض آتا ہے اور پھر آتا ہے صلہ۔ میں تم سے صرف ایک چیز کی توقع رکھتا ہوں اور وہ ہے بھروسہ۔ تم لوگوں میں بھروسے کی کمی ہے اور جہاں بھروسے کی کمی ہو، وہاں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تمھارے خیال میں، میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں؟ اعتماد اور یقین کے ساتھ! اٹل اور جنون کی حد تک اعتماد اپنے مقصد میں۔ اعتماد، صرف اعتماد کے ساتھ میں نے اس شہر کو للکارا تھا اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی اعتماد کے ساتھ میں ڈاگس بورو تک پہنچا۔ اسی اعتماد کے ساتھ میں کونسل ہال کی سیڑھیاں چڑھا۔ میرے ہاتھ ننگے اور خالی تھے لیکن ناقابلِ تسخیر اعتماد میرے پاس تھا!

روما : اور ایک ٹامی گن بھی!

اُدی : نہیں، نہیں، ٹامی گن تو اور لوگوں کے پاس بھی ہے لیکن مکمل اعتماد کی کمی انھیں لیڈر نہیں بننے دیتی۔ اسی لیے یہ بہت ضروری ہے کہ مجھ پر مکمل اعتماد رکھو! بھروسہ کرو! اور یقین کرو کہ میں جانتا ہوں، تمھارے لیے مناسب اور بہتر کیا ہے اور میرا اٹل فیصلہ ہے، وہی ہو کر رہے گا اور کہ فتح اور کامیابی کا راستہ مجھے مل کر رہے گا۔ اگر ڈاگس بورو چل بستا ہے تو پھر میں فیصلہ کروں گا، کون کیا بنتا ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے لیکن تم یقین رکھو، تم تمام لوگ مطمئن ہو گے۔

گی دولا : (اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے) آرتورو!

روما : (خفگی سے) تو لڑکو، اب تم پھوٹ لو!

گیری، گی دولا اور گی دولا کے باڈی گارڈ، ہاتھ اوپر کیے، دھیرے سے باہر جاتے ہیں۔

گیری : (باہر جاتے ہوئے، روما سے) مجھے تمھارا اسپیٹ پسند ہے۔

گی دولا : (باہر جاتے ہوئے) روما ڈیئر . . .

روما : پھوٹو! ہاں، گری سخت ہے، اپنی ہنسی پیچھے چھوڑ جاؤ اور مکارگی دوا، اپنی لنگڑی ٹیڑھی ٹانگ ساتھ لے جانا مت بھولنا حالانکہ مجھے یقین ہے، یہ بھی تم نے کہیں سے چرائی ہے۔

جب وہ باہر چلے جاتے ہیں، اُوئی چند اپنی سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔

اُوئی : میں اکیلا ہونا چاہتا ہوں۔

روما : (بے حس و حرکت کھڑے رہتے ہوئے) آرتورو، وہ اعتماد، وہ بھروسہ جس کا ذکر ابھی تم نے کیا ہے، اگر مجھ میں نہ ہوتا تو کبھی کبھی اپنے آدمیوں سے آنکھیں ملانے میں دشواری ہوتی۔ ہمیں کچھ کرنا پڑے گا اور فوراً! گری کوئی غلیظ کھیل کھیل رہا ہے۔

اُوئی : گری کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں بہت بڑا اور بہتر منصوبہ بنا رہا ہوں۔ اور اب، ارنستو کہ تم میرے سب سے پرانے اور وفادار دوست ہو، میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔

روما : (چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ) کہو سب کچھ، آرتورو۔ گری اور اس کے بارے میں مجھے جو کچھ کہنا ہے، وہ پھر سہی۔

وہ اُوئی کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ روما کے آدمی ایک کونے میں کھڑے منتظر ہیں۔

اُوئی : اب صرف شکاگو سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے کچھ اور بھی چاہیے۔

روما : کچھ اور؟

اُوئی : ہاں۔ سبزی ترکاریاں اور شہروں میں بھی تو بکتی ہیں۔

روما : لیکن وہاں گھس بیٹھنے کی ترکیب کیا ہے؟

اُوئی : صاف اور سیدھی ترکیب۔ ہمیں سامنے کے دروازے سے گھسنا ہے، پچھلے دروازے سے بھی اور کھڑکیوں کے راستے سے بھی۔ یہی تو ہوگا نا کہ پہلے ہمیں روکا جائے گا، پیچھے دھکیلا جائے گا لیکن پھر ہمیں بلایا جائے گا، سیٹیاں بجائی جائیں گی اور تسلیم کر لیا جائے گا۔ کبھی دھمکی، کبھی التجا اور درخواست۔ کبھی تذلیل، کبھی شریفانہ سختی اور کبھی آہنی ہم آغوشی۔ مختصر یہی کہ جو کچھ یہاں کیا ہے۔

روما : لیکن دوسری جگہوں پر حالات یہاں جیسے نہیں ہیں۔

اُوئی : میرا خیال ہے، ہم پرکھ کے لیے اسے کسی چھوٹے شہر میں آزما دیکھیں۔ اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ حالات واقعی مختلف ہیں۔ ویسے مجھے ذرا شک ہے اس پر۔

روما : اور تم نے آزمانے کے لیے کون سی جگہ چُنی ہے؟

اُوئی : سِسرو۔

روما : لیکن وہاں ان کے پاس ڈل فیٹ اور اس کا اخبار جو ہے جو ان سبزی ترکاری فروشوں کے مفاد کی دیکھ بھال کرتا

ہے اور سیر کو مجبور شیپٹ کے قتل کا الزام لگاتا ہے۔

اُوئی : اس کا تو مُنہ بند ہو جانا چاہیے۔

روما : وہ تو بند کر دیا جائے گا۔ اخبار نویسوں کے بھی تو دشمن موجود ہیں۔ یہ اخبار نویس اُجلے کاغذ پر کالی روشنائی سے لکھتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو بہت کچھ سُرخ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً مجھے۔ ہاں آرتورو میرے خیال میں ان الزامات کو خاموش کیا جاسکتا ہے۔

اُوئی : ہاں مجھے یقین ہے، ان کو خاموش کیا جاسکتا ہے ——— اس وقت ٹرسٹ سِسرو کے ساتھ بات چیت کر رہا ہے، اس لیے ابھی ہم شکاگو میں سے پھول گوبھیاں بیچیں گے۔

روما : یہ بات چیت کون کر رہا ہے؟

اُوئی : کلارک، لیکن اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے کارن۔

روما : اوہ، اب سمجھا۔ تو یہ چکر کلارک کا ہے۔ مَیں ذرا برابر کلارک کا بھروسہ نہیں کر سکتا۔

اُوئی : سِسرو میں سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کولی فلاور ٹرسٹ کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ وہ پھول گوبھیاں چاہتے ہیں، ہمیں نہیں۔ دوکاندار ہمیں پسند نہیں کرتے اور یہی حال دوسروں کا ہے، مثلاً ڈل فیٹ کی بیوی جو برسوں سے ہری سبزیوں کا تھوک بیوپار کر رہی ہے۔ وہ ٹرسٹ میں شامل ہونا چاہتی ہے اور شامل ہو بھی جاتی لیکن ہماری وجہ سے وہ شامل نہیں ہوئی۔

روما : تمھاری باتوں کے تو یہ معنی ہوئے کہ سِسرو کو ہتھیانے کا منصوبہ تمھارا نہیں، ٹرسٹ کا ہے۔ آرتورو، اب مَیں سب سمجھ گیا۔ میں ان کی ذلیل چال سمجھ گیا۔

اُوئی : کس کی چال؟

روما : ٹرسٹ کی! اور کس کی ؟ ڈاگس بورو کے ہاں جو سازشیں ہو رہی ہیں! اس کی وصیت! یہ سب ٹرسٹ کی چالاکی ہے۔ وہ سِسرو سے ٹانکا ملانا چاہتے ہیں اور تم راستے میں کھڑے ہو۔ اب وہ تم سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں؟ ان کی گردن تمھارے شکنجے میں ہے کیونکہ اپنے کالے دھندے کے لیے انھیں تمھاری ضرورت تھی اور انھوں نے تمھارے طریقوں کو مان لیا تھا۔ لیکن اب انھوں نے ایک راستہ کھوج نکالا ہے : بڈھا ڈاگس بورو مرتے دم توڑتے توڑتے، تابوت میں جاتے جاتے اعترافِ گناہ کرتا ہے۔ پھول گوبھیوں والے لوگ، گہرے دکھ کے ساتھ اس کی مردہ مٹھی سے وصیت نامہ کھول نکالتے ہیں اور سسکیاں بھرتے ہوئے اسے نامہ نگاروں کے سامنے پڑھتے ہیں : کیسے وہ پچھتاتا ہے اور سنجیدگی اور متانت سے کیسے وہ سب کی منت سماجت کرتا ہے کہ اس پلیگ کو، جس کی ذمہ داری وہ قبول کرتا ہے، مٹا دیا جائے اور پھول گوبھیوں کے کاروبار کو پھر اسی پرانے ڈھنگ سے چلایا جائے ——— یہ ہے ان کی چال، آرتورو۔ وہ سب اس میں شامل ہیں : گری جو ڈاگس بورو سے وصیت نامہ لکھوا آیا ہے، کلارک سے ملا ہوا ہے۔ کلارک جو سِسرو کے ساتھ بات چیت کر رہا ہے اور ہمارے کارن مشکلات میں پھنسا ہوا ہے، صاف ستھری سورج کی روشنی چاہتا ہے کہ چین کی بنسی بجا سکے۔ گی وولا جو مرے ہوئے چوہوں کو سونگھتا پھرتا ہے۔ اور یہ ڈاگس بورو، ایماندار بڈھا ڈاگس بورو جو اپنے بروقت وصیت نامے سے تم پر گندگی اچھالنا چاہتا ہے، اسے ٹھکانے لگانا پڑے گا، آرتورو، نہیں تو تمھارے بہتر اور

بڑے منصوبے، سیسرو کے بارے میں تمہارے منصوبے کے منصوبے گڑبڑ جائیں گے!

اُوٹ : تم سمجھتے ہو، یہ سب ایک سازش ہے؟ یہ سچ ہے کہ انھوں نے مجھے سیسرو کے سلسلے سے باہر رکھا ہے اور میں نے اسے محسوس بھی کیا ہے۔

رومتا : آرتورو، میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ مجھے اس معاملے کو سلجھانے دو! دیکھو، میں کیا کرتا ہوں: میں اور میرے لڑکے آج رات ڈاگس بورو کے گھر پر دھاوا بول دیں گے اور اسے اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ چلو اسپتال تک، ہم اسے کہیں گے اور پھر ہم اسے مردہ گھر میں پہنچا دیں گے۔

اُوٹ : لیکن گری تو اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر ہے۔

رومتا : وہ وہاں ہے تو ٹھیک ہی ہے۔

دونوں نظریں ملاتے ھیں۔

ایک تیر سے دو شکار!

اُوٹ : اور گی وولا؟

رومتا : واپسی پر میں گی وولا کی پھولوں کی دوکان سے ہوتا آؤں گا اور ڈاگس بورو کے جنازے کے لیے پھول بھی کہتا آؤں گا۔ مسخرے گری کے لیے بھی۔ اور گی وولا کو پھولوں کی قیمت بھی دیتا آؤں گا۔

اپنی پستول تھپتھپاتا ہے۔

اُوٹ : ارنستو، مجھے حقارت سے مجرم قرار دیتے ہوئے ڈاگس بوروں، کلارکوں اور ڈل فیٹوں کا سیسرو کے قصے سے مجھے باہر نکالنے کا منصوبہ فولادی ہاتھوں سے مٹا دینا چاہیے۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔

رومتا : اور تمہارا بھروسہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ہماری روانگی سے پہلے تمھیں ہم سے ملنا ہوگا اور میرے لڑکوں کو بتانا ہوگا کہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔ تم جانتے ہی ہو، میں ڈھنگ سے بات نہیں کر سکتا۔

اُوٹ : (ھاتھ ملاتے ھُوئے) تو سب طے ہوا۔

رومتا : میں جانتا تھا آرتورو! فیصلہ اسی طرح ہونا تھا۔ تم ہی کہو، ہم دونوں! کہو، تم اور میں! بھولے بسرے اچھے دنوں کی طرح (اپنے آدمیوں سے) میں نے کیا کہا تھا لڑکو؟ دیکھو اس نے ہمیں ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔

اُوٹ : تو میں آؤں گا۔

رومتا : ٹھیک گیارہ بجے۔

اُوٹ : لیکن کہاں؟

رومتا : گراج میں۔ دیکھو، مجھ میں اب کتنی جان آگئی ہے۔ آخر ہمیں دو دو ہاتھ دکھانے کا موقع تو ملا!

وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ فوراً باہر چلا جاتا ہے۔

کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اوئی تقریر کی تیاری کرتا ہے جو اسے روما کے آدمیوں کے سامنے کرنی ہے۔

اوئی : دوستو، بہت رنج کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے خبر ملی ہے، میری پیٹھ پیچھے شرمناک غداری کی سازش رچی جا رہی ہے۔ وہ لوگ جو میرے قریب ہیں، جن پر میں نے یقینِ کامل کیا، میرے خلاف ہو گئے ہیں۔ لالچ اور ہوس نے ان ذلیل لوگوں کو اندھا کر دیا ہے اور یہ ذلیل لوگ پھول گوبھیوں کے دلالوں سے جا ملے ہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، پھر کن سے، ہاں میری سمجھ میں آ گیا! یہ لوگ پولیس سے جا ملے ہیں کہ بے رحمی سے تم لوگوں کا صفایا کر دیا جائے اور، میں نے سنا ہے، میرا بھی! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، اس لیے میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم لوگ ارنستو روما کی سرکردگی میں، جس پر مجھے مکمل بھروسہ ہے، آج کی رات . . .

کلارک، گیری اور بیٹی ڈل فیٹ داخل ہوتے ہیں۔

گیری : (سیٹی بجاتے ہوئے کیونکہ اوئی خوفزدہ نظر آ رہا ہے) ہم ہیں، باس!

کلارک : اوئی، ان سے ملو۔ یہ ہیں سسرو کی مسز ڈل فیٹ۔ ٹرسٹ کی خواہش ہے کہ تم ان کی طرف ذرا توجہ دو اور ٹرسٹ امید کرتا ہے کہ آپ دونوں کچھ طے کر لیں گے۔

اوئی : (بدحواسی سے) ہاں، میں سن رہا ہوں۔

کلارک : جیسا کہ تم جانتے ہو، شکاگو کے کولی فلاور ٹرسٹ اور سسرو کے بیوپاریوں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے کہ دونوں کو ایک کر دیا جائے۔ بات چیت کے دوران سسرو نے کولی فلاور ٹرسٹ میں تمھاری موجودگی پر اعتراض کیا لیکن تھوڑی بہت بات چیت کے بعد ٹرسٹ نے اس مخالفت پر قابو پا لیا۔ مسز ڈل فیٹ یہاں اس لیے آئی ہیں کہ . . .

مسز ڈل فیٹ : غلط فہمی دُور ہو جائے۔ اور پھر میں یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر مسٹر ڈل فیٹ کا رُخ مسٹر اوئی کے خلاف نہیں تھا۔

اوئی : تو پھر کس کے خلاف تھا؟

کلارک : میں بھی صاف اور سیدھی بات کرنا چاہتا ہوں، اوئی۔ شیٹ کی خودکشی نے سسرو کے لوگوں پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ شیٹ چاہے اور کچھ بھی ہوتا، وہ جہازوں کے کارخانے کا مالک تھا، ایک نمایاں شہری تھا، وہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا تو تھا نہیں کہ اس کی موت کا چرچا نہ ہوتا۔ اور اس کے علاوہ کاروتھر کے گراج نے بھی شکایت کی ہے کہ ان کے ایک ٹرک پر گولیاں برسائی گئیں۔ اور تمھارے آدمیوں سے میں ایک کا، اوئی، دونوں معاملوں میں ہاتھ ہے۔

مسز ڈل فیٹ : سسرو کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ شکاگو کی پھول گوبھیاں خون میں رنگی ہوئی ہیں۔

اوئی : کیا آپ یہاں مجھے بے عزت کرنے آئی ہیں؟

مسز ڈل نیٹ : نہیں، نہیں، آپ کو نہیں کیونکہ مسٹر کلارک نے آپ کے بارے میں تو تصدیق کر دی ہے۔ یہ تو وہ شخص رہا ہے۔

کلارک : (قصداً) ناؤ نہ کھاؤ، اوڈی!

گیری : یس سر۔ . . .

اوڈی : تم مجھ سے اس طرح بات نہیں کر سکتے! تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ بس، بہت سُن لیا! ارنستو روما میرا آدمی ہے۔ میں کسی کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کہ کس کو دوست بناؤں۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔

گیری : باس!

مسز ڈل نیٹ : اگنا تیس ڈل نیٹ اس دنیا کے تمام روماؤں سے آخری دم تک لڑتا رہے گا۔

کلارک : (سرد مہری سے) اور یہ صحیح اور مناسب ہوگا۔ اس معاملے میں ٹرسٹ ڈل نیٹ کے پیچھے ہے۔ اوڈی، پھر سوچ دیکھو۔ دوستی اور کاروبار دو مختلف چیزیں ہیں۔ بتاؤ، کیا کہتے ہو؟

اوڈی : (اسی کی طرح سرد مہری سے) آپ مجھے سُن چکے ہیں، مسٹر کلارک۔

کلارک : مسز ڈل نیٹ، مجھے شدید رنج ہے کہ اس ملاقات کا یہ انجام نکلا۔

باہر جاتے ہوئے، اوڈی سے۔

حد درجہ غیر دانشمندانہ رویّہ، اوڈی۔

اوڈی اور گیری، دونوں جب اکیلے رہ جاتے ہیں، وہ ایک دوسرے پر نظریں تک نہیں ڈالتے۔

گیری : یہ اور پھر کاروبار کے ٹرک کا الٹا یعنی جنگ۔ بات صاف ہے اب۔

اوڈی : میں جنگ سے نہیں ڈرتا۔

گیری : ہاں، تم جنگ سے نہیں ڈرتے۔ کیا ہوگا، یہی ہوگا نا کہ ٹرسٹ، اخبارات، تمام شہر اور ڈاگس بورو اور اس کے چیلے چانٹے تمہارے خلاف ہو جائیں گے! بات بس میرے اور تمہارے درمیان ہے، باس، میں تو کچھ کرنے سے پہلے دو بار سوچوں . . .

اوڈی : میں جانتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے اور مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک علامت اُبھرتی ہے۔

گیارہ

گیراج۔ رات۔ بارش کی آواز۔

ارنستو روما اور نوجوان اِنّا۔ پس منظر میں مُسلّح باڈی گارڈ۔

اِنّا : ایک بج رہا ہے۔
روما : وہ یقیناً کہیں پھنس گیا ہوگا۔
اِنّا : کہیں وہ ہچکچا تو نہیں رہا؟
روما : ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ آرتورو اپنے چمچوں کا اس حد تک وفادار ہے کہ وہ ان کی جگہ اپنی بلی چڑھا سکتا ہے۔ اور تو اور، ان چوہوں، گری اور گی وولا تک کے بارے میں وہ خود کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ اپنا وقت ضایع کرتا ہے اور خود سے الجھتا بھی رہتا ہے۔ ممکن ہے، دو بج جائیں یا تین، لیکن وہ ضرور آئے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ خود کو تیار کر رہا ہوگا۔ وہ یقیناً آئے گا، میں اسے جانتا ہوں، اِنّا۔
وقفہ
میں صاف دیکھ رہا ہوں، گری زمین پر اوندھے مُنہ پڑا ہے، اس کی چالاکیاں خون کی طرح بہہ رہی ہیں، میرا نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے۔ بس یوں سمجھو چند لمحوں ہی کی بات ہے۔
اِنّا : یہ برساتی راتیں میرے اعصاب کے لیے بہت سخت ہیں۔
روما : ان راتوں کی یہی سختی تو مجھے بھاتی ہے۔
راتیں سیاہ ترین
کاریں تیز تر
اور دوست
مضبوط تر۔
اِنّا : کتنے برسوں سے تم اسے جانتے ہو؟
روما : کوئی اٹھارہ برس سے۔
اِنّا : یعنی ایک زمانے سے . . .
ایک مسلح باڈی گارڈ: (آگے بڑھتا ہے) لڑکے شراب مانگتے ہیں۔
روما : نہیں۔ آج رات ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

باڈی گارڈ ایک مختصر سے آدمی کو لاتے ہیں۔

مضطرب آدمی : (ہانپتے ہوئے) چوراہے پر ہنگامہ ہے . . . ! پولیس ہیڈکوارٹر کے باہر دو بکتر بند گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں، سپاہیوں سے لدی ہوئیں . . .

روما : ہاں تو پھر لڑکو، بلٹ پروف شٹر گرا دو۔ ان پولیس والوں کو ہم سے کیا لینا دینا، پھر بھی دور اندیشی کا تقاضہ ہے کہ ہم آنکھیں کھلی رکھیں۔ اور ہاں . . .

دھیرے دھیرے لوہے کا شٹر گرتا ہے اور گیراج کا منہ بند ہو جاتا ہے۔

راستہ صاف ہے کیا؟

اتا : (سگار کا کش لیتا ہے) تمباکو میں ایک بات کمال کی ہے۔ جب کوئی شخص تمباکو پیتا ہے، وہ پر سکون نظر آتا ہے اور اگر اس کی دیکھا دیکھی تم بھی تمباکو سلگا لیتے ہو تو تم بھی پر سکون نظر آنے لگتے ہو۔

روما : (مسکراتے ہوئے) ذرا اپنا ہاتھ تو بڑھاؤ!

اتا : (ہاتھ بڑھاتا ہے) لرز رہا ہے۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔

روما : گھبراؤ مت۔ سب ٹھیک ہے۔ یہ کوئی باکسروں کے ہاتھ تھوڑی ہیں جو کچھ محسوس نہیں کرتے۔ نہ کوئی انھیں زخمی کرتا ہے، نہ وہ کسی کو زخمی کرتے ہیں، کم از کم شدید طور پر نہیں ——— کانپتے لرزتے ہم سب ہیں۔ کمپاس کی سوئی بھی تو لوہے کی بنی ہوتی ہے لیکن اپنی جگہ پر ٹھہرنے رکنے سے پہلے کانپتی رہتی ہے۔ تمھارے ہاتھ کی مٹھیاں بھی تو منتظر ہیں اور یہی چاہیے۔

ایک چیخ : (ایک طرف سے) چرچ اسٹریٹ کی طرف سے پولیس کی گاڑی آرہی ہے۔

روما : (غور سے کان لگاتے ہوئے) کیا گاڑی رک رہی ہے۔

ایک آواز : نہیں۔

ایک مسلح باڈی گارڈ : دو اندھی آنکھوں والی گاڑیاں نکڑ سے مڑ گئی ہیں۔

روما : یعنی وہ آرتورو کا انتظار کر رہی ہیں، یعنی گی وولا اور گری اس کی گھات میں ہیں۔ وہ تو سیدھا ان کے جال میں پھنس جائے گا! ہمیں بہر صورت اسے بچانا پڑے گا! آؤ چلو!

ایک مسلح باڈی گارڈ : یہ تو خودکشی ہوگی۔

روما : اگر یہ خودکشی ہے، تو پھر خودکشی ہی سہی! لعنت ہے! اٹھارہ برس کی دوستی کا سوال ہے!

اتا : (اونچی اور صاف آواز میں) شٹر اٹھا دو! مشین گنیں تیار کر لو!

ایک مسلح باڈی گارڈ : تیار۔

اتا : لو، وہ شٹر اٹھنے لگا!

بلٹ پروف شٹر دھیرے دھیرے اوپر اٹھتا ہے۔

اوئی اور گی وولا تیزی سے اندر آتے ہیں۔

ان کے پیچھے باڈی گارڈ ھیں۔

روما : آرتورو!

اِتّا : (رُکتے ھوئے سانسوں سے) ہاں، اور گی وولا بھی!

روما : چکر کیا ہے؟ آرتورو، ارے تم نے تو، تم نے تو ہمیں فکر سے مار ہی ڈالا تھا۔ (اُونچا ھنستا ھے) لعنت ہے! سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا!

اُوئی : (کرخت آواز میں) سب کچھ ٹھیک کیوں نہ ہوتا؟

اِتّا : ہم سمجھے تھے، کہیں کچھ گھوٹالہ ہے۔ میں آپ کی جگہ جو ہوتا باس، بڑھ کر روما سے ہاتھ ملاتا۔ وہ تو آپ کو بچانے کی خاطر ہمیں جہنم کی آگ میں لے جا رہا تھا۔ کیوں روما؟

اُوئی روما کے پاس جاتا ھے اور ھاتھ بڑھاتا ھے۔ روما ھنستے ھوئے اس کا ھاتھ تھام لیتا ھے۔
اسی لمحے کہ روما نے اُوئی کا ھاتھ تھام رکھا ھے اور اس کا ھاتھ فوراً پستول تک نہیں پہنچ سکتا، گی وولا ایک لمحہ تک ضائع کیے بنا، اپنے چوتڑوں سے جُڑی پستول نکال کر روما پر داغ دیتا ھے۔

اُوئی : چلو تم سب کونے میں!

روما کے آدمی ھکا بکا کھڑے ھیں ——— سب کو کونے کی طرف دھکیل دیا جاتا ھے۔ اِتّا سب سے آگے ھے۔ گی وولا روما پر جھکتا ھے جو فرش پر پڑا ھے۔

گی وولا : ابھی اس کی سانس چل رہی ہے۔

اُوئی : ٹھنڈا کر دو اسے (دیوار کے ساتھ قطار میں کھڑے باڈی گارڈوں سے) میرے خلاف تمہاری گھناؤنی سازش کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ اور ڈاگس بورو کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بھی۔ میں نے تمہیں بروقت پکڑ لیا ہے۔ مفاہمت بے کار ہے۔ میرے خلاف بغاوت کرنے کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا، حرام زادو!

گی وولا : ان میں سے کوئی بھی تو غیر مسلح نہیں! (روما کی طرف اشارہ کرتا ھے) سالا ہوش میں آ رہا ہے۔ آنے دو اسے ہوش میں۔ سالا یہی سوچے گا کہ کبھی ہوش میں نہ آتا۔

اُوئی : میں آج رات ڈاگس بورو کے بنگلے پر ملوں گا۔

تیزی سے باھر نکل جاتا ھے۔

اِتّا : سُور ہوئے چوہو۔ . . !

: مکارو۔ ۔ ۔!

گی وولا : (ہوش میں آتے ہوئے) لگا دو ٹھکانے سب کو!

دیوار کے ساتھ لگے کھڑے باغی گارڈ مشین گنوں سے بھون دیے جاتے ہیں۔

روما : (ہوش میں آتے ہوئے) گی وولا! یا خدا!

کروٹ بدلتا ہے۔ اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہے۔

کیا ہوا وہاں؟

گی وولا : کچھ بھی تو نہیں۔ بس کچھ غداروں کا صفایا کیا گیا ہے۔

روما : کتے! آہ میرے آدمی! میرے آدمیوں کے ساتھ تم نے کیا کیا؟

گی وولا خاموش رہتا ہے۔

اور آرتورو کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں، تم نے اسے بھی قتل کر دیا ہے!

نگاہوں سے فرش پر اوئی کو تلاش کرتا ہے۔

آرتورو کہاں ہے؟

گی وولا : وہ ابھی یہاں سے گیا ہے۔

روما : (جبکہ اسے دیوار کی طرف گھسیٹا جاتا ہے) کتو، ذلیل کتو!

گی وولا : (سرد مہری سے) تم کہتے ہو، میری ایک ٹانگ چھوٹی ہے۔ میں کہتا ہوں، تمھارا بھیجا اتنا سا ہے۔ تو اب تم اپنی خوبصورت ٹانگوں سے تو کہو، تمھیں دیوار تک لے جائیں!

ایک علامت ابھرتی ہے۔

بارہ

گی دولا کی پھولوں کی دوکان۔
اگناتیس ڈل فیٹ جو ایک پست قد شخص ہے اور بنیٹی ڈل فیٹ اندر آتے ہیں۔

ڈل فیٹ : مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں۔
بنیٹی : کیوں نہیں؟ انھوں نے روما کی چھٹی کر دی ہے۔
ڈل فیٹ : ہاں، انھوں نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔
بنیٹی : یہی تو ان کا چلن ہے۔ کچھ بھی ہو چھٹی تو ہوئی اس کی۔ کلارک کہتا ہے کہ اُوئی کے طوفانی اور سخت دن رات اب ختم ہوئے۔ ایسا وقت تو اچھے سے اچھے آدمی پر بھی پڑتا ہے۔ اُوئی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے رنگ ڈھنگ بدلنا چاہتا ہے۔ اور اگناتیس، تم اب بھی اگر اس پر حملے کرتے رہے تو ایک بار پھر اس کی بدی جاگ اٹھے گی اور اس کا پہلا شکار تمھیں بننا پڑے گا۔ لیکن اگر تم نے اپنا منہ بند رکھا، وہ تمھیں کچھ نہ کہیں گے۔
ڈل فیٹ : مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں ہے کہ میری خاموشی مددگار ثابت ہوگی۔
بنیٹی : مجھے پورا یقین ہے۔ وہ درندے تو نہیں ہیں!

روما کا ہیٹ پہنے، گبری ایک طرف سے اندر آتا ہے۔

گبری : ارے، تم لوگ پہنچ بھی گئے؟ مسٹر اُوئی اندر ہیں؟ وہ آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ میں رک نہ سکوں گا۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی مجھے دیکھ لے، مجھے نکل جانا چاہیے ——— میں نے گی دولا کا ہیٹ اڑا لیا ہے۔

اتنے زور سے ہنستا ہے کہ چھت سے پلاسٹر چھٹ کر گرنے لگتا ہے
اسے جھاڑتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔

ڈل فیٹ : یہ لوگ بری طرح غراتے ہیں اور ہنستے بھی کچھ کم نہیں۔
بنیٹی : ایسی باتیں نہ کہو، اگناتیس۔ کم از کم یہاں نہیں۔
ڈل فیٹ : (تلخی سے) نہ کہیں اور۔
بنیٹی : تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ سسرو میں پہلے ہی افواہیں گرم ہیں کہ اُوئی ٹومکس ہیرو کی جگہ لے رہا ہے اور اس سے

بھی زیادہ بری بات یہ ہے کہ بسرو کے سبزی ترکاری فروش خود کوئی فلاور ٹرسٹ کے ساتھ کوئی چکر چلا رہے ہیں۔

ڈل نیٹ : اور انھوں نے میرے دو چھاپے خانے بھی تباہ کر ڈالے ہیں ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ بیٹی، مجھے یوں لگتا ہے جیسے برے کالے دن آ رہے ہیں ۔

گی ڈولا اور اوئی اندر آتے ہیں، ہاتھ بڑھائے ہوئے۔

بیٹی : اوہ، اوئی!

اوئی : خوش آمدید ڈل نیٹ!

ڈل نیٹ : مسٹر اوئی، میں آپ کو صاف گوئی سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے آنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کیونکہ ۔ ۔ ۔

اوئی : ہچکچاہٹ کیوں ؟ آپ جیسے آدمی کو تو ہر جگہ خوش آمدید ہی کہا جائے گا۔

گی ڈولا : اور خوبصورت عورت کو بھی!

ڈل نیٹ : مسٹر اوئی، کچھ باتوں کی مخالفت کرنا میں نے ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور ۔ ۔ ۔

اوئی : محض ایک غلط فہمی کی بنیاد پر! اگر ہم شروع ہی سے ایک دوسرے کو جان لیتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ میرا تو ہمیشہ سے یہی ایمان رہا ہے کہ جو کچھ بھی کیا جائے سکھ چین سے کیا جائے۔

ڈل نیٹ : لیکن تشدد ۔ ۔ ۔

اوئی : مجھ سے زیادہ اسے کون نفرت کرتا ہے۔ اگر لوگ ذہین ہوتے، اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

ڈل نیٹ : میرا مقصد ۔ ۔ ۔

اوئی : وہی مقصد تو میرا بھی ہے۔ ہم دونوں یہی تو چاہتے ہیں کہ کاروبار خوب پھلے پھولے۔ چھوٹے اور معمولی سبزی ترکاری فروش جن کی زندگیاں آج کل ایک دکھ بنی ہوئی ہیں، سکھ چین سے اپنا دھندا کر سکیں۔ کوئی انھیں لوٹے، ان پر حملہ کرے تو ان کی حفاظت ہو۔

ڈل نیٹ : (مضبوطی سے) اور اس کا فیصلہ وہ خود کریں کہ انھیں حفاظت کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اسے میں لازمی سمجھتا ہوں۔

اوئی : میں خود بھی یہی سمجھتا ہوں۔ فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی انھیں ملنی چاہیے۔ لیکن جب وہ خود اپنا محافظ چن لیتے ہیں اور اپنے محافظ میں مکمل اعتماد رکھتے ہیں، جو ہر کاروبار کی طرح سبزی ترکاری کے کاروبار کے لیے بھی ضروری ہے، تب ہر طرف سکھ چین ہونا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ اسی طرح سوچا ہے۔

ڈل نیٹ : آپ کی زبانی یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ بسرو کے لوگ، اسے بدتمیزی نہ سمجھیے گا، کبھی کسی جبر کو برداشت نہیں کریں گے۔

اوئی : یقیناً۔ کون جبر برداشت کرتا ہے جب تک کہ وہ مجبور نہ ہو۔

ڈل نیٹ : صاف بات تو یہ ہے اگر ٹرسٹ کے ساتھ ہماری اس ساجھے داری کے معنی یہ ہیں کہ وہ خون خرابہ جس نے شکاگو کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ہمارے پرامن شہر میں بھی پہنچ جائے، تو میں اس ساجھے داری کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔

اُودی : صاف گوئی کا تقاضا بھی صاف گوئی ہے مسٹر ڈل فیٹ۔ ہوسکتا ہے، ماضی میں کچھ ایسی باتیں ہوئی ہوں جو اونچی اخلاقی سطح کو نہ چھوتی ہوں۔ جنگ میں بھی تو ایسا ہوتا ہے۔ ہاں، دوستوں کے درمیان ایسی باتیں کبھی نہیں ہوتیں۔ مسٹر ڈل فیٹ، میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کے لیے آپ مجھ پر بھروسہ کریں، مجھے اپنا دوست سمجھیں جو کبھی آپ کو دغا نہیں دے گا جب تک کہ سمندر سوکھ نہیں جاتے۔ اور، اب میں خاص سبب کی طرف آتا ہوں۔ آپ کے اخبار میں وہ خوفناک کہانیاں نہیں چھپنی چاہئیں جن سے میرا خون کھولتا ہے۔ میں نہیں مانتا، میں کچھ زیادہ مانگ رہا ہوں۔

ڈل فیٹ : جو کچھ ہوتا ہو، اس کے بارے میں نہ لکھنا بہت آسان ہوتا ہے، جناب۔

اُودی : درست۔ چونکہ زمین پر آدمی بستے ہیں، فرشتے نہیں، اگر کبھی کبھار نہ ہونے کے برابر کوئی واقعہ ہو جائے، کسی ایسے مجرم سے جو بچوں کے کھلونوں سے کھیل رہا ہو، تو تم اسے نظر انداز کر سکتے ہو۔ میں یہ یقین تو نہیں دلا سکتا کہ ہمارا کوئی ڈرائیور کبھی کوئی غلیظ لفظ نہیں بکے گا کیونکہ یہ بھی تو انسانی کمزوری ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ ہمارا کوئی آدمی کسی سبزی فروش سے گاجریں وقت پر پہنچانے کے بہانے ایک آدھ سیر کی تول نہیں لے گا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ان معمولی سی باتوں کو بد اخلاقی اور چور بازاری کی کہانیاں بنا کر نہ چھاپا جائے۔

بیٹی : مسٹر اُودی، میرے شوہر بھی آخر انسان ہیں۔

گی وولا : اس میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔ اب جبکہ آپسی بات چیت سے دوستوں کے درمیان سب کچھ طے ہو گیا ہے، شاید آپ لوگ میرے پھول دیکھنا پسند کریں۔ . . ؟

سب گی وولا کی پھولوں کی دکان کا معائنہ کرتے ہیں۔ اُودی کے ساتھ بیٹی ہے اور گی وولا کے ساتھ ڈل فیٹ ہے۔ مندرجہ ذیل مکالموں میں یہ جوڑیاں پھولوں کی نمائش کے پیچھے آگے ہوتی رہتی ہیں۔

گی وولا اور ڈل فیٹ سامنے آتے ہیں۔

گی وولا : یہ، ڈل فیٹ ڈیر، ملایا کے پھول فرونڈ ہیں۔
ڈل فیٹ : ہاں، میں دیکھ رہا ہوں، جو ننھے ننھے بیضوی تالابوں کے گرد کھل رہے ہیں۔
گی وولا : ان تالابوں میں نیلی کارپ مچھلیاں ہیں جو گھنٹوں ساکن رہتی ہیں۔

دونوں پھولوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ——— اُودی اور بیٹی سامنے آجاتے ہیں۔

بیٹی : مضبوط آدمی کو اپنی بات منوانے کے لیے قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔
اُودی : دلائل گولیوں کی طرح چلیں تو بہتر ہوتے ہیں۔
بیٹی : ٹھوس اور کھرے دلائل کا اثر یقینی طور پر ہوتا ہے۔

اُوٹی : اس وقت نہیں جب پیسہ اکٹھا کرنا ہو۔
بنیٹی : دھمکیاں، چالاکیاں۔ ۔ ۔
اُوٹی : میں اسے کاروباری سیاست کہنا بہتر سمجھتا ہوں۔

دونوں جھنڈوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ـــــــ گی مولا اور ٹُل نیٹ سامنے آجاتے ہیں۔

ٹُل نیٹ : پھول آزاد ہیں ہوس اور چھل کپٹ سے۔
گی مولا : اسی لیے تو میں انھیں پیار کرتا ہوں۔
ٹُل نیٹ : یہ کیسی خاموشی سے جیتے ہیں۔ انھیں کوئی جلدی نہیں۔
گی مولا : (شرارتاً) نہ مسائل، نہ اخبارات، نہ پریشانیاں۔

دونوں جھنڈوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ـــــــ اُوٹی اور بنیٹی سامنے آجاتے ہیں۔

بنیٹی : مجھے بتایا گیا ہے، آپ راہبوں کی طرح رہتے ہیں۔
اُوٹی : نہ میں تمباکو پیتا ہوں نہ مجھے شراب سے کوئی واسطہ ہے۔
بنیٹی : تو آپ حرکت و عمل سے سادھو سنت ہوئے نا!
اُوٹی : دُنیاوی موہ مایا سے مجھے کچھ مطلب نہیں۔

دونوں جھنڈوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ـــــــ گی مولا اور ٹُل نیٹ سامنے آجاتے ہیں۔

ٹُل نیٹ : پھولوں سے بھری پُری تمھاری یہ زندگی پُرسکون ہونی چاہیے۔
گی مولا : پُرسکون ہوتی، اگر دُنیا بھر کے اور جھمیلے نہ ہوتے۔

دونوں جھنڈوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ـــــــ اُوٹی اور بنیٹی سامنے آجاتے ہیں۔

بنیٹی : مسٹر اُوٹی، آپ کے نزدیک مذہب کے کیا معنی ہیں؟
اُوٹی : میں عیسائی ہوں اور اتنا کافی ہے۔
بنیٹی : وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ جو دس احکام ہوتے ہیں، ان کا آپ کی زندگی میں کیا عمل دخل ہے؟
اُوٹی : میں تو یہ کہوں گا ان کا روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔
بنیٹی : اگر میں آپ کے صبر کا امتحان لے رہی ہوں تو معاف کیجیے گا لیکن یہ ضرور بتائیے، آپ کے سماجی نظریات کیا ہیں؟

اُوڈٹ میرے سماجی نظریات متوازن، صاف شفاف اور صحت مند ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے : میں کبھی دولت مندوں کے سلسلے میں غفلت نہیں برتتا۔

دونوں ستونوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ——— گی وولا اور ٹحل فیٹ سامنے آجاتے ہیں۔

ٹحل فیٹ : پھولوں کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور ان کی سماجی ضرورت بھی ہوتی ہے۔
گی وولا : میں کہوں گا یہ صحیح ہے۔ خصوصاً جنازے کے وقت!
ٹحل فیٹ : ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ پھول تمھاری روزی روٹی بھی ہیں۔
گی وولا : درست۔ میرے بہترین گاہک مُردے ہیں۔
ٹحل فیٹ : میرے خیال میں صرف یہی تمھارا دھندا نہیں ہے۔
گی وولا : کچھ لوگوں میں ڈر خوف کو سونگھ لینے کی سکت ہوتی ہے۔
ٹحل فیٹ : تشدد سے، گی وولا، نام دیر تک زندہ نہیں رہتا۔
گی وولا : لیکن نتائج تو جلد نکل آتے ہیں۔
ٹحل فیٹ : یہ الگ بات ہے۔
گی وولا : آپ اتنے پیلے کیوں نظر آرہے ہیں؟
ٹحل فیٹ : یہاں کی فضا نم ہے اور گھٹن بھی تو ہے۔
گی وولا : غالباً تیز بو آپ پر جلد اثر کرتی ہے۔

دونوں ستونوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں ——— اُوڈی اور بنیٹی سامنے آجاتے ہیں۔

بنیٹی : میں بہت خوش ہوں کہ تم دونوں نے سب کچھ طے کرلیا۔
اُوڈٹ : صاف گوئی نے آخر راستہ سجھا ہی دیا۔
بنیٹی : کھرے دوستوں کی دوستی کبھی مایوس نہیں کرتی۔ . .
اُوڈٹ : (بنیٹی کے کندھوں کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے) مجھے صرف وہ عورت پسند ہے جو باتیں یوں سمجھ لیتی ہے۔

گی وولا اور ٹحل فیٹ، جو مُردے کی طرح زرد ہے، دونوں سامنے آجاتے ہیں۔
ٹحل فیٹ دیکھ لیتا ہے کہ اس کی بیوی کے کندھوں کے گرد اُوڈی کا بازو لپٹا ہوا ہے۔

ٹحل فیٹ : آؤ بیٹی، چلیں!
اُوڈٹ : (ٹحل فیٹ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) مسٹر ڈل فیٹ، آپ کے فیصلے نے آپ کی عزت بڑھائی ہے

اس فیصلے سے سب کا بھلا ہوگا - دو ایسے آدمیوں کے درمیان ملاقات، جیسے کہ آپ اور میں، مبارک ہی کہی جا سکتی ہے -

گی دوآ : (بنیٹی کو پھول پیش کرتے ہوئے) حسن کے حضور حسن !
بنیٹی : دیکھو اگناتس ! کتنے اچھے ہیں یہ - اوہ، میں کتنی خوش ہوں - اچھا، خدا حافظ !
گی دوآ : اب ہم جہاں چاہیں، جا سکتے ہیں -
اوٹو : (معنی خیز تیور کے ساتھ) مجھے وہ آدمی پسند نہیں -

ایک علامت اتحاد کی ہے -

■■ ▭▭

متیرہ

گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

ایک جنازہ سسرو کے گرجا گھر میں لے جایا جا رہا ہے۔ پیچھے بیوگی کے ماتمی لباس میں بنی ٹومنیٹ ہے۔ ساتھ ہی کلانک، آدمی، گریس، اور گی وولا ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے بڑے بڑے گچھے ہیں۔

اپنے اپنے گچھے دوسروں کے حوالے کر کے گریس اور گی وولا گرجا گھر کے باہر ہی ٹھہر جاتے ہیں۔

اندر سے پادری کی آواز سنائی دیتی ہے۔

آواز : اور اب اگنا تیس ڈل فیٹ کا جسمِ فانی سپردِ خاک کیا جاتا ہے۔ ایک بھرپور، نیک نام زندگی ختم ہوتی ہے۔ وہ زندگی جو ہمیں چھوڑ رخصت ہوئی ہے، جو عمر بھر اوروں کے لیے دوڑ دھوپ کرتی رہی ——— جنت کے دروازے پر فرشتے اگنا تیس ڈل فیٹ کے کندھے پر ہاتھ دھریں گے اور محسوس کریں گے، اس کا لباس گھس پھٹ گیا ہے اور کہیں گے : اس شخص نے تمام عمر اپنے پڑوسیوں کا بوجھ جھیلا ہے ——— اور آنے والے وقتوں میں، کونسل ہال میں، جب سب لوگ بول چکا کریں گے تو ایک خاموشی چھا جایا کرے گی کیونکہ تمام شہری اگنا تیس ڈل فیٹ کی آواز سننے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ اس کی آواز کا انتظار کیا کریں گے ——— ایسا لگتا ہے، جیسے شہر کا ضمیر مر گیا ہے۔ یہ شخص جو بے وقت اپنے اختتام تک پہنچا ہے، آنکھیں بند کیے تنگ و تاریک راستوں پر چل سکتا تھا۔ یہ پست قد شخص جو بلند دماغ شخصیت تھی اور جس کا اخبار ایک ایسا منبر بن گیا تھا جہاں سے اس کی صدائے حق ہمارے شہر کی حدود کے باہر، دور تک پہنچتی تھی ——— اگنا تیس ڈل فیٹ، تمھیں سکون نصیب ہو! آمین!

گی وولا : بہت ہی ہوشیار آدمی ہے۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا، وہ مرا کیسے۔

گریس : (جواب ڈل فیٹ کا حیث پچھے ہوئے ہے) ہوشیار آدمی! ہونہہ، سات بچے ہیں اس کے۔

کلانک اور مل بیری گرجا گھر سے باہر آتے ہیں۔

کلانک : خدا کی مار! کیا تم یہاں اس لیے پہرہ دے رہے ہو، کہیں جنازے کے سامنے سچائی نہ اگل دی جائے؟

گی وولا : ایسی غیر شائستہ بات کیوں، ڈیر کلارک؟ میں نے تو سوچا تھا، اس متقدس جگہ پر تمھارا مزاج کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔ اور پھر ہمارا باس ابھی ذرا اپنے آپ میں نہیں ہے کیونکہ یہاں کا ماحول انھیں کچھ پسند نہیں آیا۔

مل بیری : اور وفا تلو! اگنا تیس ڈل فیٹ نے اپنی بات نبھائی تھی ——— وہ تو بالکل خاموش رہا تھا۔

گی موذاں : صرف خاموشی کافی نہیں ہے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو نہ صرف ہمارے بارے میں خاموش رہیں، بلکہ ہمارے لیے بولنے کو تیار رہیں ——— اور وہ بھی ذرا زور سے۔

مل سیبرٹ : وہ تم لوگوں کو قصائی کے علاوہ اور کس نام سے پکار سکتا تھا؟

گی دوذاں : اسے بہر صورت جانا تھا۔ اس کے جسم سے سبزی ترکاری فروشوں کے لیے ٹھنڈا پسینہ ٹپکتا تھا جو ناقابلِ برداشت تھا۔

گیڈی : اور تمہاری پھول گوبھیاں؟ کیا تم انہیں کسرو میں بیچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

مل سنیٹری : قتل و غارت گری کے ذریعے نہیں۔

گیبرٹ : بگلے بھگت، تو اور کس طرح؟ ہم جانوروں کو کس کے لیے ذبح کرتے ہیں، بتاؤ؟ تم حرامی مسخرے گوشت کے لیے چیختے چلاتے ہو اور پھر بادچی پر برستے ہو کہ اس کے ہاتھ میں چھری کیوں ہے؟ ہم تم لوگوں سے صرف آشنا چاہتے ہیں: چٹخارہ لو، ہونٹ چاٹو، انگلیاں چاٹو، اور بس ——— اور جاؤ اب اپنے گھر!

مل سیبرٹ : کلارک، وہ دن کالا تھا، جب تم ان لوگوں کو لائے تھے!

کلارک : یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟

دونوں چلے جاتے ہیں، غم میں ڈوبے ہوئے۔

گیبرٹ : باس، ان نامعقولوں کے کارن جنازے کے لطف سے محروم نہ ہونا!

گی دوذاں : ہشت! بیٹی آ رہی ہے۔

ایک اور عورت کا سہارا لیے، بیٹی گرجا گھر سے باہر آتی ہے۔
اوڈٹ اس کی طرف بڑھتا ہے ——— گرجا گھر سے آرگن پر بجتی ہوئی دھن سنائی دیتی ہے

اوڈٹ : مسز ڈول نیٹ، میری ہمدردیاں . . . !

بیٹی بنا کچھ کہے اس کے پاس سے گزر جاتی ہے۔

گیڈی : (گونج دار آواز میں) ارے، تم!

بیٹی یکایک رک جاتی ہے اور مڑتی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے۔

اوڈٹ : میں نے کہا، میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں، مسز ڈول نیٹ۔ ڈول نیٹ تو، خدا کی رحمت ہو اس پر، مر گیا ہے لیکن پھول گوبھی، تمہاری پھول گوبھی اب بھی ہمارے پاس ہے۔ شاید تم اسے دیکھ نہیں سکتیں کیونکہ اب بھی تمہاری

آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ المناک واقعہ کہیں تمہیں اتنا اندھا نہ کر دے اور تم یہ نہ دیکھ سکو کہ قانونی طور پر سبزی ترکاریاں ڈھونے والے ٹرکوں پر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے بزدل کمینے گولیاں برسا رہے ہیں اور بے رحم ہاتھ سبزی ترکاریوں پر مٹی کا تیل چھڑک رہے ہیں ——— میں اور میرے آدمی حفاظت مہیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کا جواب تمہارے پاس ہے!

بنیٹی : (آسمان کی جانب سر اٹھاتے ہوئے) ابھی سے یہ سب۔ ابھی تو ڈل فیٹ نے قبر میں پاؤں بھی نہیں پسارے ہیں!

اُوٹ : یقین کرو، میں اس حادثے کی مذمت کرتا ہوں؛ وہ آدمی جو بے رحم ہاتھوں ختم ہوا، میرا دوست تھا۔

بنیٹی : وہ ہاتھ جنہوں نے اسے ختم کیا، وہی ہاتھ تھے جو اس نے دوستی میں تھامے تھے۔ تمہارے ہاتھ!

اُوٹ : یہ جھوٹ، غلیظ افواہیں میں کب تک سنتا رہوں گا۔ یہ تہمت، یہ بہتان میرے نیک ارادوں اور اعلیٰ مقاصد کی جڑوں میں زہر گھول رہا ہے۔ میں تو سب کے ساتھ مل کر سکھ چین کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ آہ، یہ سب لوگ مجھے سمجھتے کیوں نہیں؟ انہیں مجھ پر اعتماد کیوں نہیں؟ ان کی یہ نفرت بھری دھمکیاں جبکہ میں ان سے سوجھ بوجھ کی التجا کرتا ہوں! دوستی اور محبت میں بڑھے ہوئے میرے ہاتھ کو یوں جھٹک دینا۔ . . !

بنیٹی : ہاں، قتل کے ارادے سے بڑھا ہوا تمہارا ہاتھ!

اُوٹ : نہیں! میں التجا کرتا ہوں اور سب لوگ مجھ پر لعنت بھیجتے ہیں!

بنیٹی : تمہاری التجا؟ جیسے سانپ چڑیا سے التجا کر رہا ہو!

اُوٹ : سنا تم نے؟ لوگ اس طرح مجھ سے بات کرتے ہیں! یہی حال ڈل فیٹ کا تھا۔ اس نے میری گرم جوشی اور کھلے دل کی دوستی کو چالاکی سمجھا اور میری فراخ دلی کو میری کمزوری جانا۔ ہائے، اس نے میرے دوستانہ الفاظ کے عوض مجھے کیا دیا؟ پتھریلی خاموشی۔ میں نے تو چاہا تھا، وہ ہنستا کھیلتا چہکتا لپکتا مگر وہ خاموش رہا۔ میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہوتا رہا لیکن بار بار اس سے التجا کرتا رہا، دوستی کے لیے، تعلق کے لیے، انسانی ہمدردی کے لیے، لیکن، ہائے میں ترستا ہی رہا۔ میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ مجھے صلہ کیا ملا، شدید حقارت۔ اور اس کا خاموش رہنے کا وہ وعدہ جو اس نے خفگی سے میرے ساتھ کیا تھا اور خدا گواہ ہے، بے دلی سے کیا تھا، وہ اس نے پہلے ہی موقعے پر توڑ دیا۔ میں پوچھتا ہوں، وہ خاموشی کہاں ہے جس کا اس نے وعدہ کیا تھا؟ نئے اور بھیانک قصے چہار سمت پھیلائے جا رہے ہیں ——— لیکن اب میں تمہیں بتائے دیتا ہوں: حد سے آگے نہ بڑھو کہ آخر میرے مثالی ضبط کی بھی تو ایک انتہا ہے!

بنیٹی : الفاظ مجھے دغا دے رہے ہیں۔

اُوٹ : دل کی آواز پر جو لفظ نہ نکلیں، دغا دیتے ہیں۔

بنیٹی : تم اسے دل کہتے ہو جو تم سے چکنی چپڑی باتیں کہلوا رہا ہے۔

اُوٹ : میں جو محسوس کرتا ہوں، وہی کہتا ہوں۔

بنیٹی : کیا کوئی اس طرح محسوس کر سکتا ہے جس طرح تم بولتے ہو۔ شاید محسوس کر سکتا ہے۔ قتل پہلے تمہارے دل میں اُگتے ہیں۔ تم اپنے سیاہ ترین جرموں کے بارے میں اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے ہو جتنی شدت سے دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے بارے میں محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح ہم دین میں یقین رکھتے ہیں، اس طرح تم دغا میں یقین رکھتے ہو۔ کوئی نیک کام

سایہ نہیں ڈال سکتی! سانپ کی چال سیدھی ہو ہی نہیں سکتی! تم بے وفائیوں میں سچے ہو، مکاریوں میں مضبوط ہو!
دشیانہ اعمال سے تم جوت جگاتے ہو! خون دیکھ کر تمھیں خوشی ملتی ہے! انشدد تمھاری روح کو ساتویں آسمان پر لے جاتا ہے!
ذلیل، کمینے کام تمھاری آنکھوں میں آنسو لا دیتے ہیں، اور اچھے نیک کام تم میں شدید نفرت جگاتے ہیں اور انتقام کی
پیاس بڑھاتے ہیں!

اُڈم : مسز ڈل نیٹ، میں ہمیشہ، کہ میرا اصول ہے، اپنے حریف کی ایک ایک بات سنتا ہوں چاہے وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے حلقے میں کوئی بھی مجھے نہیں چاہتا۔ میرا حسب نسب، اور یہ میں نے کبھی چھپایا نہیں کہ میں برانکس کی ایک معمولی اولاد ہوں، میرے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں، سب کہتے ہیں، کہ پھنسی ہوئی مچھلی کس کانٹے سے کھائی جاتی ہے۔ پھر وہ یہ کیسے امید کر سکتا ہے کہ بڑے کاروبار میں اسے قبول کر لیا جائے گا۔ جب قیمتیں طے کرنے کے سلسلے میں بات چیت ہوگی یا اسی طرح کے دوسرے مالی مسائل کے سلسلے میں، تو امکان اس بات کا ہے کہ وہ قلم سے نہیں، چاقو سے بات کرے گا! ناممکن! ایسا آدمی ہمارے کسی کام کا نہیں! میرا گنوار لب و لہجہ اور سانپ کو سانپ کہنے کی میری صاف گوئی میرے خلاف الزامات ہیں۔ تعصبات کی یہ فصیلیں مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں اپنے ہی روئیوں پر بھروسہ رکھوں ——— تم پھول گوبھیوں کے کاروبار میں ہو اور میں خود بھی اسی کاروبار میں ہوں۔ ہمارے درمیان یہی ایک پل ہے۔

بینیٹ : اور خلا گھناؤنی لاشوں ہی سے پر کیا جا سکتا ہے!

اُڈم : تلخ تجربوں سے میں نے سیکھا ہے کہ انسانی نقطۂ نظر سے بات چیت پر زور نہ دیا جائے۔ تو اب میں تم سے، ایک بارسوخ شخصیت اور سبزی ترکاریوں کے کاروبار کے ایک مالک سے پوچھتا ہوں: پھول گوبھیوں کا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ کیونکہ ہمارے دکھوں کے باوجود زندگی کا کاروبار تو چلتا ہی رہتا ہے۔

بینیٹ : ہاں، چلتا ہی رہتا ہے ——— اور میں اپنی زندگی کو کام میں لاؤں گی۔ عمر بھر لوگوں کو اس وبا کے بارے میں بتاتی رہوں گی! میں اپنے مرے ہوئے شوہر کی قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ کبھی میری زبان سے 'صبح کا سلام'، یا 'میرا کھانا لگاؤ' نہیں نکلے گا، ورنہ مجھے اپنی آواز سے نفرت ہو جائے گی۔ میری زبان صرف ایک بات، ایک بات دہراتی رہے گی: 'اُڈی کو مٹا ڈالو!'

گیڈی : (دھمکانے کی آواز میں) اے لونڈیا، حد سے آگے نہ بڑھ!

اُڈم : کیونکہ مقبروں کے درمیان مجھے نرم و نازک محسوسات کی کوئی امید نہیں، میں تو صرف کاروبار کی بات کروں گا جس کا مُردوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

بینیٹ : اوہ ڈل نیٹ، ڈل نیٹ! اب میں نے سچ جان لیا کہ تم مر چکے ہو۔

اُڈم : درست۔ ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو کہ ڈل نیٹ مر چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سسرو کی وہ اکیلی آواز بھی مر چکی ہے جو جرم اور دہشت کے خلاف بول سکتی تھی۔ اس کا رونا کب تک روتی رہو گی! اس سنگ دل دنیا میں جہاں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کمزور ناتواں ہمیشہ روند ڈالے جاتے ہیں، اب تم ایک مجبور لاچار ہو۔ اب تمھارے لیے صرف ایک ہی چارہ رہ گیا ہے۔ اور وہ میں ہوں، آرتورو اُوئی۔

بینیٹ : اور یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو، اس آدمی کی بیوہ سے، جس کو تم نے قتل کیا! راکشس! آہ، میں جانتی تھی، تم یہاں

آؤ گے کیونکہ تم ہمیشہ وہاں پہنچتے ہو جہاں تم نے جرم کیا ہوتا ہے اور پھر تم دوسروں پر الزام دھرتے ہوئے 'نہیں، وہ میں نہیں تھا، وہ کوئی اور تھا، میں تو کچھ بھی نہیں جانتا' گھاؤ چیختا ہے، خون پکارتا ہے: 'قتل، قتل، قتل! قتل کا انتقام لو!'

اُودی : میرا منصوبہ جوں کا توں قائم ہے۔ سسر کو حفاظت کی ضرورت ہے۔

بیٹی : (نحیف آواز میں) تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اُودی : کامیابی یقینی ہے! آسنا! میں جانتا ہوں۔

بیٹی : اے خدا، اس محافظ سے ہمیں محفوظ رکھ!

اُودی : مجھے اپنا جواب دو۔

اُودی اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔

دوستی کا ہاتھ یا۔۔۔؟

بیٹی : جب تک میں زندہ ہوں، کبھی نہیں!

خوف کے مارے پیچھے ہٹتی ہے، پھر بھاگ جاتی ہے۔

ایک علامت اُبھرتی ہے۔

چودہ

ہوٹل مسمت۔ اُوتی کا شب خوابی کا کمرہ۔
اُوتی اچانک خود اپنے خواب میں مبتلا ہے اور بستر پر تڑپ رہا ہے۔
کرسیوں پر اس کے باڈی گارڈ بیٹھے ہوئے ہیں —— پستول ہر ایک کی گود میں پڑی ہوئی ہے۔

اُوتی : (سوتے میں) نکل جاؤ، خونی سایو! رحم کرو! چلے جاؤ یہاں سے!

اُوتی کے پیچھے کی دیوار صاف شفاف کانچ کی دیوار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
انستورما کا بھوت ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر گولی کا سوراخ ہے۔

روما : ان سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ یہ سارے قتل، یہ سب خون خرابہ، یہ دھمکیاں اور یہ چاپلوسیاں —— سب بیکار ہیں آرتورو، کہ تمہارے جرائم کی جڑیں ہی سڑی ہوئی ہیں۔ یہ کبھی پھلیں پھولیں گی نہیں۔ غداری بری کھاد ہے۔ قتل، جھوٹ، سب مناسب۔ کلارکوں کو دھوکا دو، ڈل فیٹوں کو موت کے گھاٹ اتارو لیکن اپنے ساتھیوں کی طرف مت بڑھو۔ ایک دنیا کے خلاف سازش کرو لیکن اپنے ساتھی سازشیوں کو چھوڑ دو۔ سینکڑوں پیروں تلے شہر کو روند ڈالو مگر اے پاگل کتے، روندنے والے پیروں کو مت روندو۔ سب کو ٹھگ لو لیکن یہ کبھی سوچنا تک نہیں کہ اسے بھی ٹھگ لوگے جس کا منہ تم آئینے میں دیکھتے ہو۔ مجھے مار کر، تم نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا ہے، آرتورو! میں نے تو اس وقت اپنی زندگی کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھما دی تھی، جب تم شراب خانے کے فرش پر ایک سائے سے زیادہ کچھ نہ تھے —— اور میں اب خلا کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں جب کہ تم چکنے اور مغرور شلین کے ساتھ میز کے گرد بیٹھے ہو۔ دغا بازی نے تمہیں بنایا بسایا ہے اور دغا بازی ہی تمہیں لے ڈوبے گی۔ جس طرح تم نے ارنستو روما کو، اپنے دوست اور دست راست کو دغا دیا، اسی طرح تم سب کو دغا دوگے، اور ہر ایک، آرتورو، آخر میں تم کو دغا دے گا۔ سبز مٹی نے تو ارنستو روما کو سمیٹ لیا ہے لیکن تمہاری ناپاک روح، فضا میں، مقبروں کے اوپر بھٹک رہی ہے اور سب اسے دیکھ رہے ہیں، یہاں تک کہ قبریں کھودنے والے بھی —— آرتورو، جن کو تم مار چکے ہو، جن کو تم ابھی مارو گے، ایک وقت آئے گا، سب اٹھیں گے، تم سے نفرت کے کارن وہ مضبوط ہو چکے ہوں گے اور تمہارے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ تم مدد کے لیے چاروں طرف دیکھو گے جس طرح ایک بار میں نے دیکھا تھا۔ تم وعدے کرو گے، دھمکیاں دو گے، التجائیں کرو گے لیکن کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ جب مجھ پر آن پڑی تھی، تب کون میری مدد کو آیا تھا؟

اُوتی : (تڑپ کر اٹھ بیٹھتا ہے) گولی مار دو اسے! قتل کر ڈالو اسے! غدار! جاؤ، اپنے مُردوں کے پاس

لوٹ جاؤ!

باڈی گارڈ دیوار میں اس جگہ پہ گولیاں چلاتے ہیں، جس جگہ کی طرف اُوئی اشارہ کرتا ہے۔

روما : (دھیرے دھیرے غائب ہوتے ہوئے) اب جیسا کچھ باقی میں بچا ہوں، یہ گولیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

پندرہ

ضلع مالیات - شکاگو کے سبزی ترکاری فروشوں کی میٹنگ ۔
سب کا رنگ زرد ہے ۔

پہلا سبزی فروش : قتل! استحصالِ زر! راہزنی!
دوسرا سبزی فروش : اس سے بھی بدتر : غلامی اور بزدلی!
تیسرا سبزی فروش : غلامی، کیا مطلب ہے تمھارا؟ جنوری میں جب ویسے پہلے دو آدمی دھاڑتے ہوئے میری دوکان میں گھسے اور جب انھوں نے پستول دکھا کر مجھے دھمکایا تو میں نے انھیں قہر بھری نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا اور سختی سے جواب دیا: میں خود طاقت کا دلدادہ ہوں ———— اور میں نے انھیں صاف کہہ دیا کہ میں اُن کے رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہیں کرتا اور نہ ان کے ساتھ کوئی لین دین رکھنا چاہتا ہوں۔ میری صورت برف کی مانند تھی، جیسے میں نے کہا ہو: تو پھر ٹھیک ہے، لو، یہ زبردستی کا حصہ لے جاؤ۔ اور یہ تم صرف اس لیے لے جا پا رہے ہو کہ تمھارے پاس وہ پستولیں ہیں۔
چوتھا سبزی فروش : بالکل صحیح کہا تم نے! اب ہم ٹھہرے سیدھے سادے لوگ! یہی میں نے اپنی بیوی سے کہا۔
پہلا سبزی فروش : (جوش سے) بزدلی، کیا مطلب ہے تمھارا؟ ہم نے اپنی کھوپڑیوں کا استعمال کیا۔ اگر ہم خاموش رہے، دانت پیستے رہے اور انھیں پیسے دیتے رہے تو صرف اس لیے کہ ہم نے سوچا، اس طرح وہ خونی بدمعاش اپنی بندوقیں پستولیں ایک طرف رکھ دیں گے۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ نہیں! پھر وہی قتل! لوٹ کھسوٹ! راہزنی!
دوسرا سبزی فروش : اس ذلت کو کوئی اور برداشت نہ کرتا۔ وہ جس کے پاس ریڑھ کی ہڈی ہے . . . !
پانچواں سبزی فروش : تمھارا مطلب ہے کوئی بدمعاش بندوقچی یہ ذلت برداشت نہ کرتا۔ میں کوئی دادا نہیں ہوں۔ میرا کام سبزی ترکاری بیچنا ہے۔
تیسرا سبزی فروش : میری تو صرف ایک خواہش ہے اور راستہ بھی صرف یہی دکھائی دیتا ہے کہ کسی دن حرامی کی مڈبھیڑ کسی ایسے ویسے سے ہو جائے جو اسے دانت دکھا سکے ———— وہ یہ تماشا کسی اور جگہ پر کر کے تو دیکھے!
چوتھا سبزی فروش : مثلاً سسرو میں!

سسرو کے سبزی فروش داخل ہوتے ہیں ———— سب کا رنگ زرد ہے ۔

سسرو باسی : ارے بھائی شکاگو باسیو!
شکاگو باسی : اوہ، سسرو باسی! اِدھر کدھر، کیسے؟
سسرو باسی : ہمیں آنے کے لیے کہا گیا تھا۔

شکاگو باسی : کس نے کہا تھا؟

سسرو باسی : اُس نے۔

پہلا شکاگو باسی : کون کہتا ہے؟ وہ تم پر کیسے حکم چلا سکتا ہے؟ سسرو کو کیسے گرفت میں لے سکتا ہے؟

پہلا سسرو باسی : اپنی پستول سے۔

دوسرا سسرو باسی : حیوانی طاقت سے۔ ہم تو بے بس ہیں۔

پہلا شکاگو باسی : سڑے ہوئے بزدل! کیا تم لوگ مرد نہیں ہو؟ کیا سسرو میں کوئی قانون نہیں ہے؟

پہلا سسرو باسی : نہیں۔

دوسرا سسرو باسی : اب نہیں۔

تیسرا شکاگو باسی : سنو، دوستو! تمھیں لڑنا پڑے گا۔ یہ پلیگ تمام ملک پر ٹوٹ پڑے گی اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو . . .

پہلا شکاگو باسی : پہلے ایک شہر، پھر دوسرا شہر۔ آخری دم تک لڑو! تمھارے ملک کی ذمہ داری ہے تم پر!

دوسرا سسرو باسی : ہم کیوں؟ ہم ٹھہرے سیدھے سادے لوگ۔

چوتھا شکاگو باسی : ہم تو صرف ایک امید کر سکتے ہیں کہ خدا کی عنایت سے کسی دن اس حرامی کی مڈبھیڑ کسی ایسے ویسے سے ہو جائے جو اسے دانت دکھا سکے۔

تھوم دھڑاکا۔

آرتورو اُوئی اور بیٹی ڈل فیٹ جس نے ماتمی لباس پہنا ہوا ہے، داخل ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے کلارک، گری، گی وولا اور باڈی گارڈ ہیں۔

سب کے جھرمٹ میں گھرا ہوا اُوئی بیچ میں سے گزرتا ہے۔

پس منظر میں باڈی گارڈ قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

گری : تو دوستو، کیا سسرو کے سب لوگ موجود ہیں؟

پہلا سسرو باسی : سب موجود ہیں۔

گری : (اُوئی سے) سب لوگ موجود ہیں۔

گی وولا : خوش آمدید، میرے دوستو۔ کولی فلاور ٹرسٹ آپ کا دل سے خیر مقدم کرتا ہے۔ سب سے پہلے مسٹر کلارک آپ سے مخاطب ہوں گے۔ (کلارک سے) مسٹر کلارک۔

کلارک : صاحبان، میں تو آپ کے لیے ایک خبر لایا ہوں۔ چند ہفتے پہلے ایک بات چیت شروع ہوئی تھی جو بڑے صبر سے جاری رہی، ہاں کبھی کبھی بڑے شدید لمحے بھی آئے، یوں جانیے، جیسے میں کوئی اسکول کے زمانے کی کہانی سنا رہا ہوں، تو اب جا کر کہیں ہم ایک نتیجے تک پہنچے ہیں ——— سسرو کے بی۔ ڈل فیٹ تھوک فروش کولی فلاور ٹرسٹ میں شامل ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً اب کولی فلاور ٹرسٹ آپ کو سبزی ترکاریاں فراہم کیا کرے گا۔ آپ کا مفاد صاف ظاہر ہے: محفوظ اور مناسب تقسیم۔ نئی قیمتیں جو ذرا زیادہ ہیں، طے ہو چکی ہیں ——— مسز ڈل فیٹ،

بڑی مسرت سے ٹرسٹ آپ کو نئی ممبر کی حیثیت سے خوش آمدید کہتا ہے۔

کلارک اور بیٹی ڈل فیٹ ہاتھ ملاتے ہیں۔

گِوولا : اور اب : آرتورو اُوئی۔

اُوئی مائیکروفونوں کے سامنے پہنچتا ہے۔

اُوئی : دوستو، ہم وطنو! شکاگو باسیو اور سِسرو باسیو! جب کوئی سال بھر پہلے میرے بزرگ ڈاگس بورو نے، خدا ان کی روح کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آنسو بھری آنکھوں سے شکاگو کے سبزی ترکاریوں کے کاروبار کی حفاظت کی درخواست کی تو، حالانکہ میرا دل بھر آیا تھا، مجھے اپنی ذات، اپنی طاقت پر شک تھا کہ میں ان کے سدا بہار اعتماد کی لاج رکھ بھی سکوں گا۔ اب ڈاگس بورو ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہاں، ان کا وصیت نامہ موجود ہے جسے، جب آپ کا جی چاہے، پڑھ سکتے ہیں۔ سیدھے صاف لفظوں میں انھوں نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے اور میرا شکریہ ادا کیا ہے کہ میں نے ان کی درخواست پر اتنا کچھ کیا ہے۔ آج شکاگو میں سبزی ترکاریوں کی تجارت، چاہے وہ شلغم ہوں، پیاز ہوں یا گاجر، یا جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، مکمل طور پر محفوظ ہے۔ مجھے یہ بڑی بات کہنے دیجیے کہ یہ کام میری ثابت قدمی کے سبب ہوا۔ اور پھر، جب سِسرو کے نیتا اگناتیس ڈل فیٹ نے ایسی ہی درخواست کی تو مجھے تعجب ہوا۔ میں نے سِسرو کو اپنی حفاظت میں لینے کی درخواست مان تو لی لیکن یہ شرط رکھی : اگر سِسرو کے تاجر، بیوپاری ایسا چاہتے ہوں تو۔ . . میں صرف اس صورت میں آ سکتا ہوں، اگر یہ سب لوگ آزادانہ طور پر خود فیصلہ کریں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے صاف سیدھے اور دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ سِسرو پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے، سِسرو کے ساتھ کوئی زبردستی نہ کی جائے! شہر خود مکمل آزادی کے ساتھ مجھے چنے! میں نہیں چاہتا، کوئی بے دلی سے کہے، 'کیوں نہیں ؟'، اور میں یہ بھی نہیں چاہتا، کوئی دانت پیستے ہوئے کہے، 'ہاں، ٹھیک ہی تو ہے' —— نیم رضامندی میرے نزدیک زہر سے کم نہیں۔ تو سِسرو باسیو، میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ آپ سب خوشی کے ساتھ ایک آواز میں 'ہاں' کہیں جو آپ کی زبان سے ہی نکلے، دل سے بھی نکلے —— اور چونکہ میں یہ چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہر چیز کی تکمیل ہو جائے، اب میں شکاگو باسیو، آپ سے مخاطب ہوتا ہوں کہ آپ مجھے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں، اور مجھے یقین ہے میری قدر بھی کرتے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں : میرے ساتھ کون ہے، میرے حق میں کون ہے؟ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں : جو میرے ساتھ نہیں ہے، وہ میرے خلاف ہے اور اگر اس کے ساتھ کچھ ہو جاتا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اب آپ فیصلہ کر سکتے ہیں!

گِوولا : لیکن اس سے پہلے چند الفاظ مسز ڈل فیٹ کہیں گی —— مسٹر ڈل فیٹ کی بیوہ جنھیں آپ سب لوگ جانتے ہیں —— مسٹر ڈل فیٹ جنھیں آپ سب لوگوں نے پیار کیا۔

بیٹی : پیارے دوستو! آپ کے وفادار دوست اور میرے پیارے شوہر اگناتیس ڈل فیٹ آج ہمارے درمیان

نہیں ہیں کہ . . .

گی دوڈلا : خدا ان کی روح کو سکھ چین دے!

بنیٹی : . . . ہم ان کا سہارا لے سکیں، ان کی مدد لے سکیں۔ میں آپ سب کو یہی مشورہ دوں گی کہ آپ سب مسٹر اُوئی پر بھروسہ کریں، جس طرح میں کرتی ہوں۔ اپنے دُکھ کے اِن دنوں میں، میں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے اور جانا ہے اور ان پر بھروسہ کیا ہے۔

گی دوڈلا : تو اب ووٹ دینے کا وقت آگیا ہے!

گیدن : وہ لوگ جو آرتورو اُوئی کے حق میں ہیں، اپنا دایاں ہاتھ اُٹھائیں!

کچھ لوگ اپنا ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

ایک سیسرو باسی : کیا یہاں سے جانے کی اجازت ہے؟

گی دوڈلا : ہر شخص آزاد ہے۔ اس کا جی جو چاہے، وہ وہی کر سکتا ہے۔

جھجکتے ہوئے سیسرو باسی باہر جاتا ہے۔
دو باڈی گارڈ اس کے پیچھے باہر جاتے ہیں۔
گولی کی خفیف آواز آتی ہے۔

گیدن : تو پھر دوستو، اب ہم آپ کا آزادانہ فیصلہ جاننا چاہتے ہیں!

سب لوگ اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہیں

گی دوڈلا : بس، سب نے آپ کے حق میں ووٹ ڈالے ہیں۔
سیسرو اور شکاگو کے سبزی ترکاری فروش
آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں
کہ آپ نے انھیں
اپنی مہربان حفاظت میں لے لیا ہے۔
خوشی کے مارے ان کے دانت بج رہے ہیں . . .

اُوئی : میں فخر کے ساتھ آپ کا شکریہ قبول کرتا ہوں۔
کوئی پندرہ سال پہلے، جب میں برانکس کا ایک حقیر و ناتواں
اور بے روزگار بیٹا تھا، جب غیب کی آواز سنتے ہی

میں سات مضبوط ساتھیوں کے ساتھ
طوفانی ہواؤں کے اس شہر کی طرف بڑھا تھا، میرے دل میں
سبزی ترکاریوں کی تجارت میں
سکھ چین قائم کرنے کا آہنی عزم تھا —— یہی میرا مقدر تھا۔
سکھ چین کے اس آدرش تک پہنچنے کے لیے
ہم مٹھی بھر ساتھیوں نے
عاجزی سے، لیکن ایک جنونی شدت کے ساتھ عمل کیا۔
آج ہمارے ساتھ ایک جم غفیر ہے۔
شکاگو کی سبزی ترکاریوں کی تجارت میں سکھ چین
اب خواب کی بات نہیں رہا۔ آج یہ ایک
ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور اس حقیقت کے استحکام کے لیے
تم نے مزید مشین گنیں، ربڑ کے کوڑے اور چابکیں وغیرہ
حاصل کرنے کا حکم دیا ہے
کہ صرف شکاگو اور سِسرو ہی حفاظت کے لیے
فریاد نہیں کر رہے ہیں!
اور دوسرے شہر بھی ہیں:
واشنگٹن اور مل واؤکی! ڈیٹ راؤٹ! تولیدو! پٹس برگ! سن سِناتی!
اور بھی دوسرے شہر ہیں جہاں سبزی ترکاریوں کی تجارت ہوتی ہے!
فیلے ڈلفیا! کولمبس! شارل سٹن! اور نیویارک!
سب کا ایک ہی مطالبہ ہے: حفاظت!
"اُف ف . . . !"
"یہ بات اچھی نہیں . . . !"
—— ایسی باتیں آرتورو اُوئی کے بڑھتے قدموں کو نہیں روک سکتیں!

پردہ گرتا ہے

اختتامیہ

. . . اس لیے آنکھوں سے دیکھنا سیکھو!
حیرت و استعجاب سے خلا میں گھورنے سے کام نہ چلے گا،
دن بھر کی باتیں دن کھو دیں گی!
تمھیں تو عمل کی ضرورت ہے!
اُس درندے نے تو دُنیا بس جیت ہی لی تھی!
وہ تو قوموں کے اتحاد نے اُسے
اُس مقام پر پہنچا دیا
کہ جو اُن جیسے لوگوں کا ہوتا ہے!
لیکن اپنی نجات پر یوں
اور اتنی جلدی
خوش ہونے کی ضرورت نہیں ——
کہ وہ کوکھ
جہاں سے وہ رینگتا ہوا نکلا تھا،
اب بھی بڑی زرخیز ہے!

سلسلۂ واقعات

۱: ۱۹۲۹-۱۹۳۲ء: جرمنی عالمی معاشی بحران کے بھنور میں۔ بحران کے انتہا کے دنوں میں پرشیا کے متعدد جاگیردار (امیرزادے) سرکاری قرضے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں۔ سادئی روہر کے بڑے صنعت کار صنعت کی توسیع کے خواب دیکھتے ہیں۔

۲: قرضوں کے سلسلے میں صدر ہنڈن برگ کی ہمدردانہ تائید حاصل کرنے کے لیے پرشیا کے جاگیردار ہنڈن برگ کو ایک جاگیر کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

۳: ۱۹۳۲ء کے موسمِ خزاں میں ہٹلر کی سیاسی پارٹی اور اس کی نجی فوجی تنظیم کا دیوالہ نکلنے اور شیرازہ بکھرنے کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔ صورتِ حال کو سنبھالنے کی غرض سے ہٹلر خود کو چانسلر (وزیرِ اعظم) نامزد کرانے کا جتن کرتا ہے لیکن ایک مدت تک ہنڈن برگ اس سے ملنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔

۴: جنوری، ۱۹۳۳ء میں، ہنڈن برگ، ہٹلر کو چانسلر مقرر کر دیتا ہے لیکن اس شرط پر کہ ہٹلر پرشیا کے جاگیرداروں کو دی گئی 'امداد' کا اسکینڈل دبائے رکھے گا کیونکہ ہنڈن برگ خود اس میں ملوث ہے۔

۵: قانونی طور پر اقتدار میں آنے کے بعد ہٹلر اپنے متشدد اقدامات سے اپنے سرپرستوں کو ششدر کر دیتا ہے —— لیکن وہ اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتا ہے۔

۶: داداؤں کا سردار تیزی سے سیاست دان بن بیٹھتا ہے —— اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ایک قصباتی اداکار سے خطابت اور چال ڈھال کی تربیت حاصل کی ہے۔

۷: فروری ۱۹۳۳ء میں ریش تاغ (پارلیمنٹ) کی آتش زنی۔ ہٹلر اپنے دشمنوں کو آتش زنی کا ملزم ٹھہراتا ہے اور اس کے اشارے پر 'شبِ آہنی وسنگ' کے دوران لاتعداد 'دشمن' موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔

۸: لیپ زگ میں عدالتِ عالیہ ایک بے روزگار مزدور کو آتش زنی کا مجرم گردانتے ہوئے سزائے موت کی سزا دیتی ہے۔ آتش زنی کے اصل مجرم صاف بچ نکلتے ہیں۔

۹ اور ۱۰: عمر رسیدہ ہنڈن برگ کی موت کے احتمال سے نازیوں کے درمیان اقتدار کے لیے کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جاگیردار اور صنعت کار، ہٹلر کے دستِ راست روہم کو ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں —— آسٹریا پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔

۱۱: تیس جون، ۱۹۳۴ء کی شب، ہٹلر اپنے دوست روہم پر ٹوٹ پڑتا ہے جو ایک سرائے میں ہٹلر کا انتظار کر رہا ہے۔ آخری لمحے تک روہم یہی سمجھتا رہتا ہے کہ ہٹلر اس کے ساتھ مل کر ہنڈن برگ اور گورنگ (ہٹلر کا ایک قریبی ساتھی) کے خلاف مشترکہ محاذ بنانے آ رہا ہے۔

۱۲: دھمکیوں اور دباؤ کے تحت آسٹرین چانسلر ڈول فوس، ہٹلر کے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ وہ آسٹرین اخبارات میں ہٹلر کے خلاف حملے بند کروا دے گا۔

۱۳: ہٹلر کے اشارے پر ڈول فوس کو قتل کر دیا جاتا ہے —— ہٹلر آسٹریا کے دائیں بازو کے سیاسی حلقوں کے ساتھ بات چیت جاری رکھتا ہے۔

۱۴: گیارہ مارچ، ۱۹۳۸ء کو ہٹلر اپنی فوج کے ساتھ آسٹریا میں داخل ہوتا ہے —— نازی دہشت انگیزی میں منعقد چناؤ میں اٹھانوے فی صد ووٹ ہٹلر کو ملتے ہیں۔

ساتویں ایکٹ کے دوران جمیز گرین وُول ایک گیت گاتا ہے۔
اس ڈرامے کی براڈ نہ وے کی ابتدائی سیبل پروڈکشن میں مندرجہ ذیل گیت
شامل تھا۔
اس گیت کا اُردو ترجمہ بلراج کومل نے کیا ہے۔

گرین وُول کا گیت

○

چراگاہ سرسبز ہے
اس کے پہلو میں
چھوٹا سا کیبن ہے
یہ میرا خوشیوں سے بھرپور گھر تھا
دریچے سے
اب جھانکتی ہیں
وہ آنکھیں
جو میرے لیے اجنبی ہیں
مَیں جن کے لیے اجنبی ہوں
مجھے رہ نوردی خدا جانے کیوں بھا گئی تھی
مَیں نکلا، تو پھر لوٹ کر آ نہ پایا
مجھے لے چلو، لے چلو میرے گھر میں
مجھے لے چلو آج واپس
اسی میرے
خوشیوں سے معمور گھر میں
مجھے لے چلو، لے چلو، میرے گھر میں
مجھے لے چلو آج واپس
حسین قہقہوں اور رنگوں سے مسرور گھر میں

بریخت

گیارہ نظمیں

ترجمہ : بلراج کومل

میرا بھائی طیارہ باز تھا

یہودی کی محبوبہ میری سینڈرز کی داستان

بدھ کی حکایت خانۂ زیر آتش

○

ترجمہ : منیر الدین احمد

انسان کے کارنامے

انسانیت

یہ بات انھیں ضرور کہوں گا

عدالتوں کا ترانہ

راحت کا بسیرا

قانون ان کے ہاتھ میں ہے

ایک مزدور کے سوالات

میرا نام کیوں لیا جائے

میرا بھائی طیارہ باز تھا

○

وہ ایک طیارہ باز تھا
میرا بھائی، میرا برادرِ تازہ کار
اک روز، اس کو
حکمِ سفر ملا
اور اس نے چھوٹے سے بکس میں
اپنا سارا رختِ سفر سمیٹا
جنوب کی سمت چل دیا تھا
وہ میرا بھائی!

وہ کامراں ہے
ہمارے لوگوں کو تنگیٔ جائے زندگی کا گلہ رہا ہے
ہماری ہر نسل
خوابِ توسیعِ سلطنت
روز و شب زمانوں سے دیکھتی ہے

وہ خاک پارہ، وہ اجنبی خطۂ زمیں
جس پہ اس نے قبضہ کیا تھا، اس دن
جو ابرِ کہسار گاڈر تا میں آج محفوظ
طول
چھ فٹ ہے اور دو انچ
اور گہرائی
چار فٹ سے زیادہ چھ انچ!!

یہودی کی قحبہ میری سینڈرز کی داستان

○

نیورم برگ میں
جب قانون نئے کچھ جاری کیے گئے
شاہد رعنا
مردِ غلط کے ساتھ جو کل شب سوئی تھی
صبح ہوئی تو شام ڈھلے تک روئی تھی
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول تو ڈھول کا شور بڑھا
امشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کرنے والے ہیں
وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنے والے ہیں

میری سینڈرز

بال ترے عاشق کے سُندر کالے ہیں
کل کی طرح نہ پیارے، اپنے جسم سے لپٹاؤ اس کو
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول تو ڈھول کا شور بڑھا
امشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کرنے والے ہیں

وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنے والے ہیں

ماں! اب تالے کی چابی دے دو مجھکو
اتنے ظالم، اتنے برے
ہو نہیں سکتے میرے شہر کے لوگ ابھی
چاند ابھی پہلے کی طرح
سندر، البیلا لگتا ہے
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
زور زور سے پیٹا گیا جب ڈھول تو ڈھول کا شور بڑھا
امشب وہ اس شہر میں جانے کیا کیا کرنے والے ہیں
وہ بستی پر نازل کوئی حادثہ کرنے والے ہیں

صبح ہوئی،
نو بجتے ہی، اس روز وہ تنہا، صرف قمیض سی پہنے ہوئے
پورے شہر میں گھوم گئی
گلے میں لٹکا رکھی تھی اک تختی اس نے
سر پر کوئی بال نہ تھا
گلی گلی میں اس کی ہنسی اُڑائی گئی
خالی ٹھنڈی آنکھوں سے وہ تکتی تھی
اور چُپ چُپ حیران وہ چلتی جاتی تھی
شہر سے باہر کی گندی بستی میں گوشت کا بھاؤ چڑھا
امشب وہ اعلان کرے گا، امشب سٹریچر[ط] بولے گا
کان، آنکھ سے ان کو خدا نے کاش نوازا ہوتا تو
جان ہی جاتے وہ امشب اپنی بپتا اور اپنا دکھ
امشب وہ اعلان کرے گا
امشب وہ لوگوں سے مخاطب ہوگا
وہ کچھ بولے گا۔

ط : سٹریچر، نازی اخبار نویس (۱۹۴۶-۱۸۸۵ء)

بدھ کی حکایت خانۂ زیرِ آتش

○

بدھ نے حرص و ہوس کے دائرے کا ذکر چھیڑا
جس سے وابستہ ہیں ہم خاکی جہاں میں
اور پھر گویا ہوا :
"ترک کر دو، آرزوئے نو بہ نو
اور بارِ آرزو سے ہو چکو آزاد
تم پر در کھلیں گے، اس خلا کے، اور اس
نروان کے ـــــ
جس سے تم واقف نہیں"
ایک روز
کچھ مریدوں نے یہ پوچھا :
"مرشدِ اعظم
ہمیں منظور تعمیلِ معظم،
اور ترکِ آرزو۔
وہ خلا، نروان، موجِ گرمیِ تخلیق
لطفِ جسم و جاں، وہ کس طرح کا تجربہ ہے، ہائے! کچھ ایسا نہیں
بسترِ آبِ رواں پر ہم سدا محسوس یہ کرتے رہیں
جسم ہلکا ہے، اگلِ تازہ سا
دوپہر کا وقت ہے

فکر و غم سے ماورا
اونگھتے سوتے رہیں
سر سے پا تک نرم سی میٹھی تمازت میں نہاں
ہم اُترتے جا رہے ہیں لذتوں میں
کیا خلا اے مرشدِ اعظم خلا ایسا خلا ہے
یا کوئی مہمل سا، یخ آلود، بے معنی خلا!!"

مرشدِ اعظم
بڑی ہی دیر تک گم سم رہے
اور بے پروا سے پھر گویا ہوئے :
"یہ سوال
تم نے پوچھا ہے، بڑا اچھا کیا۔
خامشی میرا جواب
خامشی میرا جواب۔"

شام کو وہ لوگ رخصت ہو گئے جب
مرشدِ اعظم، بڑے گمبھیر، نخلِ نان کے سائے میں
ان لوگوں سے —— استفسار کی لذت سے جو باہر تھے اب تک
اس طرح گویا ہوئے :
"میں نے دیکھا تھا، گلی میں، کچھ دنوں کی بات ہے
اک مکاں جلتا ہوا
اور مکیں دیوار و در میں اس گھڑی موجود تھے
خانۂ آتش زدہ کے ان مکینوں کو پکارا میں نے جب
آستانِ خشت سے
بدنصیبو، چھوڑ دو یہ گھر، یہ زیرِ آتشِ موجِ فنا ہے
دوڑ کر نکلو، تمھارے پاس تھوڑا وقت ہے
ان کو لیکن کچھ بھی تو جلدی نہ تھی
آگ جھلسانے لگی پلکوں، بھووں کو

ایک بولا : موسمِ جنت ہے کیسا؟
زمزمِ بارش رہِ گل پر چھڑکا ہے یا نہیں؟
موجِ رنگ و نور کیا بہنے لگی؟
کیا نسیمِ صبح چلتی ہے وہاں؟
دوسرا گھر بھی تو ہوگا اپنے رہنے کے لیے،
جانے کیا کیا پوچھتے تھے، زیرِ آتش لوگ مجھ سے اس گھڑی
سوچتا تھا : موت کی آغوش میں
خاموش ہو جائیں گے ان کے سب سوال۔"

سچ تو یہ ہے دوستو!
مجھ کو اس سے کچھ نہیں کہنا، مکینِ حسرتِ بے دام سے
نرمیِ بستر سے جو کچھ اس قدر مانوس ہے
زیرِ آتش ہے مگر وہ بسترِ آرام کو
چھوڑتا ہرگز نہیں۔
سوچتا ہے، دوسرا بستر اسے جب تک نہ مِل پائے گا، اس پر ہی
قناعت کی سہانی نیند سوئے گا
زمیں مشورے دیتے ہیں سب کو ہم یہاں۔
ہم سپردہ خاطری کے آج بھی رسیا نہیں
ہم شعارِ ترک کے افسانہ خواں
ان سے کہتے ہیں :
جھٹک دو ظالموں کو، بار ناموزوں کو، لیکن
وہ بموں کی یورشوں کے درمیاں
مرگ آسا طائروں کے درمیاں
سوچتے ہیں آنے والے دن کی باتیں
جامۂ تعطیل کا کیا حشر ہوگا
روزِ موجِ انقلاب

بعدِ سیلِ انقلاب
ان سے اب ہم کچھ نہیں کہتے کہ کوئی لفظ
ان کے واسطے باقی نہیں۔

انسان کے کارنامے

○

پہاڑوں کے اوپر
اڑتا ہے انسان بغیر کسی دقّت کے
اُس کے کارنامے بہت اونچے ہیں
مگر سب کے لیے روٹی وہ پیدا نہیں کر سکتا
خدا کی مار
آخر کیوں سب لوگ سیر نہیں ہو سکتے

ایک برِّ اعظم سے دوسرے تک
انسان ایک گھر سے دوسرے گھر بات کرتا ہے
لاکھوں ہاتھ
ایک دوسرے کی طرف اُٹھتے ہیں
خدا کی قسم
اگر یہ تمام متحد ہو جائیں

انسانیت

○

اس نظام میں جو انھوں نے قائم کر رکھا ہے
انسانیت ایک استثنائی شے ہے
جو کوئی اس کا مظاہرہ کرتا ہے
اس کو اس کی سزا خود ہی بھگتنی پڑتی ہے
ترس کھاؤ اس پر جو تمھیں
ہمدرد نظر آئے
اُس شخص کو باز رکھو جو
کسی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہو

تمھارے پہلو میں پیاسا مر رہا ہے، جلد آنکھیں بند کر لو
کان میں روئی ٹھونس لو، تمھارے قریب کوئی کراہ رہا ہے
اپنے قدموں کو روکو، کوئی شخص مدد کے لیے دہائی دے رہا ہے
خبردار جو کوئی اس چیز کو چھوئے
وہ ایک انسان کو پینے کے لیے پانی دیتا ہے اور
ایک بھیڑیا اُسے پیتا ہے

یہ بات انھیں ضرور کہوں گا

○

مَیں نے سوچا : کیا کہوں ان سے ؟
یہ لوگ علم خریدتے ہیں تاکہ اُسے بیچ سکیں
وہ صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ علم کہاں پر ارزاں ملتا ہے
جسے وہ گراں فروخت کرسکیں
آخر کیوں وہ ایسی بات سُننی گوارا کریں جو
اس خرید و فروخت کے خلاف ہو ؟
وہ فتح حاصل کرنی چاہتے ہیں
فتح کے خلاف کوئی بات نہیں سننا چاہتے
وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ اُن کو دبایا جائے
وہ خود دبانا چاہتے ہیں
وہ ترقی کے خواہاں نہیں
صرف دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں
وہ ہر کسی کے تابعدار ہیں جو
ان سے وعدہ کرے کہ انھیں حکمداری دی جائے گی
وہ اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں
تاکہ قربانی کا پتھر اپنی جگہ پر قائم رہے

کیا کہوں ان سے، مَیں نے سوچا
یہ بات انھیں ضرور کہوں گا، میں نے فیصلہ کیا

عدالتوں کا ترانہ

○

لٹیروں کے لشکر کے عقب میں
عدالتیں راہ رواں ہیں
جب بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے تو
منصف مل بیٹھتے ہیں اور اُس کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں
مظلوم کی قبر پر
انصاف کا خون بہایا جاتا ہے

عدالت کے فیصلے
جلّاد کی تلوار کے سایوں کی طرح برستے ہیں
آہ، جلّاد کی تلوار جو تیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی، اُسے بھلا
کیا حاجت ہے عدالت کے فیصلوں کی؟

دیکھتے ہو گِدھوں کی پرواز، کدھر کا رُخ ہے؟
بنجر صحرا نے ان کو ہجرت پر مجبور کر دیا ہے
عدالتیں انھیں غذا مہیا کریں گی
قاتل ادھر کا رُخ کرتے ہیں اور ان کا پیچھا کرنے والے بھی
وہاں پر حفاظت میں ہیں اور وہاں پر
لٹیرے اپنی لوٹ کا مال چھپاتے ہیں جو کہ
ایک کاغذ میں لپٹا ہوا ہے جس پر قانون درج ہے

رات کا بسیرا

○

مَیں نے سُنا ہے کہ نیو یارک میں
سڑک نمبر چھبیس اور براڈوے کی نکڑ پر
سرما کے مہینوں میں ایک شخص کھڑا ہوتا ہے
جو بے گھروں کے لیے جو اس جگہ اکٹھے ہوتے ہیں
راہگزاروں کی منت سماجت کر کے رات بھر کے ٹھکانے کا انتظام کر دیتا ہے

مگر اس سے دُنیا نہ بدل سکے گی
اور نہ ہی انسانوں کے باہمی تعلقات بہتر ہو سکیں گے
استبداد کا زمانہ بھی اس وجہ سے کم نہ ہو سکے گا
تاہم چند ایک مردوں کو رات کا بسیرا مل گیا ہے
اور ایک پوری رات کے لیے سرد ہواؤں سے ان کا بچاؤ ہو گیا ہے
اور ان کے جسموں پر پڑنے والی برف اب سڑک پر گرے گی

کتاب کو ہاتھ سے نہ رکھ دے اے پڑھنے والے انسان
چند ایک انسانوں کو رات کا بسیرا مل گیا ہے
اور ان کے جسموں پر پڑنے والی برف اب سڑک پر گرے گی
مگر اس وجہ سے دُنیا میں کوئی تبدیلی نہ آ سکے گی
اور نہ ہی انسانوں کے باہمی تعلقات اس وجہ سے بہتر ہو جائیں گے
اور استبداد کا زمانہ بھی اس وجہ سے ختم نہ ہو پائے گا۔

قانون اُن کے ہاتھ میں ہے

○

قانون کی کتابیں اُن کے ہاتھ میں ہیں اور احکامات کے پلندے
جیلیں اور قلعے بھی اُن کے قبضہ میں ہیں
(اُن کے معاشرتی اداروں کا ہم شمار نہیں کرتے)
اُن کے ساتھ جیل کے داروغے اور منصف ہیں
جنھیں موٹی تنخواہیں ملتی ہیں اور جو ہر خدمت کے لیے تیار ہیں

جی ہاں، بھلا کاہے کو؟
کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح ہمیں اپنے قابو میں کر لیں گے؟
اپنے جانے سے قبل، اور وہ دن جلد آئے گا،
وہ جان چکے ہوں گے کہ یہ تمام چیزیں اب اُن کے لیے بے سود ہیں

اخباریں اُن کے ہاتھ میں ہیں اور چھاپے خانے
ہمارے خلاف لڑنے کو اور ہمارا منہ بند کرنے کے لیے
(اُن کے سیاست دانوں کا ہم شمار نہیں کرتے)
دین کے ٹھیکیدار ان کے ساتھ ہیں اور پروفیسر صاحبان
جنھیں اونچی تنخواہیں ملتی ہیں اور جو ہر خدمت کے لیے تیار ہیں
جی ہاں، بھلا کاہے کو؟
سچائی سے وہ آخر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں؟
اپنے جانے سے قبل، اور وہ دن جلد آئے گا،
وہ جان چکے ہوں گے کہ یہ تمام چیزیں اب اُن کے لیے بے سود ہیں

ٹینک ان کے پاس ہیں اور توپیں
مشین گنیں اور گرینیڈ
(لاٹھیوں کا ہم شمار نہیں کرتے)
سپاہی اُن کے ساتھ ہیں اور فوجی جوان
جنھیں معمولی تنخواہیں ملتی ہیں مگر وہ ہر خدمت کے لیے تیار ہیں
جی ہاں، بھلا کاہے کو؟
کیا اُن کے دشمن اس قدر طاقتور ہیں؟
وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کو گرنے سے بچانے کے لیے
کوئی سہارا ہونا چاہیے
ایک روز اور وہ دن جلد آئے گا،
وہ جان چکے ہوں گے کہ یہ تمام چیزیں اب اُن کے لیے بے سود ہیں
تب وہ خواہ کتنے ہی اونچے سے "ہالٹ" چلائیں
انھیں نہ ان کا پیسہ دہی توپیں بچا سکیں گی

ایک مزدور کے سوالات

○

سات دروازوں والے شہرِ تھیبز کو کس نے بسایا
کتابوں میں بادشاہوں کے نام لکھے ہیں
کیا بادشاہ پہاڑوں سے پتھر کاٹ کے لائے
اور وہ بار بار اجڑنے والا بابل
کون اسے اتنی بار تعمیر کرتا رہا
اور کن مکانوں میں بستے تھے سونے کے چمکتے دمکتے لیما کے معمار
اور کس سمت گئے اس شام مزدور
جس روز چین کی دیوار مکمل ہوئی
اور روم بھرا ہوا ہے فتح کی محرابوں سے
کس نے انھیں تعمیر کیا اور کس پر قیصر فتح مناتے تھے
اور کیا بازنطین میں جس کی بے حد تعریف کی گئی ہے
سب لوگ محلات میں آباد تھے
خود قصے کہانیوں کے شہر اٹلانٹس
اس رات جبکہ سمندر اسے نگل رہا تھا
ڈوبنے والے اپنے غلاموں کو پکارتے تھے
نوجوان سکندر نے ہندوستان کو فتح کیا
اکیلے نے کیا
سیزر نے گالیو کو شکست دی

وہ اپنے ساتھ کیا ایک باورچی کو بھی نہ لے کے گیا تھا

اسپین کا بادشاہ فلپ رویا جب اس کا بیڑا سمندر کی نذر ہوا
کیا اس کے سوا اور کوئی نہ رویا
فریڈرک دوم سات سالہ جنگ جیتا
کیا اس کے سوا اور کوئی بھی جیتا
ہر ورق ایک فتح
فتح کے جشن میں کھانا کس نے پکایا
ہر دس سال میں ایک شخصیت
اس کی قیمت بھلا کون ادا کرتا رہا

اتنی ساری خبریں
اتنے ہی سوالات

میرا نام کیوں لیا جائے

۱:

میں سوچتا تھا بعد کے زمانے میں
جب مکانات گر چکے ہوں گے جہاں میں رہتا ہوں
اور کشتیاں گل سڑ چکی ہوں گی جن پر میں نے سفر کیا
تب بھی میرا نام لیا جائے گا
دوسرے ناموں کے ساتھ

۲:

کیونکہ میں اچھی چیزوں کی تعریف کرتا رہا
جو میرے زمانے میں ایک غیر شریفانہ فعل تھا
کیونکہ میں ادیان کی مخالفت کرتا رہا
کیونکہ میں استبداد کے خلاف لڑتا رہا
یا کسی اور ایسی ہی وجہ کے سبب

۳:

کیونکہ میں انسانوں کے حق میں تھا اور
ان کو ہر دوسری شے پر ترجیح دیتا رہا اور اس طرح ان کی تعظیم کرتا رہا
کیونکہ میں شعر کہتا رہا اور زبان کی وسعت کا سبب بنا
کیونکہ میں مستحسن طرزِ عمل کی تلقین کرتا رہا

یاکسی اور ایسی ہی وجہ کے سبب

۴ :

اس وجہ سے میرا خیال تھا کہ
میرے نام کا تذکرہ ہوگا اور ایک پتھر پر
میرا نام کندہ ہوگا اور کتابوں میں سے
نئی کتابوں میں میرا نام نقل کیا جاتا رہے گا

۵ :

مگر آج
مَیں اس بات سے متفق ہوں کہ اسے بھلا دیا جائے
آخر کیوں
تنورچی کے بارے میں پوچھا جائے جبکہ کافی روٹی موجود ہو
کس لیے
برف کی تعریف کی جائے جو پگھل چکی ہو
اور نئی برف گرنے والی ہو
کس وجہ سے
ماضی موجود رہے جبکہ
مستقبل آنے والا ہو

۶ :

آخر کیوں
میرا نام لیا جائے

شمیم حنفی
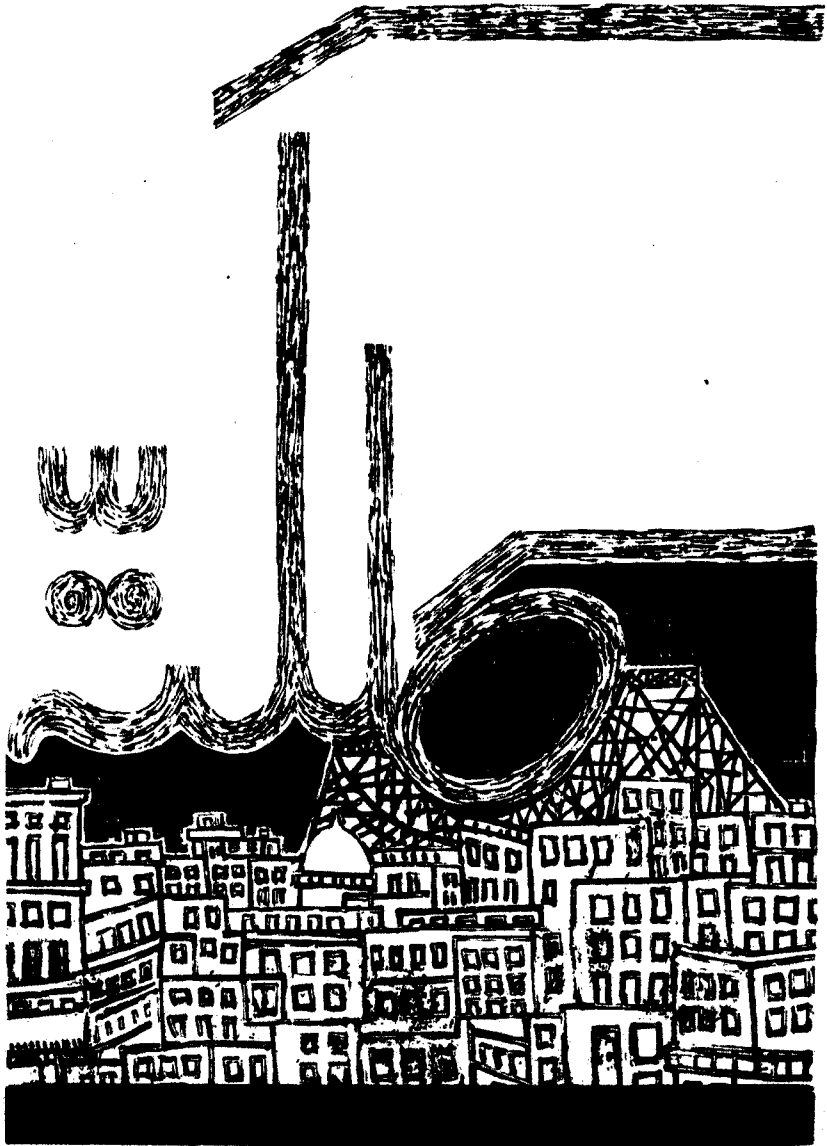
اے پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ
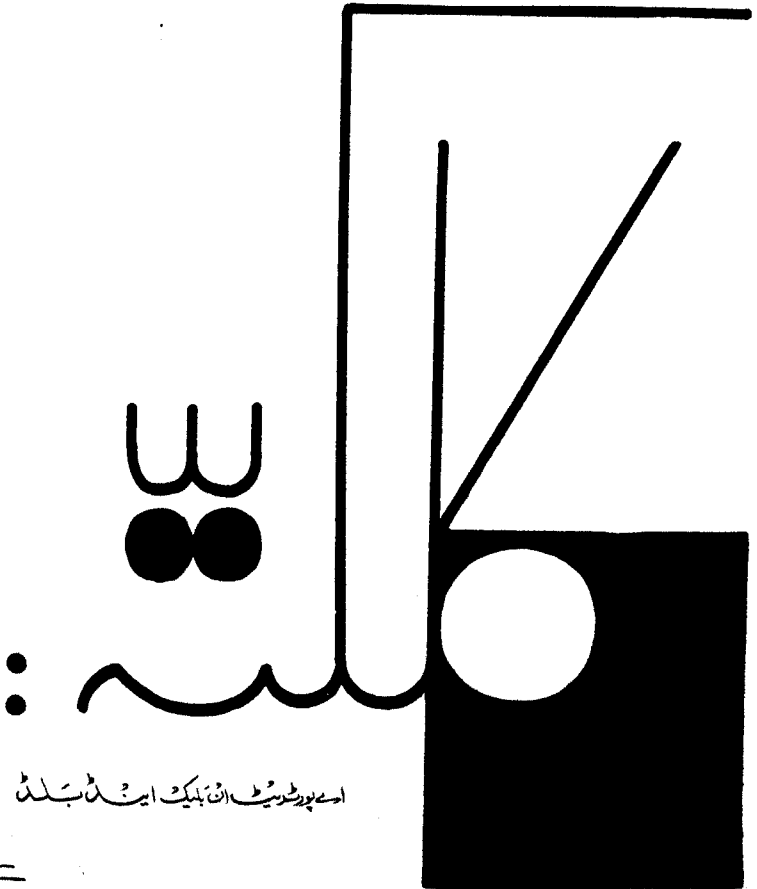
کتابوں میں لکھا ہے : جس دن بھگوان شیو کی پتنی کالی نے پران تیاگے، شیو کی آتما دکھ سے نڈھال بھی ہوئی اور جلتی جھلستی جوالا سمان کرودھ اور اُتیجنا سے لال بھی۔ کاندھے پر کالی کی بے جان کایا سنبھالے، وشولوک کے چاروں اور شیو کا چکر پھرے۔ سمے جیسے جیسے بیتتا جاتا تھا ناچ کی گت تیز ہوتی جاتی تھی۔ اور دناش کے اس نرتیہ کی گت کے ساتھ ساتھ کرودھ کی جوالا نرنتر اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔ تب دیوتاؤں کو دھیان آیا —— بھگوان شیو کے کاندھوں پر کالی کی کایا اگر اسی طرح رکھی رہی تو سنسار ان کے کرودھ کی اگنی میں بھسم ہو جائے گا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تب وشنو بھگوان نے کٹار اٹھائی اور پوری شکتی کے ساتھ اسے کالی کی کایا کی اور اچھال دیا۔ پھر وہ کایا باون ٹکڑوں میں بٹی اور یہ ٹکڑے ساری دھرتی پر جہاں تہاں بکھر گئے۔ بنگلہ بھومی کی ایک مہان ندی کے کناروں پر کالی کے دائیں پیر کی ایڑی گری۔ شردھا بھکتوں نے اس استھان کو پوتر جانا اور وہاں کالی کے مندر کی استھاپنا کی۔ سو دھرتی کا وہ ٹکڑا کالی کتہ کہلایا اور سارے جگت میں اپنی مہما کا شنکھ بجایا ——

کالا چکیلا بدن، غصیلی آنکھیں، لہو میں ڈوبی پھنکارتی جیبھ، گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا اور ہار کی طرح لپٹے ہوئے سانپ، چار ہاتھوں میں سے ایک میں ننگی تلوار، ایک اور ہاتھ میں کٹا ہوا انسانی سر، لہو کی بوندیں ٹپکاتا، بھگوان شیو کے شریر پر ایک پیر سے کھڑی وہ ناچتی رہتی ہے۔ کالی —— سب سے عظیم، سب سے بے کنار اور مہیب اور زفا در مطلق رات جس کی اندھی گپھا میں سب کچھ ڈوب جاتا ہے۔

کلکتہ : خوف اور دہشت اور اندھیرے اور اُتیجنا کا شہر۔ فضا کی بلندیوں سے نیچے دیکھو تو دور دور تک ہریالی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں گہری، سیاہی مائل، کہیں پیلاہٹ لیے ہوئے۔ لیکن یہ سارا رنگ نمو اور اظہار کے لیے مضطرب ایک

ان دیکھی توانائی کا استعارہ ہے۔ پھر انہی ہریالیوں میں یہاں وہاں چمکتا، چونکتا، کوندتا ہوا پانی۔ جھیلیں، آب رود اور ندیاں اور ایک طرف حدِ نظر تک پھیلی ہوئی نقرئی چادر۔ ایک ننھا سا نقطہ اس لینڈ اسکیپ میں دھیرے دھیرے پھیلتا جاتا ہے اور ایک شہر کی تصویر اُبھرتی ہے۔ کُتّے کے پیر جیسی ہیئت رکھنے والی چوڑی بھوری ندی کے گرد بسا ہوا شہر، ساحلوں پر لنگر انداز دخانی کشتیاں اور جہاز، قوی الجثہ کرین، ملوں کی چمنیاں اور کارخانوں کی زنگ آلود آہنی چھتیں۔ پھر ذرا اور نیچے آنے پر تاڑ کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف اس جھنڈ سے اُبھرتا ہوا برٹش راج کی یادوں میں بسے ہوئے پرانے کلیسا کا سفید دم بخود مینار، دوسری طرف بیل گاڑی پر بھاری بوجھ لادے، بیلوں کو ٹھونگے لگاتا کالی کلوٹی جلد والا مزدور۔ یہ شہر تضادات کا ہے اور انوکھے متصادم تجربوں کا۔ روشن روشن سڑکیں اور اندھی گلیاں۔ کہیں دولت کی ریل پیل اور تعیش کی عریانی، کہیں افلاس، نکبت، بیماری اور بھوک۔ عقاید اور توہمات کے طلسمی محل اور نوکِ سناں کی طرح سینے میں اترتی ہوئی جھگیاں۔ ایک طرف کشادہ اور وسیع میدان ہے جو تقریر اور تفریح کے شوقین چہروں کی چھلکتی ہوئی بھیڑ سے بھر جانے کے بعد اور وسیع نظر آتا ہے، دوسری طرف ڈربوں جیسی کھولیوں میں خشک ایندھن جیسے بے رونق جسموں کے انبار، جہاں اجالا ہے نہ ہوا۔ آرزومندیوں نے کسی اور کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی ہے۔

ہگلی ندی کے کنارے بیس میل کے طول میں بسا ہوا مہانگر، اسّی لاکھ سے اوپر آبادی جس کے جواب میں صرف ٹوکیو، لندن، اور نیویارک کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن کلکتہ کے دل میں ان سے کہیں زیادہ بھید چھپے ہوئے ہیں اور آنکھوں میں ان سے کہیں زیادہ وحشتیں آباد ہیں۔ یہاں لاکھوں کھلے آسمان کے نیچے عمریں گذار دیتے ہیں، فٹ پاتھ پر پیدا ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بچّے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ یہاں غربت ایسے رنگ روپ ساتھ لے کر آتی ہے کہ بہتیرے اس نظارے کی تاب نہیں لا سکتے۔ یہاں تشدد ہے، دہشت ہے اور انتشار۔ دوسری طرف تنظیم ہے، دھیما پن ہے اور گھر کی چوکھٹ پر اس پرانی مٹی کی مہک جس سے دوسرے بڑے شہر، یہاں تک کہ صدیوں کے تجربات میں نہائی ہوئی دلّی بھی خالی ہوتی جارہی ہے۔ کلکتہ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور شعور کی جاگرتی کا سب سے بڑا مرکز۔

ایسا نہ ہوتا تو کلکتہ کے مورخ اس سے اتنے ہراساں نہ ہوتے۔ مہانگر کے اپنے باسیوں کو چھوڑ کر بیشتر نے کلکتہ کا ذکر یا تو ڈر میں ڈوبے لفظوں میں کیا ہے یا حقارت، نفرت اور بے اعتمادی کی زبان میں۔ برٹش راج کے ایک سرکاری وقایع نویس، سرجارج ٹریولین نے ۱۸۶۳ء میں یہ لکھا کہ کلکتے سے زیادہ بیزار کن بستی چار دانگ عالم میں اور کوئی نہیں۔ اسے فطرت نے جتنا برا اور غیر صحت مند بنا دیا ہے اس پر کوئی اضافہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ کپلنگ نے اسے خوفناک اور ڈراؤنی راتوں کا شہر کہا تھا۔ نواب کلائیو کے خیال میں یہ کائنات کی سب سے شریر بستی تھی، لیکن اسی نسل کے ایک نمائندے ولیم ہنٹر نے ایک رات اپنی منگیتر کو جو محبت نامہ بھیجا اس میں یہ لفظ بھی شامل تھے:

> تصور کرو ان تمام چیزوں کا جو فطرت میں سب سے شاندار ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام عناصر کا جو تعمیر کے فن میں سب سے زیادہ حسین ہوتے ہیں، پھر تم اپنے آپ کلکتہ کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ لوگی۔

——— اور انیسویں صدی کے دوسرے سرے پر چرچل نے اپنی ماں سے کہا تھا ——— کلکتے کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ

خوش ہوگی کیونکہ اسے ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ یہ ایک عظیم شہر ہے اور رات کی ٹھنڈی ہوا اور سرمئی دھند میں یہ لندن جیسا دکھائی دیتا ہے۔

کلکتہ اور لندن کی مماثلت کا کچھ ایسا ہی نقش مغل اشرافیت کے سب سے شائستہ ترجمان غالب کے ذہن میں بھی اُبھرا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں، جب برٹش راج کے قیام کی تیاریاں کمپنی کے فرزندوں نے تقریباً مکمل کر دی تھیں اور مغل حکمراں کے اقتدار اور قرونِ وسطیٰ کے تمدن کی بساط سمٹتی جا رہی تھی، غالب ۱۸۲۶ء کے ماہ نومبر یا دسمبر میں دلی سے روانہ ہوئے اور ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہونچے۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے سامنے انھیں اپنا پنشن کا مقدمہ پیش کرنا تھا۔

> کلکتے میں لوگوں نے ان کی بہت خاطر مدارات کی اور ان کو کامیابی کی اُمید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ ان کے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملے گا۔ کول بروک صاحب جو اس وقت دلی میں رزیڈنٹ تھے، انھوں نے دلی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے۔ مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔
>
> ——— یادگارِ غالب

اس ناکامی سے قطع نظر سفر میں بھی غالب نے بہت رنج کھینچے تھے۔ دریائی سفر کا شوق تھا مگر اس پر خرچ بہت اٹھتا، سو گھوڑے پر بہت سا راستہ طے کیا۔ کلکتہ پہونچے تو شملہ بازار میں دس روپے ماہانہ پر مکان ایک ستھرا، کشادہ اور آرام دہ مل گیا۔ آب و ہوا طبیعت کو موافق تھی۔ شہر آباد، بازار بارونق۔ ملک ملک کے سامان سے دوکانیں بھری ہوئی۔ انگریزوں کے فضائل و محاسن سے اس حد تک شناسا ہوئے کہ اس قوم کے طور طریقوں، ایجادات و اختراعات، اسلوبِ حیات اور اس کی عورتوں کے رنگ روپ سب کے گرویدہ ہو گئے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

——— پھر اسی دیار میں غالب نے سب سے پہلے بھاپ سے چلنے والا انجن، بغیر روغن کے روشن ہونے والے برقی چراغ، پرندوں کی

صورت اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ جانے والے حرفوں کا طلسم اور زخمے کا سہارا لیے بغیر بجنے والا مشینی باجہ، غرضکہ بھانت بھانت کی نادرہ کاریاں دیکھیں اور مسرور ہوئے۔ پس جب نئی عقلیت کے سب سے معروف مسلمان مفسر سرسید نے آئینِ اکبری کا ترجمہ کیا اور غالب سے اس پر تقریظ کی فرمائش کی تو مغل رئیس زادے نے تعمیل تو کر دی لیکن یہ مشورہ بھی دیا کہ میاں ہر زمانہ اپنا آئین اپنے ساتھ لاتا ہے اور پرانے آئین کو از کار رفتہ ٹھہراتا ہے۔ ذرا لندن کی سمت نظر کرو تو پتہ چلے گا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

پھر کلکتے میں ان دنوں شعر و شاعری کا چرچا بھی بہت تھا۔ مدرسۂ عالیہ اور فورٹ ولیم جیسے ادارے تھے جہاں مشرقی علوم اور زبانوں کی ترقی اور سرپرستی کے سامان مہیا تھے۔ دلّی والے میر امن بھی اردو زبان کے انگریز مربیوں کی سخاوت کا شہرہ سن کر غالب سے برسوں پہلے کلکتے گئے تھے:

> صاحبانِ والا شان نجیبوں کے قدردان کو خدا سلامت رکھے۔ اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصّے کو ہزار جد و کد سے اردوئے معلّی کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا اب امید وار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا غنچۂ دل مانند گل کے کھلے . . . جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا، اور دس پانچ پشتیں اس شہر میں گزریں، اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہو گی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہونچا ہے۔
>
> ——— باغ و بہار

لیکن سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ آدمی چاہے جتنا آگے جائے بیتے دنوں اور تجربوں کی پرچھائیں اُس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سو میر امن نے لفظوں کا جو باغ لگایا اس کی جڑوں میں مہک شہر دلّی کے کوچہ و بازار کی تھی اور غالب نے کلکتے میں جو دو برس گزارے ان پر چھوٹ اسی تمدن کی پڑ رہی تھی جسے وہ آئینِ گوشتہ سمجھ رہے تھے۔ شعر و سخن کی محفلیں جمتیں۔ زبان دانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ غالب کا "ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی" والا قطعہ کلکتے ہی کے زمانۂ قیام کی یادگار ہے۔

> تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے؛ اونھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی، بہت پاکیزہ اور بے ریشہ، اپنے کفِ دست پر رکھ مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہہ کر اون کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اون سے لی۔
>
> ——— مکتوب غالب بنام میرزا حاتم علی مہر

ایسا لگتا ہے کہ کیا پنشن کا مقدمہ اور کیا سائنسی کرشمے اور جدتیں، سب کچھ بھول بھال کر غالب مزاج سے مناسبت رکھنے والے

مشغلوں میں ڈوب گئے۔ کمپنی کے مدرسے میں ایک بزمِ سخن قائم ہوئی تھی جہاں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا۔ غالب بھی ان میں شریک ہوتے اور اپنا شعر سناتے۔ حاسدوں نے سوچا کہ ایک دلی نژاد پردیسی ساری داد لوٹے لے رہا ہے۔ سو معترض ہوئے اور زبان و بیان کی غلطیاں نکالیں۔ غالب مسافر تھے اور محتاج مگر معاملہ زبان دانی کا آپڑا تھا پس الجھ گئے۔ خوب معرکہ چھڑا۔ تنگ آکر ایک فارسی مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف نظم کی اور اہلِ کلکتہ کی نا مہربانی اور بے مروتی کے شاکی ہوئے :

اے کلکتے کے سخن پرورو اور زبان آورو!
رسمِ دنیا ہے کہ دوستوں کے کام بناتے ہیں
مہمان کو نوازتے ہیں
پردیسیوں پر ستم کب روا ہے
اگر رحم نہیں کرتے، نہ کرو،
لیکن یہ ستم، کیا معنی؟

○

انوکھا اتفاق ہے کہ اُردو کے سب سے بڑے شاعر کے سفرِ کلکتہ کے ٹھیک پندرہ برس بعد فرانس کا ایک آوارہ مزاج شاعر بھی لمبے، جاں گداز فاصلوں کو عبور کرتا ہوا کلکتہ پہونچا۔ غالب کا سفر ایک مادی ضرورت کا نتیجہ تھا۔ بودلیئر کے سفر کی غایت نفسیاتی تھی۔ چھ برس کی عمر میں اس کے باپ کی موت اور ماں کی دوسری شادی اس کے لیے ایک جذباتی مسئلہ بن گئی۔ اس کی آوارہ گردی اور عنفوانِ شباب کی بے راہ روی، پھر پیرس کے تھیٹروں، قہوہ خانوں اور قمار خانوں کی تخریب آلود زندگی سے تنگ آکر اس کے گھر والوں نے سوچا کہ اسے دور مشرق کی پُر اسرار بستیوں میں بھیج دیا جائے۔ غالب کے لیے کلکتے کے کینوس پر مادی کمال کے مظاہر سے شناسائی ایک نیا تجربہ تھی، پس وہ اس سے مسحور بھی ہوئے، مرعوب بھی۔ بودلیئر مادی کمال میں نہاں زوال کا رمز آشنا بھی تھا اور اس کا شکار بھی، پس مشرق کی پُر اسرار سرزمین کے ایک شہر میں اس کی آمد اس کے لیے ایک دوسری قسم کا تجربہ بن گئی :

یہاں اس کا قیام ایک سال سے کچھ کم عرصے کے لیے ہی رہا۔ ایک تو ویسے ہی کچی عمر میں ایسے دور دراز کے سفر سے عین ممکن تھا کہ اس کی طبیعت میں ایک تبدیلی رونما ہوتی۔ دوسرے اس کے کلام سے، نیز اس کی عملی زندگی سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے خام اور نابالغ ذہن پر سانولے سلونے سحرِ بنگالہ نے ایک خاص اثر کیا۔ کالی کے مندر کو بھی اس نے دیکھا ہوگا۔ اور دیو مالا کے اس افسانے میں اذیت پرستی کا جو فلسفہ پنہاں ہے اس کی پراسرار اور مسحور کن ہیبت نے اس کے دل میں صدیوں کی دبی ہوئی وحشی انسان کی طبعی تحریکوں کو از سرِ نو ایک اچھوتے انداز میں بیدار کر دیا ہوگا . . .

○

بودلیئر کے لیے جنسی تعیش کوئی نئی چیز نہ تھی۔ لیکن نئے ماحول میں نسائی دلکشی اسے

ایک اچھوتے رنگ میں دکھائی دی۔ کالی دیوی اور اس کے افسانوں کے متعلقات میں
اسے کون سی دلچسپی محسوس ہوئی؟ سانولے سلونے حسن میں اسے کیا دلکشی دکھائی دی؟
اس کا واضح جواب تو نہیں دیا جا سکتا البتہ اندازے اور اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔

—— مشرق و مغرب کے نغمے

اور اب بودلیئر کی ایک نظم کے چند مصرعے جو میراجی کی میرا سین کا ایک عکس لرزاں بھی ہے:

اس کی ہر بات کالے رنگ کی ہے۔ وہ تو روح شبانہ دکھائی دیتی ہے،
روح تیرگی۔ اس کی آنکھیں گپھائیں ہیں جن کی گہرائی [illegible] اسرار درخشاں ہیں۔
لیکن ان آنکھوں کی نگاہیں بجلی کی طرح ہیں، ایک چمکارا جو رات کے پردے
کو چیر دے۔
وہ ایک مہر آبنوسی ہے، ایک نجم سیاہ! اور اس کے باوجود نور و مسرت
کی کرنیں اس میں سے پھوٹ رہی ہیں، بلکہ وہ ایک ایسے چاند کی طرح ہے جس نے
اسے اپنا لیا ہے۔
اس کے ننھے سے سر میں ایک آہنی قوتِ ارادی پنہاں ہے اور ایک تشنگی شکار
کی۔ پھر بھی اس کے وحشی چہرے میں، جہاں گپھاؤں جیسے نتھنے طلسمی سانسیں
لے رہے ہیں، سرخ و سفید اور پیارا شیریں دہن رنگ سے دمک رہا ہے،
یوں —— جیسے جوالامکھی کے کنارے پر کسی پھول کی شوبھا!

—— ترجمہ: میراجی

دو

کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔
سرل نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور کلکتے کا تصور کرنا چاہا جہاں وہ بالآخر اب پہنچنے والا
تھا۔ محلات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔
بنگالے کا سحر انگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ مانجھی اپنی زبان میں
گا رہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

—— آگ کا دریا

جاب چارناک نے جس روز ہگلی کے مشرقی کناروں پر اپنے خیمے استادہ کیے اور کلکتے کا خواب نامہ ترتیب دیا (اور کچھ عرصے بعد اس خواب کی تکمیل کے لیے ایک ہندوستانی عورت بیاہ لی) اس سے اکیاسی برس پہلے ہنری ہڈسن کے ہاتھوں نیویارک کی تاریخ کا حرف آغاز لکھا جا چکا تھا۔ موٹریال نصف صدی پہلے بسایا جا چکا تھا۔ اس طرح کلکتہ دنیا کے سب سے کم عمر شہروں میں سے ایک، ساتھ ہی انسان کی سب سے پرانی تہذیبوں میں سے ایک کا آئینہ خانہ بھی ہے، قدیم و جدید کا سنگم۔ اور اس سنگم میں پانی کی وہ اندیکھی دھارا جو سرسوتی کی طرح اپنا وجود رکھتی ہے ہر نگاہ سے اوجھل ہے گذرے ہوئے کل اور آج کے ساتھ آنے والے کل کا اشاریہ ہے، بظاہر معدوم لیکن دل کی مثال دھڑکتی ہوئی۔ یہی ہے کلکتہ کا تیسرا البعد۔ ایک کچی کہانی کا تیسرا باب جو حرف حرف ہوا کی تختی پر لکھا ہوا ہے۔ کہانی کا یہ صفحہ آنے والی فصلیں پڑھیں گی۔

جاب چارناک کی آمد ۱۶۵۵ء میں ہوئی۔ ۱۶۶۳ء میں جب وہ پٹنے میں ایک کارخانے کا نگراں تھا ایک روز گھومتا پھرتا اس جگہ جا پہونچا جہاں ایک چتا روشن تھی۔ اور ایک خوبرو عورت میریا جسے رشتے داروں نے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جانے کا حکم دیا تھا اچانک آنکھوں کے راستے چارناک کے دل میں اتر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دہکتی ہوئی آگ میں جست لگاتی چارناک نے جھپٹ کر اسے سنبھال لیا۔ پھر وہ اسے ہگلی لے گیا اور ساتھ ساتھ دونوں زندگی کا سفر طے کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ میریا کی وفات کے بعد ہر سال چارناک اس کی قبر پر ایک مرغ کی قربانی دیتا تھا۔

کپتان الیکزینڈر ہیملٹن سے روایت ہے کہ ستی کے شعلوں سے ایک خوبرو جوان عورت کی جان بچانے والا رحم دل جاب چارناک کسی ریاستی حکمراں سے زیادہ مطلق العنان تھا۔ جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھتا تو اس کے حکم سے ڈائننگ روم کے باہر مقامی باشندوں کو تنفر بچا کوڑے لگائے جاتے تاکہ وہ ان کی دہشت زدہ چیخیں سنتا رہے اور محظوظ ہوتا رہے۔

"سور ہاھے کیا بوڑھا کتا۔" سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا ——

مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

"یہ بڑے ذلیل لوگ ھیں، جب تک ھنٹر نہ لگاؤ ان میں چستی نہیں آتی" پیٹر نے کہا۔

سرل نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی۔

"او آدمی —— کیا نام ھے تمھارا ——"

"ابوالمونشور —— صاحب ——"

"ابوالمونشور —— اگر تم چاھتے ھو کہ اس ھنٹر سے تمھاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ —— سمجھے۔"

"جی صاحب۔" وہ پھر پتوار پر جھک گیا۔

—— آگ کا دریا

کچھ معنوں میں کلکتہ کی کہانی ہندوستان کی کہانی ہے بلکہ تیسری دنیا کی ایک مختصر تصویر۔ یہ تصویر ہمیں بتاتی ہے کہ سامراج کیوں اور کیسے وجود میں آتے ہیں اور جب ہوا کے ایک سرکش جھونکے کے ساتھ یہ ماضی کی دھند میں کھو جاتے ہیں تو کیا ہوتا

ہے؟ کلکتہ کی کہانی صنعتی انقلاب کی کہانی ہے۔ تیسری دنیا کے ان باشندوں کی کہانی جو نجات کے پرانے نسخوں کو آزمانے کے بعد اب ایک نئے یقین کی جوت جگا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کلکتہ حواس پر ضربیں لگانے والا شہر ہے۔ پہلے اس کے ایک سرے پر واہموں کا طلسم آباد تھا، دوسرے سرے پر سر دسچائیاں اور کتنوں ہی کے لیے ان دو منطقوں کے بیچ کا علاقہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اس No Man's Land کی مانند تھا جس پر کسی کا اختیار نہ تھا، جس کا نہ کوئی خدا تھا، نہ حاکم۔ یہ انتہاؤں کا شہر ہے۔ سب سے پہلے اسی شہر نے صنعتی ترقی اور ایک نئی فکر کے عناصر اپنے لہو میں جذب کیے۔ اور سب سے پہلے اسی شہر میں انقلاب اور بغاوت کی چنگاریاں روشن ہوئیں۔ اُن دنوں جب برٹش راج کی عظمت کا آفتاب سروں پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اس کی دھوپ میں چھپی تیرگی کے نشان سب سے پہلے کلکتہ نے دریافت کیے۔ انگلش مین، بنگال ہرکارو، کلکتہ ریویو، ہندو پیٹریاٹ، فرینڈس آف انڈیا، ایک نئے انقلابی شعور کے پہلے نقیب تھے۔ احتجاج اور انکار کی ہر لہر بنگال کی سنہری دھرتی سے اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کالی کو دیوتاؤں نے اس لیے جنم دیا تھا کہ وہ تباہی کی تمام طاقتوں کا سر کچل دے۔ برٹش راج اس طاقت کا سب سے سیاہ سرچشمہ تھا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ نے اعلان کیا کہ بنگالی اخبارات راج کے خلاف نفرت اور غصے کا فساد پھیلا رہے ہیں سو انھیں اس جسارت کی سزا دی جائے۔ سماچار درشن کو چھاپا کر دیا گیا۔ بنگال ہرکارو پر مقدمہ چلایا گیا۔ بنگالی ادیبوں نے گمنام طریقوں سے انقلاب کی یہ شمع روشن رکھی کہ جب معاملہ اصولوں کی پیکار تک پہنچ جائے تو آدمی آدمی نہیں رہ جاتا، عقیدہ اور خواب بن جاتا ہے۔ دین بندھو مترا نے اپنے ڈرامے نیل درپن کی اشاعت اس طرح کی کہ اس کے لفظوں میں ان کے اپنے چہرے کی جگہ بنگال کی ساری دھرتی کا تپا ہوا چہرہ جھانک رہا تھا۔ کلکتے میں رام نارائن تار اکانتا کے ڈرامے کلین کلا سر دسو کا اسٹیج ہونا تھا کہ بیرک پور کی فوجوں میں بغاوت کا زہر پھیلنے لگا۔

کہانی کا یہ صفحہ بھی اسی شہر سے منسوب ہے جس نے فورٹ ولیم کالج، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ہندو کالج، مدرسہ عالیہ جیسے اداروں کو ایک نئی روشنی کا علمبردار سمجھ کر سینے سے لگایا تھا۔ جہاں سر ولیم جونس، ڈیوڈ ہیر اور راجہ رام موہن رائے شانہ بشانہ تعمیر کے ایک نئے منصوبے کے ساتھ ایک پس ماندہ ملک کی قیادت کے کارنامے انجام دے چکے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں (۱۸۱۳ء) جب برطانوی پارلیمان کے توسط سے کمپنی بہادر نے ہندوستانی علم و ادب کی ترقی کے لیے ایک لاکھ روپے کا گراں قدر عطیہ دیا اس وقت سب سے پہلے رام موہن رائے ہی نے یہ شکایت کی تھی کہ:

> ہمیں پوری امید تھی کہ یہ روپیہ ہندوستانیوں کو مختلف علوم جدیدہ سے روشناس کرانے کے لیے ذہین اور قابل یوروپین اساتذہ پر خرچ کیا جائے گا۔ . . لیکن اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہندو پنڈتوں کی نگرانی میں ایک سنسکرت مدرسے کے قیام کے سلسلے میں کمپنی یہ روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ . .
>
> سبھی جانتے ہیں کہ اس زبان نے صدیوں تک ہندوستانیوں کے لیے صحیح علم کے حصول کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔

——— بحوالہ پرسیول گرفتھس: ماڈرن انڈیا

اس واقعے کے کوئی چھپن برس بعد مسلمانوں میں جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے ترجمان سر سید احمد خاں نے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے نام لندن سے بھیجے گئے ایک خط (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء) میں یہ لکھا تھا کہ :

> ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو بد اخلاقی کا ملزم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی میں اس الزام سے ان کو بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہ تھے بلکہ در حقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔ میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں در حقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو . . .

دوسری طرف، انگریز قوم کے ایک فرزند (پرسیول اسپیر : Twilight of the Mughuls) کو دکھ تھا کہ قومی حکومت کے خاتمے کے بعد ہندوستانی سماج میں تعلیم کا مطلب بس انگریزی زبان میں ذرا سی شُد بد پیدا کر لینا اور مغربی طرزِ زندگی کی اندھی تقلید رہ گیا ہے۔

اور اودھ کے آخری تاجدار جانِ عالم پیا واجد علی شاہ کلکتے کے مٹیا برج میں بیٹھے حزنِ اختر لکھ رہے تھے :

دلِ زار ہرگز سنبھلتا نہیں
وہ کوہِ گراں ہے کہ ٹلتا نہیں
ہر اک سمت پھیرا ہر اک سمت یاس
رفیق و ملازم میں خوف و ہراس
کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کج کلاہ
اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ
ملازم کبھی تھے مرے سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
ہوئے قید اس طرح ہم بے گناہ
اسیروں میں ہوں نام ہے بادشاہ

روایت ہے (جیوفری موڑہاؤس : Calcutta) کہ نیا بنگال آندولن کا ہیرو ہنری لوئی ویوین ڈی روزیو جو ایک انگریزی فرم کے کسی افسر کا بیٹا تھا اور جس نے کلکتے کے پرائیویٹ انگلش اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ رابرٹ برنس، فرانسیسی انقلاب اور انگریزی ریڈیکلزم سے سخت متاثر تھا۔ وہ شعر کہتا تھا اور ایک نظم میں نویرینو کے مقام پر یونانیوں کی جدوجہد آزادی میں کامیابی

کا اس نے پُرجوش انداز میں خیر مقدم کیا تھا۔ اس کی ادارت میں بنگالی اخبارات شایع ہوتے تھے اور اس وقت جب وہ بہت نوعمر تھا ہندو کالج میں اعلیٰ درجات کو درس دیتا تھا۔ اس کے مقلدوں میں بیشتر اعلیٰ ذات کے ہندو لڑکے تھے، انگریزی رنگ میں رنگے ہوئے۔ اس نے ان سب کو دہریہ بنا دیا۔ پس یہ افواہ ان دنوں کلکتے کے اعلیٰ سماجی حلقوں میں بہت گرم تھی کہ ہندو کالج کے طلبا پرارتھنا کے وقت مقدس صحیفوں کے بجائے الیڈ کے اقتباسات پڑھتے تھے اور ایک روز ایک لڑکے سے جب کالی کی شبیہہ کے سامنے سر جھکانے کو کہا گیا تو اس کی زبان سے بس یہ لفظ نکلے —— گڈ مارننگ! مادام!

... اُنیسویں صدی کے اواخر کا کلکتہ بے حد موڈرن شہر تھا جس میں اَن گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پریس اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہند و تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ راجہ سُریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سوامی وویکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں ویدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ مُلک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی۔ مگر نواب علی رضا بہادر (واجد علی شاہ کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں) کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سوشل تعلقات مُرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنؤ اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنؤ میں یہ لوگ کلکتے والے نواب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انہیں لکھنؤ والے کہا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے۔ کلکتہ، پٹنہ عظیم آباد اور لکھنؤ۔ اس سے آگے کی دُنیا کی انہیں خبر نہیں تھی۔ اُن کا سارا وقت لکھنؤ، دِلّی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔ وثیقے کی آمدنی کی وجہ سے بے فکری سے گذر ہوتی تھی۔ سر پر برطانیہ کا سایہ سلامت تھا۔ راوی چین لکھتا تھا۔

—— آگ کا دریا

تین

اکتوبر ۱۹۰۵ء میں برٹش راج نے فیصلہ کیا کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک جانا بوجھا ڈر اس فیصلہ کی اساس تھا۔ سو بٹوارہ ہوا۔ مشرقی بنگال میں آسام کو ملا دیا گیا۔ مغربی حصّے میں بہار، چھوٹا ناگپور اور اُڑیسہ کے باشندے جوں کے

توں جڑے رہے۔ اب مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ مغربی بنگال میں کلکتے کی غالب آبادی ہندو بنگالیوں پر مشتمل تھی، لیکن وہ بہاریوں، اڑیا باسیوں اور دوسرے مہاجروں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان میں اشتراک کی بنیاد اگر کچھ تھی تو مذہب۔ جب کہ مشرقی بنگال کے باسی مذہبی امتیاز کے علاوہ اپنے رویوں، مزاج و طبیعت اور اسلوب زیست کے اعتبار سے کم و بیش ایک جیسے تھے۔ بٹوارے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونچی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل بھدر لوک اپنے ایک بہت بڑے حصے سے کٹ کر رہ گیا۔ کلکتہ کے بھدر لوک سے زیادہ برٹش راج کو ڈرانے والی سچائی اور کچھ نہ تھی۔ اس تقسیم کا مقصد تھا ایک مہیب اور توانا سچائی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر کمزور کر دینا۔

لیکن نتیجہ راج کی توقع کے برعکس نکلا۔ بٹوارے نے انقلاب کی جس چنگاری کو ہوا دی تھی وہ دھیرے دھیرے شعلہ بن گئی۔

بٹوارے کی شام کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک عام سبھا ہوئی۔ یہ اعلان کیا گیا کہ انگریزی اشیا کا مکمل بائیکاٹ ہوگا۔ سودیشی تحریک زور پکڑتی گئی۔ نئے اسکول کھولے گئے جن میں ایک نئے قومی شعور کی اشاعت کو بنیادی نصب العین کی حیثیت حاصل تھی۔ اب تعلیم کے نصاب میں جسمانی تربیت کے سبق بھی شامل کر لیے گئے۔ بنگلا اخبارات کھل کر راج کی تنقید کرنے لگے۔ اخباروں کی تعداد اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا۔

پھر تشدد کی لہر جاگی۔ کلکتے کے طول و عرض میں جگہ جگہ بم بنانے کے خفیہ مراکز قائم ہوگئے۔ چھوٹے چھوٹے منظم جتھوں میں نوجوان لڑکے لڑکیاں چھپ چھپا کر نکلتے اور آزادی کا یہ نیا حربہ استعمال کرتے۔ مغربی دنیا کے اخبارات میں ان کے حوصلہ کو سراہا جانے لگا۔ یہ گرفتار ہوتے اور سر جھکائے بغیر سزا قبول کر لیتے۔ ان پر اور ان سے تعاون کرنے والے عام انسانوں پر راج کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ اخباروں پر روک لگا دی گئی۔ ان کے مدیروں اور ناشروں کو جیل خانوں میں ڈال دیا گیا۔ آئے دن سیکیورٹی افسر کلکتہ یونیورسٹی یا طلبا کے خفیہ مراکز پر چھاپے مارتے۔

برٹش راج کو اپنی اس بھیانک بھول کا کچھ اندازہ پرنس آف ویلز کے دورے (۱۹۰۵-۶ء) کے وقت ہوا۔ اس سے پہلے برطانوی اقتدار کے محافظوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ معاملہ اس حد تک بگڑ چکا ہے۔ انھیں توقع تھی کہ پرنس بنفس نفیس جب اپنی رعایا کے سامنے جائیں گے تو سارا غصہ اور اضطراب ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

... کلکتے کے صدر بازار کے فٹ پاتھ پر وہ ایک گھنٹے سے کھڑے تھے۔ بازار میں مکمل ہڑتال تھی لیکن تماشائیوں کا پتلا ہجوم بند دکانوں کے آگے آگے گھوم رہا تھا۔ بازار کے بیچوں بیچ رستہ صاف تھا اور دو رویہ غیر ملکی اور مقامی پولیس کے آدمی کھڑے تھے۔ سڑک پر انگریز فوجی اور پولیس افسر موٹر سائیکلوں پر گھوم رہے تھے۔ پرنس آف ویلز کا جلوس گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ ہو چکا تھا...

... اچانک شہزادے نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دیکھتا رہا۔ پھر وہ ذرا سا گورنر کی طرف جھکا۔ گورنر نے بھی اسی سمت میں دیکھا اور اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی، پھر سامنے دیکھا۔ سرو کے مصنوعی درختوں سے بنے ہوئے تقریبی گیٹ پر برقی روشنی سے لکھے ہوئے یہ الفاظ بار بار نظا ہر اور

غائب ہو رہے تھے :

"Tell your Mother, we are unhappy."

. . . اچانک پرنس کے برابر والی گلی سے چند لوگوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ ان کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیٹوں پر بڑے بڑے بورڈ باندھ رکھے تھے جن پر لکھا تھا :

"Tell your Mother, we are hungry ."

. . . نعیم عذرا کو تھام کر واپس چلنے لگا۔ عذرا کا سر ابھی تک اس کے کندھے پر ٹِکا ہوا تھا۔ الٹے لٹکتے ہوئے بورڈوں کے نیچے نیچے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے، وہ چلتے گئے۔

—— اُداس نسلیں

پرنس بہت دل برداشتہ ہوئے۔ امپیریل کونسل میں وائسرائے کے ہوم ممبر جان جنکنس نے مشورہ دیا : تختِ شاہی کو دلی منتقل کر دیا جائے۔ کلکتہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کے حوصلے اسی طرح پست ہوں گے۔ دلی بہت محفوظ ہے۔ پرانے وقتوں میں وہیں پانڈووں اور کوروں میں ایک لمبی جنگ چھڑی تھی۔ مغلوں نے اسی دیار میں بیٹھے بیٹھے سارے ہندوستان پر حکومت کی۔ کلکتہ کی فضا میں تشدد ہے۔

پس تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دلی دربار کے انتظامات کیے جانے لگے۔ سب کچھ بہت خاموشی سے، بہت خفیہ طریقے سے طے کیا گیا۔ بس مٹھی بھر لوگوں کو معلوم تھا کہ اقتدار کا مرکز تبدیل ہونے والا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء کی اس صبح کو ملکہ نے چار ہزار ایک سو انچاس ہیروں سے مزین تاج پہن رکھا تھا۔ سامنے زرق برق لباسوں میں بیس ہزار افراد پر مشتمل انگریز اور ہندوستانی فوجیوں کے دستے تھے۔ اور پچاس ہزار راجے مہاراجے۔ یہ دلی دربار کا جشن تھا۔ اور جب بادشاہ جارج نے اعلان کیا —— "ہم اپنی رعایا کو یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت کا احساس کرتے ہیں کہ ہم نے حکومتِ ہندوستان کا مرکز، کلکتے سے ہندوستان کی قدیم راجدھانی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے" —— تو چند لمحوں کے لیے مجمع پر پتھریلی خاموشی طاری رہی۔ پھر دیر تک تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔

اس روز کلکتہ میدان میں پانچ ہزار فوجیوں نے ایک شاندار پریڈ کا مظاہرہ کیا۔

تشدد پسند نوجوانوں نے جو غیر آئینی طریقوں میں پختہ یقین رکھتے تھے، ایک مختصر وقفے کے لیے اپنی سرگرمیاں بند کر دیں۔ ان کے چہروں پر تشکر کی چمک تھی۔

لیکن تاجروں اور کارخانہ داروں کی صفوں میں بے اطمینانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب کلکتہ ویران ہو جائے گا۔ دلی اشیاء کی تقسیم کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اب سارا مال بمبئی اور کراچی کی منڈیوں میں پہنچنے لگے گا۔ ہم نے جما جما بہت سا کاروبار پھیلا لیا تھا اور اتنی عمارتیں کھڑی کر لی تھیں، اب ان کا کیا ہوگا؟ بڑے تاجروں اور کارخانہ داروں میں اکثریت انگریزوں کی تھی۔

مقامی اخبارات میں ہفتوں اس واقعے پر بحث جاری رہی۔ کئی اخبارات انگریز سرمایہ داروں کے مفاد کی نمائندگی کرتے تھے اور حالات کی اس اچانک کروٹ پر حواس باختہ تھے۔ اسٹیٹس مین نے لکھا : "وائس رائے اور ان کی کونسل نے یہ فیصلہ صوبے کے ایک بھی ممتاز فرد کی صلاح کے بغیر چپ چپاتے کر لیا۔ اور اب وہ متوقع ہے کہ اس فیصلے سے جن لوگوں کی توہین

ہوئی ہے وہی اسے کھلے دل سے قبول کرلیں گے!"
بہرحال، یہ واقعہ محکوم پسماندہ انسانوں کے سامنے عظیم الشان برٹش راج کی ہزیمت کا پہلا اشاریہ تھا، ایک اختتام کا آغاز، صرف کلکتے کی انگریز برادری کے لیے نہیں بلکہ ساری اجنبی حکمراں قوم کے لیے۔ لندن کی محفلوں میں لوگ سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے اس واقعے کا ذکر کرتے اور جب انھیں خیال آیا کہ جس روز پایۂ تخت کلکتے سے ہٹایا جانے والا ہے وہ دن تو April Fool's Day ہوگا تو بہتوں کے چہرے پر ایک خشک، بے جان مسکراہٹ پھیل گئی۔

فضا بارود کی بو سے بوجھل ہے۔
مہابیدھ کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ ۱۹۴۳ء۔ سر پر سوکھا بے ابر آسمان۔ قدموں کے نیچے چٹختی، ٹوٹتی، جھلستی بے آب زمین۔ یا سیلاب، طوفان اور مکمل تباہی۔ کلکتہ اجتماعی موت کو کئی نام دیتا ہے۔ سیلاب، سائکلون، سوکھا۔

اکال آیا، مُہیب، ہولناک، لڑکھڑاتا ہوا، لفظ بیان سے عاجز ہیں۔ مالابار میں، بیجاپور میں، اڑیسہ میں، اور ان سب سے زیادہ بنگال کے زرخیز اور مالدار صوبے میں، غذا کی قلت کے سبب مرد اور عورتیں اور ننھے بچے ہر روز ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہوئے۔ کلکتہ کے محلوں کے سامنے وہ اچانک گرتے اور مر جاتے، بنگال کے ان گنت گاؤں میں، کچی مٹی کے جھونپڑوں میں، دیہی علاقوں کی سڑکیں اور کھیت ان کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ ساری دنیا میں لوگ مر رہے تھے یا جنگوں میں ایک دوسرے کی جان لے رہے تھے؛ عموماً ایک فوری موت، اکثر ایک بہادرانہ موت، موت کسی مقصد کی خاطر، ایک بامعنی موت، موت جو ہماری دیوانی دنیا میں واقعات کی ایک بے رحمانہ منطق دکھائی دیتی تھی، زندگی کا اچانک خاتمہ جسے ہم نہ تو موڑ سکتے تھے نہ اس پر ہمارا قابو تھا۔ موت ہر طرف خاصی عام تھی۔
لیکن یہاں موت کا کوئی مفہوم نہ تھا، کوئی منطق نہ تھی، نہ کوئی ضرورت؛ یہ انسان کی نااہلی اور شقاوت کا نتیجہ تھی، انسانی ہاتھوں کا کارنامہ، ایک سست رو، رینگتی ہوئی دہشت ناک چیز جس سے نجات کا کوئی راستہ نہ تھا، زندگی موت میں گم ہوتی ہوئی، مدغم ہوتی ہوئی، ویران آنکھوں اور پژمردہ جسموں سے موت جھانکتی ہوئی جبکہ ابھی پل بھر کے لیے زندگی ان میں ٹھیری ہوئی ہوتی۔ . .

——— ڈسکوری آف انڈیا

کلکتہ اور اس کے نواحی علاقوں میں ان دنوں بھی اکال پڑا تھا جب انگلستان کے کارخانے سونا اگل رہے تھے۔ انھیں ایندھن چاہیے تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے اکال بھی انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تھے۔ ۱۷۷۰ء اور ۱۸۷۰ء میں اکال کے بعد مہاماری بھی پھیلی تھی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ بشریات کے ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۳ء کے اکال نے بنگال میں کم سے کم چونتیس لاکھ جانیں لیں۔ اور جب کلکتہ کے اسٹیٹس مین نے کلکتہ کی سڑکوں پر مرنے والی فاقہ کش عورتوں اور بچوں کی ڈراؤنی تصویریں پیش کیں تو ایک سرکاری نمائندے نے یوں تبصرہ کیا کہ حالات کو ڈرامایا جا رہا ہے۔

کلکتہ کی سڑکیں اور گلیاں تو لاشوں سے ڈھک گئی تھیں اور دوسری طرف اونچے طبقے کے دس ہزار انسان اپنی تفریحات میں مگن تھے۔ رقص، دعوتیں، شور شرابہ اور قہقہے۔ غذا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے گاڑیاں کمیاب تھیں۔ ریس کے میدانوں میں گھوڑ دوڑ کا تماشہ اسی طرح جاری تھا اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے ملک کے دور دراز علاقوں سے ریل کے مخصوص ویگنوں میں لائے جاتے تھے۔ کلکتہ کی دو دنیاؤں کا تضاد اس سے پہلے کبھی اتنا کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ ان دونوں دنیاؤں میں طبعی فاصلے نہ تھے، لیکن یہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں۔

بنگال میں اب تک سات بار اکال آچکا تھا۔ ۱۷۷۰ء کے اکال نے اس کی ایک تہائی آبادی کا صفایا کر دیا تھا۔ بنگال کے گاؤں، قریے، بستیاں ویران ہوتی جاتی تھیں، گلی کوچوں میں خاک اڑ رہی تھی اور ادھر انگلستان میں شہر بس رہے تھے۔ صنعتی انقلاب کے شور میں برٹش راج کی ایک دور افتادہ مملکت کا سارا درد گم ہو گیا۔ فاصلوں کے باوجود واقعات میں کیسے انوکھے ان دیکھے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اپریل ۱۹۴۳ء میں سڑک پر پڑی ہوئی ایک لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے معدے میں صرف گھاس تھی۔

بھوک کی ہیبت کا یہ حال تھا کہ مذہبی امتناعات بھی نظر انداز کر دیے گئے۔ کٹر ہندو، جو عام حالات میں غیر ذات کے کسی شخص کے ہاتھ سے پانی کا ایک پیالہ بھی قبول نہ کرتا، مسلمانوں کے ہاتھ سے کھانا وصول کر رہا تھا، مسلمان ہندوؤں سے غذا لے لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ والدین بچوں کا بیوپار کرنے لگے۔ کھلنا کی ایک عورت نے اپنی بیٹی پندرہ روپے کے بدلے بیچ دی۔ بردوان میں ایک تین سالہ بچی کا مول کل پانچ روپے لگے۔ مالدہ میں بھوگردی منڈل نے اپنے اکلوتے بیٹے مظفر، عمر تین سال، کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیا کہ وہ اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا اور اس کے خاندان نے ہفتہ بھر سے غذا کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ ایک بوڑھا مچھیرا اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ جب بھوکے کتے اس پر جھپٹے تو وہ اپنی مدافعت بھی نہ کر سکا۔

ادھر لندن کے ہاؤس آف کامنس میں راج کی عزت و عظمت کا ایک محافظ حاضرین کو یہ اطلاع دے رہا تھا کہ ہندوستان میں اس وقت اناج کی کوئی کمی نہیں۔ گیہوں کی فصل شاندار ہوئی ہے۔ مسئلہ، جو کچھ بھی ہے، تقسیم کے نظام میں خرابی کے سبب ہے۔"

ٹیگور نے یہ صورت حال رونما ہونے سے صرف تین سال پہلے اپنے آپ سے پوچھا تھا: یہ لوگ کیسا بھیانک ہندوستان، کیسی ہولناک بے بسی اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گے، جس دن ان کے اقتدار کا سوتا خشک ہوگا، ان کے پیچھے صرف کیچڑ اور غلاظت باقی رہ جائے گی ——— !

لندن کے ہاؤس آف کامنس میں راج کی عزت و عظمت کے اس محافظ کا یہ کہنا کہ سارا فساد تقسیم کے نظام میں خرابی کا ہے سچائی کا ایک پہلو بھی رکھتا ہے!

دولت کی تقسیم، سہولتوں کی تقسیم، مواقع اور مفادات کی تقسیم، دکھ، الجھن اور آشوب کی تقسیم، دھوپ اور سائے کی تقسیم، اجالے کی تقسیم، اندھیرے کی تقسیم، فطرت کی عطا کردہ خیرات اور مقدرات کی تقسیم ——— غرضکہ زندگی اور وجود کی

دائرہ در دائرہ سچائیوں کا کون سا نظام ہے جس میں گرفتار نہیں!

شہر! تو اس دریا کے کنارے اپنے گندے پاؤں پسارے لیٹا ہے
غلیظ، بدکار، بے رحم!
میں تیری دیوانہ کن خواہشوں سے بیزار ہوں
شہر! لوگ کہتے ہیں کہ تو بدکار ہے ———
اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سرِ شام تیری رنگے چہرے والی عورتیں
لڑکھڑاتے جوانوں کو نگل جاتی ہیں
شہر! تو اپنے گندے لباس کب اتارے گا؟
شہر! لوگ کہتے ہیں کہ تو بے رحم ہے!
رات گئے، جب تیرے دانش ور رکشے لیے خودکشی کرنے جاتے ہیں
——— تو خاموش رہتا ہے
شہر! لوگ کہتے ہیں، مرنے کے بعد میری ہڈیوں سے بٹن بنائیں گے
شہر! تیرے مکانوں کی دیواروں پر کیسی تحریریں ہیں؟
شہر! میں نے مہینوں سے اخبار نہیں پڑھا۔

——— عین رشید

میرے سامنے تصویروں کی ایک کتاب ہے۔ (جوزف لیلی ولڈ : CALCUTTA) رگھوبیر سنگھ نے کیمرے کی آنکھ سے شہر کو دیکھا ہے، شہر کے اندر چھپے ہوئے شہر کو۔ یہ تصویر خبر نامے نہیں، روزمرہ کی جانی بوجھی، چکھی برتی سچائیاں ہیں۔

پہلی تصویر : شام کی دھند میں ڈوبا ہوا شہر۔ اونچی اونچی قوی ہیکل عمارتوں کی قطاریں۔ ان کی چھتوں کے بیک گراؤنڈ سے جھانکتا ہوڑہ پل۔ اوپر کھلے آسمان میں ایک اکیلا پرندہ۔ نیچے سڑکوں پر موٹریں، آٹو رکشہ، وین، ٹیکسیاں اور ان سے بچتے بچاتے شطرنج کی بساط کے پیدل۔ بھیڑ۔ لگتا ہے کسی ان دیکھی قوت نے دھرتی کو بھینچ کر اس کے معدے میں چھپی ہوئی ساری غلاظت ایک مصروف سڑک پر انڈیل دی ہے۔

دوسری تصویر : شیام بازار کی دیواریں، ستون، چھجے ہندی اور بنگالی فلموں کے چمکدار پوسٹروں میں چھپ گئے ہیں۔ نیم برہنہ، خوش صحت اور لذت آمیز نسائی ہیولے۔ رنگ روشن ہیں اور ان رنگوں کے ہجوم میں گھوڑے پر سوار سبھاش چندر بوس کا مجسمہ، کالا، پرچھائیں صورت، سنجیدہ، اس کے پس منظر سے جھانکتے ہوئے پوسٹر میں سرخ و سفید فلمی اداکارہ کا ہنستا ہوا چہرہ۔

تیسری تصویر : ایک طرف کالی کی شبیہہ ہے، کالی جو بدی اور شر کے چراغوں کو نگل جانے والی اتھاہ رات ہے۔ ——— دوسری طرف کوڑے کے ڈھیر اور ان کے درمیان جھگیوں میں رہنے بسنے والے بچے اور نوجوان جو اسی ڈھیر سے رزق پاتے ہیں، پلاسٹک کی ٹوٹی ہوئی چپلیں، خالی ڈبے، خالی بوتلیں۔ اور کبھی کبھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی۔ تصویر میں کالی کی آنکھیں جھکی ہوئی

ہیں۔ چہرہ جذبات سے یکسر عاری ہے۔

چوتھی تصویر : فٹ پاتھ کے شہزادے۔ بچے، مرد، گہری نیند میں غرق۔ سونے والوں سے کتراتے، سر پر چھوٹے لادے تین پھیری والے۔ ایک بچہ جاگ کر اٹھ بیٹھا ہے اور نیم غنودگی کے عالم میں، بہت متین اور اپنے آپ میں گم بیٹھا ہے۔ تھوڑی دور پر ایک کتا بیٹھا ہوا ہے، اسی کی طرح خاموش اور سرنگوں۔

پانچویں تصویر : مدر ٹریسا ہوم، سرخ تکیوں اور ستھرے بستروں پر آرام کرتے ہوئے بچے جوان اور بوڑھے۔ کسی ویٹنگ روم سے مماثل منظر۔ اگلی ٹرین کے انتظار میں۔ آگے شاید موت ہو۔ لیکن کم سے کم باعزت تو ہوگی۔

ذرا اس تصویر کے ساتھ جیوفری مورہاؤس کی کتاب (CALCUTTA) کی چند سطریں :

> مدر ٹریسا، سکڑی ہوئی، گول چہرے والی، ننھی سی عورت، گہری بھوری آنکھیں اس طرح پرسوز انداز میں جھپکتی ہوئی جن سے اس راسخیت اور قوتِ ارادی کا ذرہ برابر اظہار نہیں ہوتا جن کے بغیر کسی بھی مذہب کے بانی نے کبھی زندگی نہیں گزاری۔ کلکتے کے لگ بھگ چالیس ہزار کوڑھیوں کی تنہا قوت۔ مدر ٹریسا اور اس کا نرمل ہردے اور نرمل ہردے کی سسٹرز گندی بستیوں، سڑکوں، گلیوں میں مرنے والے بھکاریوں، کوڑھیوں، فاقہ کش انسانوں کا سب سے بڑا سائبان ہیں۔

کالی کے سب سے مقدس مندر کے سامنے سے دن رات مدر ٹریسا اور ان کی سسٹرز نیلی کناری کی سفید ساریوں میں ملبوس، پیدل یا گاڑیوں پر گزرتی رہتی ہیں، ذلیل اور بے سہارا زندگی کی کگر سے لٹکے ہووں کو کم از کم ایک باعزت موت کی سرحدوں تک پہنچانے کے لیے۔ لیکن تصویروں والی اس کتاب کے ایک صفحے پر جس میں فریم کی ہوئی تصویریں بیچنے والی ایک دوکان کا منظر ہے، دیوار پر کالی اور اندرا گاندھی اور وویکانند اور ٹیگور اور چھتے جیسے بالوں والے سائیں بابا کی شبیہیں آویزاں ہیں، مدر ٹریسا کی کوئی شبیہ نہیں کہ مدر ٹریسا سامان آرایش کی فہرست میں کوئی مقام نہیں رکھتی۔

آخری تصویر : اور یہ تصویر رنگوں سے نہیں روشنائی سے بنائی گئی اور لفظ کی لکیروں میں اس لمحے کو مقید کیا گیا جب کلکتہ کے آسمانوں میں جنگی طیارے پرواز کر رہے تھے اور مشرقی بنگال خالی ہو رہا تھا کہ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا جھلسے ہوئے مکانوں، شکستہ پلوں، ٹینکوں اور توپوں کی گرج، رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گولیوں کی سنسناہٹ کے سوا۔ مہاجروں کے قافلے سونار بنگلہ کی حالیہ تاریخ کے سب سے ہولناک تجربوں کا گٹھر اٹھائے جوق در جوق کلکتہ کی جانب امڈ رہے تھے :

> . . . پھر میں تنہا تھا اور بلیک آوٹ کی تاریکی سے نجات پانے والا شہر، رینگتے ہوئے بوڑھے عفریت کی صورت جنگل کی آغوش میں کروٹیں لے رہا تھا۔ ہوڑہ کی جانب کے صنعتی علاقے اور مزدوروں کی بستیاں، ٹھٹھرے ہوئے نم دیدہ مکانوں کی دیواریں گندے پانیوں کے جوہڑ ـــــ ماؤ کے اقوال، پارٹی کا نشان، سوشل ڈیموکریٹس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کارٹون ـــــ پرانی دیواروں کا نیا رنگ ـــــ جاں کنی کے سانس کی طرح

سرکتی ہوئی موٹریں ——— پارک سرکل کی فلک بوس عمارتوں کے مقابل پھیلے ہوئے میدان، چوراہوں پر پولیس کے خوف زدہ سپاہی اور سپاہیوں کی حفاظت کرنے والے دوسرے مسلح سپاہی ——— آزمائش اور کشاکش کے خوف سے سی آر پی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگیاں . . . خاردار تاروں اور فاصلے قائم کرنے والی منڈیروں سے محفوظ کیا ہوا، عدم تشدد کے بانی مہاتما گاندھی کا تشدد آزمودہ اسپیچ۔ چورنگی، سیالدہ، پارک پور، علی پور، مٹیا برج اور بے شمار محلے ——— شاہراہیں کسی اچانک ہونے والے حادثے کا خوف ——— اور گزرے ہوئے دنوں کے ہنگاموں کا فضا میں پھیلا ہوا ذائقہ ——— ! سب کچھ میرے ساتھ چلتا رہا . . .

——— محمود ہاشمی، اوڈیتاز

چار

[کچھ لفظ جو مُور ہاؤس اور جوزف لیلی ولڈ سے ماخوذ ہیں :]

میں کلکتہ کے ایک پرانے سفر میں ایک پولیس آفیسر سے اس کے ضلع میں انقلابی دہشت پسندی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ گفتگو پراسرار طریقے سے ولیم میک پیس تھیکرے پر جا پڑی جو کلکتہ ہی میں پیدا ہوا تھا۔ پولیس آفیسر یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرا تھیکرے کا پسندیدہ ناول کون سا ہے۔ میں نے جب یہ اعتراف کیا کہ میں نے صرف Vanity Fair پڑھ رکھا ہے اس نے اصرار کیا کہ Henry Esmond بھی حاصل کروں۔ میں اب بھی یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ انگریزی دنیا میں کسی پولیس اسٹیشن پر اس قسم کا مشورہ کلکتہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے!

——— جوزف لیلی ولڈ

——— یہ شہر حواس سے زیادہ ذہن پر حملہ آور ہوتا ہے اور اس کے اثرات نادیدہ جراثیم کی صورت دوسروں کے وجود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اب سے نصف صدی پہلے یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا کہ "آج کلکتہ جو کچھ سوچتا ہے، کل وہی کچھ سارا ہندوستان سوچے گا۔"

پتہ نہیں یہ محض خوش گمانی ہے یا مستقبل کی دھند میں لپٹی ہوئی کوئی ناگزیر سچائی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کلکتہ ذہنی اعتبار سے دنیا کا شاید سب سے مستعد شہر ہے۔ کپلنگ نے بہت پہلے کہا تھا ——— اس شہر میں افلاس اور غرور ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ غرور نتیجہ ہے ایک گہرے شعور اور اجتماعی ذمے داری کے احساس کا۔ جوزف لیلی ولڈ نے ایک اور تجربے

کا ذکر کیا ہے :

> کلکتے میں بھکاریوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ بھیک مانگنا یہاں ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔۔ تنہا بھکاری جسے میں نے مسلسل انعام سے نوازا ہے ادھیڑ عمر کا ایک مرد ہے۔ ایک ہاتھ سے محروم، سر پر باریک ترشے ہوئے سفیدی مائل بال، دانت پان چھالیہ سے لال، گرینڈ ہوٹل کے سامنے وہ ٹیکسی کا دروازہ کھولتا بند کرتا ہے اور انعام پاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے زمانے میں ایک روز ٹیکسی میں بیٹھتے وقت میں نے پوچھا —— "تم نے ووٹ دیا؟" اس کا جواب تھا —— "ہاں صاحب! کام پر آنے سے پہلے میں ووٹ ڈال آیا تھا" اس روز میں نے اسے سماج کے ایک رکن، ایک شہری کی حیثیت سے پہچانا۔

اور افلاس اور غرور کے ساتھ ساتھ کلکتہ ہندوستان کا سب سے دولت مند شہر بھی ہے، ہر چند کہ یہ دولت مندی اس کے وجود سے وابستہ بھانت بھانت کی الجھنوں کے سبب اب دم توڑ رہی ہے۔ دہشت کی آسیبی فضا میں وہ رات کبھی بھی آسکتی ہے جب گندی بستیوں اور فٹ پاتھوں سے فاقہ زدہ انسانوں کی بھیڑ اٹھ کھڑی ہو اور خوش حال طبقے کے لیے قہر بن جائے۔ یہ طبقہ چند ہزار افراد پر مشتمل ہے جب کہ فاقہ کشوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ "مفلس پرچھائیاں چپ چاپ اپنی تاریکیوں سے نمودار ہوں گی اور خوش حال انسانوں کو ان کی کاروں سے باہر گھسیٹ نکالیں گی۔ اور جب تک وہ لوگ اپنی دفاع کی صورتیں مہیا کریں مفلس پرچھائیاں اپنی تعداد کی کثرت کے سبب انھیں زیر کرلیں گی۔ اس ڈراؤنے خواب کا سگنل وہ رکشہ بان دیں گے جنھوں نے کلکتے میں خوش حال انسانوں کو کھینچنے میں جانوروں جیسی زندگیاں گزار دیں۔ ۔ " کچھ لفظ جو لینن سے منسوب کیے جاتے ہیں یوں ہیں کہ "عالمی انقلاب کا راستہ پیکنگ، شنگھائی اور کلکتے سے ہو کر جاتا ہے۔"

کلکتہ ہندوستان کی پہلی ریاستی راجدھانی ہے جہاں ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے بعد چودہ سیاسی جماعتوں کی ملی جلی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ مغربی بنگال کے وزرا کی حفاظت کے لیے اب پولیس درکار نہ ہوگی۔ وزیر اعلیٰ کی تنخواہ گیارہ سو پچاس روپے ماہانہ سے گھٹا کر سات سو کر دی گئی اور عام وزیروں کی تنخواہیں نو سو روپیوں سے کم کر کے پانچ سو روپے ماہانہ مقرر کر دی گئیں۔ اعلان نامے میں یہ بھی کہا گیا کہ گورنمنٹ سکریٹریٹ کے دفاتر میں اب ایرکنڈیشننگ جیسی عیاشیوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ [لو سے ہر سال سینکڑوں موتیں ہوتی ہیں] حکومت کا بار سنبھالنے کے بعد ہی کلکتہ میدان کے ایک عام جلسے میں ایک اٹھارہ نکاتی پروگرام پیش کیا گیا تھا جس میں کسانوں کی بدحالی، زمینی اصلاحات، تعلیمی ڈھانچے میں سدھار اور ترقی اور آزادی کی طاقتوں کو پابندیوں سے رہا کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی تھی

عوام کے انقلابی موڈ کا اظہار کسانوں اور بے زمین مزدوروں کے علاوہ کارخانوں کے ملازمین اور صنعتی مزدوروں کی سرگرمیوں سے بھی ہوتا ہے لیکن سوال شاید اتنے سہل نہیں ہوتے جتنی آسانی سے ان کے جواب سوچ لیے جاتے ہیں۔

شہر کی دیواریں نعروں سے ڈھک گئی ہیں، ایک بے رحم انقلاب کی بشارت کے ساتھ۔

"بنگال کے بیٹو! نیند سے جاگو اور دہاڑو شیر کی طرح!" اس نعرے کے ساتھ ہی ہلکے نیلے رنگ میں ماؤ کا ایک پورٹریٹ

لگا ہوا ہے۔ سُرخ پرچم کے پیچھے جلوس دکھائی دیتے ہیں، ہاتھوں میں لاٹھیاں، بھالے، تیر اور کمان سنبھالے۔ "ماؤزے تنگ زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا جلوس کسی گودام کے سامنے رُکتا ہے اور اناج کا ہر دانہ لُوٹ لیتا ہے۔ یہ نکسل باڑی کا عقبی پردہ ہے۔

نکسل باڑی مغربی بنگال کی ایک تنگ پٹی میں واقع ایک پولیس ڈسٹرکٹ ہے، ایک طرف نیپال، دوسری طرف بنگلہ دیش۔ چین اور تبت کا فاصلہ وہاں سے صرف اسّی میل ہے۔ یہاں چائے کے باغات ہیں اور جنگل اور پہاڑیاں، گوریلا لڑائی کے لیے ساری سہولتیں موجود۔ اس کی تقریباً ساری آبادی قبائلی افراد پر مشتمل ہے۔ انھیں کھاد کا ایک ریزہ بھی نہیں ملا کہ اس پر چائے کے باغات کا قبضہ ہے۔ ان کی محنت سے جو اناج پیدا ہوتا ہے اس کا تناسب مغربی بنگال کی کل پیداوار کا ایک تہائی حصّہ ہے۔ یہ مسلح جدوجہد کے ترجمان ہیں جن کے نزدیک مزاحمت صرف بندوق کے ذریعہ ممکن ہے ——— "محنت کش طبقے کو اسلحے اکٹھا کرنے دو اور اس جدوجہد کا حفاظتی دستہ بننے دو!"

"میں نے کچھ دردناک کہانیاں سنی ہیں" ایک اُدھیڑ عمر کے مارکسی نے کہا جسے نکسلیوں کی عام گرفتاری کے زمانے میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اسے جس کوٹھری میں ڈالا گیا اس میں شمالی بنگال کے کسی گاؤں کا ایک پندرہ سالہ لڑکا بھی تھا، خوش شکل۔ "میں نے اپنے بیٹے کی طرح اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ جب کبھی مجھے کسی سے ٹافیاں اور بسکٹ وصول ہوتے، میں اسے دے دیتا۔ ایک رات میں نے اس سے پوچھا کہ عوامی جنگ میں اس کا کیا رول رہا ہے؟ لڑکے نے بتایا کہ ایک روز جوت داروں کا تختہ پلٹنے سے متعلق کسی پُرجوش نعرے سے متاثر ہو کر وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک معمّر جوت دار (زمیندار) کے پاس گیا جس نے ان سب سے دوستی کر رکھی تھی۔ پھر اس لڑکے اور اس کے ساتھیوں نے بوڑھے کو مرغ کی طرح ذبح کر ڈالا کہ یہ ان کے نزدیک یہی انقلاب تھا۔ اس کی لاش پر نکسلائٹ نعرے کندہ کیے اور اس کے لہو میں اپنے ہاتھ دھوئے۔ میں نے پوچھا: "اس کا سوشلزم سے کیا تعلق ہے؟ تم عوامی جنگ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" لڑکے کو اس کی ابجد کا بھی پتہ نہ تھا۔

——— جوزف لیلی ولڈ : کلکتہ

کلکتہ یونیورسٹی اسناد کی تقسیم کے معاملے میں دُنیا کی سب سے بڑی فیکٹری کہی جاتی ہے۔ دُنیا کے سب سے سرکش طالب علم بھی یہیں ملتے ہیں۔ دُنیا میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا سب سے بڑا بازار بھی اسی کے نواح میں ہے۔ لگ بھگ آدھے میل کی دوری تک کالج اسٹریٹ کی دوکانیں کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ آس پاس کی درجن بھر سڑکوں پر بھی کتابوں کے اسٹال ہیں، فٹ پاتھوں پر کتابوں کے ڈھیر۔

دُنیا کے کسی بھی علاقے میں انسانی معاشرہ کسی اضطراب سے دوچار ہو کلکتہ کا دل ضرور دھڑکتا ہے، شعور کی آزادی اور جاگرتی کے سب سے پُرجوش محافظوں کا شہر! آندرے مالرو نے جب فرانس کے ثقافتی امور کی وزیر کی حیثیت سے دنیا کے

پرانی فلموں کے سب سے بڑے آرکائیوز لا سینما تھیکیو کے سکریٹری جنرل ہنری لانگ لوئی کی مدت ملازمت کے خاتمے کی دھمکی دی تو بنگال کے دانشوروں نے کلکتہ کی سڑکوں پر زبردست مظاہرہ کیا۔ ویت نام کی جنگ کے زمانۂ عروج کا ایک معروف نعرہ تھا:
امار نام، تومار نام، ویت نام!
وہ سڑک جس پر امریکی قونصل خانہ واقع ہے، کلکتہ کارپوریشن نے اس کا نام ہیرنگٹن اسٹریٹ سے بدل کر ہوچی منہ اسٹریٹ رکھ دیا ہے!

دانش وروں، فن کاروں، شاعروں، قہوہ خانوں اور لٹل میگزینوں کا شہر!
نمائشیں، سنگیت سبھائیں، مذاکرے، گوشٹھیاں۔ آئے دن جریدے شایع ہوتے ہیں اور اسی رفتار سے بند بھی ہو جاتے ہیں۔
ستیہ جیت رے کی ایک فلم کا ایک رومانی نوجوان کردار کہتا ہے:

"میں کلکتے سے باہر ایک پل بھی نہ رہ سکا!"
"کیا مطلب؟" اس کا بھائی پوچھتا ہے۔
"یہاں زندگی ہے! باقی ساری جگہیں مردہ ہیں!"

کلکتہ میدان جس کی وسعت اور شادابی کے سبب کچھ لوگ اسے شہر کے پھیپھڑوں سے تعبیر کرتے ہیں کہ گھنی بستیوں کے جنگل میں ہوا کے جھونکے یہیں آزادانہ سفر کرتے ہیں ——— ہفتے کی شاموں کو آواں گارد شاعروں، برہم نوجوانوں اور نفی و انکار کو حرفِ اقرار کی صورت پلکوں میں سجائے ہوئے فن کاروں کی ٹولیاں میدان کے مختلف گوشوں میں جمی دکھائی دیتی ہیں ——— Alienation، کمٹ منٹ، پروٹسٹ، روز پرانے بت ٹوٹتے ہیں اور نئے ڈھالے جاتے ہیں۔ بیس بیس، تیس تیس کی ٹکڑیوں میں، کوئی اپنی تازہ نظم سنا رہا ہے، کہیں کوئی نئی دُھن سنائی جا رہی ہے۔ کہیں کسی نئے برش ورک پر لمبی گفتگو جاری ہے ———
اور جب گنس برگ نے کلکتے کا سفر کیا تھا، نیم تلہ شمشان گھاٹ پر چتا کے جلنے کا منظر اس کے حواس کا آسیب بن گیا تھا۔ اس نے کئی مہینے بھوکی پیڑھی کے شاعروں کی صحبت میں گزارے اور جب یہاں سے واپس اپنے ملک کو گیا تو اسے یاد آیا کہ ایک ہی حلقے کے شاعر بھی کلکتے کے قہوہ خانوں، سڑکوں پر ایک دوسرے سے لڑتے پھرتے ہیں، سو ملے رائے چودھری کے نام اس کے ایک خط میں یہ جملہ بھی آیا کہ "کوئی تو ایسی بنیاد ہو جس پر تم سب ایک دوسرے کا تحفظ کر سکو! اس وقت یہ اکیلی بنیاد ادبی اظہار کی آزادی کا مسئلہ ہے۔"
لیکن اظہار کی اس آزادی کے استعمال نے ایک شاعر کو عدالت کے دروازے تک پہنچا دیا۔ ہنگری جنریشن کا ایک شمارہ البرٹ ہال، کالج اسٹریٹ، کلکتہ کے کافی ہاؤس میں تقسیم ہوا، سوالات زیرِ بحث آئے، ملے رائے چودھری نے اپنی ایک نظم پڑھی۔ اور عدالت نے فیصلہ کیا کہ نظم فحش ہے۔ قہوہ خانے جیسی جگہ پر، جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں جمع ہوتے ہوں، جن کے ذہن بہت جلد بیرونی اثر قبول کر لیتے ہیں" اس قسم کی فحش نظم پڑھنا فحاشی کو ہوا دینا ہے اور ادب وہی ہے جو اعلیٰ اقدار کی اشاعت اور ترجمانی

کا قرض ادا کرے۔

اَب ایسے لفظ نہیں رہ گئے جنہیں ہم ادب میں استعمال نہ کرسکیں،
نہ ایسے مناظر ہیں جنہیں ہم بیان نہ کرسکیں۔
ہندوستانی سماج جہاں فلموں میں بوسہ لینا ممنوع ہے اور جہاں جنسی اعضا
کے ذکر پر پابندی ہے، اس کی تحقیر یا اس پہ ہنسنا حماقت ہوگی۔ تمہارے سامنے
ایک طویل، مشکل مرحلہ ہے۔

[ہالرڈ میکارتھ کا خط طلے رائے چودھری کے نام
واشنگٹن: مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۶۵ء]

ابھی کلکتہ کے سامنے کئی مرحلے ہیں، ایک لمبا جاں گداز سفر، مسائل کا ایک سلسلہ کہ کلکتہ کی کہانی پورے ہندوستان
کی کہانی ہے، یا مختصر لفظوں میں میری دُنیا کی کہانی۔

——— اَن گِنت روشن، رُوح فرسا سوالات کا شہر!
——— کُچھ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ ہی اُن کا جواب بھی ہے ———!

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔
سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے
پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت
کرسکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کرکے اس کی ذات میں فنا ہوسکے۔
مرگھٹ۔ یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور کالی جو ذہن اور گویائی
سے ماورا ساری کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ جو شونیہ کو پورن بناتی ہے۔
پورن جو روشنی اور سکون ہے۔
کالی جس کا لباس سماوی ہے۔ وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔
مایا سے بلند تر ہے۔ کیونکہ خود مایا بن کر دُنیا کی تخلیق کرتی ہے۔
مرگھٹ میں کالی شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

——— آگ کا دریا

شہر دلی: بستی جامعہ نگر:
ذات: آخری پہر:
۲۷/۲۸ مئی ۱۹۷۸ء

شمیم حنفی

۱۳ نظمیں

نیلیندر ناتھ چکرورتی : کلکتہ تمہارے لیے

نریندر ناتھ چکرورتی : کیمپن گارڈن

ارون بھٹاچاریہ : کلکتہ ۱۹۷۱ء

لوک ناتھ بھٹاچاریہ : کلکتہ میں اب بھی بہار آتی ہے

سرت کمار مکھوپادھیائے : آدھی رات گئی، گھر واپس آؤ

پورنیندو پاتری : تشدد کے سایوں سے

آلوک سرکار : چھتری

ترن سانیال : تعطیل کا دن

شنکر چٹوپادھیائے : اسپتال کا سبزہ زار

شکتی چٹوپادھیائے : اس بدبختی سرزمین پر کچھ بھی ہو سکتا ہے

سنیل گنگوپادھیائے : کلکتہ نگری اور میں

موہت چٹوپادھیائے : تابوت پر پہنا چاند

بونک رے : کلکتہ سے

سمریندر سین گپتا : ایس ایم ایف ۷۹

تاراپد رائے : کلکتہ تمہیں یاد ہے؟

پوان بیند وداس گپتا : کلکتہ کے لیے چار سطریں

پوان بیند وداس گپتا : کم از کم کہیں تو

اتل کمار باسو : ۶ بج کر ۳۰ منٹ، صبح

نانی بھوشن آچاریہ : مرتی ہوئی ہیسوا

رتنیشور ہازرا : کلکتہ

دیباتوش باسو : کارمنصبی کی آزادی

تشار رائے : کلکتہ، ایک

تشار رائے : کلکتہ، دو

سنتانو داس : بہت سی سیاحتوں کے بعد، میں کلکتہ پہنچا ہوں

تلسی مکھوپادھیائے : میں سوچتا ہوں

مرنال باسو چودھری : کلکتہ

پروسجیت چودھری : کلکتہ تم مجھے پرائے کیوں لگتے ہو؟

سمسیر انور : کلکتہ تمہیں اتنا بستر

سبرتا چکرورتی : ماں ام کی کھڑکی

اشیش مکھوپادھیائے : جب کلکتہ میں ہنسا جاگتی ہے

جیبانند داس

سڑک پر ٹہلتے ہوئے

جیسے کسی نشان کو یاد کرتے ہوئے اکیلا
ایک سڑک سے دوسری سڑک پر، شہر میں
آج میں بھٹکتا پھرا، بہت ساری چیزوں کو دیکھتا۔
ٹرامیں اور بسیں اپنے صحیح راستوں پر جاتی ہیں
اور پھر بڑے سکون کے ساتھ، سڑکوں کو چھوڑ کر، گم ہو جاتی ہیں
اپنے نیند جگت میں۔

رات بھر گیس کے ہنڈے اچھی طرح روشن رہتے ہیں،
اپنے فرض کا احساس لیے
کسی سے کوئی بھول نہیں ہوتی، اینٹیں، گھر، سائن بورڈ،
کھڑکیاں، کواڑ، چھتیں، سب کے سب محسوس کرتے ہیں
ایک اٹوٹ نیند کی ضرورت
آکاش کے نیچے

یوں اکیلے گھومتے پھرنا گہری شانتی دیتا ہے
میرے من کو
رات کا پچھلا پہر، جب بہت سارے ستارے
شہید مینار کی چوٹی کو گھیر لیتے ہیں
اس ایکانت میں؛ میں سوچتا ہوں، کیا، کبھی
[illegible] نے کوئی اور منظر دیکھا ہے

اس سے زیادہ سادا، زیادہ امکانی، ستاروں کا جھنڈ
اور کلکتہ شہید مینار سے بھرا ہوا؟
آنکھ جھپکتی ہے ——— چرٹ سُلگتا ہے
سناٹے میں ——— ہوا گھاس اور گرد اُڑاتی ہے؛
آنکھیں بند کیے، میں ایک طرف کھسک جاتا ہوں۔

پیڑوں سے بھوری پتیاں
غایب ہو چکیں؛ بس میں اکیلا پھرتا رہا
بابل میں رات کو
کیوں، میں نہیں جانتا، آج بھی
ہزاروں معروف برس بیت جانے کے بعد بھی

جیبانند داس:
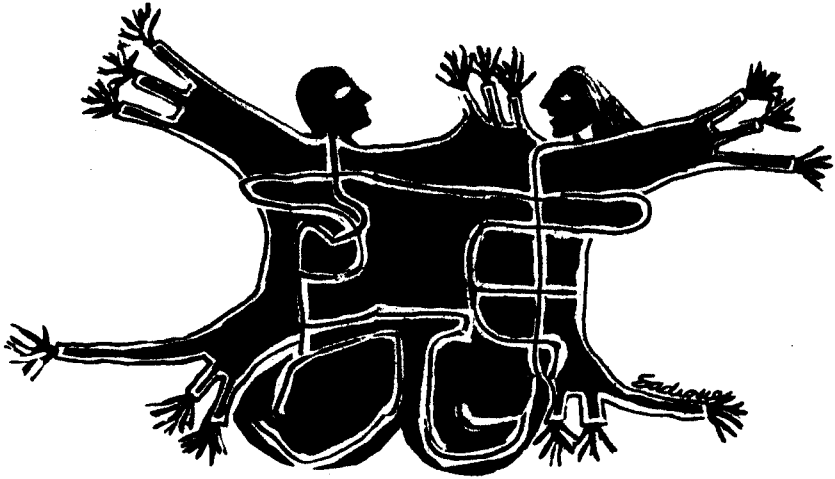
پیدایش ۱۸۹۹ء؛ وفات ۱۹۵۴ء
شعر کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں روپسی بنگال بھی شامل ہے۔ کہانیاں اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ٹیگور کے بعد کے عہد کی سب سے بڑی شاعرانہ شخصیت۔

امیہ چکرورتی

ناج دینے والا

شہر کا دل پتھر میں لپٹا ہوا ہے،
ایک کھیت جہاں کوئی ناج نہیں اُگتا ——
پھر تم کیوں یہاں آؤ گے؟
یہاں لہو بکتا ہے سونے کے بدلے
اور مہربانی کا مول چکایا جاتا ہے سود میں،
یا پھر ریاستی فرمان اسے بھی کچل دیتا ہے، سب کے ساتھ،
کنکریلے کلکتہ میں کوئی فصل نہیں اُگتی۔

اگر تمھیں آنا ہی ہے، تو ہتھوڑے لاؤ
مشین لاؤ توڑ پھوڑ کا کام کرنے والی
ہریالی فصلوں کا طلسم
اور پھر لوٹ جاؤ، جھنڈ کے جھنڈ، ان علاقوں کو
جہاں کھیت ہیں اور دریا کا کنارا
مجبور کر دو اس عفریت کے مینار کو جھکنے پر
اور تمھیں چاول دینے پر، فتح کر لو، التجا مت کرو!
ناج دینے والے سے
کنکریلے کلکتہ کی جیت تمھارا مرحلہ ہے۔

امیہ چکرورتی:
پیدائش ۱۹۰۱۔ شاعر اور نقاد۔
نیویارک کے اسٹیٹ یونیورسٹی کالج میں پروفیسر۔

پرمیندر متر ا

شہر کے لیے ایک دعا

اپنے سر پر وصول کرو
میرے شہر
صبح کی دعائیں
اپنے الجھے ہوئے، دھول اور دھوئیں سے بھرے سر پر۔
ہاتھ جوڑ کر
جو مشین سے گھائل اور لہو اور سیاہی سے داغدار ہیں
صبح کے آگے جھکو
دونوں ہاتھوں سے رات کے سپنوں کا دھند بھرا جال چیرتے ہوئے
اوپر دیکھو لعین!
نیلے آکاش کی سمت
جہاں مشرق صبح کو سلام کر رہا ہے
اجالے کے سنگیت کے ساتھ

تمھارا گھایل دل

جس کی تاریکی نے لپیٹ رکھا ہے
ایک ابدی شعلہ
اپنے آپ کو کھو دیتا ہے ڈھانچ جیسی سڑکوں پر
جنونی گپھاؤں میں
اور بے شرمی کے ساتھ چھپ جاتا ہے دھرتی کی تہہ میں
بھیس بدلی لالچ اور کھوٹے چہرے میں نفرت رینگتی ہے،
خاموش، بھوک کی ماری، اندھیرے میں
مہدا دو صبح کے اجالے کو کہ شانتی کے ساتھ آئے
تمھارے جھلسے ہوئے سینے کو بچانے کے لیے

مشینوں اور لوہے اور لالچ کے کانڈ کو توڑ کر
صبح کو نمودار ہونے دو
وہ نشچھل، نوجوان بھکشو
آئے اور اس رنڈی کو ہاتھ لگائے وقار کے ساتھ
تاکہ یہ جمع کی ہوئی تاریکی
بے شرمی، پاپ اور دکھ
بہت سارے لوگوں کا برسوں سے بٹورا ہوا غصہ
اجالے کی موج یہ سب کچھ بہالے جائے

موت کی رسوم ادا کرنے والی پاگل راہبہ
تو کہ امیدوں کی چتا پر شکتی کی پوجا کرتی ہے
آنند کی قربان ہو جانے والی لاش پر
تو بھول گئی تھی
آکاش کا نیلا انوکھا پن
راتوں کا بھید
جیون کا اجالا، مہک اور آکار
اب اپنے آپ پر مسلط کیے ہوئے بن باس کا انت ہونے دے!

آج، تیری غراتی ہوئی آنکھوں کے پیچھے
جو طاقت کی شراب سے سرخ ہیں

کوئی چڑیا گھونسلا نہیں بناتی
ممنوعہ سرحد کے پتھر پر
ایک دبلی پتلی گھاس، ایک پیلی کلی، ڈر سے جاگ اٹھتی ہے
سکڑتی ہوئی نقاہت کے ساتھ
یہ کبڑی خشین جیسی سڑک دکھاتی ہے
بس بے دست و پا زندگی کا نقلی سفر ——————

پرمیندر میترا:

پیدائش ۱۹۰۴، شاعر، ناول نویس، کہانی کار،
تیسرے دہے میں ایک نیا ادبی آندولن شروع کیا۔ کئی ادبی جریدوں کی
ادارت کی۔ ایک زمانے میں کئی فلمیں بھی بنائیں۔

ارون مِترا

کلکتے میں

کلکتہ مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے
اپنی پراچین صداؤں کے ساتھ
مجھے لاتا ہے اپنے جانے پہچانے موڑ تک
اس انجانی بھیڑ سے
میں اس کے پتھروں میں لوٹ آتا ہوں
اور بنگال کے گھنے دھان کے کھیت
میرے قدموں تلے کانپتے ہیں
اس کے راستوں
اور اُس کے آسمانوں میں مجھے پتہ ملتا ہے
پچھلے پرانے پیڑوں کی دھندلی غپ شپ کا
مدہوش لمحوں میں لتاؤں اور جنگلی پھلوں کا
کسی اُلجھی ہوئی مہک اور دور کی کسی لے کا
میرا گاؤوں والا بنگال لوٹتا ہے
بار بار کلکتہ کی جانب

شام کو یا رات کے آخری پہروں میں
ایک جھونپڑی سے سُنائی دیتی ہے ماتم کی آواز
سیٹیاں بجاتی ہوا کے ساتھ ریتیلی ندی کے کنارے
ایسا لگتا ہے کہ ماتم کی وہ آواز جس نے اس کے چہرے کو چھپا رکھا ہے
کلکتہ کی گود میں، اونچی ہوتی ہے اور کپکپا دیتی ہے . . .

سوئے کھیتوں کا درد
مجتمع ہو کر حویلیوں کی چھتوں تک جا پہنچتا ہے
گلیاں اور گلیوں سے نکلنے والی گلیاں اکھڑتی جاتی ہیں
اور مردہ گھر کی طرف جانے والی بھیانک سڑک
سیکڑوں میلوں کو پار کر کے کلکتہ آجاتی ہے

میں دیکھتا ہوں، پکی جوار کا قہقہہ
اس بوڑھے جوڑے کے لبوں پر
اور بال میلے میں دیکھتا ہوں روشنیاں
روشنیاں جو اچانک جگمگا اٹھتی ہیں
کلکتہ میں

کھڑکیاں میرے پیچھے
ایک ایک کر کے بند ہو جاتی ہیں،
پھر دوبارہ کھلتی ہیں . . .

ایک بستی کے ایک چھوٹے کمرے میں
میں دیکھتا ہوں محبت کے اس جزیرے کو
جب کہ درد گھورتا رہتا ہے . . .
اور احساس کی وہ لہر جس نے چکنا چور کر دیا
اجالے کی سرحدوں کو، کپکپا دیا
آنگن میں کھڑے ناریل کے پیڑوں کو،
اسے روک دیا گیا، اور اس کا سنگیت
پتھریلے کلکتہ پر ٹوٹ بکھرا
پچھلی ہار کا نشان مٹا دینے کے لیے

میرے کلکتہ کے سنگی ساتھی
مجھ پر چھا جاتے ہیں . . .
وہ میرے سامنے کا پردہ اٹھا دیتے ہیں
وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ جیتے رہو

وہ نفرتوں کو شدید کرتے ہیں
غصے کو اور زیادہ قوی
اور محبت کو مضطرب
وہ مجھ سے تقاضہ کرتے ہیں ایک مقدس آگ کو روشن کرنے کا
وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ اس آگ میں حسد کو جلا ڈالا جائے
اور اپنے حقیر دماغ زدی کی طرح اس میں ڈال دیے جائیں

وہ اشارے، الفاظ
تصویر بناتے ہیں ایک مستقبل کی نور کی لکیروں سے،
اور غفلتوں کو مٹا کر
صبح کے پرندوں کو جگا دیتے ہیں
اور پھر، جیوں ہی صبح کی بھونچکی مہک
اور گُلِ صلیبی کا عرق بکھرتا ہے
ہم گروہ در گروہ گاؤں کے راستوں اور جنگلوں سے نکل آتے ہیں

کلکتہ مجھ سے بہت قریب آجاتا ہے
میں اسے اپنے اعصاب میں محسوس کرتا ہوں
اس کی آواز میں پہاڑی ڈھلانوں اور جزیروں کی گونج ہے
اور میرے دل کی دھڑکنیں یہ نغمہ سُن رہی ہیں
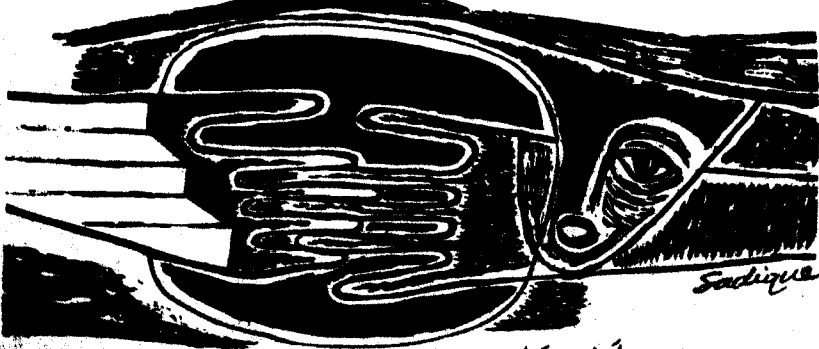
اَرون مِترا:
پیدائش ۱۹۰۹ء، ایک معروف ماہر لسانیات،
الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔

بشنو ڈے

ایک صفحہ سوالوں کا

یہ سدا کا جانا پہچانا کلکتہ اس کی تمثیل تو نہیں ؟

جب تھکا دینے والے دنوں اور بیمار راتوں میں
دھیان بھٹکتا پھرتا ہے دور آسمانوں اور ہواؤں اور سلسلہ در سلسلہ کھیتوں میں
تو کیا یہ دھیان ہوڑا ریلوے اسٹیشن کی بھیڑ کی دوڑ دھوپ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہجوم کو ڈھکیل کر
کبھی اس شہر میں اترتا بھی ہے، مسرور بھی ہوتا ہے،
جیسا کہ ایک پرانے یا دوست کے ساتھ ہونا چاہیے ؟
یا میں اپنی کمزوری کے کارن یہ موازنہ کرنے کی سوچتا ہوں
جیسا کہ بڑھاپا اپنی جوانی کے لالچ میں کرتا ہے ؛
یا جب سیاست ڈوب جاتی ہے
اور بہت سارے لوگ سٹہ بازار میں اپنے دیوتا کھڑے کر دیتے ہیں
یا بس پیٹھ موڑ لیتے ہیں
انقلاب بلکہ جوابی عمل تک کی طرف سے ؟

آپ اپنا محاسبہ زیادہ کیا جائے تو آدمی اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرنے لگتا ہے
ہم اور زیادہ یقین کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مانس لوک
جس میں ہم زندہ ہیں، شہرزادوں کی اسی بھیڑ میں وہ پاکیزگی موجود ہے
جس نے ہمارا سارا سکون چھین لیا ہے

اس ہر لمحہ بے چین اور بے مثال روز و شب میں
ایک عظیم سکون کا سپنا۔ اس بے داغ، نکھرے ستھرے دھیان نے
ہمیں پتہ ہے کہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے،
مٹھی بھر لوگوں کے بیچ، جہاں ہماری اپنی مرضی سے
آنند لال ہے اور نیلگوں آسماں
متحرک لکھو کھا لہریں ہزار ہا چوٹیوں پر
اسے پتہ ہے کہ ہمارے روک دیے گئے پرندوں کے گیت کی گت پر
مسرور ہاتھوں کے ہزار جوڑوں کے ساتھ سنسار تالی بجاتا ہے
کیا اسی لیے میں دن رات اس کی کھوج میں ہوں؟
ہمیں مل کر پھر سے کلکتہ کو بنانا ہے۔

□□
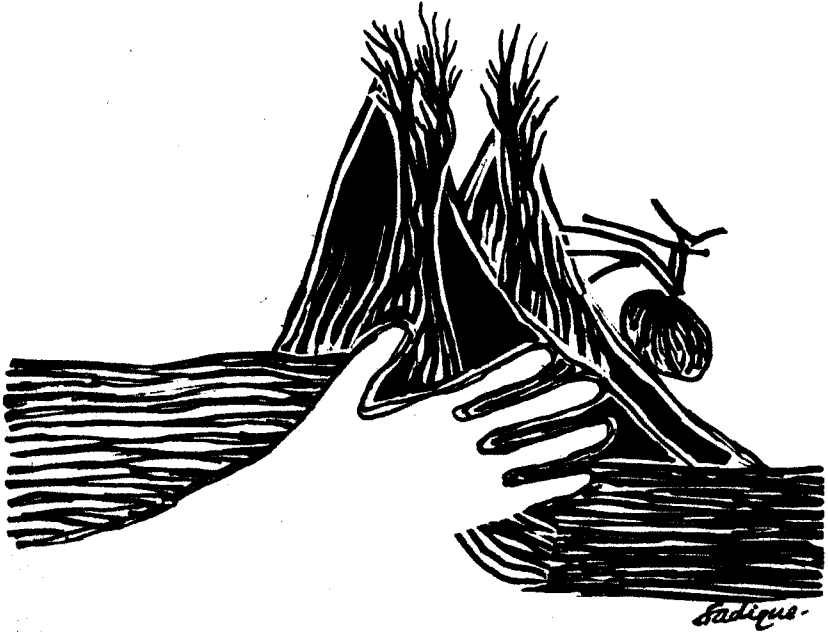
بشنو ڈے:
پیدائش، ۱۹۰۹ء، شاعر اور نقاد۔ ٹیگور کے بعد کی پیڑھی کے معروف ترین شاعروں میں سے ایک۔ گیان پیٹھ انعام یافتہ۔

سمرسین

جنت سے رخصتی

وہ
جس کی نیلگوں آنکھوں میں آج بھی
سمندر کی گہرائیاں کانپ رہی ہیں
ٹرام لائن کے خاتمے پر . . . جہاں اس پُرشور شہر کی سرحد ہے . . .
پھر بھی آسمان کے صحرا میں
رات ایک تنہا ملول درندے کی صورت نمودار ہوتی ہے
جب ٹرام لائن ختم ہو جاتی ہے . . . اور اس خاکستری شہر کی سرحد آجاتی ہے
رات کی پھیلی ہوئی چاندنی میں سنسان صحرا سُلگتا ہے
چیتے کی آنکھوں کی طرح

سورج کا چمکدار بھالا
یخ کے جلتے ہوئے جمود پر ضرب لگاتا ہے
اور آگے، پہاڑوں کی لہریں، خوابوں کی مانند ابھرتی ہیں
آج بھی چاند کی صورت چمکدار سروہی
آسمان میں اُبھرتی ہے
مرگ آسا سُست رَو زندگی
آج بھی آگے پڑی ہوئی ہے

ایوننگ ان پیرس کی مہک
رومال سے غائب ہو جاتی ہے
شہر! اے خاکستری شہر!
تو نے کالی گھاٹ پل پر کبھی

کسی عیّاش کے قدموں کے نشاں دیکھے ہیں
تو نے کبھی
وقت کی گردش کی گونج سنی ہے؟
شہر، اے خاکستری شہر!
اروسی کو چند گھنٹوں کے لیے بس دس روپیوں میں حاصل کیا جا سکتا ہے،
اور جب فاقہ کش ہجوم میں وہ محوِ رقص ہوتی ہے
اس کی ساڑی اور دیسی شراب کا نشہ
فردوس کی روحوں کو بھی مدہوش کر دیتا ہے . . .
لہو کے جھرنے ناچ اٹھتے ہیں
اور اے شہر، خاکستری شہر!
افق پر چاند کا شعلہ نمودار ہوتا ہے
اُروسی!
میں پورورادا نہیں ہوں
کاروں اور شراب خانوں میں
اور اتوار کے دنوں میں ڈائمنڈ ہاربر پر
میری محبت بس چند گھنٹوں کے لیے قائم رہتی ہے (بشرطیکہ کچھ رقم پاس ہو)
اُس وقت
کسی چیتے کی آنکھوں کی مانند
سامنے پھیلا ہوا بے آب و گیاہ صحرا جلنے لگتا ہے

۱؎ کالی گھاٹ پل کالی گھاٹ مندر کے پاس واقع ہے۔ اس سے تھوڑی ہی دور پر قحبہ خانے ہیں۔
۲؎ اروسی نسوانی حسن کا مکمل ترین پیکر ہے، اندر کی جنت کی ایک حور۔
۳؎ پورورا اُلونار سلطنت کا ایک اساطیری بادشاہ جس کی محبت میں اروسی گرفتار تھی۔

سمر سین:
پیدائش ۱۹۱۶ء۔ شعر کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بائیں بازو کے ایک ہفتہ وار "فرنٹیر" کے مدیر۔

کرن شنکر سین گپتا

نو بلیک آؤٹ

سارے شہر میں پرچھائیوں کی نقاب کشائی!
انجام کار انھیں آزادی مل گئی
چورنگی میں روشنیاں جھمکتی، ضربیں لگاتی ہیں،
اور کوئی شخص لاپروائی سے بیتے دنوں کو یاد کرتا ہے۔
پرانی کھوئی ہوئی روشنی کو جلد، بہت جلد پہچان لیا جاتا ہے ———
نفرتوں کی ماری ننگی دھرتی پر
اندھیرے میں
مَیں نے کتنی ہی راتیں گزاری ہیں۔
ہوائی جہاز کی غضب ناک گھڑگھڑاہٹ نے
آسمان کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے؛ ٹھنڈی، بنجر مٹّی
سوکھی ہڈیوں کی فصلوں کو جنم دیتی ہے،
سڑکوں پر لوگ فاقے کر رہے ہیں۔

اجالے کی بہار ——— ہر طرف مُنہ کھلے ہوئے ہیں
کیا دہشت کی خونیں تاریکی سے کسی نے پیٹھ موڑ لی؟
میرے بہت سارے سنگی ساتھی گم ہو گئے، غلط راستوں پر۔
رات نے شام کے ستارے کو اپنی دھندلی لپیٹ میں لے لیا۔
بہت ساری راتوں کے خاتمے پر لامحدود، غیر متوقع اُجالا ہے۔
اچانک حافظے میں طوفان کی ہلچل اور میں اپنی سوچ کھو بیٹھتا ہوں ———
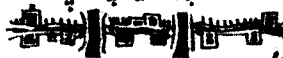
کرن شنکر سین گپتا:
پیدائش ۱۹۱۸، چوتھے دہے کے اوائل کے شاعر۔

سبھاش مکھوپادھیائے

دُلھن

گلی میں
دھیرے دھیرے شام اُتری
خونچہ فروشوں نے چلتے چلتے جانی پہچانی صدا لگائی
دُور ریڈیو نے ایک خواب بکھیرا
جلتے گیس کے ہنڈے نے اعلان کیا
دن کے انت کا

میرے دوست، سڑک کے پاس نلکا کھڑا ہے
مَیں دھیرے دھیرے جاتی ہوں، کمر پر گاگر سنبھالے
اچانک ایک پل میں گاؤں نے میرے مَن پر تلہ بول دیا
اور جیون نے بکھری ہوئی یادوں کو
کھینچ بُلایا۔

ساری دوپہر تلیا کے کالے پانی پر
گھنے جنگل اوپر سے پرچھائیاں پھینکتے ہیں
میرے محبوب،
اگر تم اپنے کانٹے سے کسی پرچھائیں کو پھنسا سکو
ہو سکتا ہے کہ چاندی جیسی کتلس بھی کھنچ آئے

یا پھر ہم دونوں پھیلے ہوئے کنارے پر بسرام کریں
اور کیسری بانے میں اپنے آپ کو لپیٹ لیں
ہمارا اک دوجے میں الجھا ملاپ ہمیں پوتر کر دے گا
ان کی نگاہوں میں جو ہمارے ہاتھوں میں چھوٹے سکّوں کی امانت دیں گے۔ ۔ ۔

سے پتھروں میں ڈھلی راج نگری، افسوس!
ہمیں اپنی دھرتی کی اور جانے دے، کروھول کیے بنا،
اپنے خزانوں سے بھی ہمیں کچھ دے دے،
ہماری واپسی اس کا سُود چکا دے گی۔

یہاں بھی، چھت سے پرے، چاند ابھرتا ہے
ادھ کھلا کواڑ مجھے کچھ اور دکھانا چاہتا ہے
جیسے پٹھان[2] آ رہا ہو، چھڑی اٹھائے
میں جلدی سے اٹھتی ہوں، آلسک کواڑوں کو بند کرنے کے لیے۔

اس سب کے بیچ، کبھی کبھی
جو مجھے سب سے پیارا ہے، گم ہو جاتا ہے، بیتاب آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں،
میں سدا اکیلی لگتی ہوں، دوسروں کے ساتھ ——
اس سے کہیں اچھا ہے کہ جھیل کے ہردے میں موت آ جائے
یہاں رونا بیکار ہے، مجھے پتہ ہے،
اس لیے، میرے دوست، پاس کے نلکے پر جہاں پانی پکارتا ہے
دھیرے دھیرے میں جاتی ہوں، کمر پر گاگر سنبھالے ——
گلی میں دھیرے دھیرے
شام اترتی ہے ——

□□

---

[1] بنگال کی ندیوں میں پائی جانے والی ایک مچھلی۔
[2] شمال مغربی سرحدوں کا ایک قبیلہ۔ جنگجو اور سود کا کاروبار کرنے والا (پیشاوری) کلکتہ میں انھیں کابلی والا بھی کہتے ہیں۔

سُبھاش مکھوپادھیائے:
پیدائش ۱۹۱۹ء، بائیں بازو کی سیاست میں سرگرم، صحافی، ایک زمانے میں پرتیچے کے مدیر، ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ۔

سبھاش مکھوپادھیائے

چیتے کی چیخ

رات کے دوسرے شو کے بعد
ایماندار تماش بین
اپنے اپنے گھروں میں
غیر سینسر شدہ تصویریں دیکھتے ہیں
بند پلکوں کی فلم پر
اک ذرا دیر پہلے، کھانستی ہوئی
بازار کا تیل اور چھتریاں لادے
مال بردار ٹرین لنگڑی چال سے روانہ ہوئی تھی

اچانک چیخوں نے
چڑیا گھر کے چیتوں کی،
شہر کو چونکا دیا۔
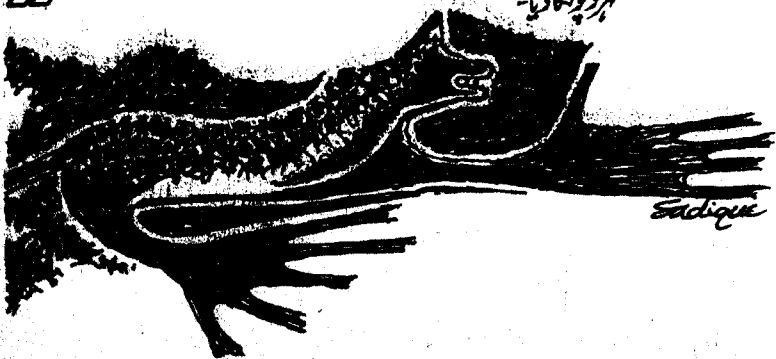
بیریندر چٹوپادھیائے

بنگال کے دل سے

رات بھر، دل دوز چیخیں
رات بھر Pop نغمے مائک پر
رات بھر، گوٹا کناری میں لپیٹی تیغ
آپ ہی اپنی اڑاتی ہے ہنسی

بیریندر چٹوپادھیائے :
پیدائش، ۱۹۲۰ء، کئی معروف جریدوں کے مدیر،
متعدد شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

بیرین‌دُر چٹوپادھیائے

مائیکلؔ[1] کی قبر

پانی سے، دھرتی سے،
پتھروں کی تاریکی سے
میں زہریلے پھول چنوں گا:
وہ سارے پھول جو مردانگی کے جوہر کی مثال درشت اور کھردرے ہیں،
تمھاری خواب گاہ کو سلام کرنے کے لیے!

وہ پھول جن کے نام ملائم اور سحر آفریں ہیں
جن کے نام عورتوں کے نام پر رکھے گئے
جن کے نام دیا اور کرونا کے نام پر رکھے گئے
میرا دل کبھی آمادہ نہ ہوگا
ان پُرسکون پھولوں کو
سرکلر روڈ[2] کی جانب لے جانے پر ——

کانٹوں، سانپوں اور جہنم کے اگلے ہوئے مادّے پر چلتے چلتے
ڈنک کی طرح نوکیلی دافعِ جنون بوٹی کے ساتھ،
جو میرے سینے میں ٹھہر سکے
میں تمھارے سنگین مینار کو سلامی دینے کے لیے آؤں گا۔

1. انیسویں صدی کے بنگال کا ایک ممتاز باغی شاعر۔ اس کی قبر کلکتہ کے ایک قبرستان میں ہے۔
2. قبرستان کی طرف جانے والی سڑک۔

موہندر رائے

چورنگی

وہ نہیں جانتے
اسی لیے چورنگی کی نیون روشنیوں کا سحر انھیں جوق در جوق کھینچتا ہے،
روشنیوں کے پیچھے پاگل
دل کی ساری جنگوں، نفرتوں، تیزی، وہ سب کچھ جو دماغ جان سکتا ہے
یا وہ بے ہئیت، لاشعوری حقیقت، لفظ یا حافظے سے ماورا ——
وہ چپ چاپ ان سب کے بارے میں سوچتے ہیں
ایک ارتعاش آگیں لے کی مانند جو سینے سے اک ذرا نیچے ساحل پر بکھر جائے؛
محبوب کی صورت
وہ لمس، وہ قہقہہ جو حرکت کرتا ہے؛
اور وہ گھنٹیاں جو رقص کرتی ہوئی دیویوں نے پہن رکھی ہیں
چورنگی میں ان سب کی گونج ہے، ناچتی ہوئی شہوانی خواہشوں کا فسوں۔

رات اور گہری ہوتی جاتی ہے
سنسان سڑک پر بھکاری اکیلا سو رہا ہے، شراب خانوں میں
شعور کا رقص برہنہ ہے
آراستہ فلیٹس میں مجنونانہ گیتوں اور اپنے آپ سے کھیلتی ہوئی
زیریں دُنیا کا دروازہ کھلتا ہے۔

اس گھڑی
جسے وہ بانٹ نہیں سکتے
خواہشیں کتنی خالی ہیں!
اندھیرے میں ڈوبے ہوئے مہیب میدان کی طرح
چورنگی کے پہلو میں خوف پھیلا ہوا ہے ——
یہ تضادات وہ ہیں
جو سارے خوابوں کو زخمی کر دیتے ہیں ——

▭▭

موہن دراشے:
پیدائش، ۱۹۱۹ء۔ کئی شعری مجموعوں کے مصنف۔ ایک ہفتہ وار اخبار
سے وابستہ۔ ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ۔

جگن ناتھ چکرورتی

کلکتہ، کلکتہ

آسماں پر، زمین پر، زمین کے نیچے
اگر جنت کہیں ہے ——— مگر نہیں، جنت کہیں نہیں، پھر بھی یہاں کلکتے میں
منہ بند کلیوں جیسی کچھ ایسی عورتیں ہیں جو انگور کی بیل کی طرح رِسنے لگتی ہیں،
کسی کو نہیں معلوم کہاں سے ——— اور ایسے مرد بھی ہیں، جو امتحانوں سے گزرے،
حوصلہ مند، بہادر، اور قاتل۔
شام کو جگمگاتی ہوئی دوکانیں کی صفیں،
سنہری مکھیوں کی شہد آگیں گنگناہٹ ———
نیو مارکیٹ آنکھوں کی ضیافت کے لیے ہے۔
ہر گلی میں بڑے یقین سے پیش گوئیاں کرنے والی نجومی
بیٹھے ہوئے ہیں اور پیاس، جوڑوں میں، میزوں پر،
کلکتہ

یہاں بہار کو سنگیت سبھا کا نام دیا جاتا ہے اور خزاں

شامیانے کے نیچے ایک مائکروفون کی بازگشت ہے۔
برساتی کی تنگ حدوں یا بس اسٹاپ کے نیم روشن دھندلکے میں برسات
پیار کی پہلی ہم آغوشی کا سندیس لاتی ہے۔
اور سرما کے ساتھ سیب، سنگترے اور انگور آجاتے ہیں۔

نہیں، جنت کہیں نہیں مگر
ہمارے لہو میں جھینگر چوں چوں، چوں چوں کرتے ہیں اور ہمارے سپنوں میں
ٹیلی فون ڈائل سگنل دیتا ہے۔

آئینے میں میں ہیں ہیں
جس کی محبت کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔
گرم چھبیلی عورتیں الگ پڑی ہیں اور ندی کا نیم گرم پانی سدا کی طرح بہہ رہا ہے۔
نوجوان عورتوں کے لیے نوجوان مرد ہیں
نوجوان مردوں کے لیے پارک اور ریستوران ہیں
اور ان دونوں کے لیے مشہور کافی ہاؤس کا گُن گُن گُن گُن کرتا خانۂ زنبور۔

نہیں، جنت کہیں بھی نہیں، لیکن یہاں
اگست کے مہینے میں گنگا کا سیلاب اور ماہی گیروں کے جال چاندی جیسی ہلسا مچھلی سے جگمگاتے ہیں
چکنی چمک دار Paper Backs کی صورت۔
چھوٹی ناویں لہروں پر جوق در جوق تیر رہی ہیں
اور بجروں، دخانی کشتیوں، سمندروں کی سمت جاتے ہوئے مغرور اسٹیمروں کے درمیان
گھونگھے ———
اچانک نشے میں ڈوبی کھاڑی سے ادباشانہ سیٹیوں کی لہراتی ہوئی آواز ابھرتی ہے
یہاں کیا نہیں ہے؟
لڑکوں کے لیے سیارے اور ان کے بزرگوں کے لیے سینما ہاؤس
سفید بالوں والے مذہبی صحیفے پا جاتے ہیں۔
دوستوں کے لیے دوستی، پیاسوں کے لیے مشروب،
نو واردوں کے لیے راشن کارڈ۔
کیا تم غیر ملکی ہو؟
یہاں تم بھی آرام سے رہ سکتے ہو۔

کیا تم بدیسی خاتون ہو؟
تم بھی یہاں خوش رہو گی۔ یہاں ہر پائپ کے لیے تمباکو دستیاب ہے، ہر آنکھ کے لیے ڈرگ،
اس خوبصورت، نیک نام اور لعین شہر کا نام
کلکتہ ہے۔

ہیروز کے لیے ہیروئنیں۔ اور ان دونوں کے لیے اسٹوڈیو،
"جدید" شاعری جو جوشیلے انداز میں سُنائی جا سکے، اور گٹار پر نرم نغمے۔
تصویروں کے لیے نمائشیں اور بعد میں مصوروں کے ساتھ ہمدردانہ گفتگو!
یہاں بہت کچھ ہے جس کی تمنا کی جائے مطبوعہ چیزوں اور لعنت ملامت کسی کا یہاں کوئی انت نہیں۔

یہاں جھیلوں کا پانی گہرا اور خاموش ہے۔
جو لیٹ کے سینے کی ایک جھلک کی مانند ایک سفید ناؤ تیرتی ہے
وہ پکار رہی ہے ــــــــــــ
"رات آجا، رومیو آجا، اے میری راتوں کے سورج! آجا!"
پتیوں، ٹیلی فون کے تاروں اور سبزہ زاروں میں پیلے جگنو جگمگاتے ہیں۔
فرش پر پیالی، اخروٹ کے چھلکے اور آئس کریم کپس۔ ٹھنڈی ہلکی ہوا کے نرم سیر جھونکے۔
اگر تم کبھی جھیلوں تک نہیں گئے تو تم نے ابھی جنم ہی نہیں لیا۔
جنت کہیں نہیں، بس یہیں ہے، پریڈ گراؤنڈ پر کسی نے ایک یادگار کھڑی کر دی ہے (شہید مینار)
جنت کو جاتی ہوئی سیڑھی جیسی۔
اسی کے قدموں میں عام سبھائیں ہوتی ہیں
اور چھتریوں کا گچھا
اسی کی چکردار سیڑھیوں کے سرے پر دکھائی دیتا ہے۔

دیس میں پھیلی ہوئی ساری آزردگی،
برہمی، اشتعال اور مستیوں کو
یہاں پلیٹ فارم مل جاتا ہے۔
یہ مینار شہزادوں کے سمندر کا لائٹ ہاؤس ہے
بادلوں کا زینہ۔
اس نے تاریخ بنائی ہے۔

اگر جنت کہیں ہے ——— مگر نہیں، وہ تو کہیں بھی نہیں
پھر بھی، زمین کے گولے پر کبھی نہ مٹنے والے حروف تمنا میں تحریر، گنگا کی مثال مقدس،
مینار کی مانند تاریخی، جنوب کی جھیلوں کی صورت مبہم جو،
ایک لفظ
کلکتہ، کلکتہ، کلکتہ

نیو مارکیٹ ایک جدید طرز کا فیشن ایبل شاپنگ سینٹر ہے۔
کافی ہاؤس: کلکتے میں چار کافی ہاؤس ہیں۔ غپ بازوں کی پناہ گاہ اور کرسی نشین انقلاب کے اڈے۔
ہلسا ایک لذیذ اور مقبول مچھلی۔

جگن ناتھ چکرورتی:
پیدائش، ۱۹۲۴ء، جادوپور یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد۔ ایک معروف مضمون نگار۔
شیکسپیر کے المیوں میں انتقام کے موضوع پر ایک کتاب کے مصنف۔

نریندر ناتھ چکرورتی

کلکتہ، تمھارے لیے

پیار پیار کے لیے ہے
اور کیا؟
میں نے کسی مورکھ کی طرح یہ بھید چھپایا ہے
کلکتہ میں۔

ایک بھیانک پیاس سینے میں سلگتی ہے
اور غسل خانے میں
پانی ٹپک رہا ہے، قطرہ قطرہ قطرہ . . .
اے کلکتہ
جھلسی ہوئی چھاتی کی بھٹنی پر دودھ کی بوند سوکھ چکی

جانا آنے کے لیے ہے، اور آنا آنے کے لیے ہے
پیار اسی آنے کی طرح ہے
اور میں پھر لوٹ آیا ہوں تمھارے اُداس غسل خانے میں

میں دُور دُور بھٹکتا پھرتا ہوں، پھر پاس آجاتا ہوں،
میرا پیار بس پیار کی خاطر ہے
اور کیا؟
میں نے کسی مورکھ کی طرح یہ سچائی چھپائی ہے
کلکتہ میں۔

□□

نریندر ناتھ چکرورتی:
پیدائش، ۱۹۲۴ء، صحافی، شاعری اور مضامین کی
کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

نیرندر ناتھ چکرورتی

کچن گارڈن

گلاب کے پھول!
تم کلکتہ کے ایک کچن گارڈن میں کھِل اُٹھے،
تم نے گناہ کیا ہے ——
تمھیں پتہ ہے —— ہمارا فوری مسئلہ غذا کی کمی ہے
لوکی، بوڑے اور بھنڈی کی طرف بھاگتے ہجوم کو
اب کسی اور راہ پر لگانا مشکل ہے

چھتوں پر، برآمدوں میں، لٹکتی ہوئی کارنسوں پر
جہاں کہیں ایک انچ جگہ بھی خالی ہے،
انچ یا سینٹی میٹر میں ناپ جوکھ کے بعد،
چھوٹے چھوٹے تختوں، بیکار برتنوں، گھڑوں، لکڑی کی سینیوں اور گملوں میں
ہر کوئی پالک، پھلیاں اور مرچیں اگا رہا ہے ——

اور ان سب کے درمیان تم بے نیازانہ کھلے ہوئے ہو ——
تم نے پاپ کیا ہے
کوئی اداسی سے کہتا ہے: "میرے خدا، کتنا بڑا گلاب ہے!"
لیکن اسے ووٹ نہیں ملتے ——
پرائیویٹ بس کے بائیں فٹ بورڈ کی جانب بھاگتا ہجوم
چلا آتا ہے: "گولڈیگھی چلو ——!"

مگر گولڈ یگھی تو بس ایک جگہ ہے ـــــــــ
شمال، جنوب، سچ تو یہ ہے کہ کلکتہ کے سارے طول و عرض میں
ایک شاندار سبزیوں کا باغ اُگ رہا ہے۔
گلاب تو بس ایک لفظ ہے،
چارلی چیلپن جیسی حرکات
سارے پھولوں کو کھائے جا رہے ہیں، ڈنٹھل سمیت۔
ہر کوئی ڈوبا ہوا ہے ٹماٹر، اوشی اور ڈھونڈل میں
اور دل ہی دل میں حساب لگا رہا ہے
کہاں اور کیسے
فوراً کھیتی کی جا سکتی ہے ـــــــ پُل پر، پلیٹ فارم پر،
چناؤ سبھا میں، شام کو کلکتہ میدان میں
یا سینٹرل بلڈنگ میں ـــــــ؟

ارون بھٹاچاریہ

کلکتہ ۱۹۷۱ء

چاہے تم ساری سہ پہر نظر اُٹھائے رہو،
کوئی پرندہ نہ آئے گا ——
اب سے کچھ پہلے وہ جھنڈ کے جھنڈ آئے تھے
میرے ناشپاتی کے پیڑ پر،
اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر،
اور ایک پتی سے دوسری پتی پر، اپنا بھار سنبھالے،
چونچ سے چونچ ملائے، پیار کی باتیں کرتے،
وہ دور آسمانوں کے اسرار کی خبر دیتے تھے ——

آج ان کے پروں میں بارود کی بو ہے
ان کی آنکھوں کے ڈھیلے دھماکوں کی صدا سے سہمے ہیں۔

میرے پیڑ آج سنسان ہیں، کوئی نہیں آتا، کوئی بھی نہیں،
نہ گلہریاں،
نہ چھپکلیاں —— ان کے ٹھنڈے جسم
اب پتیوں پر نہیں چمکتے ——

انھیں بارود اور دھماکوں کا ڈر ہے۔

میں اکیلے گھر کے سب سے اکیلے پیڑوں کے نیچے بیٹھا ہوں
دیکھ رہا ہوں، مین روڈ پر
آتے جاتے دستوں کو
اس کے لیے اور کیا کیا جا سکتا ہے ——
۱۹۷۱ء کے برسات کی یہ ابر آلود سہ پہر ——
ایک اکیلا پرند بھی نہیں، چاہے دیکھتے رہو ——
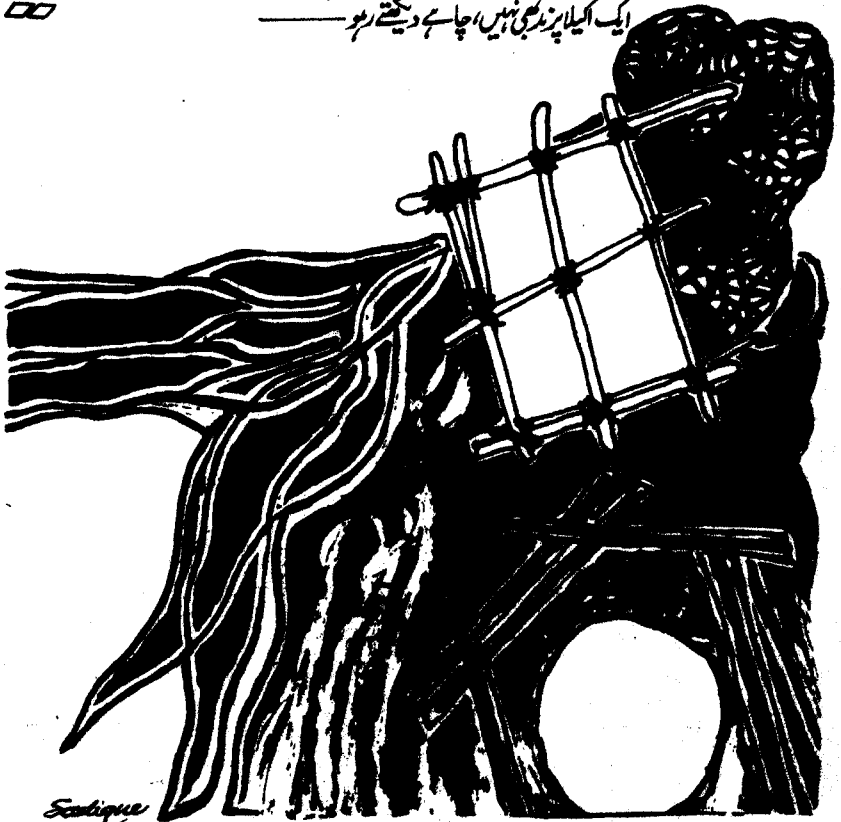
ارون بھٹا چاریہ :

پیدائش، ۱۹۲۵ء۔ ایک صحافی اور بعد میں رابندر بھارتی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر۔ کئی شعری مجموعوں اور موسیقی کی کئی کتابوں کے مصنف۔ اتر سوری کے مدیر۔

لوک ناتھ بھٹاچاریہ

کلکتے میں اب بھی بہار آتی ہے

ان دنوں بھی
کلکتے میں بہار آتی ہے۔ شباب اور شادابی سے معمور، عالمی غلاظتوں کی ملکۂ معظمہ،
گل مہر کا حسن دائمی ہے۔
میں اگر جاپان کا باسی ہوتا تو مسلسل تین دن اور تین رات گل مہر کے حسن پر دھیان لگائے رکھتا،
اور اس کے پھولوں اور پتوں میں رنگوں کی صف آرائی کے سحر انگیں تماشے کے اسرار پر سر دھنتا۔
پھر اس منظر کی بے رنگ تفصیلات کے مطالعے میں مزید دو ایک گھنٹے صرف کرنے کے بعد،
روایتی ایجاز اور اختصار کے ساتھ لیکن انتہائی الٹرا ماڈرن انداز میں میں وہ متوقع اور عام سی
چار سطریں لکھتا،
مثلاً ——— "بہار میں گل مہر بہت شاندار دکھائی دیتا ہے،" وغیرہ وغیرہ

اور جب اس کام سے فرصت ملتی تب اٹھتا، آہستہ قدموں سے غسل خانے کی طرف جاتا،
سینے میں اس آگہی کی آسودگی کا گہرا احساس لیے ہوئے کہ زندگی اس درجہ شاد کام ہو سکتی ہے۔

کسے خبر؟ ——— اب پانچ سو برس بعد ماضی میں دلچسپی رکھنے والا کوئی مدیر یونیسکو کی
طرف سے شایع ہونے والے کسی انتخاب میں میری نظم شامل کرلے اور اس کی شرح تک لکھ

ڈالے۔

میرا نام یاد کیا جائے گا ——

تم سمجھ گئے، سمجھ گئے نا کہ کون سی بات اتنی قابلِ مذمت ہے؟
گل مہر اپنی خودسری کے سبب فطرت کے اندھا دھند وار کرتے ہوئے تمسخر کے ساتھ میرے شہر کے دروازے تک ایک ایسا دن لے کے آیا ہے جو تمام لفظوں کو حیرت زدہ لایعنیت کی سطح تک پہنچا دیتا ہے اور حبت لگاتی ہوئی موت سے سرافراز نظم، جو وجود میں آتی ہے، اس کی نوعیت سرے سے بدلی ہوئی ہوتی ہے ——

لوک ناتھ بھٹاچاریہ:

پیدائش، ۱۹۲۷ء، شاعر اور ناول نگار، ساہتیہ اکاڈمی کے انڈین لٹریچر کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ریں بو کی A Season in Hell کے مترجم۔

سرت کمار مکھوپادھیائے

آدھی رات گئی، گھر واپس آؤ

میں نے کلکتے کے آخری مسافر کو رخصت کردیا
اب نہ ٹرامیں ہی نہ بسیں، بس اکا دکا ٹیکسیاں
بھینسوں کی طرح ڈکارتی ہوئی، اُجالے سے اندھیرے میں جانے کے لیے
اور اندھیرے میں رکشا کی گھنٹیوں کی گونج،
ایک بھکاری، پٹیوں بندھے پیر کے ساتھ بے نیازانہ بیٹھا ہے
لیمپ پوسٹ کے نیچے،
مٹھیاں بھر بھر کے چھوٹی ریزگاری کمر سے نکال کر گنتے ہوئے
اس کی چالاک آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں
اپنے پالتو کوڑھ کو ایک بار دھیرے سے چھوتے ہوئے
وہ دعا کرتا ہے، "بھگوان، اگلے جنم میں مجھے پھر کوڑھی بنادے۔"

اک ذرا آگے، سڑک کی پٹڑی پر ایک لال بتی رکھتے ہوئے
غلاف کو کھولتے ہوئے، چار آدمی
کلکتے کے دل کا اندھیرا دیکھ رہے ہیں
بدبو میں، قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی کی آواز
سنجیدہ آنکھوں کو یہ منظر فحش نظر آتا،
لیکن اس گھڑی یہ بہت عمدہ ہے؛ یوں لگتا ہے کہ یہ بے نقابی کی گھڑی ہے۔

یہ نقاب کشائی کی گھڑی ہے
تمھیں کوئی نہ دیکھے گا، نہ فلاں ابن فلاں کہہ کر پکارے گا،

کیونکہ ان میں سے ہر ایک، منہ میں دم دبائے، سپنے دیکھ رہا ہے
لہو کی طرح وحشی بن جانے کے،
اپنے نیک اعمال کی صندوقچی کھولتے ہوئے، خوف زدہ۔
پڑوس کی اس بستی سے، مٹھی بھر ہوا
چمگادڑ کی طرح میرے گالوں کو چھوتی،
تار کو پار کرتی، پردے کو ڈھکیلتی، کسی کے کمرے میں گھس گئی،
باہر آئی، پھر اندر چلی گئی،
اچھا مذاق ہے، جیسے میں نے کسی خفیہ چوری کا پتہ چلا لیا ہو۔

گھر واپس آتے ہوئے، روز کی عادت کے مطابق —— آج مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔
مجھے ایک دم سُن کردو، بھگوان، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔
یہ کوڑھی، یہ دکھنی ہوا، بوند بوند پانی گرنے کی آواز
کلکتہ کے رحم میں،
مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔
مجھے دیکھنے دو یہ انوکھا خالی پن، ایک لیمپ پوسٹ کی طرح کھڑے کھڑے
رات بھر، اکیلے ——
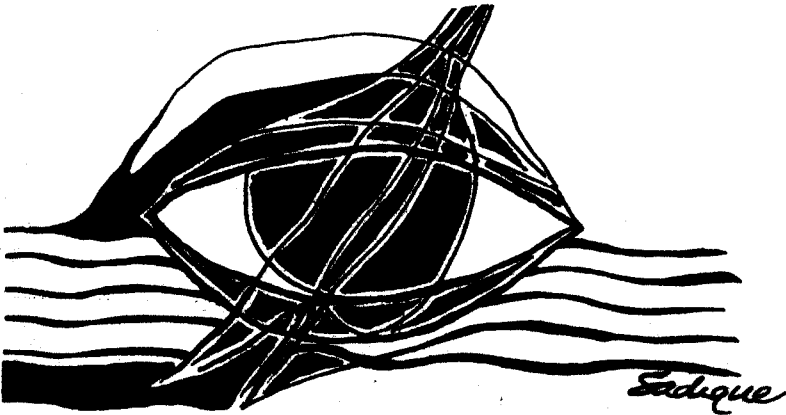
سنیل کمار مکھوپادھیائے :
پیدائش، ۱۹۳۰، شاعری کی چار کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔
پیشے کے اعتبار سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ۔

پورنیندو پاتری

تشدد کے سائباں سے

تشدد کے سائباں سے کسی کے غیبی ہاتھ
اچانک مسرت آمیز اجالے کی بوچھار کرتے ہیں
لہو ——— بدبو ——— گرد ——— مٹی سے بھرے ہوئے کلکتہ باسیوں کے لیے ———
اب رات اتنی سرد مہر نہیں لگتی۔
پان کی پیک سے رنگے ہونٹوں سے قہقہہ اٹھتا ہے
اس وقت جب شام بازار کے چوراہے پر
گھنٹی نما پھولوں کا خوشہ باندھا جا رہا ہے۔
میرے پاس کھڑے دوست پھر گہرے دوستوں سے مماثل نظر آتے ہیں
اور اس کشادہ صحن میں
انسانوں کی بیچ کی دوریاں ٹوٹ جانے کے بعد ان میں گہرا مکمل مکالمہ شروع ہو جاتا ہے
اور باہمی تلطف کے سفر کا آغاز۔

تشدد کے پیچھے انسان کی غلط فہم جانبداری باقی رہ جاتی ہے
اور بدبو اور لہو کو پونچھتے ہوئے، آخرکار
انسان تمنا کرتا ہے
اس گہرے قلبی اجالے سے اتصال کی۔
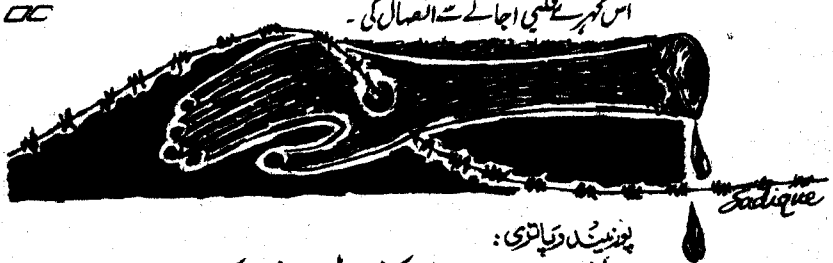
پورنیندو پاتری:
پیدائش، ۱۹۳۲، شاعر اور نثر نگار، کمرشیل آرٹسٹ اور فلم ڈائرکٹر۔
ایک اہم روزنامے سے متعلق ہیں۔

آلوک سرکار

چھتری

یوں محسوس ہوتا کہ وہ سارے لفظ ٹرام کے پہیوں کی طرف لوٹ آئے
وہ سارے لفظ اندھی اور حواس باختہ گلیوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو گئے
دوپہر کی ہوا کے اس جھونکے میں . . . پتیوں کی مردہ اُمیدوں میں
وہ راز . . . جو پہیوں پر گھنٹیوں کی مانند مترنم غلاف چڑھا دیتا ہے
اس نے خود کو ملائم اور نازک زیر زمیں علاقے میں کھو ڈالا
ٹرام کے پہیوں کی پیچیدہ چھتری دھوپ کا راستہ روکتی ہے
پرچھائیاں حواس باختہ خیالات سے بھری ہوئی، معمولی اور آر پار دکھائی دینے والے
پانی کی طرح برس جاتی ہیں

وہ سارے لفظ، جو اندھی اور بدحواس گلیوں کی
بھول بھلیاں میں گم ہو گئے
اس سے بھی زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں
پھر لے جاؤ، لے جاؤ اس رازداری کو
فریب اور جھوٹ کے اس موت سے عاری بازار کو
اینٹیں دکھاتی دیواروں کے گھنے اسرار میں۔
ٹرام کے پہیوں کے نرم گھنٹیوں جیسے لمس کو دوہراؤ
(یہ تمام عرصہ تشویش کا ہے۔) ——————
یہی وہ کنارا ہے اور بہت ساری پرچھائیاں برساتی ہیں ——————
دھوپ سے بچنے کے لیے ٹرام کے پہیوں کی پُراسرار چھتری!

آلوک سرکار:
پیدائش، ۱۹۳۲ء، پانچویں دہے کے ایک ممتاز شاعر۔ ایک معروف مترجم اور مضمون نگار۔ ایک شعری رسالے کے مدیر۔

ترن سانیال

تعطیل کا دن

یَں سارے شہر میں گھومتا پھرتا ہوں
میرے پیروں کے نیچے کولتار ہے،
میرے کانوں، میرے دل میں سرنگوں کو منتشر کرتی ہوئی صدا، ٹرین کی،
آسمان بوس اینٹوں پر پھورا آکاش جھولتا ہے۔ . .
مَیں تمھیں کہیں لے جاؤں گا، یہاں سے بہت دور
اپنے دل میں، اپنی آنکھوں کے تل کی تاریکیوں میں . . .
خوف زدہ مت ہونا ——

آدھی رات کو چاند سے سراسیمہ خزاں کی جانب لوٹتے ہوئے
مَیں فرش پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔
کھڑکیوں کو کپکپاتی ہوئی ہوائیں
گونج رہی ہیں، گونج رہی ہیں، گونج رہی ہیں
میرے کان میں، میرے دل میں . . .
آ، اے محبت!
شبِ اوّلیں کے شہنشاہ!
مرجھائے پتّوں پر چل کر آجا!

لووَر سرکولر روڈ پر
چاند قبروں کو دُھندلا دیتا ہے!
لونا پوکور میں کوئی ٹرام نہیں، بسوں کی آوازیں کھو جاتی ہیں،
برف نہیں وقت منجمد ہے —— سپید
اور دُم دار ستارے کی سیڑھی
خزاں کے چاند کی سمت رُخ کیے،
چُپ چاپ سفیدیوں پر ٹکی ہوئی ہے۔

مترن سانیال:
پیدائش، ۱۹۳۲ء، کلکتہ کے ایک کالج میں معاشیات کے لیکچرر ہیں۔
سیمانتا کے مدیر اور پرتیچے کے مدیر معاون۔

شنکر چٹوپادھیائے

اسپتال کا سبزہ زار

الوداع کہتے ہوئے، ایک سفید رومال ہلاتے ہوئے
دیر تک، میں سڑک کے کنارے کھڑا رہتا ہوں
دیکھتا رہتا ہوں
دھیرے دھیرے گزرتا ہوا وقت۔
وقت گزرتا رہتا ہے، لہورنگ جہازوں کے خزانے،
خوابوں میں محبت کی بلندی اور پستی
زاید منافع کا کتبہ، یاد، پکاسو یا خدا کا نیلا رنگ،
آٹوگراف دست خط۔
پری دلیس کا باجہ، اور پٹیوں میں لپٹی ہوئی
موت کے گیتوں کا ایک مافوق الفطرت گل دستہ،
دیک، بادبان، چھتریاں، شیشوں کے گلاب،
کشتیاں، نرسری کے سُرخ لباس ——
شادی کے دعوت نامے یا ایک کروڑ مشین گنوں کا فارمولا
آئین کی تین نقلیں، جمہوریت، روح کا جوہر وغیرہ؛
اس سارے نفع بخش کاروبار کو لوٹنے کے بعد
غضبناک قاتل
سیڑھیاں روشنی کی اور اندھیرے کی نمودار ہوتی ہیں۔
میں اس وسیع کھلے سبزہ زار میں لرز اٹھتا ہوں۔

□□

Sadique

شنکر چٹوپادھیائے:
پیدائش، ۱۹۳۳ء، پانچویں دہے کی بنگالی شاعری کا ایک انتخاب ترتیب دیا تھا۔
ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہیں۔

شکتی چٹوپادھیائے

اس بدیسی سرزمین پر کچھ بھی ہو سکتا ہے

اس بدیسی سرزمین پر
کچھ بھی ہو سکتا ہے
ڈرین پائپ پتلونیں، وائلڈ شرٹ اور لانڈری میں دُھلے ہوئے جانگھیے،
یہاں اگر اسوتھما کسی کے ساتھ ہے،
تو کچھ بھی ہو سکتا ہے اس بدیسی سرزمین پر

برابر پائپ، نوکیلے جوتے،
ناک کی پھنگی پر ٹکے ہوئے دھوپ کے چشمے پر گرمی کا بہانہ
کچھ بھی ہو سکتا ہے اس بدیسی سرزمین پر

لیکن وہ تمھاری کھجور کی چھڑی
اور تمھارے سینے میں بادلوں سا ملایم وہ آبائی مکان ——
جہاں سے تم آئے تھے، اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لیے،
کاش کچھ حوصلے بھی ساتھ لائے ہوتے ——
اس بدیسی سرزمین پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ل اسوتھما: مہابھارت کا عظیم مجاہد، درونا چاریہ کا بیٹا۔

شکتی چٹوپادھیائے:
پیدائش ۱۹۳۳ء، ۱۹۶۸ء کے بنگالی پوئٹری اینول کے مدیر۔ پانچویں دہے کے ممتاز ترین شاعر، ایک اہم روزنامے سے متعلق ہیں۔

سُنیل گنگوپادھیائے

کلکتہ نگری اور مَیں

کلکتہ نگری ایک وحشت ناک پتھر ہے
میرے دل میں
مَیں اسے تباہ کر دوں گا
میں بالجبر اس کے ساتھ زنا کروں گا اور اسے ہلدیا پورٹ تک لے جاؤں گا،
اسے زہر دوں گا، ناریل کی مٹھائیوں میں ملا کر۔
وہ ایک ہولناک پتھر ہے میرے دل میں
کلکتہ نگری چاندنی کو فریب دیتی ہے
ان دنوں اس نے
بوسوں میں کانٹے اور بلبلے ملانا سیکھ لیا ہے

اتنے بہت سے عاشقوں کی توجہ سے محروم ہوکر،
تم اشک آسا چائے میں شکر ملانا بھول جاتی ہو . . .
دن دہاڑے بھی تمھاری جانگھیں برہنہ رہتی ہیں
میری محبوب! کیا مَیں تمھیں اتنی آسانی سے
دلّی کے سپریم کورٹ تک جانے دوں گا؟
اس کے بجائے، شام کو، مہک دار دل کے ساتھ،

خستہ، سپید کپڑوں میں،
میں تمھارے دونوں بازو پکڑ کر تمھیں ٹیکسی پر سیر کے لیے لے جاؤں گا۔
رقص گاہوں اور ہوٹلوں میں ٹوئسٹ کی خاطر،
سنگیت کے آہنگ سے تمھاری ساری کی کناری کانپ رہی ہوگی،
اپنے دونوں کیمرے تمھاری چھاتی کی طرف گڑائے ہوئے
جادو، مدھو اور شیام لفنگوں کی طرح سیٹیاں بجائیں گے۔

بدن میں ایسا سُریلا پن
تم اجالے کی مہان بھینٹ ہو
آئینے میں اپنا عکس ٹٹولتی ہوئی۔
شہر کے جنوب سے مَیں تمھارے لیے مدح وثنا کے ڈونگرے لاسکتا ہوں
تم ہاتھوں میں کنول کے پھول چاہتی ہو؟
آدھی رات کو تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔
میرے ہاتھ سے بچ کر تم کہاں جاؤ گی؟
تم کیننگ اسٹریٹ میں نہیں چھپ سکتیں
اور اگر تم نے چائینز بٹر روڈ پر بھاگنے کی کوشش کی
میں تمھارا تعاقب کروں گا، چیتے کی طرح۔
ٹریفک لائٹس کو پھلانگتے ہوئے، چورنگی [جو بیمار کے لیے ٹانک ہے] راستے سے
دکھوں کے بڑا بازار کو پار کرتے ہوئے،
میرا تعاقب جاری رہے گا،
ایک بے بدن، ہوا کی جنمی روح کی مانند
میرے دردمند پیار سے بدلہ لے کر
تم کہاں بھاگ سکو گی؟
گنگا کی طرف ——؟
میں تمام جہازوں کے رُخ موڑ دوں گا
کلکتہ میدان کے اندھیرے کو اپنی طاقت ور ٹارچ لائٹ سے چھیدتے ہوئے
مَیں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا ——
تمھارے بدن کی خندقوں میں بارود بھر دوں گا،
اپنی خفیہ تحریریں؛ اور ایک دن بیچوں بیچ میں
ماچس کی ایک تیلی جلادوں گا ——

محل زمیں بوس ہوجائیں گے، اینٹیں اور شہتیر بکھر جائیں گے ——
سارا مال سمان، ہیرے جواہرات، چیت پور کا امر سنسار،
تحلیل ہوجائے گا۔
تم نے مجھے موت کی طرف ڈھکیلا ہے
تمھیں کون بچا سکتا ہے میری تقدیر بانٹنے سے ؟

ل جادو، مدھو اور شیام، Tom, Dick and Harry کے مترادفات ہیں۔
ب کیننگ اسٹریٹ اور چائنیز روڈ اور بڑا بازار گھنی آبادی والے علاقے ہیں اور تجارتی مراکز۔

سُنیل گنگوپادھیائے۔
پیدائش، ۱۹۳۴ء، کرتی باس کے مدیر، کہانی اور ناول لکھتے ہیں۔
اِن دِنوں ایک اہم روزنامے سے متعلق ہیں۔

موہت چٹوپادھیائے

تابوت پر پورا چاند

کلکتہ، میں تمھیں کچھ اور وقت دوں گا،
ہو سکے تو خود کو بدل لو، نہیں تو میں اپنی راہ چلا جاؤں گا۔
اور فائیو پوائنٹ کراسنگ پر کھڑا لیمپ پوسٹ آہیں بھرے گا
اور نیون لائٹ میں، لال، یا نیلا یا وہ سب کچھ جو بھیانک ہے،
بھر جائے گا
تم سے ہو سکے تو خود کو بدل لو۔
ساری بساط پر بکھرے ہوئے کسی بلا کے آسیب میں گرفتار لوگوں کو بدل دو
اور اس گھڑی، جب وہ سو رہے ہوں،
ان میں سے کچھ کے سینوں میں
کسی ترغیب یافتہ پرندے کا دل ڈال دو۔
ہتھیلی کی لکیریں بدل دو، اور بدل دو ان کے بیچ ابھری ہوئی کیاریاں ——
پھر یوں محسوس ہو کہ جیسے کف دست پر ایک بیکراں، پورے چاند کی رات اٹکھیلیاں کر رہی ہے
اور دمے سے نجات پائے ہوئے درخت کامیاب ہواؤں میں قہقہے لگا رہے ہیں۔

ہر طرف رنگ رلیاں، اور سجے ہوئے بال
پشت پر لہرا رہے ہیں اور چاند کی سمت گرم پرواز ہیں؛
کچھ لوگ، ایک آنے کے سکے کی شرط باندھ کر، بندوقوں میں لوہے کے چھرے ڈال کر
غباروں پر نشانہ لگا رہے ہیں۔
رنگین چکنی کھال پر اندھیرا پھوٹ رہا ہے، رنگین انگلیاں کانپ رہی ہیں
اور بھاگتی ہوئی فراک کے گھیرے سے لٹکا مسخرا،
بڑے انہماک سے ایک عورت کی امرود جیسی پکی ایڑی پر دانت جما دیتا ہے
کچھ لوگ کاروں میں کھائی کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں

اور کچھ آزاد، شریر اور ملائم چہروں والے بچے جمناشک کے جھولے پر بڑی بہادری سے لہرا رہے ہیں،
اور کچھ اچار جیسی مہک دار چلبلی عورتیں
ہماری زبانوں کے سامنے سے گزرتی ہیں
رنگین پروں پر مکھیاں گشت کر رہی ہیں۔
یہ سب کچھ تلخ ہے، اور درشت، کلکتہ! مَیں تمھیں کچھ وقت دیتا ہوں
جو تم سے ہو سکے تو یہ سب بدل دو!
اس کا ذائقہ بہت کڑوا ہے،
آنکھیں درد سے بھری ہوئی،
رفتہ رفتہ، تمام محبوب پتے ڈائری سے غائب ہوتے جاتے ہیں،
ایک غضبناک وائلن، اس کے سنہری سیمیں تار ٹوٹے ہوئے
اچانک بس کے پہیوں کے نیچے چیخ اٹھتا ہے ——
کوئی چلّاتا ہے "احمق" اور اپنے باغیچے میں گھس جاتا ہے،
پیچھے سے کون زور سے ہنسا تھا،
کون اچانک کھسک گیا؟

اس سے بہتر ہے کہ ایک چرائی ہوئی کار کے ساتھ بھاگ لیا جائے
کاندھے پر ایک لیمپ پوسٹ لیے ہوئے جلوس میں شامل ہو جانا اس سے بہتر ہے
اس سے بہتر ہے کہ ایک جگنو جال میں پکڑ لیا جائے اور پھر یہ فرض کر لیں کہ یہ ایک پرندہ ہے

کلکتہ —— میں تمھیں کچھ وقت اور دوں گا ——
بدل ڈالو خود کو، جو ہو سکے،
ورنہ اس مضمحل تکیے کے نیچے ڈائنا مائٹ کا ایک ٹکڑا دبا کر میں سو جاؤں گا،
ٹھیک اسی طرح جیسے تعطیل کے دن کی خاموش سہ پہروں کو
بہت سے لوگ گلے میں پاؤں دبا کر سو جاتے ہیں ——
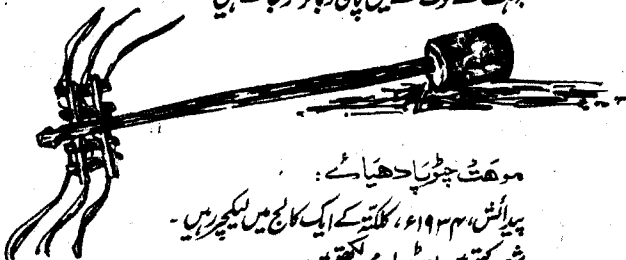
موہت چٹوپادھیائے:
پیدائش، ۱۹۳۴ء، کلکتہ کے ایک کالج میں لیکچرر ہیں۔
شعر کہتے ہیں اور ڈرامے لکھتے ہیں۔

برنک رے

کلکتّے سے

اس کی دونوں چھاتیوں میں شہنائی کا خاموش شاہانہ اور عفریت کا زہر ہے
مغرور عورت
اور اس شاموں کو، گنگا کے کنارے چلتی ہوئی
تنہا، پانی پر نظر ڈالتی ہے اور آپ اپنا عکس دیکھ کر لرز اٹھتی ہے :
اس کے پیچھے، جنگلوں کی دھندنے پرندے کی برق آسا چمک چھپالی ہے ———
اپنے برہنہ سینے میں آہستہ سے وہ اپنا دل کھولتی ہے،
دفعتاً مغرب کی لہو رنگ ساعت غروب چمک اٹھتی ہے
شعلہ رنگ رات کی تاریکی میں
روشنیوں کا انوکھا، رنگین طلسمی تیوہار . . .
جسم میں کیسی مہک ہے!
ہمّت اور حوصلے تھک جاتے ہیں، مہتم بالشان حویلیاں :
ان میں چھپے ہوئے، عورتوں اور مردوں کے ہم آغوش بدن،
وہ دلکش عورت، گھنے اندھیروں میں مسکراتی ہے،
اور دُور گنگا کے بیچ کی لہروں سے
انوکھی ہوا میں
اجالے اور اندھیرے کی بانسری سُنائی دیتی ہے

Sadique

برنک رے :
پیدائش، ۱۹۳۵ء، پانچویں دہے کے اواخر کا ایک اہم نام
پریسی ڈینسی کالج میں بنگالی کے لیکچرر۔

سمریندر سین گپتا

ایس او ایس ۶۹

(۱۹۶۹ء کا ایک لاسکی پیام)

مَیں خبریں بھیج رہا ہوں، دھان اور پنجابی گندم کے ویران علاقوں سے کلکتہ کی خبریں، انگریزی میں غرور اور روایت کی ۱۹۶۸ء کی خبریں بھیج رہا ہوں، ڈھاکہ کی ململ کی خبریں [جولاہوں کے انگوٹھے تراش دیے گئے] بادشاہ کی بیٹی کے پھل دار بدن کی سرزنش اور شیو، کالی، گنیش اور کرشن کی ٹیڑھی تاریخ کی خبریں جو کوٹھوں پر کناری دار ساڑیاں پہننے والی رنڈیوں کے کمروں کی دیوار پر کانپ رہی ہیں ——— جو ہوڑا ہٹ سے لائے گئے سوتی دھاگے کی میراث ہے: مَیں اس شہر کے بانی، جاب چارناک کی قبر سے خبریں بھیج رہا ہوں، یہ قبر اب گھاس اور کتوں کے پیشاب سے ڈھک گئی ہے؛ بنگالی بھاشا اور اس کے گہرے دوست مائیکل مدھوسودن دت اور دیوتا صفت ایشور چندر ودیا ساگر کی شاعری کی خبریں؛ میں اس زوال پذیر یادگار (شہید مینار) اور کوئن وکٹوریا میموریل کی خبریں اور فوری تدفین کے لیے ملیکا کے مرجھائے پھولوں کی ضرورت کے سلسلے میں ستیہ بالی بخش کی رائے بھیج رہا ہوں - یہ پھول لاتو باگان باغ میں کھلتے تھے؛ ہگلی کے کنارے واقع فورٹ ولیم کی بیرکوں سے ایس او ایس ۶۹ موصول ہوا ہے، جبکہ بدیسی جہازوں کے اونچے علم اور سونا اسمگل کرنے والی آب دوز کشتیوں کی لاحاصلی کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے اور غریب مچھیرے کی آواز سنائی دے رہی ہے ——— "ہری، دن بیت گیا، سانجھ آگئی"، میں بنگال کے حال، اس کے لاموجود لمحوں اور اس کے مستقبل کی خبریں بھیج رہا ہوں، بنگال ——— "جو ساری سرزمینوں سے زیادہ شاداب ہے" ——— ہوائیں میرے بال جھاڑ کے

پر مِرچ کی طرح اُڑ رہے ہیں، مَیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میرا سایہ بڑا ہے یا چھوٹا، اور اگر سایہ نہیں تو پھر آدمی کا وجود کیوں کر ممکن ہے؟ اور اسی لیے نتیجے کے طور پر، اور صرف اسی کارن مَیں ایک قابلِ نفرت غدار ہوں، ہواؤں سے نرم گفتگو کرتا ہوا، مَیں بنگال کی ناخلف اولاد ہوں اور الیکٹرونک وسائل سے مائیکل مدھوسودن کو خبریں بھیج رہا ہوں؛ وہ مجھے بے شمار مٹھائی اور کرنسی نوٹ بھیجے گا؛ یہ گدلا پانی گنگا سے کہیں برتر ہے' جہاز، نیلے اور لال شکرے، کارخانوں کی چمنیاں، ہائی کورٹ کا گنبد، ہوڑہ پل اور ریزرو بینک کی عمارت —— انھیں پر مائیکل مدھوسودن کی ناموری، اس کی مٹھائی کی دوکانیں اور اس کا سکہ بیٹھا ہوا ہے، میں ایک عاق کیے ہوئے بچے کی طرح اچھی مٹھائیوں پر جھپٹ کا جھپٹوں گا، بغلیں بجاؤں گا اور پھر گینڈے کی کھال کے بنے کالے جوتوں میں اکڑ اکڑ کر چلوں گا —— بل کی ادائیگی مدھوسودن کرے گا —— مَیں تو بس مٹک مٹک کر چلتا جاؤں گا اور جوتوں میں سے چرخ چوں، چرخ چوں، چرخ چوں جیسی آواز نکلے گی —— پیام ختم —— !

سمریندر سین گپتا:
پیدائش، ۱۹۳۵ء، ایک میڈیکل فرم میں کام کرتے ہیں۔
کرتی باس کے مدیر۔

تارا پید رائے

کلکتے تمھیں یاد ہے؟

تمھیں یاد ہے، کلکتہ،
میرا سبز پاسپورٹ اور سبز قمیص
اُس روز سیالدہ اسٹیشن پر
بارش میں شرابور، سرحدی ٹرین سے اُترتے وقت
مَیں نے پہلی بار بوٹ پالش کرنے والے آدمی کو دیکھا تھا

میرے خوابوں کے شہر، میرا وہ ہیجان
زندگی میں پہلی بار وہ ٹرام گاڑی، فرسٹ کلاس کا وہ ڈبہ
فرسٹ کلاس کلکتہ
اور ہر کھڑکی میں وہ دھوپ چھاؤں کا اسرار

میری ہری قمیص، پھٹے جوتے
ہر طرف گھومتے پھرنے کی وہ حیرانی
بھکاری کے ساتھ وہ دیوانہ، دیوانے کے ساتھ وہ شرابی۔
جلوس ـــــــ قوس قزح کی صورت ـــــــ افق کو چھوتے ہوئے،
چائے خانوں کی وہ بھیڑ اور سڑکوں پر وہ بے معنی جلسے،
سوکھے پتّوں کو بکھراتے ہوئے سہ پہر کی ہوا کے وہ سرکش جھونکے،
دھوپ میں چمکتی ٹرام لائنیں ہاتھی کی سونڈ جیسی خم دار،
یہ کسی کو کہیں نہیں لے جاتیں۔
کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمھاری سرحدوں میں نہیں ہوں،

میرا شہر کہیں بھی نہیں،
لیمپ پوسٹ کے دو کھمبوں کے درمیان جہاں ایک لمبی ہنالی لڑکی میں
چاند نما فٹ بال کو کوئی خلا کی طرف اچھال دیتا ہے
اور گیلری میں پرچھائیوں جیسے لوگ چلاتے ہیں ——— "گول!"

ان بیس برسوں میں بھی، مجھے تم میں ایسا کچھ دکھائی نہ دیا جو ہم دونوں میں مشترک ہو،
میرے شکستہ خواب، سیکڑوں پرزوں میں پھٹی میری نظمیں
ردّی بیچنے والے اُٹھالے گئے،

یہ بیس برس، ہر روز
میرے خوابوں کے یہ لفظ
کِلو کے حساب سے بیچے جاتے ہیں۔

اس اسرار کی کھڑکی کوئی کہیں نہیں کھولتا
کوئی چھت آسمان تک نہیں پہونچتی
لباس کا رنگ، جوتے کا سائز
بلا وجہ بدلا ———
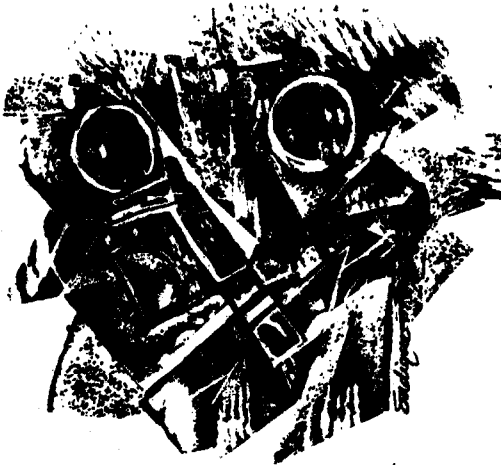
تارا پد رائے:

پیدائش، ۱۹۳۶ء، سول سروس میں ہیں، کہانیاں اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔
پورو میگھا اور کاکیہ جن کے سابق مدیر۔

پران بیندو داس گپتا

کلکتہ کے لیے چار سطریں

اعصاب کے مالک، کلکتہ
آخر کیوں تم مجھے مکمل طور پر تباہ کرنے کے درپے ہو؟
میرے پاس ایک گھوڑا ہے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پردیس میں ٹھکانہ
میں اپنے شہر کی سمت جاتا ہوں۔
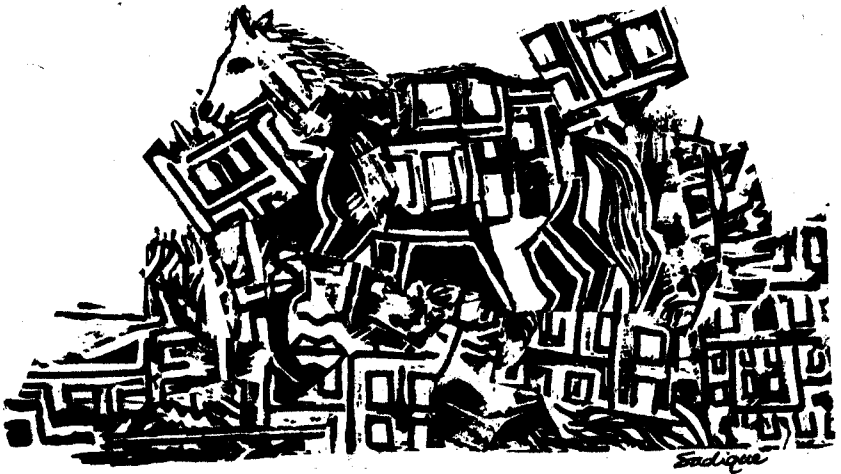
پران بیندو داس گپتا :
پیدائش، ۱۹۳۶ء، جادوپور یونیورسٹی میں تقابلی ادب کے
استاد۔ آلندا کے مدیر۔

پران بیندو داس گپتا

کم از کم کہیں تو

کم از کم کہیں تو، سب کچھ ٹھیک ہے ———
گھر واپس آنے کے بعد کی نیند میں
گھر واپس آنے کے بعد کی دھوپ میں . . .
گھر آنے کے بعد

پالتو خرگوش بکسوں اور صندوقوں کی درمیانی جگہوں میں بھاگتا پھرتا ہے
پھر ایک لمحے کے لیے چاندنی کچھ زیادہ ہو جاتی ہے
افق کا احاطہ کرتے ہوئے ہم کتوں کی طرح پھٹ پڑتے ہیں
پھر بھی کہیں تو سب کچھ ٹھیک ہے
کہیں تو
کمرے کے اندر والے کمرے میں
مچھردانی سے نیند کی آواز سنائی دیتی ہے

پیاری مینا آدمیوں کی ہی بنائی باتیں ٹیپ ریکارڈ کرتی ہے
ہرے کرشنا، ہرے کرشنا، ہرے کرشنا، ہرے ہرے ———
اس الّو کے شہر میں، کہیں تو
سب کچھ ٹھیک ہے۔

اُتپل کُمار باسُو

۶ بجکر ۳۰ منٹ صُبح

کسی کسی دن
پروں والے بادل کے پالتو پرندے کی صورت
کلکتہ اُڑ جاتا ہے
وہ لوگ جنھوں نے وعدہ کیا تھا
کہ آج یا کل یا کسی ہفتہ یا مستقبل کے کسی مہینے میں، یا برس کے تھکے ہارے خاتمے پر
لوٹ آئیں گے
وہ سب کے سب جھوٹ بولے تھے

—

کلکتہ کسی کسی دن، تمھاری بوڑھی بڑبڑاہٹ میں
بھر جاتا ہے اجالا، سیانے جھوٹ
اس وقت صبح کے دھندلکے میں تمام کشتیاں گنگا کے ساحل پر آرام کر رہی ہیں
اور دونوں کناروں پر دوسری سو آنکھوں کا غبار جمع ہے۔
میں اسے سیکھوں گا چاہے اس کی اہمیت کچھ بھی نہ ہو ——
جب دن کچھ اور روشن ہوگا
میں جنوبی سمندروں کے سفر پر چلا جاؤں گا۔

اُتپل کُمار باسُو:
پیدائش، ۱۹۳۶ء، پہلے کلکتہ کالج میں لیکچرر تھے اور کرتی باس کے معاون مدیر۔
ان دنوں انگلستان میں رہائش اختیار کر لی ہے۔

فانی بھوشن آچاریہ

مرتی ہوئی بسوا

سنگترے
انگور کے چھلکے
اور انار کا انجر
اس کے بستر مرگ کے چاروں طرف بکھرا ہے۔
اور ہم، مختلف زمانوں میں اس کے پریمی،
بھوتوں کی طرح، بےحس بیٹھے ہیں۔
ہاتھ صلیب کی صورت سینے پر رکھے،
باہر مردہ گاڑی منتظر ہے۔
اس کے سرہانے آکسیجن سیلنڈر ہے
پیروں کے پاس سیلائن کی بوتلیں ——
ہم میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ سونا نہیں چاہتا۔

صبح ڈاکٹر نے کہا تھا،
"اسے خون چاہیے"
ڈاکٹروں کو ہمیشہ خون کی ضرورت ہوتی ہے۔
ہم میں سے کسی نے بھی نگاہ نہ اٹھائی
"کون —— میں؟"
کچھ اس لیے آئے تھے کہ اپنے کھوئے ہوئے نجی دکھ پھر سے پا جائیں،
دوسروں کو درد کے انمول لمحوں کی جستجو تھی
ہم اپنی کوڑی کوڑی واپس چاہتے ہیں!

اس لہورنگ گلاب میں بہار کی کوئی مہک نہیں

پھر بھی، اس ڈوبتی شام کو،
جیسا کہ وہ اکثر کرتی تھی،
وہ اپنے سانولے سرمئی ہونٹوں پر بہت آہستگی سے ایک رنگین برش پھیرتی ہے۔
اب ہم اس کے ساتھ سونے سے ڈرتے ہیں۔

اس کی پیلی، سپید، سیدھی انگلیاں، آہوں کی طرح تنی ہوئی
ایک انجانا ڈر ہماری شریانوں کو اینٹھتا ہوا۔
ہم بیٹھے رہے، بیٹھے رہے
ایک دوسرے سے نظریں چرائے
اپنے آپ سے نگاہیں بچاتے ہوئے
ہم اپنی لالچ کے خفیہ خنجر تیز کرتے ہیں
بدنصیب پانڈوؤں کی طرح
ہم ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، گھایل کرتے ہیں
دروپدی کو اپنی اکیلی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے۔

ہم نے کتنی بار اسے دھمکی دی ہے
"میں لوٹ کر نہیں آؤں گا!"
اور دور افتادہ علاقوں سے
ہارے ہوئے، لوٹ آئے،
ایک بار پھر اس کی ملائم ٹھوڑی کو چومنے کے لیے . . .
اور ہم نے مسکرانا چاہا، مگر درد ابھر آیا،
اور ہماری آنکھوں میں چھلکنے لگا،
جہاز کے سائرن کی طرح گریہ کناں ——
"کلکتہ، کلکتہ، میری جان کلکتہ . . ."

فانی بھوشن آچاریہ:
معاصر عہد کے اہم ترین بنگالی شاعروں میں سے ایک۔ ناول بھی لکھے ہیں۔
"ہائے کلکتہ" کے مصنف۔

رتنیشور جھا

کلکتہ

تم وہ لڑکی ہو جو میری زمین کے پاس کھڑی تھی
اور دائرے کی تکمیل کے لیے
گھومی، اور گھومی، اور گھومی، اور گھومی
ان گنت بار . . .
دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھے، پاؤں وقار کے ساتھ جمے ہوئے
اور سر آسمان کو چھوتا ہوا

تم وہ لڑکی ہو جس نے
بجلی کی روشنی بند کر دی اور موم بتی کے اُجالے میں
خواب آور گولیاں دے دیں، موت کی خاطر،
مَیں محتاط تھا، مَیں نے تمے کی اور نرم کر دیں
تمھاری جانگھیں جو تکیوں جیسی ملایم تھیں . . .
تمھاری آغوش پر شہد کا چھتہ پھیلا ہوا تھا
دھندلی تاریکی میں چمگادڑیں سارے کمرے کا چکر کاٹ رہی تھیں
تم نے یہ دیکھنے کے لیے کہ میں سانس لے رہا ہوں میرے نتھنوں کے پاس روئی رکھی
تھی
وہ لڑکی ہو
جس کی خاطر میں نے سفر کیا کمبھ میلے میں اشنان کے لیے
بجلی کے تار کاٹ دینے کے بعد،
تال مکھانے کے ارغوانی پھولوں سے بھرا تالاب، بوسیدہ دلدل، مین ہول کا ڈھکنا کھولنا

پھر بھاگتا، بھاگتا، بھاگتا . . .
میرے پیچھے تمھارے پر میرے پیروں سے قریب آتے ہوئے
موت
اور گردش، گردش، گردش، گردش
ایک کمرہ
اور روشنی بند کرنا
مَیں نے خواب آور گولیاں تمھارے حوالے کر دیں . . میں آمیزش کے لیے۔ ▱▱

رتنیشور ھانڈا:
چھٹے دہے کے ایک انتہائی اہم شاعر،
سرکاری دفتر میں کام کرتے ہیں۔

دیباتوش باسو

کار منصبی کی آزادی

میرے دن، جولاہے کے کرگھے کی طرح تیزی سے نیچے سرکتے ہیں
وہ نہ جھکتے ہیں، نہ ایک طرف کھسکتے ہیں، نہ سینے سے چمٹتے ہیں
دیکھنے اور ان دیکھے کے درمیان
ایک کی محبت اور دوسرے کی نفرت کے درمیان
وہ تیزی سے نیچے سرکتے ہیں ——
میرے کرگھے جیسے دن۔

میرے دن
گلی کے نکڑ پر دودکش پائپ جیسے لڑکے کا مشاہدہ کرتے ہیں
مشاہدہ کرتے ہیں فراک میں ملبوس لڑکی کا
مشاہدہ کرتے ہیں پتی، پتنی، بے چاری گائے کا
اور کلکتہ کی سڑکوں پر کتوں کے دردناک جنسی اضطراب کا
لیکن
وہ انتظار نہیں کرتے، نہ پچھتے ہیں، نہ چیختے ہیں
—— صرف سرکتے ہیں تیزی سے
میرے دن کرگھے جیسے۔

مجھے پتہ ہے
اپنی ماں کی چاہت اور اپنے باپ کی اصول پسندی کا
میں نے دیکھا ہے کس طرح سٹیشیں

اُس کے چہرے پر سیدھا گر کر پھر اُٹھ جاتا ہے
میں نے پیمائش کی ہے
عاشقوں کی ماورائے شعور بلندیوں کی
مجھے اب اور کچھ نہیں سمجھنا ہے، نہ سیکھنا ہے، نہ ناپنا ہے

چکراتے چکراتے، اب میرے دن
——— ایک کالی شال ——— بے جڑ نیلاہٹوں کا محاصرہ کر لیتی ہے۔ ▭▭
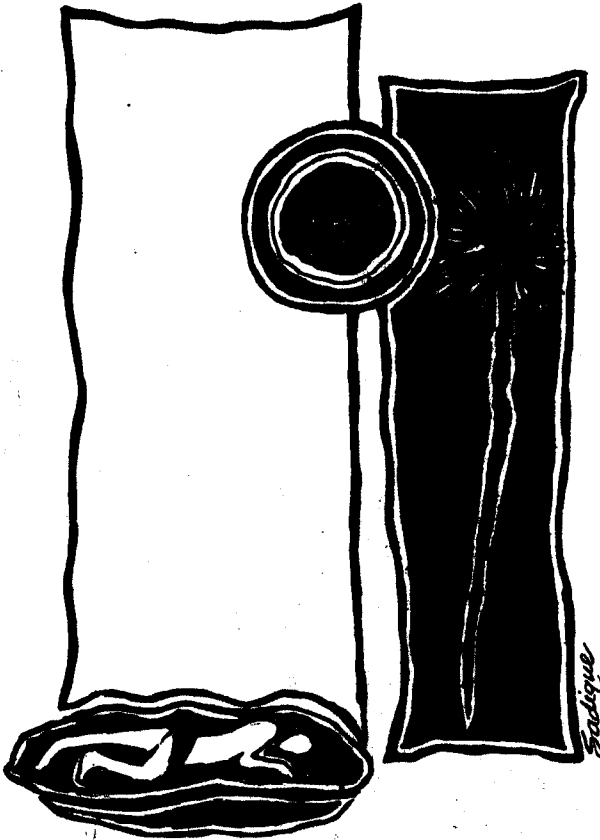
دیباتوش باسو:
ایک شاعر، مترجم اور مضمون نگار،
پیشے کے اعتبار سے مدرّس۔

تشار رائے

کلکتہ : ۱

کلکتہ، تم آگ دہکائے رکھتے ہو لہو کی گہرائیوں میں
کلکتہ، تم ہاتھ سے گندھے ہار ہو ایک نئی نویلی دولہن کا
کلکتہ، تم ڈالی کی گھڑی ہو
یا ایک مہیب قفل
. . . غلط سوراخ میں غلط چابی ڈالتے ہو اور ایک مسلسل مزاحمت کو جنم دیتے ہو
کلکتہ، تم اپنے بازاروں میں
گردن میں پھندا ڈالنے والی مالا بیچتے ہو ——

□□

تشار رائے :
پیدائش، ۱۹۳۸ء، چھٹے دہے کے ایک "ناراض" شاعر، ان کے مجموعے "ہیڈ ماسٹر" کی پذیرائی زور و شور سے ہوئی۔

تشار رائے

کلکتہ : ۲

کلکتہ،
تمھارے بازار رجنی گندھا اور لہو رنگ گلاب کے پھول بیچتے ہیں
ان سے شادی کی سیج سجائی جاتی ہے، یا میت کی کھاٹ
یا پھر ان پھولوں کو کسی عظیم مجاہد کی تصویر کے چوکھٹے پر آویزاں دیکھا جاتا ہے . . .
پھر بھی، اس دن کو یاد کرتے ہوئے —— جب شمشان گھاٹ کی طرف جانے والے کاندھے پر
رکھی چارپائی میں پڑے جیانند داس کا سر اور چہرہ ادھر اُدھر جھول رہا تھا
میں نے سوچا، نہیں، پھول نہیں، اس نے تو ہار کے لیے پر مانگے تھے . . .
لیکن پھر بھی، شام کو، جگناتھ گھاٹ پر گانجہ پینے کے بعد میں نے بچے کی تمنا کرتی ہوئی کسی بانجھ عورت
کی طرح سوچا —— پھول ؟
میں ایک مضحک بیوقوف ہوں !

آسماں بوس عمارتوں کے پہلو میں مگن کام دیو اور زنا کار خانقاہیں اور کھیت
اے شہر، تمھارے روپ پر نظر ڈالتے وقت میں نے اپنی بیوی کے لیے ایک ٹوپ کی بات سوچی،
تمھارا روپ دیکھنے سے میرا معدہ ٹھیک ہو جاتا ہے،
رنگ اور برش خریدنے کے لیے لاہا کے اسٹور کی طرف جاتے ہوئے،
میں پاس والی گلی میں گھس جاتا ہوں، جہاں "ربر کے سامان" کا کاروبار زوروں پر ہے۔

اچھی طرح پھلائے ہوئے، ہوا بھرے غباروں کے ساتھ، لڑکیاں بھٹکتی پھرتی ہیں،
ہندی فلموں کے پوسٹر ٹوٹ بکھرتے ہیں، اور اس پر مجھے تاؤ آجاتا ہے۔
میں تھوکتے وقت چلا اٹھتا ہوں کیونکہ صرافہ بازار میں

میری جنسِ ادب کا بھاؤ کر رہا ہے : پھر میں ہنس پڑتا ہوں، وہاں،
اور اس لیے بھی کہ تین مریل سے پروفیسر
تین طالبات کے مگرمچھوں سے ناپاک کیے ہوئے بھیانک Palk Straits کے بارے
میں سوچ رہے ہیں۔

یہاں تک کہ آسمان بھی دھیرے دھیرے پیلا پڑتا جا رہا ہے
تم سور کلکتہ!
تم پیلا کوڑھ بہاتے ہو، یرقان زدہ پیشاب کی طرح،
ایک عظیم فنکارانہ شاہ کار کی مانند،
پھول/احمق، گنگ، مضحک۔

□□

ؔ لاہا: تصویر کشی کے کام آنے والے سامان کے معروف تاجر جن کا اسٹور دھرم تلہ اسٹریٹ پر ہے۔
اسی سے مدان اسٹریٹ نکلی ہے جہاں ہر کا مانع حمل سامان ملتا ہے۔

سنتانو داس

بہت سی سیاحتوں کے بعد، میں کلکتّہ پہونچتا ہوں

دھماکہ . . . اور کھوپڑی اُڑ جاتی ہے
اندھیرے میں انجانے لوگ اپنی کنپٹیوں کو چھو کر دیکھتے ہیں
پھر بھی، ساری ساری رات
اس بے رحم دیوار کے ٹھیک نیچے
پتیاں، ملائم موم کی صورت ہلکورے لیتی ہیں، رنگ اوڑھتی ہیں
بہار اور بارشیں آتی ہیں اور جاتی ہیں

پُرانے وقتوں کا وارانسی، نجات کی تمنا، اور شباب کا گلشن ——
اسی لیے پہلے سے سمن جاری کرنے کے بعد،
بہت ساری سیاحتوں کے بعد، مَیں کلکتہ پہونچتا ہوں،
اور ہر بار —— ہجرت واقع ہوتی ہے۔
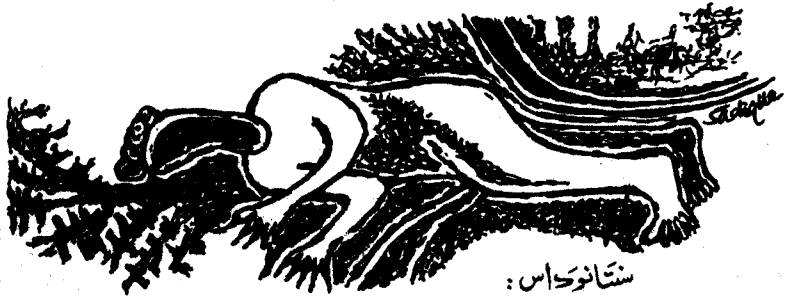
سنتانو داس :
پیدائش، ۱۹۴۲ء، چھٹے دہے کے ایک ممتاز شاعر،
رسالہ گنگوتری کے مدیر۔

تلسی مکھوپادھیائے

میں سوچتا ہوں

کبھی کبھی، میں سوچتا ہوں
کلکتہ میں کئی ہزار پیڑ ہوتے، برگد کے،
آتے جاتے راہ گیر، تھکے ماندے، اچانک رکتے،
تنے سے لگ کر اپنے دُکھ اور سکھ کی باتیں کرتے
گاؤں کی مہک کلکتہ کو شانتی دیتی

کبھی کبھی، میں سوچتا ہوں
برگد کے ہزاروں پیڑوں کا خیال کتنا سہانا ہوتا ——
اس کے بجائے، کلکتہ ایک قابلِ نفرت بھٹی ہے
کسی بھی لمحہ شعلے ابلتے ہوئے
دھوئیں کی چادر
آگ بجھانے والے انجن یوں بھاگتے ہیں جیسے گاؤں میں نوٹنکی کے گائیک
یہ اپنے ضمیر کا رول ادا کرتے ہیں۔
نہ کوئی سایہ —— نہ پل بھر کا سکون
یا ایک دوسرے کی خیر طلبی
بس بھاگے جا رہے ہیں ——

بم برسانے والے جہازوں کی طرح، بس آگے بھاگے جارہے ہیں ———

جیب کتروں کا ڈر

ٹراموں اور بسوں میں اپنی ہزیمت کا ڈر۔

اچانک مار ڈالے جانے کا ڈر۔

کبھی کبھی، مَیں سوچتا ہوں

کتنا اچھا ہوتا جو ہوتے

برگد کے چند ہزار درخت!

تُلسی مکھوپادھیائے ؛

چھٹے دہے کے ایک شاعر

مرنال باسو چودھری
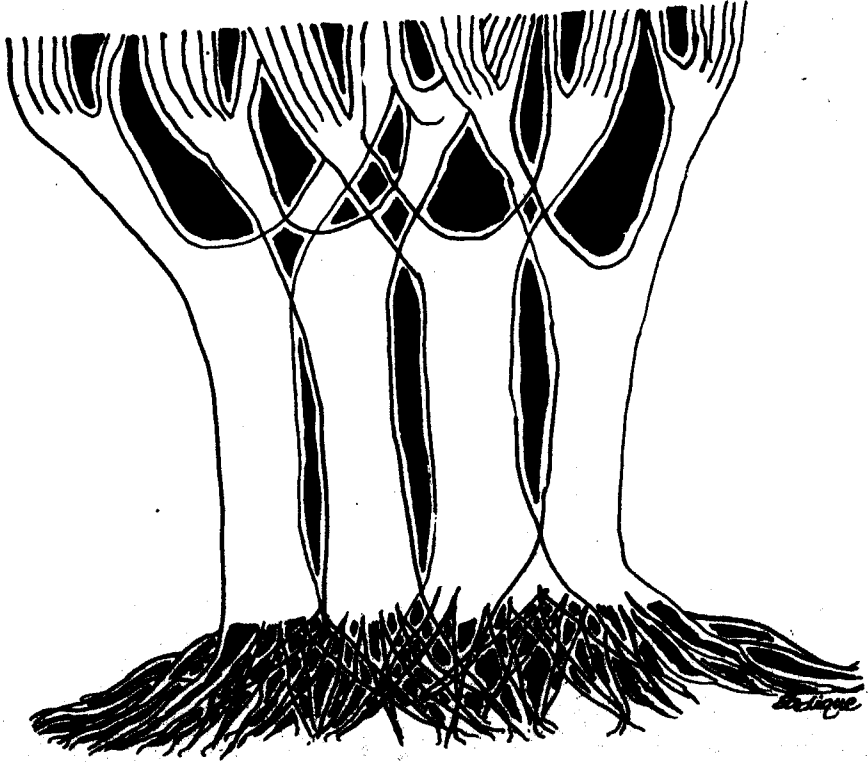
کلکتہ

سچ مچ بُرا وقت آن پڑا ہے
کسی بھی پل، ہر پل
دھماکے کا ڈر ہے
رات اور دن، بلکہ، ہر گھڑی
قصاب خانے کی دھرتی کانپتی ہے
اور کسی ان دیکھے عذاب کے کارن
پورب اور پچھم میں آسمان پہاڑوں جیسی اونچی عمارتوں میں بکھر رہا ہے
جب کہ متنازعہ ندی کے کناروں پر ادنیٰ مناقشے قدم جمائے کھڑے ہیں

حیرانی پوچھتی ہے —— کدھر جائیں؟
جدھر نگاہ اُٹھاؤں
تمہارا زہریلا پردہ پھیلا ہوا ہے
تم بس یہ کہتے ہو ——
جیو یا مرو، کلکتہ کو نہ چھوڑو۔
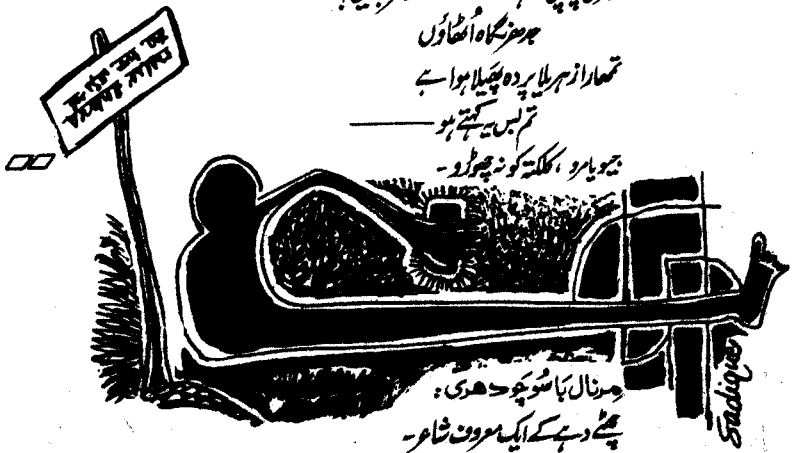
مرنال باسو چودھری:
چھٹے دہے کے ایک معروف شاعر۔

پروبھات چودھری

کلکتے تم مجھے پرائے کیوں لگتے ہو؟

کلکتہ تم مجھے پرائے کیوں لگتے ہو؟
وہ ٹریفک سگنل ایک دم اجنبی ہے
ٹرام لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
کوئی محبوب چہرہ آنکھوں میں نہیں ٹھہرتا
اور اس مشتہر شاہراہ شاہی کا کوئی منظر اس لائق نہیں کہ دعوت دے سکے
بس چالاک لومڑیاں منھ بند اندھیروں میں آباد ہیں

کلکتہ! تم اتنے پرائے کیوں لگتے ہو؟
آتش گیر پاؤڈر سے بھری تمھاری ہوائیں کچھ زیادہ ہی اجنبی ہیں
کوئی کارواں سرائے نہیں جہاں دم بھر کو رک کر سانس لی جائے
ان مناظر سے پیچھے کوئی عورت نہیں جو محبت کی طالب ہو

جاب چارناک کے کلکتہ!
تمھیں کب عقل آئے گی
تمھاری جڑوں کے سائے سے
تمھارے اپنے پانی اور تمھاری اپنی ہواؤں سے
مجھے کب وہ فطری غذا ملے گی جو ایک بیٹے کو ملنی چاہیے

کلکتہ! تمھارا گھاؤ کتنا گہرا ہے، اسے بھر جانا چاہیے،
اس سے پہلے کہ میں پرایا نہ رہ جاؤں
اور سحر زدہ ہو جاؤں؟

پروبھات چودھری:
چھٹے دہے کا ایک معروف نام۔

سمسیر انور

کلکتہ اور میرا تنہا بستر

میرے خوابوں میں کوئی وردِ بہ طلوع نہیں ہوتا
بھول اور بیوقوفی کے سوا تاریخ کے کوئی معنی نہیں
وہ عورت جس نے میرا کھنڈر تراشا تھا، اس کے قہقہے کا سفاک نقش
تاریخ کے صفحات سے چپٹا ہوا ہے

مجھے پتہ ہے، انسان کا عروج کلیو کے آنچل سے بندھا ہوا نہیں ہے
مجھے کسی سچائی کی فکر نہیں سوا اس کے جو کلکتہ اور میرے تنہا بستر کی
حفاظت میں ہے

جیسی پھوار میں میں ٹہل رہا ہوں، سر جھکائے، ایک مظلوم شخص کی صورت
میرے دل میں دُور تک سوراخ کر دیا گیا ہے گرچہ مجھے گولی نہیں ماری گئی
اور ہر رات اپنے گولیوں سے چھلنی پھیپھڑے کو سنبھالے میں گھر لوٹ آتا ہوں
میرے قدموں کی چاپ موت جیسی گمبھیر گونجتی ہے اور میں اس فٹ پاتھ کی
طرف بڑھ جاتا ہوں
اور اگر تاریخ کا مفہوم ایسی تنہائی تک واپسی ہے
تو میں اسے قبول کرتا ہوں

مجھے کسی دکھ سے خالی اشوک یا بابر کے سمندر کے کنارے کسی محل کی خبر نہیں

کوئی بنا لتا ستین بستر سے لگی میری راہ نہیں دیکھتی ! اس کے برعکس
ایک بجید شاداب پاٹری بوس کی چھاتیاں ہینڈ کوں کی طرح جاگتی رہتی ہیں

بالوں میں سستے تیل کی بدبو کے ساتھ
جب میں بریشا کی سیاہی کھوجنے کے جتن کرتا ہوں تو ہونٹوں پر ایک اضطراب آمیز ہنسی
پھیل جاتی ہے

پیروں کے نیچے خنجر جیسی دھاردار سورج کی دھوپ،
میں کہہ نہیں سکتا باہر بارش کتنی سہانی ہے
سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ میں نے یادوں کے پیار کو کھلا چھوڑ دیا ہے
بخار ابھی آنا باقی ہے پھر بھی میں اس کے سحر میں ہوں
اور دوپہریں گزرتی رہتی ہیں جب کہ میں مسلسل پیتے پیتے مدہوش ہو جاتا ہوں
میری راتوں کی ساعتیں جلنے لگتی ہیں جب میں مارواڑی جوڑے کو بے شرمی کے ساتھ
مباشرت کرتے دیکھتا ہوں
اور میں پھر لاحاصلی اور بے چارگی کے بے کراں کنارے پر لوٹ آتا ہوں

میرے گلے میں جلن ہونے لگتی ہے جب میں کسی غیر ملفوف بلیڈ پر نظر ڈالتا ہوں
مجھے سنہری گرمیں یاد آتی ہیں جب نگاہ کانٹوں پر پڑتی ہے
میں اپنی ماں تک کا چہرہ پہچاننے میں ناکام رہ جاتا ہوں
جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں، میں سوچتا ہوں، کون ہے یہ عورت
میں اس کے بدن کا حصہ تھا مگر وہ مجھے یاد نہیں
گو کہ ہر رات دو بجے اس کے دل کا لہو میری پلکوں سے بہتا ہے

میرے بستر سے لگا، کوئی کھڑا ہے، کسی قاتل کی طرح
پنجے میں ایک کٹار جکڑی ہوئی، آنکھیں چہرے پر دہکتی سی . . .
بارش اور کہرے میں، لیمپ پوسٹ کے نیچے، ایکدم اکیلا، میں بائیس برس تک کھڑا رہا
اور اپنے کندھوں کو موڑ کر میں نے دکھ کے پیچیدہ کھیل دیکھے ہیں
اور ایک دن سوتے سوتے میں قتل کر دیا جاؤں گا
کہرے اور بارش میں اسی طرح بائیس برس تک کھڑے رہنے کے بعد۔
میرے سینے میں کوئی نرم گوشہ نہیں
تہذیب کی ان تخلیقات کے لیے جو میرے سینے سے باہر
جوان ہوئیں

مجھے کسی بیچارگی کی فکر نہیں سوائے اس کے جو کلکتہ اور میرے بستر کی پیش کردہ ہے۔ ▭▭

لہ بناالتاسین : جیبانند داس کی مشہور نظم کے ان مصرعوں کی طرف اشارہ ہے۔

میں جیون کے بہت سارے راستوں کا تھکا ہارا مسافر ہوں
سیلون کے پانیوں سے ملایا کے سمندر تک اندھیروں میں بھٹکا
بمسار اور اشوک کی پرچھائیوں میں . . .
کھوئی ہوئی ایک آتما، اے جیون ساگر میں کھوئے جھاگ،
مجھے ناٹور کی بناالتاسین کی سنگت میں پل بھر کے لیے شانتی ملی
اس کے بالوں میں بدلشا کی کھوئی گئی راتیں ہیں . .

شمشیر انور:
چھٹے دہے کے شعری میلانات سے وابستہ ایک اہم نام۔

سُبراتا چکرورتی

مادامُ کی کھڑکی

آدھی رات کو یہ شہر ڈزنی لینڈ بن جاتا ہے
جھکا ہوا آسمان نیچے دیکھتا ہے پیڑ، دھندلے گھر
پھر سب کے سب گم ہوجاتے ہیں گھوڑوں کے نفخ میں، صرف یادیں رہ جاتی ہیں
اور سینے میں ایک غیر متوقع قاتل۔
شام کو، وہ لوگ جو سب سے زیادہ قریب ہیں کہیں دکھائی نہیں دیتے،
آدھی رات کو اکیلی سُنسان سڑک پر طوفان اُبلتا ہے
میرا جی چاہتا ہے سڑک کو چاٹنے لگوں ——— یہ شہر
میرا پیارے، میری کڑوی ذلّت اور میری حماقت!
ہر لمحہ سارے آسمان پر رنگین غبارے اُڑتے ہیں۔
ساری کھڑکیاں سیاہ ہیں، بس ایک کے سوا:
پری کتھاؤں کی یہ کھڑکی روشن رکھتی ہے
محبت اور نخوت کے مریع اجالے کو۔
میں کسی بھکارن کی طرح سارے شہر میں بھٹکتا پھرتا ہوں،
ڈزنی لینڈ، ڈزنی لینڈ ——— آدھی رات ———
اور یہ کھڑکی بھی دوریوں میں معدوم ہوجاتی ہے،
ننگے بدن پر کوئی کتنی ضربیں سہہ سکتا ہے!

سُبراتا چکرورتی:
چھٹے دہے کے شعری منظر نامے کا ایک اہم نقش۔

اشیش مکھوپادھیائے

جب کلکتّے میں ہنسا جاگتی ہے

میں جاگ رہا ہوں، تم سب فرار ہو سکتے ہو
جب رات گئے کلکتہ نیند میں ڈوبا ہوا ہو . . .
اس کے پیڑ، ٹہنیاں اور پتّے کانپتے ہیں،
بھاری گاڑیوں کے پہیے تیزی سے بھاگتے ہیں۔
"ابھی کون رہ گیا ہے؟" "کون لوگ اب تک اپنے گھروں سے چپٹے ہوئے ہیں؟"
—— صرف پڑوس کی بستی میں بارود کی مہک ہے،
صرف ہم اندھیرے میں چپ چاپ دیواروں کو پار کر رہے ہیں۔

قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا ہے، اچھا ہوتا کہ تم بھاگ جاتے، ابھی تمھاری تلاش نہیں ہے . . .
دیواروں پر نعرے تباہی کی گھڑی کا اعلان کرتے ہیں،
صبح بارود کی بُو اگلے گی
—— گرچہ پھول کھلتے رہیں گے ——
اور شکاری کو ہر طرف سے گھیر لیں گے . . .
"میرے پیچھے تم کون ہو؟ آؤ سامنے آؤ!" . . .
دل لال ہے، ہاتھ لہولہان، پھر بھی ہم بے موت جیے جاتے ہیں،
ہم اندھیرے میں چپ چاپ دیواریں پار کر لیتے ہیں۔

اشیش مکھوپادھیائے :
چھٹے دہے کے ایک شاعر۔

شہر پناہ کے باہر

دُنیا سے بہت قریب ہوئے بغیر بھی اسے جانا جا سکتا ہے۔

اس احساس میں میرا یقین دھیرے دھیرے تنہائی کی اُن گھڑیوں میں پختہ ہوتا گیا جب اِن نظموں کی ڈور تھامے ایک تنویم زدہ کیفیت کے ساتھ میں نے بند آنکھوں سے کلکتہ کے گلی کوچوں، بازاروں، بستیوں اور ویرانوں میں پھیلے ہوئے رنگ دیکھے۔ پھر میں اُس سیاہ روشن نُقطے تک پھونچا جس میں آج کی کھلی دھوپ کے ساتھ بیتے ہوئے اور آئندہ موسموں کے رات اور دن، اندھیرے اور اُجالے نے ڈیرہ جمایا ہے۔

یہ ایک انوکھا سفر تھا جس کی لذت رگ و پے میں تلخی، تندی، اضطراب اور الم آلود آرزومندی کا ملا جلا پُراسرار نشہ سے دوڑا دیتی ہے۔ کلکتہ کے ظاہر اور باطن ایک دوسرے میں اس طور پر گھل مِل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا محال ہے، سو یہ سفر اس دُنیا کا بھی ہے جو دکھائی دیتی ہے اور اس کا بھی جو ایک زمین دوز لہر کی طرح اینٹ اور چونے اور سیمنٹ اور فولاد اور کولتار کی پرتوں کے نیچے جاری و ساری ہے۔

گئے دنوں میں شہر اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز ہوتے تھے اور فصیل سے باہر جنگل ہوتے تھے، یا کھیت یا ویرانے لیکن مجھے، اس طلسم، نرم آثار، دردِ دہشت اور شعر، تصویر، رقص اور نغمے سے ایک ساتھ لبالب بھرے ہوئے شہر سے نکلنے پر، شہر پناہ کے باہر بھی انجانی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور چُبھتے ہوئے رنگوں کا ایک سیلاب پلکوں کی منڈیر سے ٹکراتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ کلکتہ بچھڑنے کے بعد بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے، ایک تجربہ، یا خواب، یا اُمید یا درد بن کر۔

ایک قصبہ نما شہری بستی میرا وطن ہے جہاں میں نے اپنا بچپن گذارا۔ گھر سے تھوڑی دور پر گومتی کا کنارا تھا اور کنارے پر سیتا کُنڈ۔ کہتے ہیں کہ بن باس کو جاتے ہوئے رام وہاں ٹھہرے تھے اور سیتا نے وہاں غسل کیا تھا۔ ایودھیا کا فاصلہ وہاں سے کُل اٹھارہ کوس ہوگا۔ ہر آبادی کے اپنے تجربے، دُکھ سُکھ، آسائشیں اور اُلجھنیں ہوتی ہیں۔ اُس بستی کے تجربے بھی میرے وجود کا حصّہ بن چکے ہیں لیکن یہ تجربہ بس دو سمتوں میں سفر کرتا ہے، ماضی اور حال۔ کلکتہ پہلا شہر ہے جس کے سفر میں اَن دیکھی تیسری سمت کے تجربے بھی شامل ہیں جس کا نام مستقبل ہے۔ شاید اسی کارن کلکتہ کے شاعر پرانے وقتوں

کی کہانیاں اگر سناتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ان کے واقعات ماضی اور حال کی کسی سیڑھی پر تھک کر بیٹھتے نہیں دکھائی دیتے۔

بنگال کی بھوکی پیڑھی کے ایک شاعر سے بیٹ نسل کے ایک ریڈیکل شاعر نے کہا تھا:

> مغرب کی موت کا سلسلہ ۱۸۰۵ء کے آس پاس شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے بہتیرے شاعر قسطوں میں ایک لمبا ماتمی گیت گاتے آئے ہیں۔ ولیم بلیک نے اس کا آغاز کیا تھا۔ گیٹے، بودلیئر، لوترے موں، ریں بو، ہولڈرلن (غیر شعوری طور پر) پاؤنڈ، ایلیٹ، کرین اور دوسرے تمام مانوس ناموں نے یہ منتر جاری رکھا ہے۔ ہم ان کے وارث ہیں اور شاید ان کا حرفِ انجام بھی کیونکہ ہمارا عہد اور مایوسی اور وہ جمالیاتی خودکشی، جس کے ہم اہل ہیں، اس کے خاتمے کا اعلان کرے گی۔
>
> —— ہاورڈ میکارڈ کا خط ملے رائے چودھری کے نام

مجھے کلکتے پر یہ نظمیں اسی منتر کے اختتام کا اعلان نامہ نظر آتی ہیں کہ ان میں ماتم، نوحے اور مرثیے سے زیادہ ایک گہری سماجی برہمی، احتجاج، ہر اس سچائی سے جو بیکار ہو چکی ایک دوٹوک انکار، ایک تمنا پروری اور ایک تخریبِ آزمودہ کوشش تعمیر کا آہنگ ملتا ہے۔ اس طرح یہ نظمیں ایک نئے جمالیاتی ذائقے اور کردار کی حامل ہیں۔ اس کردار سے اردو کی نئی شاعری کا تعارف ابھی مکمل نہیں ہوا۔

سیاسی اور نظریاتی شاعری کے سلسلے میں میرے اپنے تحفظات ہیں، کچھ تعصب بھی۔ سو میں ان نظموں کی فنی قدر و قیمت کے تعین کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے ان نظموں میں ایک پائدار مجنونانہ تعقل، ایک معنی خیز، دیرپا اور دوررس معروضی جذباتیت دکھائی دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے پڑھنے والا ان اصطلاحوں میں آپ اپنی تردید کا نشان ڈھونڈ نکالے اور میرے تاثر کو مہمل سمجھ کر فخر محسوس کرے۔ میں اپنے تجزیے پر اصرار نہیں کرتا لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ شعر کے کچھ ڈھب مروجہ شعری تنقید اور بار بار کی برتی ہوئی اصطلاحوں کے دائرے میں نہیں سمٹنے پاتے۔ یہ نظمیں اگر تفہیم، تجزیے اور تاثر آفرینی کے ایک نئے معیار، ایک نئے تجربے اور ایک نئے چیلنج کا مطالبہ کرنے سے قاصر ہوتیں تو میں نے ان کی رفاقت میں اتنا وقت نہ گزارا ہوتا۔ محض معلومات میں اضافے کے شوق کو میں بہت مستحسن اور کافی نہیں سمجھتا۔

اس تجربے تک رسائی مین را کے توسط سے ہوئی۔ اسی نے نظمیں اور کتابیں فراہم کیں۔ میں نے ان نظموں کے سلسلے میں کچھ شکوک اور اس کام کی بابت اپنی اہلیت کے تئیں کچھ جھجک کے ساتھ یہ سفر شروع کیا تھا۔ گھر سے باہر ایک بار نکل جائیں، پھر کہیں نہ کہیں تو پہونچ ہی جاتے ہیں۔ اس وقت کلکتہ کی سیر کے بعد شہر پناہ سے باہر کھڑا میں سوچ رہا ہوں کہ سفر شاید رائیگاں نہیں گیا۔ یہی احساس ان صفحات کی اشاعت کا جواز ہے۔

دلی شہر: ۲۰ مئی ۱۹۷۸ء

—— شمیم حنفی

تیسری دُنیا

اے ارضِ فارس

(ایک کمپوزیشن)

ترجمہ، ترتیب:

شمیم حنفی

ایرانی طلبا کے نام

مگر وقت مضراب ہے
اور دشمن اب اس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہوا
اس کے نچلے افق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے!
ہمارے صبر خندہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے!

● ن۔م۔ راشد : تمثیل کے سوداگر

فَصلِ اوّل

پہلا منظر

بہت دن ہوئے، جمشید کے زمانے میں کہ نام جس کا جامِ جہاں نما کے سبب چار دانگِ عالم میں مشہور ہوا' دشت نیزہ گذاراں (تازیان) کا حکمراں ایک مردِ نیک سرشت مرداس نامی تھا مشیتِ ایزدی کہ فرزند اُس عزیز کا نہایت بدخصلت نکلا۔

پدر اس کا اپنی پاکبازی کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام تھا اور پسر کہ نام جس کا ضحاک تھا اپنی ناپاکی کے سبب بدنام تھا۔ ایک روز ابلیس کے بہکاوے میں آکر اس ناہنجار نے سر اپنے باپ کا تن سے جُدا کر دیا۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ابلیس نے اس کے شانوں کو بوسہ دیا اور ہونٹ جس مقام پر اس شعلہ پیکر کے مس ہوئے تھے، دیکھتے دیکھتے وہاں دو سانپ نمودار ہوئے۔

ضحاک نے ایک سے ایک حاذق طبیب طلب کیا کہ سانپوں کے قہر سے نجات پائے۔

مگر آدمی کی کیا مجال کہ قدرت کے کارخانے پر اپنا حکم چلائے۔ سو ہوتا یہ تھا کہ جونہی اطبّا ان سانپوں کو ضحاک کے بدن سے منقطع کرتے، ونہی دو نئے سانپ نمودار ہو جاتے اور ضحاک کو ڈسنے لگ جاتے۔

آخر کو وہی بدی کا پتلا ابلیس بھیس میں ایک طبیب کے ظاہر ہوا اور علاج اس عجیب و غریب مرض کا یہ تجویز کیا کہ ہر روز دو جوانوں کے مغز سے پیٹ سانپوں کا بھر جائے۔

چار و ناچار ضحاک اسی مشورے پر عامل ہوا۔ ہر روز دو جوان پکڑ کر لائے جاتے، جنھیں قتل کرنے کے بعد مغز ان کا سانپوں کو غذا کے طور پر نذر کر دیا جاتا۔

کہتے ہیں کہ ضحاک نے لمبی عمر پائی۔ ایک دن کم ایک ہزار برس جیا۔ اسی حساب سے کوئی سات لاکھ جوانوں کے مغز اُس کے سانپوں کی غذا بنے۔ اے عزیزو! کرۂ خاک پر باقاعدہ آدم خوری کی یہ پہلی واردات تھی:

چنان بد کہ ہر شب دو مرد جوان	چہ کہتر چہ از تخمۂ پہلوان
خورشگر ببردی بایوان شاہ	ہمی ساختی راہ درمان شاہ
بکشتی و مغزش بپرداختی	مران اژدہا را خورش ساختی

——— فردوسی

دوسرا منظر

بہت دن ہوئے، عیسیٰ مسیح سے کوئی پانسو ستر برس پہلے، اُس قریۂ ارض پر جسے آج لوگ
آذربائیجان، ہمدان اور کرمان شاہ کے نام سے پکارتے ہیں، ایک جابر بادشاہ حکومت کرتا تھا۔
ایک عالم اُس ظالم کے قہر سے ڈرتا تھا اور محض دکھاوے کے لیے اس کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔
ایک روز، بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اپنے فرزند کو دربار میں حاضر کرے۔ قصور اس وزیر زادے
کا یہ تھا کہ ظالم بادشاہ کے نواسے سائرس سے اس کا یارانہ تھا۔ اور جرم اُس بدنصیب وزیر سے اصل میں
یہ سرزد ہوا تھا کہ اُس نے بادشاہ کے احکامات کی پیروی میں سائرس کی جان نہ لی۔ نجومیوں نے
بادشاہ کو بتایا تھا کہ آگے سائرس اپنے نانا کی حکومت کا تختہ پلٹ دے گا۔
جس روز وزیر زادے نے دربار میں حاضری دی، اسی شام وزیر کی بھی طلبی ہوئی۔ بادشاہ نے
وزیر کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ وزیر کی ضیافت کے لیے کھانا منگایا۔ اور وزیر کہ حقیقت حال سے
بے خبر تھا اور ظالم بادشاہ کی غیر متوقع نوازشوں سے متحیر، اس ظالم کے حکم کی تعمیل میں اس نے خوب
ڈٹ کر کھایا۔
کھانا ختم ہوا تو بادشاہ نے تالی بجائی۔ پھر سامنے اس کے ایک سنہری قاب آئی۔ وزیر نے قاب پر
پڑا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں اپنے فرزند کا کٹا ہوا سر پایا۔ گوشت بیٹے کے بدن کا پہلے ہی
وزیر کے معدے میں پہنچ چکا تھا۔
یہ سزا تھی وزیر کی نافرمانی کی، جبھی تو بادشاہ نے ایسی انوکھی من مانی کی۔
نجومیوں کی پیش گوئی کے مطابق انجام کار سائرس نے نانا کی حکومت کا تختہ پلٹا اور
داغ بیل ایک نئی حکومت کی ڈالی۔ سلسلہ اسی کی حکومت کا آج تک ولایت عجم میں چلا آتا ہے۔

——— رضا براہنی

تیسرا منظر

کچھ سال پہلے، اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے اپنی سلطنت کا پچیس سو سالہ جشن برپا کیا۔ جشن سے
پہلے کوئی دس ہزار مشکوک لوگ گرفتار کیے گئے اور انھیں اذیت کدوں میں بھیج دیا گیا کہ جشن کے
موقع پر رنگ میں بھنگ نہ ڈالیں۔ اخباروں پر شاہ کی خفیہ تنظیم ساواک نے گرفت مضبوط کر لی کہ باہر کے لوگوں تک صحیح
خبریں پہنچ نہ سکیں اور مشرقِ وسطیٰ کے نام نہاد "جزیرۂ استحکام" کی حرمت پر حرف نہ آئے۔
اس جشن میں ملک ملک کے بادشاہ، شہزادے، امرا، سلاطین اور عمالِ حکومت جوق در جوق
شریک ہوئے۔

آگے کا منظر، بقول رضا براہنی ٹیلی وژن کے پردے پر یوں اُبھرتا ہے کہ شاہ ایران نپے تلے قدموں
سے سائرس کے مقبرے کی طرف بڑھتا ہے۔ پیچھے اس کے معززین کی صفیں ہیں۔ شاہ اپنی نحیف آواز میں اس مکالمے
کی ادائیگی کرتا ہے:

"سائرس، تم سکون کی نیند سوتے رہو! میں جاگ رہا ہوں!"

سائرس کے مقبرے کے چار طرف پھیلے ہوئے میدانوں میں دھول اُڑ رہی ہے۔
تقریب کا آغاز ہوتا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں شاہی محافظوں اور ساواک کے ایجنٹوں نے داڑھیاں بڑھا
رکھی ہیں، مختلف ادوار کی ایرانی حکومتوں کی فوجوں کا انھوں نے سوانگ بھرا ہے۔ اچانک کھلے میدانوں میں اتنی دھول اُڑنے لگتی
ہے کہ بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، اُمرا اور سلاطین کے چہرے غبار میں چھپ جاتے ہیں۔
اس موقع پر دعوت کی تقریب میں شراب کی پچیس ہزار بوتلیں صرف کی جاتی ہیں۔

"اُسی روز کرۂ ارض کے سب سے دولت مند لوگوں نے افلاس کے پچیس ہزار برس کی یاد
بائیں طور منائی۔ بچے کھچے کو اپنے عشرت کدوں میں جا پہنچے۔ ان میں ایک
نے بھی یہ نہیں سوچا کہ سیاسی تبدیلی کس حال میں ہیں۔ چین اور سوویت یونین کے نمائندے
بھی اس باب میں اتنے ہی خاموش تھے جتنے کہ مغرب کے نمائندے ——!"

چوتھا منظر

تشدد اور بے حسی کی یہ کہانی بہت پرانی ہے۔
پہلوی خاندان نے اسی خاکے میں کیا کیا رنگ بھرے ہیں! زمانۂ حاضر کے ایک مورخ حسین مکّی سے روایت ہے کہ اس خانوادے کے بانی رضا خاں نے شاہی اختیار حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے جبر کا ڈنکا بجا رکھا تھا۔ مخالف پارٹیوں کے اراکین کو شکر کے کھولتا ہوا پانی ان کے جسموں میں پمپ کر دیا جاتا تا۔ سات برس کے بچوں سے لے کر ستر برس کے بوڑھوں تک کوئی اس قہر سے محفوظ نہ تھا۔ ایک روز رضا خاں نے حکم دیا کہ ملک الشعرا بہار کا سر قلم کر دیا جائے۔ اس کے آدمیوں نے بھول سے بہار کی جگہ ایک شخص واعظ قزوینی کو گرفتار کیا اور پارلیمان کے احاطے میں سر اس کا تن سے جدا کر دیا۔

پانچواں منظر

عکاس : رضا براہینی

"جیل میں ہمیں گوشت کم ہی کھانے کو ملتا تھا۔ ہماری غذا ٹھنڈے چاولوں اور ان پر
چٹنی کی صورت پڑے ہوئے ایک غلیظ سیال پر مشتمل تھی، جسے کھا کر ہم تبض کے شکار ہو جاتے
یا ہمیں دست آنے لگتے۔
ایک روز شاہ کے آدمی ایک نوجوان کو پکڑ لائے۔ دوسرے دن اسے اذیت کدے میں لے جایا گیا۔
پھر اس کے بعد ہم نے اس کی شکل نہ دیکھی۔ دو روز گزرے تو ایک گارڈ نے میرے کان میں
سرگوشی کی ——— 'تمھیں وہ دبلا پتلا لڑکا یاد ہے؟ اسے اتنی اذیت دی گئی کہ جان سے ہاتھ
دھو بیٹھا'۔
اگلے دن میں ایک شخص علی کے ساتھ اپنی کوٹھری میں تھا۔ کھانا آیا۔ اس میں بے رنگ گوشت
کے پتلے پتلے ٹکڑے بھی تھے۔ علی حیران ہوا اور اس متلی پیدا کرنے والے پیالے سے نظر اٹھا کر
بولا ——— 'یہ کیا؟ میں پچھلے دو مہینوں سے اس جیل میں ہوں اور کبھی گوشت کھانے کو نہیں
ملا، پھر یہ آج اچانک ———!'
دفعتاً شاید جبلی طور پر ایک دوسرے قیدی نے کہا ——— 'یہ گوشت جسے ہم کھا رہے
ہیں، ہو سکتا ہے اُسی لڑکے کا ہو!'
پھر ہم کچھ نہ کھا سکے ———
ہو سکتا ہے یہ محض ہمارا وہم ہو۔ لیکن یہ سوال ذہن میں رہ رہ کر سر اٹھاتا ہے۔
سینکڑوں ایرانی نوجوان جن کی اوسط عمر اکیس برس ہوگی، پچھلے چھ برسوں میں
ہی ختم کر دیے گئے ——— سڑکوں پر، فائرنگ اسکواڈ کے ہاتھوں، اذیت کدوں
میں۔ ان کی لاشیں کہاں گئیں؟ حکومت نے ایک بھی لاش پسماندگان
کو واپس نہ کی۔ انھیں کہاں دفن کیا گیا؟ صرف ۱۹۷۶ء میں فائرنگ اسکواڈ
یا ٹورچر کی تاب نہ لا کر مرنے والوں کی تعداد کم سے کم سو ہوگی ——— ان
نوجوان مردوں اور عورتوں کی لاشیں کہاں ہیں؟
اس سوال کا جواب صرف ایک شخص کے پاس ہے ——— شاہِ ایران!"

سلاخوں کے پیچھے فقط چند شوریدہ سر بے شعور!

—— ن ۔م ۔ راشد : ایک شہر

اچانک میں جاگ اٹھتا ہوں۔

میں سچ مچ سو رہا تھا یا ڈرانے خواب دیکھ رہا تھا؟ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

لیکن انھوں نے دروازہ اتنے دھیرے سے کیسے کھولا؟ دروازے پر ٹاکر آزودی کھڑا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیر سے دیکھ رہا ہوگا۔

اس کے پیچھے گارڈ ہے جو میری طرف دیکھ رہا ہے۔ دوسری تمام کوٹھریوں میں مکمل خاموشی ہے۔ یہ آدھی رات کا وقت ہوگا۔

"تم جو ایک یونیورسٹی کے پروفیسر ہو، ایک معروف شاعر ہو اور ایک ممتاز صحافی ——

تم نے ایسی حرکت کیوں کی کہ ہم تمھارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کرنے پر مجبور ہوئے؟"

"لیکن، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

وہ اندر آتا ہے، گارڈ کو دروازہ بند کر کے چلے جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

"تم نے کچھ تو کیا ہوگا، نہیں تو یہاں نہ ہوتے!"

"کوئی غلط فہمی ہوئی ہے —— میں نے کچھ نہیں کیا!"

"کوئی غلط فہمی نہیں —— اس ملک کا ہر باشندہ —— فوج کے معمولی سپاہی سے لے کر قوم کے سربراہ تک —— سب جانتے ہیں کہ تم غدار ہو!"

"کس کا غدار؟"

"بادشاہ کے اور ملک کے!" میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ ہاتھ اٹھاتا ہے اور میرے ہونٹوں کو چھوتا ہے —— "تم غدار ہو! ہمارے پاس تمام ثبوت موجود ہیں!"

وہ مجھے پوری طاقت سے ایک طمانچہ مارتا ہے۔ میں فرش پر گر پڑتا ہوں۔ وہ مجھے پے بہ پے ٹھوکریں لگاتا ہے اور مجھ پر گھونسوں کی بارش شروع کر دیتا ہے۔ میں چیخنے لگتا ہوں۔ مجھے اذیت کدہ کے تجربے نے بتایا ہے کہ جب جب میں چیخنے لگتا ہوں، مجھے تھوڑا سا سکون مل جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کی نیندیں بھی اچٹ جاتی ہیں اور چونک کر وہ بھی چیخنے لگتے ہیں۔ وہ مجھے مارتا جاتا ہے اور گالیاں بکتا جاتا ہے۔

"میں نے اس کوٹھری میں بیس سے زیادہ شاعروں کے ساتھ بدفعلی کی ہے! سمجھ گئے تم میرا مطلب؟ میں نے انھیں اوندھا کر دیا . . . اگر تم تبو لتے نہیں تو تمھارے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جائے گا۔ سمجھے؟"

میں چیختا رہتا ہوں۔

وہ دروازہ کھولتا ہے اور دوسرے قیدیوں سے چیخ کر کہتا ہے —— "تم سب سو جاؤ، چپ چاپ حرامیو!"

وہ اس کی آواز پہچانتے تھے۔ اچانک سب کے سب چپ ہو گئے۔ میں رینگ کر کوٹھری کے ایک کونے میں چلا جاتا ہوں ——

—— رضا براہنی

دوسرا منظر

میری کوٹھری میں ایک نوجوان لایا جاتا ہے —— فیکلٹی آف سائنس اینڈ انڈسٹری سے تازہ وارد۔
ہم سب کے یونیفارم میلے ہیں۔ اس نے چست پتلون اور ایک ستھری رنگین قمیض پہن رکھی ہے۔ اسے یقین ہے کہ گھنٹے بھر میں اسے رہا کر دیا جائے گا۔ ایک قیدی مصطفیٰ، جو اصفہان کا باشندہ ہے، مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس نوجوان کو یہ اصلیت بتا دوں۔
میں پہلے ہی، سزا دینے والوں یا اذیت رسانی کی خدمت انجام دینے والوں کی عادات کے سلسلے میں ایک ماہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں
میں اسے بتاتا ہوں کہ ابھی وہ آئیں گے اور اسے اذیت کدہ میں لے جائیں گے۔ میں بتاتا ہوں کہ ڈرنا بے سود ہے۔ ہم ان تجربوں سے گزر کر بھی زندہ ہیں۔ سو، وہ بھی زندہ رہے گا!
وہ لڑکا کہتا ہے —— "لیکن یہ غلط ہے! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا!"
میں اسے جواب دیتا ہوں کہ اکثر لوگ جو یہاں آئے، بے قصور تھے۔ پھر بھی انھیں اذیت دی گئی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہے اور انتظار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ آدھمکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں پر ایک گندی پٹی چڑھا دی جاتی ہے۔ پھر وہ ان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔
کچھ دیر بعد، کوٹھری کا دروازہ کھلتا ہے۔ گارڈز ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو اندر دھکیل دیتے ہیں۔ اس لڑکے کو بجلی کے شاک دیے گئے تھے، اور اُسے مختلف طریقوں سے ٹورچر کیا گیا تھا۔ ہم بہ مشکل اسے یا اس کے جسم کو، یا اس کی پتلون اور قمیض کو پہچان پاتے ہیں۔ دروازہ جب پھر باہر سے بند کر دیا جاتا ہے تو میں اس کے پیر دیوار کی جانب پھیلاتا ہوں، اس کا سر اپنے گھٹنوں پر ٹکا دیتا ہوں، اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں سنبھالتا ہوں اور وہ سالن جو ہم نے اس کے لیے بچا رکھا تھا، اس کے مُنہ میں انڈیلتا ہوں —— پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا کر کانٹے اور چمچے کو وہ خطرناک چیزیں سمجھتے تھے اور ہمیں یہ کچھ رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ پھر میں اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر غسل خانے کی طرف لے جاتا ہوں۔
اس سے پہلے بھی میں کئیوں کو اسی طرح اُٹھا کر لے گیا ہوں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اسی طرح میری پیٹھ پر لدے لدے وہ حاجت رفع کر لیں۔ بس یہ کوشش کریں کہ پیشاب نہ آ جائے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس حالت میں پیشاب روکنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر میں انھیں آبدست دیتا ہوں —— اور واپس کوٹھری میں لے آتا ہوں۔ انکسار اور خدمت کا سبق ہم اسکولوں میں نہیں سیکھتے۔ یہ سبق ہمیں ایرانی قید خانوں میں سکھایا جاتا ہے ——
"یہ تم ہو؟ رضا براہینی؟ باہر تو یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ تم مار ڈالے گئے۔ سبھی کو اس افواہ پر یقین ہے —— لیکن! میں اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاؤں؟ یہ سب کیا ہے؟"
—— یہ الفاظ کوٹھری نمبر ۱۸ کے قیدی کے ہیں، جس سے اچانک غسل خانے میں ملاقات ہو جاتی ہے۔
میں جواب دیتا ہوں —— "ابھی میں زندہ ہوں!"

—— رضا براہینی

تیسرا منظر

مجھے بلا کسی وارنٹ یا الزام یا سبب کے حراست میں لیا گیا تھا۔ تہران، اردبیل، زنجان اور آبادان میں ——— بارہ برس مسلسل مجھے اذیتیں دی گئیں۔ انھوں نے مجھے اڑتالیس گھنٹوں تک بھوکا رکھا، اس حالت میں کہ میرے ہاتھ پیچھے ہتھکڑیوں میں جکڑ دیے گئے تھے اور ایک کال کوٹھری کی چھت سے مجھے لٹکا دیا گیا تھا۔ ہتھکڑیوں اور پیچھے بندھے ہاتھوں کی وجہ سے میری کلائیوں، بازوؤں، سینے اور کاندھوں پر ناقابلِ برداشت دباؤ پڑ رہا تھا۔ اسی حالت میں میرے جھولتے ہوئے جسم کی کنپٹی پر پستول رکھ کر کسی نے میرے کان میں چیختے ہوئے کہا ——— "بتاؤ! قبول کرو! نہیں تو دماغ کے پرخچے اُڑا دیے جائیں گے۔" میں چیختا رہا، منتیں کرتا رہا، میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں! قسمیں کھائیں کہ میرے پاس انھیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اذیت رساں یہی کہتے رہے کہ "تمھیں قبول کرنا پڑے گا کہ تم سوویت یونین سے بھیجے گئے ہو، تمھیں سوویت قونصل خانے سے تنخواہ ملتی ہے اور تم ان کے لیے کام کرتے ہو!"
میں نے انھیں بتایا کہ "میں ایک غریب، ان پڑھ آدمی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں سوویت یونین کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سُنا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے پتہ نہیں کہ سیاست کیا چیز ہے۔ اگر تم نے میری زبان سے کبھی بھی سیاست سے متعلق ایک لفظ سُنا ہو تو مجھے پھانسی دے دو یا شوٹ کر دو!" ایک طویل عرصے تک میرے گڑگڑانے اور جرح کرنے کے بعد انھوں نے

میرے سر اور ہاتھ اور بدن پر کوڑے سے چار پانسو ضربیں لگائیں۔ پھر یہ دھمکی دینے لگے کہ وہ مجھے طرح طرح کی بھیانک اذیتیں پہنچائیں گے تاکہ میں ان تمام جرائم کا اعتراف کروں، جو وہ میرے سر ڈال رہے ہیں۔
کچھ قیدیوں کو یہ ساری اذیتیں دینے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے سر برف میں دبا دیے جائیں۔ وہ قیدی سوں کے جم جانے سے مر گئے۔ پھر انھوں نے میری آنکھوں کے سامنے کچھ کو الیکٹرک شاک دے کر ختم کر دیا۔ کچھ فائرنگ اسکواڈ کی نذر ہو گئے۔ اور اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ ——— "تم نے ان کی موتیں دیکھ لیں۔ اب اعترافِ جرم کے لیے تیار ہو یا نہیں؟" جب میں نے قسمیں کھائیں کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے، جس کا اعتراف کروں تو انھوں نے میرے سر کو بجلی کے زبردست شاک دیے۔
——— علی فرخ زادہ۔

۰ رجنوری ۱۹۶۹ء کو میری گرفتاری کے بعد مجھے خرم شہر کے ساواک مرکز میں لے جایا گیا۔ تین آدمیوں نے مجھے مادر زاد ننگا کر دیا اور نام نہاد جسمانی معائنے کے نام پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ رات کے آٹھ بجے سے دوسرے روز ایک بجے تک اسی طرح لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ مجھ سے جواب طلبی کی جاتی رہی۔ پھر مجھے آبادان لے جایا گیا اور ایک پاخانے میں قید کر دیا گیا۔ میں نے ایک ہفتہ اسی حالت میں گزارا۔ میرے پاس بس ایک پرانا فوجی کمبل تھا۔ چوبیس گھنٹے میں ایک بار کھانا ملتا تھا اور بدن پر ایک دھجی بھی نہ تھی۔ آٹھویں دن ہتھکڑیاں پہنا کر مجھے تہران کی ایک ساواک جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ سوال و جواب کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ مار بھی پڑتی رہی۔ ڈاکٹر حسین زادہ اور انجینیر یوسفی نامی نے گھنٹے بھر تک مجھے زد و کوب کیا۔ پھر مجھے ایک میز کے قریب بٹھا کر مطالبہ کیا گیا کہ میں ایک تحریری بیان دوں۔ یہ کہ میں ایک کمیونسٹ ہوں اور جاسوسی کے کام میں لگا رہا ہوں۔ میرے انکار پر حسین زادہ نے دو پولیس سار جنٹوں کو حکم دیا کہ مجھے جبراً لٹا دیں۔ پھر انھوں نے کالے تار کے ایک کوڑے سے مجھے مارنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ ایک ایک کر کے وہ سستاتے، پھر مجھے مارنے لگتے۔ میرا سارا جسم نیلا پڑ گیا اور پیٹھ سے خون رسنے لگا۔
دوسرے روز پھر یہی عمل دوہرایا گیا، اس فرق کے ساتھ کہ مجھے بھاری ہتھکڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ انھوں نے حکم دیا کہ میں ایک اسٹول پر بس ایک پیر سے کھڑا ہو جاؤں۔ میں اسی طرح کھڑا ہو گیا۔ پھر کئی بار انھوں نے لات مار کر اسٹول نیچے گرا دیا اور میں اپنے پورے بوجھ کے ساتھ فرش پر آ گرا۔ اس کے اگلے دن طمانچوں کی وجہ سے میرے کانوں سے خون بہنے لگا۔ بائیں کان کا پردہ پھٹ گیا۔ اُس وقت سے میرا یہ کان سماعت کی قوت کھو بیٹھا ہے۔
——— پھر اسی دن وہ مجھے کہیں لے گئے اور ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ میری آنکھوں پر پٹیاں چڑھا دی گئی تھیں۔ وہاں مجھے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ حسین زادہ نے یہ فیصلہ سُنایا کہ شکر اللہ پاک نژاد کو شاہ پر قاتلانہ حملے کی تیاری اور ایک دشمن بیرونی حکومت سے ساز باز کے جرم میں سزائے موت دی جاتی ہے۔ پھر اس نے مجھے یاد دلایا کہ چونکہ مجھے عراقی سرحد پر گرفتار کیا گیا تھا اور لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں عراق چلا گیا ہوں اس لیے کسی کو پتہ ہی نہ چلے گا کہ مجھے مار ڈالا گیا۔ رائفلیں چڑھائی گئیں۔ پھر حکم ہوا "فائر!" پھر کچھ سرگوشیاں سُنائی دیں اور حسین زادہ چیخ کر بولا ——— "یہ کیا؟ پہلے تم ایک آرڈر دیتے ہو۔ پھر اسے منسوخ کر دیتے ہو!" اس کے بعد وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔
انجام کار، وہ مجھے پھر قیدِ تنہائی کی کوٹھری میں واپس لے گئے۔ یہ ساری اداکاری مجھے بس ڈرا کر اعتراف پر آمادہ

کرنے کے لیے تھی۔ اس کے بعد سوال جواب کے دوران میری کئی انگلیوں سے ناخن اکھاڑ لیے گئے اور مجھے لاتوں سے زمین پر گرادیا گیا۔
——— اذیت کا یہ قصہ اٹھارہ دنوں تک چلتا رہا۔

——— شکر اللہ پاک نژاد

"مجھے پندرہ روز تک اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ میرا بلڈ پریشر گر کر ۵ تک پہنچ گیا اور میرا وزن
بیس کلو گھٹ گیا۔ مجھے ٹرائل کے لیے لے جانے کے لائق بنانے کی خاطر، انھوں نے مجھے مہینے بھر اسپتال میں رکھا۔ ایک بجلی کے ہیٹر سے وہ
مجھے جلاتے تھے۔ میں چل نہیں سکتا تھا اور مجھے سینے کے بل زمین پر رینگنا پڑتا تھا۔ تمھارے ایجنٹوں نے میرے منہ میں پیشاب
تک کیا ——— تمھیں اپنے آپ سے شرم نہیں آتی؟ یہ ہے وہ حکومت جس کے خلاف ہم بغاوت کرتے ہیں ——— الف سے یے تک
مجرموں کی حکومت! یہ اوّل تا آخر شرمناک ہے۔ کیا تم یہ فریب دینا چاہتے ہو کہ تمھیں ان اذیتوں کا کچھ بھی علم نہیں ہے؟"

——— مہدی رضائی: ملٹری ٹریبونل کو خطاب کرتے ہوئے

"پہلے اس نے (ڈاکٹر حسین زادہ) مجھے کرسی سے اُٹھایا اور حکم دیا کہ دیوار سے ناک لگا کر کھڑا
ہوجاؤں۔ ایک گارڈ نے میری گردن پر بندوق کی نال رکھ دی تاکہ میں سر نہ ہلاؤں۔ پندرہ منٹ تک انھوں نے مجھے ایک پیر
پر اسی طرح کھڑا کیا۔ پھر مجھے ایک اونچے اسٹول پر بٹھا دیا، جہاں سے میرے پاؤں فرش تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دو ساواک ایجنٹ
دیر تک میری گردن میں سخت لکڑیاں چبھوتے رہے۔ پھر انھوں نے ایک سوال پوچھا، اس اصرار کے ساتھ کہ میں وہی کچھ کہوں، جو
وہ سننا چاہتے تھے، یعنی کہ جھوٹ بولوں ——— میرے انکار پر انھوں نے وہی کچھ کیا، جو اس سے پہلے بھی کرتے آئے تھے۔ جب اس کا بھی
کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے مجھے فرش پر لٹا دیا۔ ایک شخص میرے سر پر بیٹھ گیا، دوسرا میرے پیر پر اور باقی سبھوں نے
کوڑوں کی بارش سے میرے سارے جسم کے چیتھڑے کر دیے۔ اس کے اگلے دن کوڑوں کی جگہ لاتوں کی بارش کی گئی اور
پستول کے آہنی پنجے اور رائفل کے کندے سے مجھے مارا گیا۔ میرے سامنے کے تین دانت ٹوٹ گئے۔ میری حالت دیکھ کر گارڈز بھی
رو دیے"

——— علی جان شمسی

لوہے کا ایک فریم بستر سے مماثل، تاروں کا بُنا ہوا، جسے ٹوسٹر کی طرح بجلی سے
گرمی پہنچائی جاتی ہے ——— پھر جب وہ تپ کر سُرخ ہوجاتا ہے، قیدی اس پر لٹا دیے جاتے ہیں:
یہ ترکیب تہران کے ایک انجینیر مسعود احمد زادہ پر آزمائی گئی۔
بالآخر ۱۹۷۱ء میں اسے سزائے موت دے دی گئی۔ جب ایک
انٹرنیشنل آبزرور، نوری البالا نے اسی تجربے سے گزرنے والے
ایک اور قیدی ناصر صادق سے سوال کیا کہ "کیا تمھیں زدوکوب
کیا گیا ہے؟" تو صادق نے جواباً کہا ——— "نہیں! مجھے بھونا
گیا تھا ——— !

——— خلیج کی جنگ: [illegible]

چوتھا منظر

"قید خانہ پولیس اسٹیشن سے ملحق ہے۔ تھانے کے وسیع احاطے میں کھڑے درختوں کو چھیڑتے
ہوئے موسم خزاں کی ہواؤں کے جھونکے کچھ کہہ رہے ہیں۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں۔ پھر طویل راہداریوں سے گزرتے ہوئے
ایک جگہ روک دیے جاتے ہیں۔ ہتھکڑیاں مقفل ہیں۔ آنکھوں پر بندھی پٹی اتار دی جاتی ہے۔ دروازہ کھلا ہوا
ہے۔ میں اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ آج ملاقات کا دن ہے۔ قریب ہی ڈاکٹر رسولی آکر بیٹھ جاتا ہے۔
ایک لڑکی اندر لائی جاتی ہے۔ مشکل سے تیرہ برس کی ہوگی۔ وہ کچھ دور پر ہمارے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔
گارڈز چاروں طرف سے ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ پھر ایک مرد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ لڑکی پنجوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے۔
اور اسے چومتی ہے۔ مرد لانبے قد کا ہے اور صورت سے کسی اسکول کا مدرس دکھائی دیتا ہے۔ یہ مرد اس لڑکی کا باپ ہے۔
لڑکی رونے لگتی ہے۔ باپ اسے چمکارتا ہے۔ وہ اور تیزی سے روتی ہے۔ میں ان کی آوازیں بآسانی سن سکتا ہوں۔
لڑکی کہتی ہے ——— 'وہ! اُدھر جو آدمی بیٹھا ہے اسے یہاں لوگ ڈاکٹر رسولی کے نام سے پکارتے ہیں۔
اسی نے میری عصمت دری کی ہے!'
اب باپ رونے لگتا ہے ———
میری بیوی رخصت ہو جاتی ہے تو میری آنکھوں پر دوبارہ پٹی چڑھا دی جاتی ہے۔ پھر میں
اوپر لے جایا جاتا ہوں، دوسری منزل پر اپنے انٹروگیٹر کے کمرے میں۔ پٹی اتار دی جاتی ہے۔ اذیت کدہ سے چیخوں کا شور
اٹھتا ہے۔ میری ہتھکڑیاں کھول دی گئی ہیں اور گارڈ بھی کہیں چلا گیا ہے۔ میں کھڑکی کی طرف بڑھتا ہوں اور دیکھتا ہوں ——— ایک
ننھی سی بچی زیادہ سے زیادہ چھ برس کی، کچھ لوگوں کے سامنے لائی جاتی ہے جنھوں نے ہتھکڑیاں پہن رکھی ہیں۔ میرا انٹروگیٹر
حسینی بھی وہیں ہے اور اس بچی سے ان آدمیوں کی شناخت کروانا چاہتا ہے۔ بچی یہ تک نہیں سمجھ پاتی کہ اس سے کیا پوچھا جا رہا
ہے۔ اس کے چہرے پر طمانچے لگائے جاتے ہیں اور اس کے کان اور بال کھینچے جاتے ہیں۔ جب ایک بار پھر سوال دہرائے جاتے
ہیں تو بچی بری طرح دہشت زدہ دکھائی دیتی ہے۔ حسینی اسے پھر مارنے لگتا ہے۔
یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہتا ہے، حتیٰ کہ ہتھکڑیاں پہنے ہوئے آدمیوں میں سے ایک اس منظر کی تاب نہ لاکر
خود اپنے بارے میں سب کچھ اگل دیتا ہے۔ بچی اپنی کوٹھری کی طرف واپس لے جائی جاتی ہے۔ وہ آدمی تیسری منزل پر اذیت کدہ
کی جانب لے جایا جاتا ہے ——— میں واپس آکر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہوں ——— !"

——— رضا براہنی

پانچواں منظر

زنداں میں ایک مکالمہ :

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ہم پر ایک نظر ڈالی اور ڈاکٹر حسینی سے پوچھا ——— "یہ کون ہے ؟"
حسینی طنزیہ لہجے میں جواب دیتا ہے : "بنی نوع انسان کی تاریخ میں اہم ترین ادبی شخصیت،
فارسی اور انگریزی کا پروفیسر، اور بھی بہت کچھ ——— نام رضا براہینی! ابھی ابھی اوپری منزل
پر ہم نے اس کے ساتھ بدفعلی کی ہے!"
وہ مجھ سے پوچھتا ہے ——— "کیوں؟ رومی اور وکٹر ہیوگو میں کون عظیم تر ہے؟"
میں حیران ہوتا ہوں ———
"جناب! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں استفسار کرتا ہوں۔
"میں پروفیسر ہوں ——— تم مجھے اسی لقب سے مخاطب کر سکتے ہو!" وہ کہتا ہے۔
"پروفیسر! آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"
"کیونکہ مجھے علم کی پیاس ہے ——— گدھے! احمق! اب جواب دو!"
"رومی!" میں جواب دیتا ہوں۔
"تم پاگل ہوئے ہو! یہ رومی کیا بلا ہے؟ وکٹر ہیوگو دنیا کا سب سے مشہور ادیب ہے۔ بتاؤ!
کیا رومی کا ترجمہ تبتی زبان میں ہوا ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم" میں اس اچانک ہیوگو زدہ ساواک ایجنٹ سے کہتا ہوں۔ "کسی تبتی سے پوچھیے یا
خود رومی سے"
"نہیں! تمھی کو جواب دینا ہوگا۔ تم رومی کو ہیوگو سے بڑا کیوں سمجھتے ہو؟ وہ اتنا مشہور تو نہیں ہے!"
"اتنا مشہور نہ سہی، مگر یقینی طور پر وہ ہیوگو سے بہتر شاعر ہے۔ مغرب میں لوگ رومی کے عاشق ہیں اور
ایران میں ہیوگو کے!"
اس بحث کی گرماگرمی میں مجھے اپنے پیروں اور پسلیوں اور ٹوٹی ہوئی انگلی کے درد کا بھی خیال نہیں رہ
جاتا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ Theatre of the Absurd کا اثر اتنا سکون بخش ہوگا۔
اچانک ساواک ایجنٹ ساری گفتگو کلائمکس کے ایک نئے نقطے تک لے جاتا ہے۔
"بڑا کون ہے؟ رومی یا ہیوگو یا تم خود؟"
میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ لازوالوں کی اس صف میں بھی مجھے شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس ساواک پروفیسر
کو اینٹی کلائمکس سے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کہتا ہوں :
"ہم تینوں میں ہیوگو کی داڑھی سب سے لمبی تھی!"
"لیکن کیا تمھارے بھی داڑھی تھی؟"

"ہاں، تھی، لیکن آج صبح کسی نے نوچ پھینکی!"
اس کے ہاتھ میں شولوخوف کا ناول "اور ڈان بہتا رہا" دبا ہوا ہے۔ کتاب کھول کر وہ اس کے بیچ سے میرے ایک مضمون کی زیروکس کاپی نکالتا ہے اور مجھے دکھاتا ہے ——
"یہ تم ہو؟"
"ہاں!"
"ناممکن! یہ راسپوٹین ہے!"
"صبح کسی نے کہا تھا کہ میں امام علی اور چی گیوارا دونوں سے مشابہ ہوں۔ تم کہتے ہو میں راسپوٹین جیسا ہوں!"
"نہیں —— تم راسپوٹین سے مشابہ ہو!"
"اور تم —— پروفیسر —— ؟" میں کہتے کہتے رک جاتا ہوں۔ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔
"ہاں —— کس کی طرح؟ کس کی طرح؟" وہ اصرار کرتا ہے۔
"تم ایک دم اپنی طرح ہو، پروفیسر —— ایک میں ہی ایسا ہوں کہ میری صورت اپنی صورت نہیں ہے!"
یہ مکالمہ اچانک ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے شروع ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟
"اچھا یہ بتاؤ کہ Cosine of one plus sine of one کیا بن جاتا ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔
"میں کیا بتاؤں؟"
"Trignometry کا نتیجہ؟"
"تمھیں پتہ ہے —— میں تو بس ایک شاعر ہوں!"
"ہمیں شاعروں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو یہ بتا سکیں کہ Cosine of one plus sine of one کا حاصل کیا ہوتا ہے؟"
"اس سوال کا جواب دینے کی مجھ میں اہلیت نہیں!"
"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ شاعری کی ہزار سطریں یاد کر لینے اور سنانے سے تم اپنا انسان ہونا ثابت کر سکتے ہو؟"
"میرا تو حافظہ بھی بہت کمزور ہے!"
"تمھیں اس کی سزا ملے گی!" وہ بہت ٹھنڈے لہجے میں کہتا ہے —— "اچھا، یہ بتاؤ کہ تم امریکہ میں کیا کر رہے تھے؟"
"پڑھاتا تھا!"
"کیا؟"
"ادب!"
"کون سا ادب؟"
"انگریزی ادب"
"کیا؟ کیا؟" وہ چلانے لگتا ہے، جیسے اچانک اس کا دماغ پھر گیا ہو۔
"انگریزی ادب!" اب کے میں اتنے ہی ٹھنڈے لہجے میں جواب دیتا ہوں۔
"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم امریکیوں کو انگریزی ادب پڑھاتے تھے؟"

"ہاں، پروفیسر!" میں پھر اسی ٹھنڈے لہجے میں کہتا ہوں۔

"جھوٹے ——— تم انتہائی احمق اور جھوٹے ہو!"

وہ ڈاکٹر حسینی کی طرف مڑتا ہے، جو میز کے پیچھے، منجمد کر دینے والی سردی کے مارے ہوئے کسی درخت کے تنے کی صورت بیٹھا ہوا ہے ———

"ڈاکٹر حسینی! کیا تم یہ چاہو گے کہ میں اس سے انگریزی میں کلام کروں ——— تاکہ تم یہ اندازہ کر سکو کہ اسے ایک حرف بھی انگریزی نہیں آتی!"

"میں نہیں جانتا پروفیسر ——— میں ان لوگوں کی زبان نہیں سمجھتا، جو مجھ سے بہتر ہیں!" ——— یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر حسینی دیوار پر ایک کیل سے لٹکے ہوئے کوڑے کی طرف اشارہ کرتا ہے ——— "لیکن اگر تم چاہو تو میں اسے بلبل کی طرح نغمہ سرائی پر، یا کوّے کی طرح کاؤں کاؤں کرنے پر، یا کتّے کی طرح بھونکنے پر مجبور کر دوں! تم اجازت دو، میں اسے ابھی جانوروں کی بولی بولنے پر آمادہ کر دوں گا!"

پروفیسر مڑتا ہے ——— کمرے سے نکل جاتا ہے۔ تین بھاری بھرکم جُثّے والے مرد جن کی صورتیں ایرول فلائن کی کسی فلم کے ڈاکوؤں جیسی ہیں، اندر آتے ہیں۔ وہ میری پسلیوں اور کانوں پر گھونسے مارنے لگتے ہیں اور بیچ بیچ میں اپنی پوری طاقت سے میرے گالوں پر طمانچے لگائے جاتے ہیں۔ پھر ایک اور شخص اندر لایا جاتا ہے، جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ایک گارڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ کمرے کے دائیں جانب ایک سیاہ پردہ کھینچ کر ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس شخص کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اندر چلا جائے۔ ڈاکوؤں کی صورت والے وہ تینوں مرد مجھے چھوڑ کر اذیت کدہ میں چلے جاتے ہیں ——— اس شخص کے پیچھے۔ پھر اچانک چیخیں بلند ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ایسے الفاظ سنائی دیتے ہیں جو قطعاً غیر انسانی اور ناقابلِ فہم ہیں۔ اُس پر جو کچھ گزر رہی ہے، کچھ گھنٹے پہلے مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔

مجھے پتہ ہے ——— اذیت کدہ میں داخل ہونے کے بعد لوگ انسانیت کی سب سے قیمتی متاع، لفظ، کھو بیٹھتے ہیں۔ اور جانور بن جاتے ہیں!

——— رضا ہمدانی

میری خاموشی اک لفظ "نہیں" تھی ——— میں نے اب تک ان گنت لفظ کھوئے تھے،
اب میں نے پہلی بار اک لفظ پایا تھا۔ اگر میں ان کی بات مان لیتا، میں
اک لفظ اور کھو دیتا اور پہلا لفظ کبھی نہ پا سکتا۔

جب مجھے ہوش آیا، میں نے دیکھا: میں سائیں سائیں کرتے جنگل میں پڑا ہوں۔
قطرہ قطرہ خون میری رگوں میں اتر رہا ہے۔
تھوڑی دیر بعد مجھے خبر دی گئی: ہمارے تین رفیق ہلاک ہوئے ہیں، دو
لاپتہ ہیں اور باقی سب محاذ پر ہیں۔

——— مین را: آخری کمپوزیشن

فصلِ سوم

منظر جواب بھی زیرِ ترتیب ہے :

آج ایران ایک آتش فشاں کے دہانے پر ہے۔

شاہ ایران، محمد رضا پہلوی نے، چند سال پہلے، امریکہ کے خبر رساں ذرائع کو خبر دی کہ وہ اپنے مُلک ایران کی تہذیب کو عظمت کے ایک نئے نشان کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس جدوجہد کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے شاہ اور ملکہ تہران کی سڑکوں پر بلٹ پروف کاروں میں بھی شاذ ہی سفر کرتے ہیں۔ زمیں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے کہ وہ ہیلی کوپٹر یا ہوائی جہاز کی سواری کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی سواریاں انھیں ان لاتعداد کمپنیوں کے احاطے تک پہنچاتی ہیں جن میں ایرانی قوم کا سرمایہ لگا دیا گیا ہے اور جن کے مختارِ کُل شاہ اور ملکہ ہیں یا پہلوی خاندان کے دوسرے افراد۔ اس وقت پہلوی خاندان کی کمند آہن دار ٹائر، سیمنٹ، جہاز سازی کے ان گنت کارخانوں، بینکوں، ہوٹلوں، جوے کے اڈوں اور ناچ گھروں کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ پہلوی فاؤنڈیشن ہر طرح کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہے اور صرف اور صرف شاہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ امریکہ کے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ولیم روجرز نے فاؤنڈیشن کی ایک شاخ نیویارک میں بھی قائم کروادی تھی۔

ان پروجیکٹوں میں شاہ کا سرمایہ کئی ارب ڈالرز کے برابر قیاس کیا جاتا ہے۔ اب شاہ کی بہن اشرف پہلوی اور ملکہ فرح انھی خطوط پر اپنے الگ فاؤنڈیشن قائم کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ایرانی شہنشاہیت کا آخری لمحہ سامنے آئے،

پہلوی خاندان دور افتادہ زمینوں پر اپنی حفاظت گاہوں کی تعمیر کا کام تمام کردینے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس خاندان کے سر پر جمی کارٹر کی دعاؤں اور سی۔آئی۔اے کی نیک اندیشیوں کا سایہ ہے۔

شاہ اس وقت دُنیا کے تین سب سے دولت مند افراد میں ایک ہے اور شہزادی اشرف کرۂ ارض کی امیر ترین عورتوں کی صف میں شامل۔ اس خاندان کے بچے بچیاں بھی اپنے بزرگوں کے نقوشِ قدم پر رواں دواں ہیں۔ چنانچہ اشرف پہلوی کا بیٹا بھی بیس سے زیادہ کارخانوں اور کنسٹرکشن فرموں کا مالک ہے۔ شاہ، امریکہ کی ممتاز دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں کے پورے پورے کورسز کی خریداری میں مصروف ہے۔

یہ تمام سعیِ تعمیر اُس ایران کے لیے ہے، جس کے علاقے ارضِ ایران کی سرحدوں سے دُور ہوں گے۔ جہاں تک ارضِ ایران کا تعلق ہے اس کے محنت کش باشندوں کے لگ بھگ چالیس فیصدی خاندانوں کی ہفتہ وار یافت سات ڈالر سے بھی کم ہے، جبکہ تہران دُنیا کے پانچ سب سے زیادہ مہنگے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اور ایران کا شاہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں جنگی ساز و سامان کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ پنٹاگن کی ایک رپورٹ کے مطابق، ۱۹۷۶ء میں امریکی ہتھیاروں کے نصف سے زیادہ حصے کا اکیلا گاہک شاہِ ایران تھا۔ اس کے علاوہ، برطانیہ، فرانس اور مغربی جرمنی کے بازارِ اسلحہ میں بھی شاہ نے ایک ارب ڈالر سے زیادہ کی خریداری کی۔

اس دراز دست اور کشادہ قلب خریدار کے جان و مال کی حفاظت کے لیے، امریکی نیوز میگزین "نیوز ویک" کی ایک رپورٹ کے مطابق، اس وقت چالیس ہزار سے زیادہ امریکی مشیر کام کر رہے ہیں۔

شاہ کی خفیہ تنظیم، ساواک کے کُل وقتی ملازمین کی تعداد تیس ہزار سے ساٹھ ہزار کے بیچ ہے۔ یہ تو باقاعدہ تنخواہ دار خدمت گار ہیں۔ مجموعی طور پر، اس تنظیم کے خادموں اور معاونین کی تعداد کم از کم تیس لاکھ ہے، جو اس کرۂ ارض کے ان تمام علاقوں پر بکھرے ہوئے ہیں جہاں ایرانی آباد ہیں یا جہاں ایرانی طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ساواک کے اخراجات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سرکاری اعلان نامے کے مطابق صرف ۷۴-۱۹۷۳ء کے مالی سال میں ساواک کا بجٹ ۳۱۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اصل اخراجات اس سے کہیں زیادہ ہوں گے!

سی۔آئی۔اے کے سابق چیف ایلن ڈلس نے یہ پودا لگایا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں شروع ہونے والے اس ڈرامے کے دوسرے چند کردار رچرڈ نکسن، جون فوسٹر ڈلیس، کرمٹ روزویلٹ اور جنرل نارمن شوارٹز کوپف ہیں۔

اس کہانی کا نقطۂ آغاز، اگست، ۱۹۵۳ء کی وہ ساعتِ سیاہ تھی جب سی۔آئی۔اے نے قانونی طور پر منتخبہ ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ شاہ اس وقت اپنے خاندان کے ساتھ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ڈاکٹر مصدق کی قیادت میں ایرانی قومی محاذ کی حکومت کے خاتمے کے بعد، سی۔آئی۔اے نے اپنے شاہ رضا پہلوی کو پھر وطن لوٹ آنے کی دعوت دی اور اقتدار کی باگ ڈور اپنے فرزندِ معنوی کو تھما دی۔ یہ باگ آج بھی شاہ کے ہاتھوں میں ہے اور گرچہ پیر رکاب سے نکل چکے ہیں لیکن سی۔آئی۔اے اور اسرائیل کی خفیہ تنظیم کے تعاون نے اسے دلاسہ دے رکھا ہے۔

۱۹۶۰ء میں شاہ کے اقتدار کی مخالف قوتوں نے متحد ہو کر اس سے نجات پانے کی ایک کوشش کی تھی۔ لیکن مصدق کی نظربندی کے سبب، یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ شاہ نے مخالف قوتوں کو لپیٹ کرنے کے لیے اس کے بعد جو اقدامات کیے ان کے نتیجے میں بربریت اور بہیمیت کی ایک ایسی داستان سامنے آتی ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ صرف ایک دن میں یعنی ۵ رجون ۱۹۶۳ء کو پندرہ ہزار سے زیادہ افراد مشین گنوں سے اڑا دیے گئے۔ یہ یومِ سیاہ شاہ کے "سفید انقلاب" کا حرفِ اوّل تھا۔

ساواک کے قیام سے آج تک تین لاکھ سے زیادہ مجاہدین ایرانی جیلوں کی قید کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔
اوسطاً پندرہ سو افراد ہر ماہ گرفتار کیے جاتے ہیں۔ ایمینسٹی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹ ۷۵-۱۹۷۴ء
کے مطابق، ۱۹۷۵ء کے دوران سیاسی قیدیوں کی تعداد پچیس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان تھی۔ اسی رپورٹ کے پیش لفظ میں
مارٹن اینلز نے لکھا ہے کہ "دیوانی عدالتوں کے کسی باقاعدہ نظام کے بغیر، ٹورچر کی ایک ناقابلِ یقین تاریخ اور دنیا میں سزائے موت
کی سب سے اونچی شرح کے باوجود، شاہ نے ایک رعایا پرور حکمراں کا مقنعہ چڑھا رکھا ہے۔"
سیاسی قیدیوں کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی ہیں۔ نوجوان عورتوں پر تربیت یافتہ جانور چھوڑ دیے جاتے
ہیں۔ ساواں جیل سے فرار ہونے والی ایک مجاہدہ اشرف دہقانی کا بیان ہے کہ اسے خوفزدہ کرنے کے لیے اس پر سانپ اچھال دیے
گئے تھے۔ قیدیوں کے اعصابی نظام کو منتشر کرنے کے لیے انہیں ایسے کمروں میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں در و دیوار سے ٹیپ شدہ
ڈراؤنی آوازیں اُبلتی ہیں۔
اور —— پیرس کے ایک اخباری نامہ نگار کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شاہ نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا:
"ٹورچر . . . آپ کے ملک میں اور امریکہ میں اور بعض دوسری جگہوں پر
اذیت رسانی کے جو طریقے رائج ہیں، وہ کہیں زیادہ منظم ہیں۔ آپ لوگ تو
نفسیاتی طریقوں سے بھی کام لیتے ہیں —— !"

انسانیت سوز واقعات اور مناظر سے بھری ہوئی اس بدنما تصویر پر سنسر شپ کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔
ادب کے نام پر صرف ان لفظوں کی اشاعت کی اجازت ہے جن سے فحش جذبات تسکین پا سکیں یا ترک اور استغنا کی مجہول تعلیم دی جا سکے۔ زندگی،
توانائی، انکار اور احتجاج کی بات کفر ہے۔
تبریز کے پسماندہ علاقوں میں اوسطاً ایک لاکھ بچوں کے لیے صرف ایک اسکول ہے۔ بلوچستان کے بیشتر شہروں
میں ساری آبادی کے لیے صرف ایک حمام ہے۔ [اور وہ بھی تقریباً کھنڈر بن چکا ہے] قدرتی تیل کی دولت سے مالا مال اس ملک
کے محروم باشندے سردیوں میں موسم کی سختی کے ہاتھوں جانیں گنوا دیتے ہیں۔ غربت، افلاس اور جہالت مشرقِ وسطیٰ کے
اس جزیرۂ استحکام کی باطنی تصویر کے شناختی نشانات ہیں۔
ساواک کے ایجنٹ گھروں کی تلاشیاں لیتے رہتے ہیں۔ جیک لنڈن، برخیت اور گورکی کی کتابیں
گھر میں رکھنا بھی ایک سنگین جرم ہے۔ اگر کوئی شخص The Call of the Wild پڑھتا ہوا دیکھ لیا جائے تو اسے تشدد پسند قرار
دے کر سات برس کے لیے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ایک تھیٹر گروپ کو اسی خطا
پر کہ وہ The Lower Depths کے ریہرسل کی کوشش کر رہا تھا، دو سے گیارہ برس تک کی قید کا حکم دیا گیا۔
ایران میں ہیملٹ، رچرڈ سوم یا میکبتھ اسٹیج پر نہیں پیش کیے جا سکتے کہ کسی بھی ایرانی کو کسی شہزادے یا بادشاہ
کی موت کا منظر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ساواک کی بلیک لسٹ پر ایرانی اور غیر ملکی مصنفوں کی پانچ سو سے زیادہ
کتابوں کے نام چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ کتابیں نہ بیچی جا سکتی ہیں، نہ خریدی جا سکتی ہیں —— اور نہ پڑھی جا سکتی ہیں۔
رضا شاہ پہلوی کے عہدِ اقتدار میں ایک صحافی محمد مسعود کو اشرف پہلوی کے زر خرید غنڈوں نے

جان سے مار دیا۔ ایک اور صحافی کریم پور شیرازی کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۱۹۵۳ء کے محاصرے کے بعد ایک شاعر مرتضیٰ کیوان
کو گولی ماردی گئی۔ ایک کہانی نویس صمد بہرنگی کو غرقاب کر دیا گیا۔ اس کے ایک دوست بہروز دہقانی کو اذیت کدہ
میں ختم کر دیا گیا۔ اور بہروز کی بہن اشرف دہقانی کو قید میں عصمت دری کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی دوسری اذیتیں
بھی دی گئیں [بالآخر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی] - ایرانی ادب میں احتجاج کی شاید سب سے مؤثر آوازوں میں سے
ایک، جلال احمد کو انتہائی پُراسرار حالات میں کیسپین کے ساحل پر جان سے مار دیا گیا۔ اس کے علاوہ قید و بند اور
اذیت کدہ کی سختیاں اٹھانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس فہرست کے چند معروف نام ہیں: مہدی اخوان ثالث،
نیما یوشیج، احمد شاملو، ہوشنگ ابتہاج، ید اللہ رویائی، فریدون تولّلی، محمد علی سپانلو، سعید سلطان پور، نعمت میرزادہ،
جعفر خوشابادی، علی محمد افغانی، احمد محمود، محمود اعتماد زادہ، فریدون تونو کابونی، غلام حسین سعیدی،
محمود دولت آبادی، نجف دریابندری، ابراہیم یونسی، جہانگیر افکاری، منوچہر جعفر خانی، خلیل مالکی،
محمد رضا زمانی، مجیبی تبریزی، ناصر رحمٰن نژاد، محسن یلغانی ——— ان میں کچھ شاعر ہیں، کچھ قصہ نویس،
کچھ صحافی، کچھ سماجی مبصر اور کچھ تھیٹر کے ہدایت کار ———
اور شاہ کا دعویٰ ہے کہ ایران ایک نئی تہذیبی عظمت کی منزلوں سے گزر رہا ہے ———

سنسر شپ پر سعیدی کی ایک رپورٹ کے چند اقتباسات:

شاہ کے عہدِ اقتدار میں اس ملک کے ادیبوں کی قسمت کا تعین بس دو مہریں کرتی ہیں ——— "قانونی"
یا "غیر قانونی"۔ ہر شخص کو پتہ ہے کہ کیا کچھ چھپ سکتا ہے اور کیا نہیں ——— اشاعتی ادارے حکومت کے عہدیداروں کے ڈر سے
کوئی بھی ایسا مسودہ اشاعت کے لیے قبول نہیں کرتے جس پر احتساب کی ذرا سی بھی گنجائش نکلتی ہو۔
ادب کی کتابوں میں سیاست، خاندانی رشتوں، روایت اور مذہب، عوامی گیتوں اور کہانیوں
سے متعلق کسی بھی ایسی بحث کی اجازت نہیں، جو بورژوا ڈیکورم کے اصولوں کو نظرانداز کرتی ہو۔ کسی ادبی کتاب کے کمپوزیشن،
املا اور آرتھوگرافی تک پر سنسر کو گرفت کا حق ہے، تاکہ فارسی زبان کی "شیرینی" پر آنچ نہ آئے۔ ملک کی ثقافت
اور فن کی پوری نگہبانی وزارت فن و ثقافت نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ دو یا تین ایجنٹوں کو اس نوع کے تمام فرائض
اور اختیارات سونپ دیے گئے ہیں اور وہی ایک پوری قوم کے افکار اور ادبیات کی تقدیر کا تعین کرتے ہیں۔ ان معززین
کے ہاتھوں سب کچھ یکسر بدل جاتا ہے اور ادبی تخلیقات ان کے مذاق و مزاج کی چھلنی میں چھن کر بے مزہ ہو جاتی ہیں۔ انھیں یہ
بھی نہیں معلوم کہ کسی بھی قلم کا وصف اس واقعے میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پرانی قدروں سے نجات اور نئی قدروں کی تشکیل پر کس حد تک
قادر ہے۔ اس سنسر شپ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ چھوٹے موٹے ناشر جو دانش وروں کی صف میں شامل تھے اور جو کتابوں کی
اشاعت پر محدود سرمایہ صرف کرنے کی اہلیت رکھتے تھے، یکسر تباہ ہو گئے۔ اس صورت حال نے بڑے اشاعتی اداروں
اور اشاعتی نوآبادیوں کے قیام میں مدد دی ہے، جو صرف اس راستے پر چلنے کے عادی ہوتے ہیں، جدھر اقتدار کی ہواؤں کا رُخ
ہو۔ اس طرح ہمارے زمانے کے ادیبوں کے ہاتھ بندھ گئے ہیں اور یہ بات صاف ہے کہ اس ملک کے فن اور ادب کا

چاہے جو بھی حشر ہو، بڑے ناشر اور سنسر شپ کے ادارے کو اس کی فکر نہ ہو گی ——— یہ لوگ ان میں نہیں ہیں جو کسی چیز کی تخلیق کا بوجھ سہار سکیں۔ انھیں کسی ذمے داری کا احساس نہیں ہے۔ ان حالات میں کمٹ منٹ کا جو بھی مفہوم ہو، اس کا تعلق اس دلیس کے لکھنے والوں سے ہے، جو آج بھی مزاحمت کی کوششیں کر رہے ہیں اور ان کوششوں سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہیں۔
یہی کمٹ منٹ تھا، جس نے مُلک کے شاعروں اور ادیبوں کے ایک گروپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ
وزیرِ اعظم سے ملاقات کریں، سنسر شپ کے خلاف احتجاج کریں اور اس سے کہیں کہ اس قسم کی سنسر شپ کوئی قانونی بنیاد نہیں رکھتی۔ الاحمد نے اس میٹنگ میں شریک ہونے والے ادیبوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ 'انتظامیہ' مُلک کے ادیبوں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے، لیکن اسے یہ پتہ نہیں کہ سنسر شپ یا اس نوع کے دوسرے بہانے کسی مُلک کی ثقافت کے بہاؤ کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے ——— ہویدا (وزیرِ اعظم) نے جواب دیا کہ اسے 'سنسر شپ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے!' ہم جو دستاویزی ثبوت ساتھ لائے تھے، اس کے سامنے رکھے۔ اس پر اس نے یہ اعتراف کیا کہ 'ہاں! سنسر شپ کا وجود ہے اور اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا'۔ اور یہ بھی کہ 'شاید اس میٹنگ میں موجود ادیب، کتابوں کی سنسر شپ کا چارج خود ہی لینا پسند کریں!' الاحمد نے یہ سُن کر کہا کہ ——— 'ہم یہاں سنسر شپ کے خلاف احتجاج کے لیے آئے ہیں، اس کی معاونت کے لیے نہیں!'

——— ایک ایسے ملک میں جہاں تمام سیاسی ادارے ایک ڈکٹیٹر کی نخوتوں کے تابع ہوں، ادب اور ادب کی تخلیق کرنے والے قوم کے ضمیر کی آواز بن جاتے ہیں۔
ایران کی آج کی نثر اور نظم انسانیت کے اس طبیعی اور روحانی افلاس کی ترجمان ہیں جس پر دہشت کا تسلط ہے۔ یہ مطلق العنانیت کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی روح کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایرانی ادیب آج ان سیاسی قائدین کا نعم البدل ہیں، جو حکمراں کے تشدد کا شکار ہوئے، مُلک چھوڑ کر چلے گئے یا جیلوں میں مقید ہیں ——— [اس ملک میں] حکومت کے جاسوس اور مخبر ادب کے نقاد بن بیٹھے ہیں، جو کسی ادبی تمثال کو چیر پھاڑ کر یہ دیکھنے کی جستجو کرتے ہیں کہ اس میں کوئی سیاسی صداقت تو چھپی نہیں ہے۔

آج کی ایرانی شاعری ایسے استعاروں سے بھری پڑی ہے جو ایک ساتھ دو یا تین معنی رکھتے ہیں۔ معنی کی ایک سطح عوام کی پسپائی کے بھید کھولتی ہے۔ دوسری اس بھید کو سنسر کی آنکھوں سے چھپاتی ہے۔ اس طرح ایرانی شاعری کا نیا اسکول ایک طرف عوام کے نقطۂ نظر سے اظہار پاتا ہے تو دوسری طرف پولیس کے نقطۂ نظر سے ———

——— رضا براہنی

زیرِ ترتیب منظر کا ایک اندرورق

تخلیق کی ایک نو دریافت سطح

رضا ابرا حسین کی آٹھ نظمیں

نظم

○

شیشے کی روح شکستہ ہے
ہاتھ ان کے پہلے ہی سے لہو میں ڈوبے ہوئے ہیں
بھٹوسے اور راسبے ساتھ بیٹھے ہیں، سوالوں کے جواب دیتے ہوئے

انقلاب کے کیمرے ان کے چہروں پر حرکت کرتے ہیں
یہ خاتمہ ہے اس مذاق کا
یہ آغاز ہے اُس متانت کا
اب صرف ایک مرحلہ باقی ہے، ایک ندی
ہم اسے تیر کر پار کرلیں گے
اب تو ننھی چڑیوں کو بھی یاد نہیں کہ وہ طبقوں میں بٹی ہوئی تھیں
وہ سب ایک ساتھ نغمہ پرداز ہیں
وہ خواب ہمارے کاندھوں تک آپہنچا ہے
ہم آگے بڑھتے ہیں اپنے مستقبل کو لکھنے کے لیے

نظم

○

تیسری دُنیا کے نوجوان
ناشتہ کرتے ہیں
ہینڈ گرینیڈز کا
لنچ کے لیے
بارود
اور ٹکڑے ٹکڑے بکھر جاتے ہیں
ڈنر کی خاطر!

اب وہ غذا کے طور پر
ایٹم بم کھانے لگیں گے
کل یا پرسوں
جب انھیں
زیادہ کیلوریز کی ضرورت ہوگی
تاکہ موت کے سامنے وہ کھڑے ہو سکیں
یا کھڑے کھڑے مر سکیں۔

نظم

O

میرا ہمدرد
وہ غیر طبقاتی آدمی
اپنے جہنم میں بیٹھا
مجھے دیکھ رہا ہے
ان لفظوں کو استعمال کرتے ہوئے
جنھیں وہ نہیں سمجھتا

وہاں ایک اکیلی
تحت الارض آتشیں لہر ہے
اس کی انگلیوں کے درمیان، اس کی بغلوں میں
اسی کے کانوں کے گرد، اور
بلاشبہ، اس کی آنکھوں کی گہرائی میں

"دیکھو مجھے، تم غنز بیزادے!"
وہ چلاتا ہے: "اگر تم چاہتے ہو
کہ ایک بڑے شاعر بن جاؤ ——— تو سنبھالو
میری ہڈیوں پر منڈھی ہوئی اس جھری زدہ جھلی کو ———
پھر لکھو: ایک جہنم کے بغیر
کسی بھی شخص کی بات میں سچائی نہیں آتی
اس کی نظمیں بس 'جدید' بن کر رہ جاتی ہیں
اور کچھ بھی نہیں!"

میں منتظر ہوں اس کی جلتی ہوئی ہڈیوں کی مشعل کا

نظم

○

جی کہتا ہے اُٹھوں اور دوبارہ اس سے جا ملوں
وہ عورت جو صحرا کی طرح مانوس ہے
اس کے ہاتھوں میں مہک ہے شلجم کی اور سورج کی
سورج، جو اسے بوڑھا کر دیتا ہے
سورج، جو اس کی جان لے لیتا ہے
سورج، جو اس کو بھول جاتا ہے

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سمجھتی ہیں جلاوطنی کا مفہوم
اسے یاد ہیں ہجرت کی راہداریاں
کلاریاں اور اونٹ اور مکھیاں گزرتی ہیں
پھول نہیں گزرتے
وہ اپنے ہاتھوں کا مفہوم سمجھتی ہے
جو کلائیوں پر اس کی نسوں میں الجھے ہوئے ہیں
اس کا مقدر ہے ایک مجروح زدہ قلب
اس کے پاؤں بے وزن ہیں
خالی سلیپروں کی مانند
اس کا رحم ایک غبارہ ہے
پچکا ہوا ——— اس کے بیٹے کہیں اور چلے گئے

مَیں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟
وہ وہیں بیٹھی ہوئی ہے، اس کی موت سے سال بھر پہلے یا بعد
اس کی تدفین سے سال بھر پہلے یا بعد
لفظ ORIENT کی طرح گول
WORD یا WORLD کے O کی طرح گول
جی کہتا ہے اُٹھوں اور اُس سے جا ملوں۔

نظم

○

مجھ میں کچھ ہے جسے میرا خیال نہیں
وہ میری داڑھی ہے یا میری آنکھیں؟
یا میری ادھیڑ عمر مستقبل کے صفحے تک پہنچتی ہوئی؟
یہ میرے لہو میں گھلی ہوئی شکر تو نہیں؟
یا میرے دماغ میں یورک ایسڈ؟
یا میرے گھٹنے جو میرے دل میں تمھارے گھٹنوں سے مَس ہو رہے ہیں؟

یہ سوچنے جیسا ہے، کسی ایسی بھاشا میں جو مجھے نہیں آتی
کسی ناری کے بارے میں جسے مَیں نہیں جانتا
جو مجھے جانتی ہے ایک ایسی بھاشا میں
جو اسے نہیں آتی لیکن وہ اس گمان میں ہے کہ مَیں جانتا ہوں

میری انگلیوں کی آرکی ٹائپس آئینے میں اُبھرتی ہیں
شیو کی صورت جو کہیں اور محوِ رقص ہے
ایتھنز میں، برگنڈی میں یا سوڈان میں
مجھ میں وہ کیا ہے جسے میرا خیال نہیں؟

پستہ قد کوماز مجھ سے مجھ تک جاتے ہیں
مجھے مجھ سے جدا کرتے ہوئے
ہر ہاتھ ایک کانٹو ہے، دوسرے سے لاتعلق
ہر قدم ایک پرندہ ہے کسی دوسری زمین کی سمت گرمِ پرواز
ہر آنکھ ایک دُور افتادہ صدی ہے، ایک اندھی ذات

کوئی مجھے لفظوں میں لکھ رہا ہے، پرندوں میں مجھے اُڑا رہا ہے
کوئی ہے جو کششِ ثقل ہے، مجھے کھینچ رہا ہے، کھینچ رہا ہے نیچے
آخر وہ کون ہے میرے اندر جسے میرا خیال نہیں؟
یا جو میرے بارے میں نہیں سوچتا جب وہ سچ مچ میرے بارے میں سوچتا ہے؟

نظم

○

(ولس بارن سٹون کے لیے)

ایک پیڑ تھا
ایک جھیل تھی
ایک خیالی گھوڑا تھا ——————
ایک اونچے اُٹھتے پہاڑ کی ڈھلان سے
نیچے لڑھکنے کی خطرناک حالت میں۔
اور چڑیوں کی رانی
آنکھیں موندے یہ منظر دیکھ رہی تھی ——————

یہی وہ جگہ ہے جہاں پچھلی بار ہم نے ہاتھ ملایا تھا
میں تمہیں چومنا چاہتا تھا
لیکن مجھے تمہاری بیوی کی شرم تھی
ہم ان چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے جو غیر اہم ہیں

پھر جدا ہو گئے ان لوگوں کی طرح جنھوں نے ایک دوسرے کو
بس پل بھر کے لیے جانا ہو

چین کسی شمار قطار میں نہیں
نہ ہی مشرق کا بقیہ حصّہ
دُنیا کے پیڑوں کی جڑیں
میری ہتھیلیوں میں تھیں
جب میں تمہارے ساتھ تھا
آج میں پڑا ہوا ہوں
دُنیا کی خالی جیب میں
ماچس کی سوکھی ڈبیا کی صورت

دُور دراز کے قاتل میری جانب بڑھے آتے ہیں
ہر دن ایک قدم سے
میرے جلا وطن شانے روشنیوں اور ستاروں سے دور ہوتے جاتے ہیں

میں وہ ہارا ہوا پرانا سپاہی ہوں
جو چکر کاٹ رہا ہے
اس کی برہنگی کے شعلوں میں
میرے دوست! میری ہڈیاں قبول کرو
ایک مسافر کی وداع کے تحفے کے طور پر ———

نظم

○

ہمارے بیچ اُگا گلاب سُوکھ جائے گا
آسمان کا کوئی نشان بچا نہ رہے گا
شہر کے دروازے بند کر دیے جائیں گے
اور فصیلوں سے دیوتا نیچے پھینک دیے جائیں گے
پرانی سپاہ نئی سپاہ کو شکست دے گی
خستہ و درماندہ چمگادڑیں شہرِ شیراز سے اُڑتی گذر جائیں گی
انسانی سروں کے گولے بھینچ کر پلپلے کر دیے جائیں گے
مہمانوں کو شراب کے پیالوں میں زہر دیا جائے گا
تبریز میں تابوت فضاؤں میں لے جائے جائیں گے
صحرا اپنے آپ کو راجدھانی تک پھیلا دے گا

اور راجدھانی کی پیٹھ بھونچال کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی
سانپ زمین کی ریڑھ میں رینگتے پھریں گے
شہید اپنی پرانی قبروں سے نکل بھاگیں گے
کیسپین سوکھ جائے گا
مچھلی درندوں اور انسانوں کے ساتھ سارے گاؤوں کو نگل جائے گی
جنوبی خلیج سے جلتے ہوئے ستارے یکایک پھوٹ پڑیں گے
اور روزنوں کے شیشوں کے پیچھے بیٹھی ایرانی بلیوں کی آنکھوں میں اُتر جائیں گے

پھر ایک چیخ طلب کرے گی بادشاہوں کو جو اپنی باری کے منتظر ہیں
سب کے سب زمین پر آئیں گے
ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے، خنجر دبائے ہوئے، اپنے دانتوں میں
ناخنوں میں
کانچ کے ٹوٹے ٹکڑوں میں
ذرّوں کی طرح چھوٹے چھوٹے آدمیوں میں
ریت میں
دستانے پہنی ہوئی کلائیوں میں
پیپ اور پیشاب کی تلچھٹوں میں

بھیڑیوں اور سیاروں میں
سوکھے پیڑوں اور پت جھڑ کی پرانی پتیوں میں
کرگسوں اور چوہوں کے چاقوؤں میں
درندوں میں جن سے آدمی اور جانور یکساں طور پر ناواقف ہیں
کوڑھیوں میں جو ایک دوسرے کو ناخنوں اور خنجروں سے کھرچ رہے ہوں گے
لہو کے لبوں میں اور جہنم کے دہانوں میں
ایک نئی صدی کا جنم ہوگا
فارس ایک بار پھر جنم لے گا[1]

---

[1] شاہِ ایران نے کچھ عرصہ پہلے یہ اطلاع دی تھی کہ فارس اگلے دس برسوں میں ایک بار پھر ایک نیا جنم لے گا۔

نظم

(جمیلہ تبریزی کے نام، ایک ایرانی خاتون جو آج بھی شاہ کے ٹارچر چیمبر میں مقید ہے)

ایک

بہن !
مجھ سے باتیں کرنا، جب ستارے سو جائیں

مجھ سے کہنا، اپنی باتیں، جب ستارے چمک نہ رہے ہوں

بہن !
مجھ سے
کہنا
اپنے دل کی
باتیں
جب
ستارے
روشن
نہ
ہوں

تمھاری انگلیاں میرے ہاتھوں میں ہیں
بہار کے گلابوں کی پنکھڑیاں
تمھارا مفہوم
ہمارے بیچ کھڑی دیواروں
ہمارے چاروں طرف پھیلی دیواروں سے گزر کر
گلابوں کی زبان میں
مجھ تک پہنچ جاتا ہے

بہن !
چمکتے

ستارے
کچھ کہتے ہیں
تم مجھ سے دل کی باتیں کرنا جب ستارے سو جائیں

دد

زنداں میں ایک عورت کا بدن

یہ اسی عورت کا بدن ہے
کرٹے پانیوں کی یخ جھیل میں
دیوار کھڑی ہے، کھڑی ہے
برف پڑی ہے، پڑی ہے
کوئی حرکت نہیں
چلو، مَیں تمھیں باہر لے چلوں
گرماؤں تمھارے بالوں، تمھاری آنکھوں، تمھارے یخ شانوں کو،
تمھارے سینے کے برفیلے گولوں کو
تمھارے دل کی ٹھنڈی کلائیوں کو
چلو، مَیں تمھیں صحرا کی طرف لے چلوں
جہاں سورج کی گرمی ہے
اور دیکھوں تمھیں برف سے ایک نیا جنم لیتے ہوئے
تمھیں بولتے اور چلتے ہوئے

بہن!
جگمگ کرتے تارے
کچھ کہتے ہیں
تم مجھ سے اپنی باتیں کہنا جب یہ تارے بجھ جائیں

ستیش

اندھیرے کی اپنی بُو ہوتی ہے
یہ بُو اس عورت کے لیے نہیں ہے

جو تیرگی میں ایک نوخیز پودے کی صورت استادہ ہو

تمھارے پاؤں کے ناخن میری جڑیں ہیں
سپاہی اندھے ہیں
وہ ان ناخنوں کو کھینچ نکالیں گے، تو میں سوکھ جاؤں گا

بہن!
چمکتے ستارے
کچھ کہتے ہیں

چاند

جب دوستوں نے مجھے بتایا
کہ کتے تمھیں اغوا کر لے گئے
میں حیران تھا
کہیں بھیڑیے بھی چاند کو چھین سکتے ہیں؟
میں اپنے کمرے میں اپنے لاموجود مجسمے کے سامنے کھڑا ہوں
اور تم سے باتیں کرتا ہوں، یوں جیسے
ہم انقلاب کے بعد کے دور میں ہوں
اور ہمیں ایک موزوں نام منتخب کرنا ہے
اس تند و تیز شراب کے لیے
تاکہ ہم ان چار برسوں کو خراج دے سکیں جو تم نے شاہ کی قید میں گزارے
تم نے کہا: ایک پڑھا لکھا کسان
بہتر ہے ایک ان پڑھ کسان سے
میں نے یہ بات مان لی کہ ایک نہ بک سکنے والا مزدور
بہتر ہے بک جانے والے سے
پھر ہم نے تالیاں بجائیں!
اور ان تمام اچھے دنوں کے بارے میں سوچا
جنھیں ہم اس جیل میں پڑے سڑنے کے بجائے
ایک ساتھ گزار سکتے تھے

ہمانچہ

ہمارے دھیان کی کوٹھریوں میں
شاعر اور اس کے شعر
ایک —— بالکل ایک ہو جاتے ہیں

پڑھنے والے اور لکھنے والے
گانے والے اور سوچنے والے
کھیلنے والے اور وہ کھیل جو کھیلا جا رہا ہو
ایک ہو جاتے ہیں

بھائی ہی بہن ہے
بیٹا ہی باپ ہے
اور باپ اور ماں
ایک ہیں —— بالکل ایک!

ناموں کے الگ الگ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا
دُنیا کی ہر شے
وہ جو چل رہا ہے اور وہ جو لنگڑا رہا ہے
سب ایک ہیں

شاہ کی جیل میں مقید
اس لڑکی کو
مَیں تسکین و تشفی کے یہ لفظ نذر کرتا ہوں

اس لڑکی کا نام
شاہ اور اس کے جرگے کو
شرمندہ کرتا رہے گا
اس عمل کا امتحان صرف یہ ہے : ساتھیو! ہم
ایک ہیں

ایک کہانی کی کہانی

ایک عورت، تیس پینتیس برس کی، مجلّہ فردوسی کے دفتر میں داخل ہوتی ہے۔ وہ انتہائی حسین اور خوش لباس ہے۔ اس نے ایک کہانی لکھی ہے اور چاہتی ہے کہ میں پڑھ کر اپنی رائے دوں۔ وہ کوئی پیشہ ور قصہ نویس نہیں معلوم ہوتی۔ بس چند صفحے ہیں۔ میں پڑھتا ہوں۔ اس اثنا میں وہ میرے پاس بیٹھی غور سے میرا چہرہ دیکھتی رہتی ہے۔

کہانی کا عنوان ہے ——— انتقام میں کہتا ہوں کہ مجھے اس کہانی میں انتقام کا کوئی نقش دکھائی نہیں دیتا۔

پلاٹ ایک انتہائی معزز وزیر کے گرد گھومتا ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ پھر اس کی بیوی ایک ذی مرتبت بھڑوے تک جاتی ہے جس کی شناخت قائم کرنا مشکل ہے۔ وہ ذی مرتبت بھڑوا اسے ایک اور پُراسرار شخصیت تک لے جاتا ہے، جس کی شناخت کچھ اور زیادہ الجھا دینے والی ہے۔ وہ اس پُراسرار شخص کی داشتہ بن جاتی ہے۔ اور ایک دن اسے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ ادھر کا رخ بھی نہ کرے۔

میں بہت نرم لہجے میں کہتا ہوں: "میرے خیال میں ہم اس کہانی کو کچھ زیادہ کامیابی کے ساتھ شاید نہیں چھاپ سکتے۔"

"مجھے اس کے چھپوانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی نظر میں اس کا کچھ مفہوم نکلتا ہے یا نہیں؟"

"مجھے اس میں کوئی مفہوم نظر نہیں آتا!"

وہ اٹھتی ہے اور باہر نکل جاتی ہے۔ اس کے چند روز بعد وہ ٹیلی فون پر مجھ سے ربط قائم کرتی ہے۔ ہم ملتے ہیں۔ وہ اس کہانی کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت سے نقاب اٹھاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے مجھ پر بھروسہ کیوں کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرے پڑھنے والوں کی صف سے تعلق رکھتی ہوگی۔ لیکن، وہ مجھے طرح طرح سے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کی کہانی سچی ہے۔ کہانی کا وزیر اس کا اپنا شوہر ہے، عورت وہ خود ہے، بھڑوا شاہ کے دربار کا ایک انتہائی معروف رکن ہے اور جس پُراسرار شخصیت کی خواب گاہ میں اسے لے جایا جاتا ہے، وہ خود شاہ کی ہے، شاہی محل میں واقع۔

میں اس سے کہتا ہوں کہ مجھے اس قسم کی غپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ہمیں اپنی آنکھیں کھولنی چاہئیں اور افواہوں کے پیچھے چھپی حقیقتوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔

پھر وہ تفصیلات بتاتی ہے اور ہر متعلقہ شخص اور واقعے کا ایسا مکمل نقشہ کھینچتی ہے کہ اگر اسے اسی صورت میں لکھ سکے

تو دنیا کی بہترین کہانیوں میں ایک اور کہانی کا اضافہ ہو سکتا ہے۔
" محل کی طرف جاتے ہوئے وہ بڈھا (الف میم) مجھ سے کہتا ہے کہ میں کسی کو اس واقعے کی ہوا بھی نہ لگنے
دوں ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے پر اس طرح ہاتھ رکھا تھا گویا دعا سے ہاتھ ہی سے کاٹ دے گا
یا بیک ہاتھ نہ ہوا، چاقو ہوا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کسی کو نہ بتاؤں گی۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ایک ایسی عزت بخشی گئی ہے
جو کم ہی لوگوں کا نصیب ہوتی ہے۔ . . پھر میں ایک کمرے میں پہنچا دی جاتی ہوں، جس کے ایک گوشے میں ریشم کی چادر سے ڈھکا ایک
بہت بڑا پلنگ پڑا ہوا ہے۔
" اچانک ایک دوسرے دروازے سے شاہ اندر آتا ہے اور میری طرف بڑھتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اسے
اس کی عینک کے بغیر دیکھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت وہ ٹھیک ویسا ہی نظر آ رہا ہے جیسا ان موقعوں پر
جب کوئی نوجوان طالبہ اسے پھولوں کا گلدستہ پیش کر رہی ہو۔ میں پہلی بار اس کے گھنے ابروؤں کو دیکھتی ہوں۔ وہ پلٹ کر
گراموفون پر ایک ریکارڈ رکھ دیتا ہے۔ اس نے ایک سرخ دھاریوں والی قمیض اور ایک ڈھیلی ڈھالی آرام دہ پتلون پہن
رکھی ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھ پاتی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں اس کے پاس لے جائی جا رہی ہوں۔ وہ مسکراتا
ہے۔ پھر کچھ نرم جملے کہتا ہے۔ رقص کے دوران ہم آہستہ سے بستر کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔
" چھ ماہ تک مسلسل ہر دوشنبہ کو ہم اسی کمرے میں ایک ساتھ سوتے ہیں۔ بعد میں مجھے پتہ چلتا ہے کہ
مجھ جیسی اور بھی ہیں، جو اسی کمرے میں لے جائی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ سوتی ہیں۔ پھر ہمیں چپ چاپ دربار کے دوسرے معززین کے
حوالے کر دیا جاتا ہے۔"
" لیکن تم نے اس کہانی کا عنوان 'انتقام' کیوں رکھا ہے؟"
" چھ مہینے پہلے میرے پہلے شوہر نے، جو وزیر نہیں بلکہ ایک معمولی آدمی تھا اور جس سے اس وزیر نے زبردستی
مجھے طلاق دلوا دی تھی ——— میرا بیٹا گرفتار کیا گیا اور اسے اذیتیں دی گئیں ——— کسی کو نہیں معلوم کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔
لوگ دن رات اسی طرح غائب ہوتے رہتے ہیں ——— یہ کہانی سنا سنا کر میں اپنا انتقام لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

سرکاری تقویمیں خراب چھپتی ہیں
سرکاری تقویمیں جھوٹ بولتی ہیں
سرکاری مطبوعات بھی . . .
ان میں "وفات" کے بجائے "تولّد"
اور "عزا" کے بجائے "جشن"
چھپ گیا ہے

ان سب کی تصحیح ہونا چاہیے
سرخ، خون کی ہم رنگ روشنائی سے

——— ایک نئی ایرانی نظم سے اقتباس ——— ترجمہ: ش۔ مسعود

فَصْلِ چہارم

زیرِ ترتیب منظر کا آخری صفحہ جو ادھورا ہے ۔

اصولی طور پر شاہ کی حکومت کا تانا بانا ایک آئینی شہنشاہیت اور چند منتخبہ پارلیمانی نمائندوں
کے باہمی اشتراک سے تیار ہوا ہے ۔ عملاً اقتدار صرف شاہ کے ہاتھوں میں ہے کہ وہاں انتخاب اور نامزدگی ہم معنی لفظ بن گئے
ہیں ۔ پارلیمانی اراکین کے حقوق و اختیارات کا اندازہ اسی واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی چند برس پہلے ، جب شاہ

اسمبلی اور سینیٹ کے ایک مشترکہ اجلاس کا افتتاح کر رہا تھا، ایک پارلیمانی رُکن تھکن اور کمزوری کے سبب بیہوش ہو گیا۔
شاہ کے افتتاحی خطبے کے دوران لازم تھا کہ تقریب میں شامل ہر شخص کھڑا رہے۔ بوڑھے رکن نے ہزار دقتوں سے خود کو پیر اٹھایا۔
لیکن وہ دوسرے ہی لمحے پھر گر پڑا۔ ایک کوشش اور کی، مگر اس بار بھی ناکام رہا کہ طاقت جواب دے چکی تھی۔ مجال نہ تھی کہ کوئی اور
اس وقت مدد کو آئے۔ پس جان سے چلا گیا۔ اور شاہ کا افتتاحی خطبہ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک شخص کی موت کسی ایسی تقریب
کی کارروائی میں کیونکر مخل ہو سکتی تھی، جہاں شاہ موجود ہو!
آگ اور خون کا یہ کھیل کب تک جاری رہے گا؟ اس سوال کا جواب نجوم اور فلکیات کے ماہروں کی بجائے وہ کسان
بتائیں گے، جو اب کھیتیوں کے مالک نہیں بلکہ مزدور بن گئے ہیں اور شاہ کے تعمیری منصوبوں اور اصلاحی اقدامات کے ہاتھوں جن کی کو آپریٹیو
کاروباری نظام منتشر ہو چکا ہے ——— وہ طالب علم بتائیں گے جن کے لیے علم و دانش کے تمام سرچشموں کا مفہوم آج صرف ایک لفظ میں سمٹ
آیا ہے ——— انقلاب! ارضِ فارس کے وہ ساٹھ فی صد سے زیادہ خاندان بتائیں گے جن کی ہفتہ وار آمدنی سات ڈالر سے بھی کم ہے۔
اور شاید ——— اس سوال کا جواب امریکی صدر اور شاہ ایران بھی بتا سکتے ہیں کہ یہ لفظ ہوا کی پیشانی پر روشن ہیں اور ان کا عکس
ارضِ فارس کے ذرّے ذرّے کی جبیں پر منعکس ہے۔
جب سامانِ زیست فراہم کرنے والی اشیا کے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں تو جانیں سستی ہو جاتی ہیں۔
اور جب جانیں سستی ہو جاتی ہیں تو انھیں اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے بہت بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ یہ قیمت ایرانی برآمدات
کے بانوے فیصد حصے یعنی قدرتی تیل سے حاصل ہونے والی اس ساری دولت و فراغت سے ادا
نہیں کی جا سکتی، جو اس وقت صرف شاہ ایران یا گنتی کے چند افراد تک محدود ہے۔
کتابوں میں لفظ مستحکم بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن زندگی ہر آن ہر لفظ کو ایک نیا مفہوم دیتی جاتی ہے۔ ارضِ عجم
کے سینے پر آج صرف ایک کتاب کھلی ہوئی ہے، اُسی زندگی کی جس کی آزمائشوں سے اس کے نیم فاقہ کش باشندے گزر رہے ہیں۔
یہ زندگی انھیں بتاتی ہے کہ ہر چھ مہینے پر اشیا کی قیمتوں میں اضافے کی شرح
پچاس فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ یہ زندگی انھیں بتاتی ہے کہ نئے، ترقی یافتہ، صنعتی تمدن کی دولتوں سے مالا مال ایران میں
سنگتروں کی ایک ننھی سی ٹوکری کا دام ایک ہزار روپے ہے۔
۲۱ اگست ۱۹۷۸ء کو آبادان کے ایک سنیما گھر میں جو آگ لگی تھی اس میں چار سو ستائیس جانیں تلف ہوئیں۔
سرکاری اخباروں نے بتایا کہ یہ آگ ان رجعت پسند قوتوں نے لگائی تھی جو تعمیرِ نو کی ہر کوشش کے خلاف ہیں۔ لیکن ۲۲ اگست
کی رات کو بی۔ بی۔ سی نے خبر دی کہ آبادان کے عوام نے ان تمام اخباروں کی کاپیاں جلا دیں، جو اس "جھوٹ" کی اشاعت کے مرتکب
ہوئے تھے۔
اب شاہ نے تشدد کے ساتھ ساتھ رعایتوں کا ایک نیا دفتر بھی کھول دیا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہوا کی پیشانی پر
ایک نئی تحریر روشن ہے! سرکاری اخبارات اور بیانات رعایتوں، نئی اصلاحوں، بعض "رفتہ و گزشتہ"
غلطیوں پر پشیمانیوں کی گونج میں اس لفظ کی دستک کو گم کر دینا چاہتے ہیں جو انقلاب کے گُلِ سرخ کا اسم ہے
اور لپکتے ہوئے شعلوں کی باڑھ میں جس کی پنکھڑیوں کا رنگ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔
ایرانی اخبارات سنسر شپ سے مکمل نجات کی جد و جہد میں مصروف ہیں، تاکہ اُسی زندگی کی واردات کا بیان
کر سکیں جس کی کتاب ایران کے شہروں، گاؤں، دانش کدوں اور گلی کوچوں میں کھلی ہوئی ہے۔ تہران ہی سے شائع ہونے والے کچھ

خبرناموں کے مطابق طلباء کے ساتھ ساتھ اب ننھے ننھے بچے بھی مظاہروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ایک مدت سے ایران جس آتش فشاں کے دہانے پر تھا، اب اُس میں اُبال آ چکا ہے۔

۱۹ر جولائی ۷۸ء : شاہ ایران نے یہ احکامات جاری کیے کہ اب پہلوی خاندان کے افراد پہلے کی طرح شخصی سطح پر آزادانہ تجارت کی سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکیں گے۔

۶ر اگست ۷۸ء : شاہ نے یہ وعدہ کیا کہ جون ۷۹ء کے پارلیمانی انتخابات بالکل آزادانہ ہوں گے۔ اور ایرانی عوام کو وہ تمام سیاسی آزادیاں حاصل ہوں گی جو مغربی جمہوریتوں میں رائج ہیں۔

۱۰ر اگست ۷۸ء : شاہ نے یہ اعلان کیا کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ عوام کو اظہار کی مکمل آزادی بھی حاصل ہوگی۔

۱۹ر اگست ۷۸ء : شاہ نے یہ اعلان کیا کہ رستا خیز کے علاوہ دوسری پارٹیوں کے اراکین بھی پارلیمانی انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں۔

۲۵ر اگست ۷۸ء : شاہ نے پیرس میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران بتایا کہ ایرانی باشندوں کو اب مظاہروں کی آزادی بھی حاصل ہوگی۔

۲۷ر اگست ۷۸ء : جمشید آموزگر کی وزارت مستعفی ہو گئی اور جعفر شریف امامی کو ایک نئی کابینہ کے قیام کے اختیارات دے دیے گئے۔ شریف امامی نے یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت مذہبی اصولوں کا احترام کرے گی۔

۲۹ر اگست ۷۸ء : شاہ نے اپنے ذاتی معالج اور چند نامقبول فوجی عہدیداروں کی ملازمتیں منسوخ کر دیں۔ شاہی کیلنڈر کے بجائے از سر نو روایتی اسلامی کیلنڈر کے اعلان کا نفاذ بھی کیا گیا۔ نئے وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ ان کی حکومت ان تمام افراد کو سزا دے گی جنھوں نے قومی دولت اور اقتدار کا استعمال اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کیا ہے۔

۳۱ر اگست ۷۸ء : شاہ نے ہیمبرگ کی ایک ہفتہ وار میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اب کسی سیاسی قیدی کو اذیتیں نہ دی جائیں گی۔

۴ر ستمبر ۷۸ء : مغربی جرمنی کے ایک اخبار نے خبر دی کہ شاہ بانو نے ملک میں صورت حال کی خرابی کے سبب اپنے دو بچوں کے ساتھ ایرانی سرحدوں سے بہت دور میکسیکو کے جزیرے میں پناہ لے لی ہے۔

۶ر ستمبر ۷۸ء : شریف امامی نے یہ اعلان کیا کہ اب کمیونسٹوں کے علاوہ تمام سیاسی کارکنوں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت ہوگی۔ ایک ایرانی روزنامے میں یہ خبر بھی شایع ہوئی کہ حکومت نے ایک وفد عراق بھیجا ہے جہاں وہ آیت اللہ خمینی سے مصالحت کی گفتگو کر سکے۔ ایرانی حکومت نے اس خبر کی سختی سے تردید کی۔

۱۱ر ستمبر ۷۸ء : شریف امامی نے سرکاری سطح پر کرپشن کے مکمل سدِ باب کی قسم کھائی۔

۱۲ر ستمبر ۷۸ء : شاہ ایران کے اٹھارہ سالہ ولی عہد سلطنت نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ وہ ایرانی حکومت کے تمام مخالفوں سے بات چیت شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ لوگ احتجاج کے نام پر ناحق اپنا وقت گنوا رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس کرنے کو اب کوئی اور کام نہیں رہ گیا ہے۔

اخذ

۱۲ر ستمبر ۷۸ء : امریکی صدر جمی کارٹر نے شاہ کو مشورہ دیا کہ ابھی مزید سیاسی رواداری کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شاہ کو یہ ضمانت بھی دی کہ امریکہ ہر حال میں تعاون کے لیے تیار ہے۔

۱۶ر ستمبر ۷۸ء : شاہ نے فرانسیسی ٹیلی ویژن ٹیم کو بتایا کہ حکومت سے دست بردار ہونے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ شاہ نے یہ بھی کہا کہ ایران اور سوویت یونین کے تعلقات بہت شاندار ہیں۔

اخذ

۶ر نومبر ۷۸ء : شاہ نے ملک میں فوجی حکومت قائم کر دی۔ وزارتِ عظمیٰ کی باگ ڈور ایرانی افواج کے سربراہ جنرل غلام رضا اظہری کو سونپ دی گئی کہ شریف امامی کی کابینہ عوامی احتجاج کو روکنے میں بالآخر ناکام رہی تھی۔

۷ر نومبر ۷۸ء : نئی فوجی حکومت نے شاہ کی خفیہ تنظیم ساواک کے سابق چیف جنرل نعمت اللہ ناصری اور کئی سابق وزرا کو گرفتار کر لیا۔ اس اقدام کا محرک شاہ کا یہ عہد تھا کہ ہر سطح پر کرپشن اور ماضی کی غلطیوں کو ختم کرنا ہے۔

۸ر نومبر ۷۸ء : فوجی حکومت نے ایران کے سابق وزیراعظم امیر عباس ہویدا کو بھی گرفتار کر لیا کہ اس کے طویل مدت اقتدار میں عوام کے ساتھ بڑی ناانصافیاں کی گئی تھیں۔
اسی روز شاہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ شاہی خاندان کی دولت اور املاک کے ذرائع کی جانچ پرکھ کے لیے ایک خصوصی کمیشن بھی مقرر کر دیا گیا ہے جو دو مہینے کے اندر اندر اپنی تفتیش اور رپورٹ مکمل کر لے گا۔

یہ کیسی پشیمانی ہے؟ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے؟
فوجی حکومت کے قیام کے باوجود بے اطمینانی کی وہ لہر ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تہران کی سڑکوں پر نئی حکومت کے قیام کے روز ایک ڈراؤنی خاموشی چھائی رہی۔ یوں شاہ رضا ایوینیو میں فائروں کی اکا دکا آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ اس سے ایک دن پہلے عوام سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ہر طرف آگ تھی اور امریکی سفارت خانے پر زبردست پہرا۔ مظاہرین گلیوں میں، شارعِ عام پر بھاگتی ہوئی کاروں کو روکتے تھے اور ان پر یہ لفظ چسپاں کر دیتے تھے: "مرگ بر شاہِ ایران!"
اس روز انھوں نے وزارتِ اطلاعات، ساواک کے دفاتر اور برٹش ایمبیسی کو نذرِ آتش کر دیا۔
۵ر نومبر ۷۸ء کو امریکہ نے ایک بار پھر اپنے تعاون کی یقین دہانی کی اور اس امید کا اظہار کہ آزمائش کے یہ لمحے شاہ کے سر سے گزر جائیں گے۔ ادھر پیرس میں آیت اللہ خمینی نے کہا کہ ایران میں امریکیوں کی موجودگی اور حکومت کے معاملات میں امریکہ کی مداخلت ہماری "آزادی" کے تصور کے منافی ہے۔ امریکیوں کو چاہیے کہ وہ ہماری زمین چھوڑ کر چلے جائیں ——— خمینی نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر جد و جہد کے موجودہ طریقے حصولِ مقصد میں ناکام ثابت ہوئے تو ہم خانہ جنگی شروع کر دیں گے ——— ایران کے ممتاز اپوزیشن لیڈر کریم سنجابی نے کہا کہ ہماری جد و جہد جاری رہے گی۔ اور امریکہ کی وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے کہا کہ فوجی حکومت کا قیام ناگزیر تھا!

تہران : ۱۹۷۹ء

فصلِ پنجم

بخارا سمرقند کو بھول جاؤ
اب اپنے درخشندہ شہروں کی
طہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کرلو
تم اپنے نئے دور ہوش و عمل کے دل آویز چشموں کو
اپنی نئی آرزوؤں کے ان خوبصورت کنایوں کو
محفوظ کرلو۔

———— ن۔م۔راشد : تیل کے سوداگر

○

انتظاریہ :

ایران کو ایک نیا وریت نام بننا ہوگا . . .

———— ایک جلاوطن ایرانی دانشور

پس ازاں : "اے ارضِ فارس" کا مسودہ شمیم حنفی نے جس وقت مکمل کیا تھا، ایران میں فوجی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ مسودے پر اس کی تکمیل کا وقت اور تاریخ، رات : ۸ / نومبر ۱۹۷۸ء ہے۔ آج جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، ۱۹۷۹ء کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ بیچ کے اس وقفے میں واقعات کی رفتار اتنی تیز رہی ہے کہ لفظ اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ "اے ارضِ فارس" کا خاتمہ اس استفہامیے پر ہوا تھا کہ "ایران کو ایک نیا ویت نام بننا ہوگا" ۱۹۷۹ء کے پہلے دن کا اخبار اس سُرخی کے ساتھ سامنے آیا ہے کہ ایران کی فوجی حکومت نے مشہد میں سات سو افراد کو ہلاک کر دیا۔ ہزار سے زیادہ لوگ گھائل ہوئے ــــــــ سو ایران، ویت نام بن چکا ہے۔ شاہ نے اس عرصے میں کئی داؤں لگائے۔ شاپور بختیار کو ایک سویلین سرکار قائم کرنے کی دعوت دی۔ کبھی یہ اعلان کیا کہ علاج اور آرام کے لیے وہ ایران کی سرحدوں سے دور جانے کی سوچ رہا ہے۔ کبھی یہ کہ وہ خود اکتا چکا ہے، تھک چکا ہے مگر اس کے فوجی صلاح کار اس بات پر آمادہ نہیں کہ وہ تخت سے دستبردار ہوجائے۔ ابھی ابھی (دوپہر : یکم جنوری ۱۹۷۹ء) ریڈیو نے خبر دی ہے کہ ایران کی فوجی حکومت کے سربراہ جنرل غلام رضا اظہری نے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے اور شاہ نے اس سے درخواست کی ہے کہ کوئی متبادل انتظام ہونے تک وہ نظم و نسق کا بار سنبھالے رہے۔ ادھر اپوزیشن نیشنل فرنٹ نے شاپور بختیار کو اپنی جماعت سے باہر کر دیا ہے۔ آدرشوں کی لڑائی میں مفاہمت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایرانی عوام کا صرف ایک مطالبہ ہے ــــــــ جبر و استبداد کی اس کہانی کو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا ہوگا جس کا مرکزی کردار شاہ ہے لیکن بُری عادتوں میں ایک عادت اقتدار کی چاٹ بھی ہے۔ شاہ کے ہاتھ سے پتوار چھوٹ چکے ہیں، سمندر کی سطح میں اُبال آچکا ہے، اور ــــــــ اور جمی کارٹر نے ڈوبنے والے کو بچانے کے لیے اپنا ساتواں بحری بیڑہ روانہ کر دیا ہے۔ یہ بچاؤ شاہ ایران کے لیے ہے یا امریکی سرمایہ داری کے لیے؟ اسکول کے بچوں سے سن رسیدہ بوڑھوں تک آدرش ایک ہے۔ اس آدرش کے حصول کا راستہ ایک ہے۔ اس راستے کے سفر کا طور ایک ہے اور مسافروں کے رگ و پے میں چکر کاٹتے لہو کی پکار ایک ہے ــــــــ انقلاب۔ مکمل انقلاب۔ اس انقلاب کی راہ میں ہلاک ہونے والے ہر فرد کے ساتھ شاہ کی لرزہ بر اندام حکومت کا ایک ستون ڈھے جاتا ہے۔ ہم نجومی نہیں ہیں مگر ہوا کے ماتھے پر لکھی وہ تحریر لمحہ روشن، اور روشن، اور روشن ہوتی جارہی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک "شعور" آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، آدرشوں کی یہ لڑائی اپنے آخری موڑ تک پہنچ چکی ہوگی۔ ایران کے جیالے عوام کے ساتھ ہماری آنکھیں بھی اسی موڑ کی منتظر ہیں!

چار سو اکیاسی

زوال پرستی کے سوال پر ایک مذاکرہ

ژاں پال سارتر

ارنسٹ فشر

ایڈورڈ گولڈ اسٹکر

ملان کندیرا

ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسندوں کے نام!

ادیب اپنی تخلیق کو کسی بھی صورت میں ذریعہ نہیں سمجھتا۔ اس کی تخلیق آپ اپنا مقصد ہے۔ خود ادیب کے لیے اور دوسروں کے لیے اس کی تخلیق ایک ذریعہ ہونے سے اس قدر دور ہوتی ہے کہ وہ اس کے وجود کی خاطر اپنے وجود کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جب بھی ایسی کوئی ضرورت آن پڑے۔

——— مارکس

سیاست دان اپنے عہد کے آرٹ کو ایک طے شدہ ثقافتی کائنات میں تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ ایک سیاسی سرگرمی ہے، فن کی قدر شناسی نہیں ہے۔ اگر وہ ثقافتی دنیا، جس کے لیے ہم جد و جہد کر رہے ہیں، ایک زندہ اور لازمی صداقت ہے تو اس کا اظہار ناقابلِ مزاحمت ہے۔ اسے خود بخود اپنے فن کار مل جائیں گے۔ اگر سیاسی دباؤ کے باوصف اسے اپنے فن کار نہیں ملتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک نقلی ثقافتی دنیا، ایک معجونِ مرکب، اور ایک اوسطیت زدہ کاغذی آدرش تلے الجھے ہوئے ہیں۔

——— گرامچی

ہندوستان کے ترقی پسند ادیب ہمارے اتارے ہوئے کپڑے پہن رہے ہیں!

——— روسی ادیبوں کے ایک حلقے کی صدائے گم گشتہ۔
پنڈت سندر لال سے ایک گفتگو کے دوران۔

ژاں پال سارتر :

میں زوال پرستی کے موضوع پر بڑی خوشی سے گفتگو کروں گا ——— لیکن، پہلے ہمیں وہ غلط فہمیاں جو آپ سب میں نہیں بلکہ ہمارے چند کمیونسٹ دوستوں میں پھیلی ہوئی ہیں، رفع کر دینی چاہئیں - میرا اشارہ کچھ سوویت مصنفوں کی جانب ہے جنھوں نے پچھلے برس لینن گراڈ کے مقام پر یورپین ادیبوں کی کانفرنس میں سرمایہ دار ملکوں کے فن میں زوال پرستی کے سوال پر بحث کی تھی - میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ زوال پرستی کا تصور ہمارے کام میں آخر کیوں زبردست مسئلے پیدا کر دیتا ہے - دراصل یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر بہت سنجیدگی سے غور کیا جائے - ہمیں اسے ٹالنا نہیں چاہیے - آپ نے بہت صحیح کہا کہ چیکوسلواکیہ عظیم ثقافتی روایات اور مارکسی افکار کا نقطۂ اتصال ہے - اس طرح یہاں ہمارے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ زوال پرستی جو کردار ادا کر سکتی ہے ہم اس کا تعین کریں - مغرب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو انفرادی یا اجتماعی سطح پر اس نوع کی جستجو میں مصروف ہیں ——— یہ لوگ ریڈیکل دانشور ہیں، اشتراکی ہوں یا نہ ہوں - اس کی بہت ساری قیاسی مثالوں میں سے میں یہاں اپنی ہی مثال پیش کرتا ہوں -

میرا جنم ۱۹۰۵ء میں ہوا - میری پرداخت میرے دادا کے ہاتھوں ہوئی جو ایک پروفیسر تھے اور ایسے بہتیرے خیالات رکھتے تھے جنھیں انیسویں صدی میں قبول عام کی سند حاصل تھی - میری نشوونما ایک ایسی دنیا میں ہوئی جس پر علامت پرستی کے ادب اور فن برائے فن کے تصور کا غلبہ تھا - مغربی فلسفے کے وہ تمام افکار جن کا میں نے مطالعہ کیا تھا، میں نے قبول کر لیے - لیکن رفتہ رفتہ میں اس کلچر سے لاتعلق ہوتا گیا گرچہ اس کے بعض مخصوص عناصر میں نے اب تک محفوظ رکھے ہیں - اس طرح، دھیرے دھیرے، ان تمام باتوں کے ساتھ جو میں نے اس وقت تک سیکھی تھیں، میں مارکسزم تک آیا - دوسری باتوں کے علاوہ، میرا خیال ہے کہ یہ میرا فرائڈ، کافکا اور جوائس (یہاں تینوں نام میں نے اس وجہ سے لیے ہیں کہ لینن گراڈ میں سب سے زیادہ ذکر انہی کا ہوا تھا) کا مطالعہ تھا جس نے مجھے مارکسزم تک پہنچایا - لیکن جب کچھ مشرقی (مشرقی یورپ کے) دانشور لینن گراڈ میں بلاتفریق ان تینوں کو زوال پرست کہہ کر صرف اس لیے مطعون کرتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک زوال پرست معاشرے سے تھا، تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرا اپنا ثقافتی پس منظر بھی (اس زاویۂ نظر سے) "غیر قانونی" ہے اور یہ کہ مجھے اپنے سوویت دوستوں سے اس امر کے پیش نظر معذرت طلب ہونا چاہیے کہ میں نے ان تینوں مصنفوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی شناخت کی ہے اور انھیں پسند کیا ہے - مثال کے طور پر، جب کچھ حضرات جوائس پر زوال پرستی کے تصور کا اطلاق کرتے ہیں تو ان کی تنقید، ایسے لوگوں کے لیے جنھوں نے جوائس کو نہیں پڑھا ہے، ایک رسوماتی نوعیت کی حامل ہو جاتی ہے - فی الوقت جو بات اہم ہے، اصلاً یہ نہیں ہے کہ زوال پرستی کے مسئلے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ایک سوچے سمجھے نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا جائے - لیکن وہ لوگ جنھوں نے زوال پرستی کا سوال اٹھایا ہے ——— مغرب کے وہ ادیب جو وہاں تدعو کیے گئے ہیں ——— اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں - ایسا اس لیے ہے کہ یہ لوگ پہلے ہی یہ کوشش کر چکے ہیں کہ ان مصنفوں میں ان تمام عناصر کو جو بورژوا قرار دیے جا سکیں اور ان تمام باتوں کو جو ایک سوشلسٹ سماج میں قابلِ قبول نہ ہو سکیں، سرے سے ختم کر دیا جائے! انھوں نے ایک طرف تو یہ کچھ کیا ہے اور دوسری طرف بیک وقت ان کی معنویت کو قائم رکھنے

کی کوشش ہی کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ معنویت آج ہم سب کے لیے بہت قیمتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مغرب کے ترقی پسند ادیبوں نے پروست اور کافکا جیسے چند مصنفوں کے مطالعے کی وجہ سے کوئی مخصوص بیماری پکڑلی ہے۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا مارکسی، ان ادیبوں کا مطالعہ کرنے کے باوصف بلکہ اسی کے سبب وہ اس بحث کو چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان ادیبوں کا سارا لکھا جوکھا ہم آنکھیں بند کرکے سچ مان لیتے ہیں، نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سچا مارکسی ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ان مصنفوں کا مطالعہ کسی دوسرے نقطۂ نظر سے کیونکر کیا جائے۔ اس کے برخلاف متذکرہ واقعے سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ (متنوع افکار کا) ایک ناگزیر امتزاج اختلافات اور بحث مباحثے ہی کے نتیجے میں سامنے آسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اینٹی مارکسسٹ بورژوا کے مقابل خود مارکسیوں میں بھی سوچ بچار کی استعداد رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو اپنی گفتگو میں ہمیں ایسے لوگوں کو مسترد نہیں کرنا چاہیے جن کی ترجمانی میں کر رہا ہوں۔ سوچ بچار کی استعداد رکھنے والوں سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو اسی بورژوا کلچر کی پیداوار ہیں، ہر چند کہ اس کے مخالف بھی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم قیاساً زوال پرستی کے تصور کو مسترد کردیں۔ یہ تو بیّن ہے کہ زوال پرستی کا ایک اپنا وجود رہا ہے۔ سلطنت روما کے خاتمے پر ایک دور تھا جب صرف اس سبب سے فن کی زوال پرستی پر گفتگو کی جا سکتی تھی کہ فن کی تخلیق کرنے والے فن کے ہیئتی ارتقا کے ایک مخصوص تصور میں بند پڑے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے سنگ تراش اپنے پیش روؤں کی تکنیکی مہارت تک رسائی سے قاصر تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "میں ایک آدمی کا بت بنا سکتا ہوں گھوڑے کا پیکر تراش سکتا ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ آدمی کو اس گھوڑے پر سوار کیسے کیا جائے؟" یہ سب کچھ مربوط ہے طبقوں میں بٹے ہوئے معاشرے سے نیز اس معاشرے کی اس معذوری سے کہ وہ کچھ نیا تخلیق کرنے کے قابل نہیں رہ گیا۔ زوال پرستی کے تصور کی تعریف اور اس تعریف کا اطلاق صرف ایک خالص فنی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا کہ "کیا فن زوال پرست ہو سکتا ہے؟" میں یہ جواب دوں گا کہ ہاں، ہو سکتا ہے۔ لیکن صرف اس صورت میں جب ہم اسے صرف اسی کے فنی معیار پر پرکھیں۔ اگر ہم جوائس، کافکا اور پکاسو کو زوال پرست ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اصلاً انہی کے کارناموں کو بنیاد بنانا پڑے گا۔ صرف اسی صورت میں —— اور مارکسیوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے —— ہم تاریخ کے سیاق اور معاشرے کے عالمی ڈھانچوں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ سمجھ سکیں گے کہ اس مظہر کی نمود کیونکر ہوئی؟

اس طریقِ کار کا اطلاق اگر ہم کسی مخصوص مصنف یا کسی مخصوص عہد پر کریں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زوال پرستی کا تصور شاذ ہی معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ وہ مصنف جن کی ہم بات کر رہے ہیں محض اس واسطے زوال پرست ہیں کہ ان کا ربط ایک زوال پرست معاشرے سے تھا گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہے، کیونکہ روز بہ روز ہم پر یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ روشن ہوتی جا رہی ہے کہ سرمایہ داری ایک طاقت ور درندہ ہے۔ کیا ہم سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ داری دیوالیہ ہے۔ میں تو نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں یہ سوال اور آگے بڑھ کر سمجھنا ہوگا۔ اس واضح بنیاد پر سرمایہ داری کا خاتمہ یقینی ہے کہ قوتِ خرید کے زوال اور زائد پیداوار کے مابین فی نفسہ ایک تضاد موجود ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اوقاف نے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور یہ کہ ان کا وجود قائم ہے۔ سرمایہ داری آج بھی مجھے اتنی ہی غیر انسانی اور ذلیل نظر آتی ہے جیسی کہ پہلے تھی، لیکن اگر ہم انیسویں صدی کی "خاندانی سرمایہ داری" سے اس کا موازنہ کریں تو میرے نزدیک اسے زوال پرست کہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ میں یہ تو کبھی نہ کہوں گا کہ سائنسی مارکسیت محض اس

منصوبہ بند طریقِ کار کے باعث ناکام ہوئی جسے سوشلسٹ ملکوں نے شخصیت پرستی کے دور میں اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی بجائے، میں یہ کہوں گا کہ اس میں کج رائی پیدا کر دی گئی، اسے ادعائی بنا دیا گیا۔ یہاں بغیر کسی جواز کے "زوال پرستی" کی اصطلاح کا استعمال کوئی کیوں کرے؟ کیا صرف اس لیے کہ بعض حالات میں، یا بعض اشخاص میں، یا بعض حلقوں میں چند مخصوص ملکی اور سیاسی اسباب کے تحت مارکسیت اپنا دم خم کھو بیٹھی ہے؟ بہت سے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں اسے ابھرنے کا موقع ملا ہے۔ دوسرے افراد بھی ہیں جنھوں نے اسے ترقی دی ہے اور یہ بات طے ہے کہ اس کی طاقت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ رومن آرٹ کے زوال سے جس کا مفہوم زوال مطلق تھا، اس کا کوئی تعلق نہیں۔ رومن آرٹ کے کھنڈروں پر وحشیانہ (barbaric) آرٹ کو فروغ حاصل ہوا لیکن یہاں بھی اس معاملے سے کُلّی تشابہہ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اسی لیے میں یہ مشورہ دوں گا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بحث سے زوال پرستی کے تصور کو باضابطہ طور پر خارج کر دیا جائے اور اسے صرف ان موقعوں پر استعمال کیا جائے جہاں فنی زوال پرستی کی واقعتہً تصدیق کی جا چکی ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح کے بازاری نعروں کے استعمال سے بچنا چاہیے۔ بصورت دیگر، میں یہی سمجھوں گا کہ یہ صحیح معنوں میں ایک مارکسی تصور نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہماری گفتگو میں اس (اصطلاحوں کے استعمال) سے کوئی بھی مقصد پورا نہیں ہوتا۔

ہم، جو مغربی ریڈیکل (کہلاتے) ہیں، یہ نہیں مان سکتے کہ کچھ مصنفین مثلاً: پروست، کافکا یا جوائس جن کی شخصیتوں کو اسی معاشرے نے ڈھالا ہے جس نے ہمیں بنایا اور جنھیں ہم باٹ باہر کرنے پر تیار نہیں ہیں، زوال پرست سمجھے جائیں کیونکہ ایسا کرنا بیک وقت اپنے ماضی کو مطعون کرنے کے مترادف بھی ہوگا اور اس مذاکرے میں ہماری شمولیت کی کسی بھی قدر کے منافی ہوگا۔ ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی میں مجھ سے کہا گیا کہ کسی زوال پرست معاشرے میں ایک فرد ایک ساتھ کئی جہتیں اختیار کر سکتا ہے، ان میں سے ایک جہت ترقی پسندانہ بھی (ہو سکتی) ہے۔ پس اگر کوئی فنکار کسی ترقی پسند تحریک کی تشکیل کرتا ہے تب تو وہ زوال پرست نہیں ہے، بصورتِ دیگر وہ زوال پرست ہے۔ یہ ایک زبردست سہل پسندی ہے کیونکہ اگر اسی معاشرے میں، جسے زوال پرست کہا جائے، ایک ترقی پسندانہ جہت بھی موجود ہے تو پھر اسے لازماً کسی نہ کسی تعداد میں ایسے فن کاروں کو متاثر کرنا چاہیے جو عملی زندگی میں ترقی پسند نہ بھی ہوں لیکن جو تضادات کا شعور رکھتے ہیں اور جنھیں حتی الوسع ان تضادات سے مطابقت پیدا کرنی چاہیے۔ میں یہاں ایک بات پھر دہراؤں گا ——— یہ کہ زوال پرستی کا تصور اپنی گفتگو سے خارج کر دیا جائے۔ اس امر پر اصرار میں اس لیے کر رہا ہوں کہ اس پر مغرب کے بائیں بازو سے اشتراکِ عمل کا انحصار ہے۔ زوال پرستی کے تصور کو قبول کر لینے کا مطلب عملاً یہ ہوگا کہ ہمارا آزادیِ اظہار کا حق چھین گیا ہے یا کم از کم یہ کہ مارکسیت سے ہمارا تعہد واضح نہیں ہے جیسا کہ مثلاً پچھلے پندرہ برسوں میں خود میرا حال رہا ہے۔ اگر ہم اس تصور کو مسترد کر دیں یا اسے کم از کم سنجیدہ اور مفصل مطالعوں کے لیے بہترین معایر کے ساتھ مخصوص کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ترقی پسندانہ کلچر کو دوسرے ترقی پسندانہ کلچر سے رابطہ قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک رجعت پرست ادیب کو ایک ترقی پسند ادیب کے بالمقابل نہ لایا جائے ——— ان میں اشتراک کا کوئی نقطہ ہے ہی نہیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہے کہ مغرب کے بائیں بازو اور مشرقی سوشلسٹوں میں کوئی مفاہمت پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں اور یہ کہ کیا ایک متحدہ محاذ قائم کرنا ممکن ہو سکے گا؟

ارنسٹ فشر :

ٹامس پال سارتر ہماری توجہ عہدِ قدیم کی زوال پرستی تک کھینچ لے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کیونکہ میں نے خود اپنے زوال پرستی کے مطالعہ میں جدید اور قدیم زوال پرستی سے بحث کی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ قدیم زوال پرستی حقیقی زوال پرستی تھی کیونکہ اس زمانے میں کوئی بھی نئی تخلیقی قوت نہیں اُبھری اور معاشرے کے کسی بھی طبقے کو اس امر سے دلچسپی نہیں ہوئی کہ پہلے اس کی کیا حالت تھی۔ وہ زمانہ تناظر اور اُمید سے یکسر عاری تھا۔ سلطنت روما نے ایک مدافعانہ رویّہ اختیار کر لیا تھا اور ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو اُس عہد کے سماجی تضادات کا کوئی حل تلاش کر سکتا۔ کلیسا کے محافظوں نے سلطنت روما کے دور آخر کے Pagan ادیبوں کی مانند بڑے بجھے ہوئے لہجے میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ دَور ایک ایسے زنداں سے مماثل تھا جس میں صرف دریچے بیرونی دُنیا کی طرف کھلتے تھے۔ بہرنوع صنعتی انقلاب کے زمانے سے پیداواری قوتوں نے کسی مزاحمت کے بغیر فروغ پایا ہے۔ میرے خیال میں ذرائع پیداوار اور پیداوار کے متروک رشتوں کے مابین مسلسل پایا جانے والا تضاد —— وہ تضاد جس پر مارکس نے بہت زور دیا ہے، فن اور ادب کے لیے بعید اہمیت کا حامل ہے۔ ہم سامراجیت کی منزل پر سرمایہ داری کی پیداواری طاقتوں کا زبردست فروغ دیکھ چکے ہیں، اور یہ سوچنا محال ہے کہ کوئی ایسی صورتِ حال ابدالآباد تک بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہ سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانیت کو ایک ایٹمی جنگ کے امکان کا دھڑکا لگا ہوا ہے، جو اسے تباہ کر دے گی۔ لیکن ان جدید پیداواری طاقتوں کو انسانیت کی خدمت پر لگانے کی صورت میں اس تباہی سے بچاؤ کا ایک امکان بھی دکھائی دیتا ہے۔

سرمایہ داری جاں بلب ہے —— لینن نے انھی لفظوں میں سامراجیت کی وضاحت کی تھی۔ لیکن یہ دور تو ایک طویل تاریخی تسلسل ہے جو لازمی طور پر فن اور ادب کے انحطاط کا احاطہ نہیں کرتا۔ گزشتہ صدی کے خاتمے پر، جس کا تجزیہ لینن نے اپنے سامراجیت کے مطالعے میں کیا ہے، دراصل زوال پرست عناصر کو ہی غلبہ حاصل تھا اور اس وقت مقتدر سماجی مرتبے کا وہ مالک تھا جو صاحبِ املاک ہو۔ لیکن اس وقت بھی بورژوا دُنیا میں تضادات موجود تھے۔ وہاں ہوئس مین کی مطلق زوال پرستی تھی جو Dreyfus Affair کے موقعے پر ایک راسخ العقیدہ کیتھولک بن بیٹھا، —— D'Annunzio کی زوال پرستی تھی جس نے چھبیلے پن (Dandyism) اور حکمراں طبقے کی آرام طلبی کا جشن منایا، —— Cocottes کی زوال پرستی تھی جس کا راگ مکتبی مصوروں کی تصویروں میں الاپا گیا ہے —— لیکن وہاں زولا اور روڈن کا بنایا ہوا بالزک کا مجسمہ، اور سیزاں، اور کیوبزم بھی تھے جو سب کے سب فن کے انحطاط کے مخالف تھے —— دستاویز بندی کے مقصد سے ان مثالوں کو کئی گنا ضرب دیا جا سکتا ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ ایک زوال پرست دَور میں مخالف قوتوں نے کس طرح لوگوں کو اپنی آواز بلند کرنے پر مائل کیا۔ اور پھر لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ لینن نے اپنے سامراجیت کے مطالعے میں حسب ذیل اشارہ بھی کیا تھا: "یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ابتری کی جانب یہ میلان سرمایہ داری کے تیز رفتار فروغ کو مستثنیٰ کر دیتا ہے . . . بہت سی صورتوں میں اس کا فروغ اور زیادہ تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔" ذرائع پیداوار کی بے روک ترقی جمود کو راہ نہیں دیتی۔ خاص طور سے آخری دہوں میں سوشلزم سے مقابلے کی وجہ سے سرمایہ داری کو توسیع کے نئے وسائل کی جستجو پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

جدید صنعتی معاشرے کے ایک تجزیے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس کے غیر محسوس ڈھانچے اور اس کی

ناگزیر ضرورت کا تعین سوشلزم کرتا ہے۔ یہ نئی سچائی فن اور ادب کو ایک نئی قوت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ہمارے متعدد دوست ایسے بھی ہیں جو بدقسمتی سے، اس حقیقت کو جدلیاتی طور پر دیکھنے کے بجائے میکانکی طور پر دیکھتے ہیں: "ہمارا معاشرہ زوال پرست ہے اس لیے اس کے فن اور ادب کو بھی زوال پرست ہونا چاہیے۔" یہ مفروضہ ہمارے عہد کے ناگزیر اور مستقل تضاد، یعنی پیداواری طاقتوں اور پیداواری رشتوں کے مابین تضاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ لازمی سماجی تقطیب جو فیصلہ کن ثابت ہوگی محنت کش طبقے اور بورژوازی کی ہوگی۔ تمام اچھے فن کاروں اور ادیبوں کے تاثرات اور شعور پر اس کا اثر ڈالنا لازمی ہے، ذرائع پیداوار بار بار پیداواری رشتوں پر غالب آئیں گے، منسوخ کیے ہوئے افکار سے ہم ایک نئی سچائی کھینچ نکالیں گے۔ ایک مؤثر مثال دیکھیے: پیرس میں ۱۹۰۰ء کے عالمی میلے کا آغاز تقریباً اسی وقت ہوا جسے لینن نے سامراجیت کے حرفِ آغاز سے تعبیر کیا تھا۔ ایک طرف ہم ایفل ٹاور، Palace of Industry اور تکنیکی تعمیرات کے مسحور کن مظاہر اور پیداوار کے شاندار اور نئے وسائل کا بے پایاں تناظر دیکھتے ہیں —— ہم سب جانتے ہیں کہ اس نے فن کو کیا جادو، کیا توانائی اور کیا وسعت عطا کی۔ اور دوسری طرف پناما نہر کا اسکینڈل اور پیداواری رشتوں کا زوال ہے۔ ایک طرف پیداواری طاقتوں کا غرور ہے جو اپنے اندر مستقبل کا بیج چھپائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ذرائع پیداوار کی سڑن اور کھوکھلا پن بھی ہے جس کا فن اور ادب پر ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو مترو‌ک فیصلوں سے الگ ہو کر فن اور ادب کے ارتقا کی جدلیات پر نظر ڈالتا ہے اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مطلق زوال پرستی کا کوئی دور نہ تو اب سے پہلے رہا ہے، نہ ہی آئندہ ہو سکتا ہے۔ ان ادوار میں، جب زوال پرستی کی لہریں غالب دکھائی دیں، ہر بار ایک مدافعانہ تحریک نے بھی سر اٹھایا جو انجام کار ہمیشہ قوی ترین ثابت ہوئی۔ کوئی بھی اہم فن کار اور ادیب تخلیق کا آغاز ہمیشہ سچائی سے کرتا ہے، ان کی تمام ترکلیت کے ساتھ —— اور مستقبل ماضی کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ باثمر اور طاقت ور ہوتا ہے۔

پس ہمیں زوال پرستی کے مسئلے تک منطق کے ماہرین کی طرح جانا چاہیے۔ D'Annunzio جیسے ادیب جو ایک ملعون صورت حال کے ملعون مؤید تھے، —— انھیں اکثر بیکیٹ جیسے ادیبوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ بیکیٹ ایک اخلاق پرست ہے جو زیر بیان صورت حال کے سلسلے میں قطعاً پرجوش نہیں ہوتا۔ یہ D'Annunzio کی طرح زوال پرستی کی فریب زدہ پذیرائی نہیں بلکہ دہشت اور مایوسی ہے۔ بیکیٹ کی مطلق "نہیں!" (یا نفی) دھماکا خیز ہے، چونکا دینے والے اضطراب سے معمور، جو ایک صحت مند کراہت اور عمل میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اگر بیکیٹ نے ENDGAME میں ایک بھی مثبت کردار شامل کر دیا ہوتا تو ہم اس سے مطمئن ہو جاتے اور مطلوبہ تاثر غارت ہو جاتا۔

یہ بات تناقضانہ ہے کہ بیکیٹ متعصب اور ادعائیت زدہ کمیونسٹوں کی طرح بورژوازی کو یا تو نزع میں گرفتار دکھاتا ہے یا پھر پہلے ہی سے مرا ہوا —— اور یہی وہ لوگ ہیں جو اسے مجسم زوال پرست کہہ کر اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں بھی ایسی مکمل نفی کا اس درجہ افسوسناک نمایاں نے کے ساتھ وجود نہ رہا ہوگا۔ پھر بھی، ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس نفی کو مسترد کرتے ہیں۔ اس کے ڈراموں کے انفعالیت زدہ کرداروں کے بالمقابل پبلک وہ فعال طاقت ہے جو کسی فیصلے تک پہنچنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ اعتراض جائز طور پر کیا جا سکتا ہے کہ "درحقیقت صورت حال اتنی امید شکن نہیں ہے۔" لیکن متذکرہ جواب کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ صدمہ زدہ ناظر یہ پوچھ سکتا ہے کہ "کیا صورت حال اس درجہ تاریک ہے؟ کیا ہم اس ENDGAME، اس بربادی کا سدباب کر سکتے ہیں؟" اس نوع کے سوال اٹھانا اور اس

قسم کے میلانات کو اُبھارنا میرے نزدیک مارکسی نقاد کا فریضہ ہے۔ اگر ہم نوجوانوں کو یہ بتائیں کہ جوائس سے بیکیٹ تک ایک زوال پرستی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تو ہم سرمایہ دار ملکوں کے نوجوانوں کو نہتا کر دینے کے قصور وار ہوں گے کیونکہ وہ کسی تریاق کے بغیر ہی اس زہر کو نگل جائیں گے۔ ہمیں D'Annunzio اور بیکیٹ کے مابین ہی نہیں، —— بلکہ بیکیٹ اور آئیونسکو کے مابین اختلافات کی وضاحت بھی کر دینی چاہیے، وہ اختلافات جو بورژوا دُنیا کے ایک شناخوانِ ایک درباری مسخرے اور ایک شوریدہ پشت منکر کے مابین پائے جاتے ہیں۔ ہم میں یہ کہنے کا حوصلہ ہونا چاہیے کہ اگر ادیب زوال پرستی کا بیان اس کی تمام تر برہنگی کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر وہ اخلاقی سطح پر اسے ملامت کا ہدف بناتے ہیں تو یہ زوال پرستی نہیں ہے۔ ہمیں نہ تو پروست کو بورژوا طبقے کے سپرد کرنا ہے، نہ جوائس کو، نہ بیکیٹ کو، حتیٰ کہ کافکا کو بھی نہیں۔ اگر ہم نے انھیں یہ اجازت دے دی تو وہ ان ادیبوں کو ہمارے ہی خلاف صف آرا کر دیں گے۔ بصورت دیگر یہ ادیب اب بورژوازی کے معاون نہ ہوں گے، یہ ہم ہوں گے جنھیں ان کا تعاون حاصل ہوگا۔

ایڈورڈ گولڈ اسٹکر:

ژاں پال سارتر نے زوال پرستی کے سوال پر جو کچھ کہا مجھے ابھی اس پر سوچ بچار کرنا ہے۔ لیکن انھیں سنتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جدید فن میں زوال پرستی نہیں ہے۔ وہ ارتقا پسند خاکہ جو کامریڈ فشر نے اس عمدگی کے ساتھ ہمارے لیے ترتیب دیا ہے —— میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک، سرمایہ دار معاشرے کا ارتقا اختیار کے عہدوں سے بعض سماجی طبقات کے اخراج کا ایک مسلسل عمل رہا ہے۔ اولاً طبقۂ اُمرا زد پر آیا، پھر بورژوازی کے مختلف طبقے۔ اس کا ثبوت سب سے پہلے رومانی عہد میں سامنے آیا جب اُمرا کے ایک حلقے نے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ زوال پرستی کے ناقابلِ تردید نشانات بھی ظاہر کیے —— مثال کے طور پر یہاں شاتوبریاں، نووالس، حتیٰ کہ Kleist جیسی عظیم شخصیت کا نام پیش کرنا کافی ہوگا۔ انیسویں صدی میں وہ طبقہ جس کی خوش گمانیوں کے سحر کا ازالہ ہوا، کم رتبہ بورژوازی کا انتہائی خوش ذوق طبقہ تھا کیونکہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی تمام عظیم اُمیدوں کا خاتمہ بس ایک خود غرض، تجارتی ذہن رکھنے والے معاشرے پر ہوا۔ اس طبقے کے فن کاروں کا ردِ عمل معاشرے سے ایک مایوسانہ پسپائی تھی اور ان کے فن سے اس (پسپائی) کا اظہار ایک واضح زوال پرستی کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس نوع کی سب سے بڑی اور انوکھی مثال شارل بودلیئر کی ہے۔ بحران کے دوران میں، جس کا خاتمہ سرمایہ داری پر ہوتا ہے، خود بورژوا کیمپ کے اندر ایک تلخ کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ لبرل سرمایہ داری کا پرانا طبقہ اقتصادی زندگی سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی قسم کی سرمایہ داری، سامراجیت کو مل جاتی ہے —— بورژوازی کا طبقۂ اعلیٰ، اوقاف اور سرمایہ کار سامنے آجاتے ہیں جبکہ کم رتبہ بورژوازی (متوسط طبقے) کا، ترقی کی اگلی صف سے اخراج ہو جاتا ہے۔ میں فن کے شعبے پر اس (تجزیے) کا اطلاق میکانکی طور پر نہیں کرنا چاہتا، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زوال پرستی کے عناصر اسی سلسلے (Process) سے پھوٹے ہیں۔ فرانز کافکا جیسا طباع اس ضمن کی متعدد مثالوں میں

سے ایک ہے۔ میں چونکہ زوال پرستی کے عناصر پر گفتگو کر رہا ہوں اس لیے میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ اپنے خیال کی وضاحت کرتا چلوں۔ مختصراً یہ عناصر ہیں : مرکزی توانائیوں کا سریع خاتمہ جو دھیان (مراقبے) کے نام پر عملی زندگی کی تردید پر منتج ہو، ایک جمالیاتی سریع الحسیت، جینے کی لگن کا کھو جانا، قنوطیت۔ زوال پرستی سے میری مراد یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے اور بھی پہلو ہوں گے۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی کے فن کاروں کے سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ محض اپنے قنوطی اور زوال پرست میلانات کے تحت وہ زندگی کے اسرار کا زیادہ بھرپور طریقے سے تجزیہ کر سکے ہیں اور انھوں نے اپنی دنیا کو فنی زبان دینے کی نئی جہتیں دریافت کی ہیں۔ یہاں ہم زوال پرستی کے عناصر کی جدلیاتی وحدت اور فنی تخلیق کے طریق میں نئی دریافتوں پر بحث کر رہے ہیں کیونکہ یہ دریافتیں کسی دوسرے فنکار کے ہاتھ لگ جاتی ہیں، وہ دنیا کے تئیں اپنے تصور کے معاملے میں کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو۔ میں اسے حتمی طور پر ضروری سمجھتا ہوں کہ زوال پرستی کے مسئلے پر، مارکسی ہونے کے ناطے ہمارا ایک اپنا موقف ہو جس کی بنیاد ہم اس جدلیات کو بنائیں جو اس میں گردش کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کے فلسفے سے زوال پرستی کے عناصر کو ممیز کیا جائے حیات اور کائنات کے تئیں یہ زوال پرست اور قنوطی ورثہ اپنے ساتھ فنی تخلیق کی جو تکنیکیں لایا ہے اس کا تنقیدی نظر سے تجزیہ کیا جائے اور اُسے گہرائی سے سمجھا جائے۔ اس نوع کی فنی ترقی اسی نکتے کو ظاہر کرتی ہے جس پر ارنسٹ فشر نے زور دیا ہے اور جو یہ ہے کہ ہر عظیم فن، خواہ وہ سرمایہ دار عہد کا ہی کیوں نہ ہو، ہم جیسوں کو بھی کچھ نہ کچھ بہم پہنچاتا ہے، اور یہ کہ اسے بیک قلم مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

میں بس اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ کمیونسٹوں کے اس مباحثے میں جس کا ذکر ابھی ژاں پال سارتر نے کیا، سب سے مہلک بات رجائیت پسند اور قنوطیت پسند فن کاروں کی میکانکی تقسیم ہے۔ وہ ادب جس کی جانب میں نے مختصراً اشارہ کیا ہے اسے کلی طور پر صرف اس لیے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ وہ قنوطی ہے اور قنوطیت کی تبلیغ کرتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ نصب العین رکھتا ہے، اس لیے ہم قنوطیت سے کوئی کام نہیں لے سکتے پس ایسے ادب کو ہمیں مسترد کر دینا چاہیے۔ میں اس رویے کو میکانکی اور ادعائی سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ آج وہ وقت آ چکا ہے جب ہم اس رویے کو ایک ساتھ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں۔

مِلاّن کُنڈیرا:

مجھے خوشی ہے کہ ہم تصورات کے صحیح اور سائنٹفک صرف کی آرزومندی کے معاملے میں ایک ساتھ ہیں۔ ہم نے اپنے ملک میں زوال پرستی، ہئیت پرستی، مجدد پرستی وغیرہ جیسے تصورات کا استعمال اکثر اس طریق پر کیا ہے کہ یا تو یہ بے مغز ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ انھیں کچھ بھی معنی پہنا دیے جائیں، یا پھر ان کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ ادعائیت کے زمانے میں چونکہ فکر صحیح معنوں میں ابھر نہ سکی اس لیے ارتقا کا تاثر پیدا کرنے کے لیے بھانت بھانت کی بے معنی اصطلاحیں مضحک طریقے سے استعمال کی گئیں۔ یہ سلسلہ اس حد تک گیا کہ اس دور کا کوئی مضمون پڑھتے وقت اس کی تاریخ کا تعین ہم اس کے نظریاتی مواد سے نہیں بلکہ استعمال شدہ اصطلاحات سے کر سکتے تھے، مثلاً: ہئیت پرستی، زوال پرستی، تحریف پسندی

یالبرل ازم وغیرہ۔ اس اصطلاحیات کا یہ رول موضوعاتی جارگن (کے دول سے) مماثل تھا۔ اس نے فلاں یا فلاں دور کے اوصاف کی نشاندہی کی۔ وہ کامریڈس جو یہاں موجود ہیں، انھوں نے یہاں آنے کے بعد سے یہ اندازہ یقیناً لگالیا ہوگا کہ وہ ادب جسے ہم زوال پرست کہتے ہیں اس کی بابت صحیح معنوں میں ایک جدلیاتی منزل تک ہم پہنچ گئے ہیں اور یہ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ نظریاتی جدوجہد انکار میں نہیں بلکہ مزاحمتوں پر قابو پانے کے عمل میں مخفی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں تاریخی حالات ہمارے لیے ساز گار رہے ہیں۔ ہم اس سکۂ بند کلیشے کو رد کرنے میں کامیاب رہے ہیں جس کے مطابق آواں گارد رجعت پسندانہ سیاست کے مترادف ہے۔ یہ حالات فی نفسہٖ، چیکوسلواکین آواں گارد کی تاریخ ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا دھیان اس طرف موڑنا چاہتا ہوں کیونکہ، آواں گارد پر بین الاقوامی مباحث میں، اور سب سے زیادہ اطالویوں اور لوکاچ کے مابین، چیکوسلواکین آواں گارد ایک اہم مثال فراہم کرتا ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ آواں گارد، اسے خواہ سرریلزم، سمبلزم سے جوڑا جائے یا اس کی خانہ بندی سے انکار کردیا جائے، کمیونسٹ پارٹی سے قریبی ربط رکھتا ہے۔ ثانیاً، چونکہ چیکوسلواکین آواں گارد کی سب سے بڑی شخصیتوں نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ آواں گارد کو حقیقت پسندی کی ایک مطلق اینٹی تھیسس کے طور پر دیکھنا مہملیت ہے۔ محض انھی کی بدولت یہ پتہ چلا کہ جدید فن کے گہرے میلانات کی وساطت سے، فن کی اس نوع تک کیونکر پہنچا جاسکتا ہے جو دنیا کا احاطہ اس کی تمامتر کلیت کے ساتھ کرسکتی ہے۔

ایک پچھلے انٹرویو میں سارتر نے البیئر کامیو کے ناول THE PLAGUE کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعے پر وہ کچھ حیران ہوئے تھے کہ ہمارے ملک میں اس کتاب کا خیر مقدم اتنے پُرجوش انداز میں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اسی سے ہماری صورتحال کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ادعائیت کے خلاف جدوجہد میں ہم اکثر بغیر کسی شرط کے ہر اس بات کی مدافعت کے نقطے تک جا پہنچے جس بات سے ادعائیت پرستوں نے انکار کیا، تاکہ ان تمام تخلیقات کی اشاعت اور تقسیم کے عمل کو تیز تر کیا جاسکے۔ آج اس کا نتیجہ ایک خاص طرح کی انتخابیت پسندی ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت جب مغربی ادب کو بس "مسترد" کردیا گیا، اس ادب کی سچی تنقید کا وجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات، حتیٰ کہ آج بھی، جب ہم اسے پڑھتے ہیں تو ہمارا رویّہ، چاہے تحسین آمیز ہو یا تنقیصی، اس تنقیدی میلان کا بہت کم اظہار کرتا ہے۔

اس واقعے میں ایک متناقضانہ پہلو بھی شامل ہے کہ (آج) ہم انھی ژاں پال سارتر کے تنقیدی کارناموں میں سوچ کو غذا پہنچانے والی باتیں پاتے ہیں جنھیں اس سے پہلے ہمارے ملک میں یہ کہہ کر رد کردیا گیا تھا کہ وہ ایک بورژوا ادیب ہیں اور ان کے یہاں مارکسزم سے اشتراک کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ میں اس وقت علی الخصوص امریکی ناول کی نظریاتی اور اسلوبیاتی بنیادوں کی بابت ان کے بیانات، یا البیئر کامیو کے THE STRANGER پر ان کے مضمون یا ان کے فاکنر والے مضمون کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح سارتر، ان کی تمام افکار اور تخلیقات کے ضمن میں ہمیں ایک خاصا ستھرا تنقیدی رویّہ اپنانے میں مدد دیتے ہیں جو ہر عہد ادعائیت کے خاتمے کے بعد، آج، ہم اپنے دروازے کھول دینا چاہتے ہیں۔

ارنسٹ فشر :

میں زوال پرستی کے سوال سے متعلق دو اور باتیں کہنا چاہوں گا۔ ہم زوال پرستی کی بنیادی شکلوں میں سے

ایک یعنی کلیشے کے ذریعے فن کی بربادی کے پہلو کو فراموش کر بیٹھتے ہیں، یا مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ عظیم Delacroix کے مقلدوں میں مجھے ایک گہری زوال پرستی کا ادراک ہوتا ہے، اور اس خیال کی تائید میں ان گنت تصویروں کی مثال میں پیش کر سکتا ہوں۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ THE BIRTH OF VENUS ——— اور اس جیسی دوسری تصویروں میں سماجی صورت حال نیز ایک خود نما، زرق برق اقلاف کے مابین جو نسوانی پیکر کے لیے ندیدے پن کے ساتھ مضطرب دکھائی دیتا ہے، ایک تضاد موجود ہے۔ THE THIRD EMPIRE کی Cocotte ایک ہیروئن ہے ——— جو کبھی صداقت (truth) کے روپ میں سامنے آتی ہے کبھی آزادی (liberty) کے روپ میں، حتیٰ کہ تقدیر (luck) کے روپ میں بھی ——— اور یہ Nana کی وہ کامل نمائی ہے، اس کا وہ روپ ہے جس نے سچائی کی جگہ لے لی ہے اور جسے میں زوال پرست تصور کرتا ہوں۔ جرمنی میں زوال پرستی نے اپنا اظہار ایک دوسری شکل میں کیا۔ میرے خیال میں وہاں سامراجی زوال پرستی کی علامت ان یادگاروں کی شکل میں سامنے آئی جو اپنی دکھاوے کی سادگی اور تعمیری ڈھونگ پن کے ساتھ جنگ کا جشن مناتی ہیں۔ جس طرح فرانس نے Cocotte کو آئیڈیلائز کیا، (اسی طرح) جرمن سامراج نے Valkyrie کو ایک مبالغہ آمیز روپ میں دیکھا۔ یہ دونوں مثالیں ظاہری شکل اور باطنی صداقت کے اختلاف کو نمایاں کرتی ہیں اور ان معاشروں کی تجدید کرتی ہیں جن کا مقدر ناکامی تھی۔ زوال پرستی کا مفہوم یہی ہے۔ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ زوال پرستی صرف اخراج بشریت، یا بہیمیت کی طرف مراجعت یا صداقت سے فرار کی بنیادوں پر نہیں بلکہ ان سب سے زیادہ ہیر پھیر، عدم خلوص اور چاپلوسی کی خصلت سے پہچانی جاتی ہے۔

مکمل تردید کے سوال پر چند اور لفظ کہوں گا۔ میں کسی بھی حالت میں اس خیال کی تشہیر کے حق میں نہیں ہوں کہ ہمیں نفیِ مطلق کی نمائندگی کرنے والی چیزیں خلق کرنی چاہئیں، بلکہ میں تو بیکیٹ یا اس جیسے کسی دوسرے (شخص) کی مطلق اور اخلاقی سلبیت کو اس سطح پر رکھنے کی انتہائی شدید مخالفت کروں گا جو خالص زوال پرستی کی سطح ہے اور جو اس کا راگ الاپتی ہے جو دیوالیا ہے۔ میں یہ قطعاً نہیں کہتا کہ یہ مطلق منفیت غالب فنی میلان بن جائے لیکن میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہمارے کلچر پر بیکیٹ کے اثر کا انحصار ہم پر، ہمارے رویوں پر اور ہماری تنقیدی فہم پر ہے۔ ہمیں ایسے فنکاروں اور ادیبوں کو جو اخراج بشریت، درندگی، جارحیت، فحاشی اور زوال پرستی کے تمام مظاہر کا گن گاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کو جو ضمیر رکھتے ہوئے بھی بے نیاز رہتے ہیں بیکیٹ جیسے ادیبوں سے الگ کر کے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے، جو اس سب کو شدید مایوسی کے عالم میں مسترد کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں ان لوگوں کو زوال پرست نہیں سمجھنا چاہیے جو زوال پرستی کو موضوع بناتے ہیں، بلکہ انھیں جو خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

ژاں پال سارتر:

میں بس دو چار لفظ اور کہوں گا۔ میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ زوال پرستی کی خاتمہ بندی فضول ہے۔ لیکن دوسری اصطلاحیں جو یہاں استعمال کی گئیں مثلاً قنوطیت، اخراج بشریت وغیرہ وغیرہ، یہ بہتر ہیں۔ اور میں نے جو کچھ کہا میں اس سے پوری طرح

متفق ہوں کیونکہ ابھی ابھی ہم نے یہ وضاحت کی ہے کہ زوال پرستی کا تصور مجموعی طور پر معاشرے سے یکسر الگ اور اس کے سیاق میں بے محل ہے، یہ کہ یہ تصور جس کا اطلاق حلقوں پر بلکہ افراد پر کیا جاتا رہا ہے، معاشرے میں ایک مخصوص اور بحرانی صورت حال کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ تشریح بھی کی ہے کہ زوال پرستی کو صرف ایک جدلیاتی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم مثال کے طور پر بودلیئر کو زوال پرست کہتے ہیں تو یہ اسی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے ایک وسیع میدان کا تمہیدی نقطہ بھی ہے، کیونکہ اس کے بعد کی تمام تر شاعری نے اس سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا ہے۔

اس اجلاس کو تمام کرنے کی ذمہ داری میری نہیں تاہم میں آپ کے سامنے دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا ——— اور یہ رسمی تشکر کا جملہ نہیں ہے، کہ ایک مشرقی (مشرقی یورپی) ملک میں یہ پہلا موقعہ ہے جب میں نے سوشلسٹوں اور پارٹی اراکین سے اتنی مفید گفتگو کی ہے۔ یہ ایک ایسا مذاکرہ ہے جس میں نقاط نظر، ایک دوسرے سے اس درجہ قریب ہیں کہ ان میں اگر اختلافات ہیں بھی تو ان پر دلچسپ بحث ہوگی۔ یہ پہلا موقع ہے جب میں نے مارکسزم کو ایک نئی زندگی دینے کی تمنا، اس کی نظریاتی توانائی کی بحالی اور اسی کے ساتھ ساتھ مارکسزم کے اساسی اصولوں کی حفاظت کے عزم کا مشاہدہ کیا ہے یہی وہ بات ہے جس نے مجھے حیران کیا، جس نے مجھے اعتماد بخشا، کیونکہ میرے نزدیک ہماری تنہا امید انہی بحثوں میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مغرب سے مصالحت ہلاکت آفریں نہ ہوگی کہ اساسی اصول ہمارے لیے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے کہ آپ کے لیے، اور یہ کہ یہ بحثیں نتیجہ خیز اسی سبب سے ہیں کہ ہم نے آزادانہ اپنا اظہار کیا۔ اور اسی لیے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا ———

زوال پرستی کے سوال پر یہ گفتگو بہ زبانِ انگریزی شاید سب سے پہلے مئی/جون ۱۹۶۵ء کے STR EETS MAGAZINE میں شائع ہوئی تھی۔ جب سے اب تک، اس کرۂ خاکی کے دریاؤں کا بہت سارا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ دُنیا بدلی، حالات بدلے، سیاسی، تہذیبی، مادی تبدیلیوں کے جبر نے سوچ کے دھارے بدل دیے۔ لیکن اُردو کے ترقی پسند اکا دکا تبدیلیوں کے باوجود، اب تک اسی دائرے میں مقید ہیں جس پر مارکس اور اینگلز نے بھی کبھی التفات کی نظر نہیں ڈالی۔ ان حلقوں سے جب کبھی انحراف کی کوئی آواز اٹھی، اسے ترمیم پسندی بھی نہیں بلکہ تحریف پسند کہہ کر پُرانی رٹ کے ایک شورِ بے اماں میں گم کر دیا گیا۔

اس سمپوزیم کے شرکاء: سارتر، فشر، گولڈاسٹکر اور کندیرا کے ذہنی تجربے اس آئینہ خانے کی مثال ہیں جس کے در و دیوار میں روایت زدہ ترقی پسندی کی معصومانہ مفروں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ سمپوزیم کے شرکاء کا تعارف یہاں غیر ضروری ہے کہ اُردو زبان اب اتنی کم مایہ بھی نہیں کہ یہ نام اس کے لیے "خبر" کی حیثیت رکھتے ہوں۔ پھر بھی، کچھ بزرگوں اور دوستوں سے تعاون کی خاطر یہ چند جملے:

سارتر: فلسفی، ناول نویس، ڈرامہ نگار، کہانی کار، کچھ لوگوں کے نزدیک ایک پمفلٹ باز قسم کا صحافی، ایک سرگرم سیاسی کارکن، سیاسی اور تہذیبی معاملات میں بجا و بیجا مداخلتوں کا تصور وار ادیب۔ مارکسی یا "انسانیت پسندانہ وجودیت" کا مخترع، جس کے نزدیک وجودیت مارکسزم کے دائرے میں گھوم پھر کر گردش کرتی رہتی ہے۔ سارتر کے نقاد اس دائرے کو مملکتِ غیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود سارتر کبھی اس دائرے میں شاد کام نظر آتا ہے، کبھی باہر کی دُنیا سے تانک جھانک بھی کرتا ہے۔

فشر: جنم آسٹریا میں ہوا۔ گراز کے مقام پر فلسفے کی تعلیم پائی اور ایک کارخانے میں غیر تربیت یافتہ، معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۲۷ء میں Arbeiter - Zeitung کے اسٹاف میں شامل ہو گیا — اس سے وابستگی ۱۹۳۴ء تک رہی۔ سوشلسٹوں نے جب فاشزم سے ساز باز شروع کی تو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر بائیں بازو کے اپوزیشن کی تشکیل میں تعاون کی خاطر وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ کچھ عرصے کے لیے جنگ کے بعد کی آسٹریائی حکومت میں وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے بھی شامل رہا۔ اگست ۱۹۶۸ء میں جب فوجی دستوں نے چیکوسلواکیہ کی سرزمین پر قدم رکھے، فشر معترض ہوا، پس معتوب ہوا اور کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔ مشہور ترین اور (بدنام ترین) دو کتابیں: Art Against Ideology اور The Necessity of Art — ہمارے ترقی پسند دوست اُسے "تحریف پسندوں" میں شمار کرتے ہیں۔

گولڈاسٹکر: ۱۹۶۳ء میں Liblice میں چیکوسلواکیہ کی مشہور کافکا کانفرنس کا مہتمم اور مرکزی مقرر۔ ادبی حقیقت پسندی اور ادبی پابندیوں کے مسئلے پر مشرقی یورپ میں پھر سے سوچ بچار کا چلنا اسی کانفرنس سے عام ہوا — اسٹالینی فریم اپ کے نتیجے میں پانچویں دہے کے کچھ دن جیل میں گزارے۔ ۱۹۶۸ء میں چارلس یونیورسٹی کا وائس ریکٹر اور ادیبوں کی انجمن کا صدر تھا۔ جب وارسا پیکٹ کے بعد جلاوطنی اس کا مقدر بنی۔

کندیرا: ایک معروف چیک ناول نویس، کہانی کار اور ڈرامہ نگار۔ پراگ ڈرامہ اکادمی کی فلم فیکلٹی میں تعلیم پائی پھر پلٹ کر وہیں تعلیم دینے کا منصب قبول کر لیا۔

——— شمیم حنفی

蹄声碎，
喇叭声咽。
雄关漫道真
如铁，而
今迈步从
头越，从头
越，苍山如海，
残阳如血。
毛泽东

ماؤزے تنگ کے اپنے خط میں نظم

ماؤزے تُنگ : لانگ مارچ کے زمانے کی ایک نظم

تندخو مغربی جھکڑ
اور ڑکے کا نامہربان خنک چاند۔

سرد مہر چاند تلے
جنگل باسی ہنسوں کی آہ و بکا،
گھوڑوں کے سُموں کی ہچکیاں
اور فوجی بگل باجوں کی گھُٹی گھُٹی سسکیاں۔

آلسی اُنیپیوں کی حوصلہ شکن ڈینگیں
کہ بے رحم اونچا پہاڑ تو دیوارِ آہن و سنگ ہے۔ ۔ ۔،
ہم اٹل قدم اُٹھاتے
مضبوط ڈگ بھرتے
پہاڑ کی چوٹی روند رہے ہیں۔

زیرِ نگاہ
دائرے میں گھومتی پہاڑیاں
سمندر رنگ۔
دم بلب سورج
لہو رنگ۔

آخری صفحہ

چارسوستانوے

تعاون
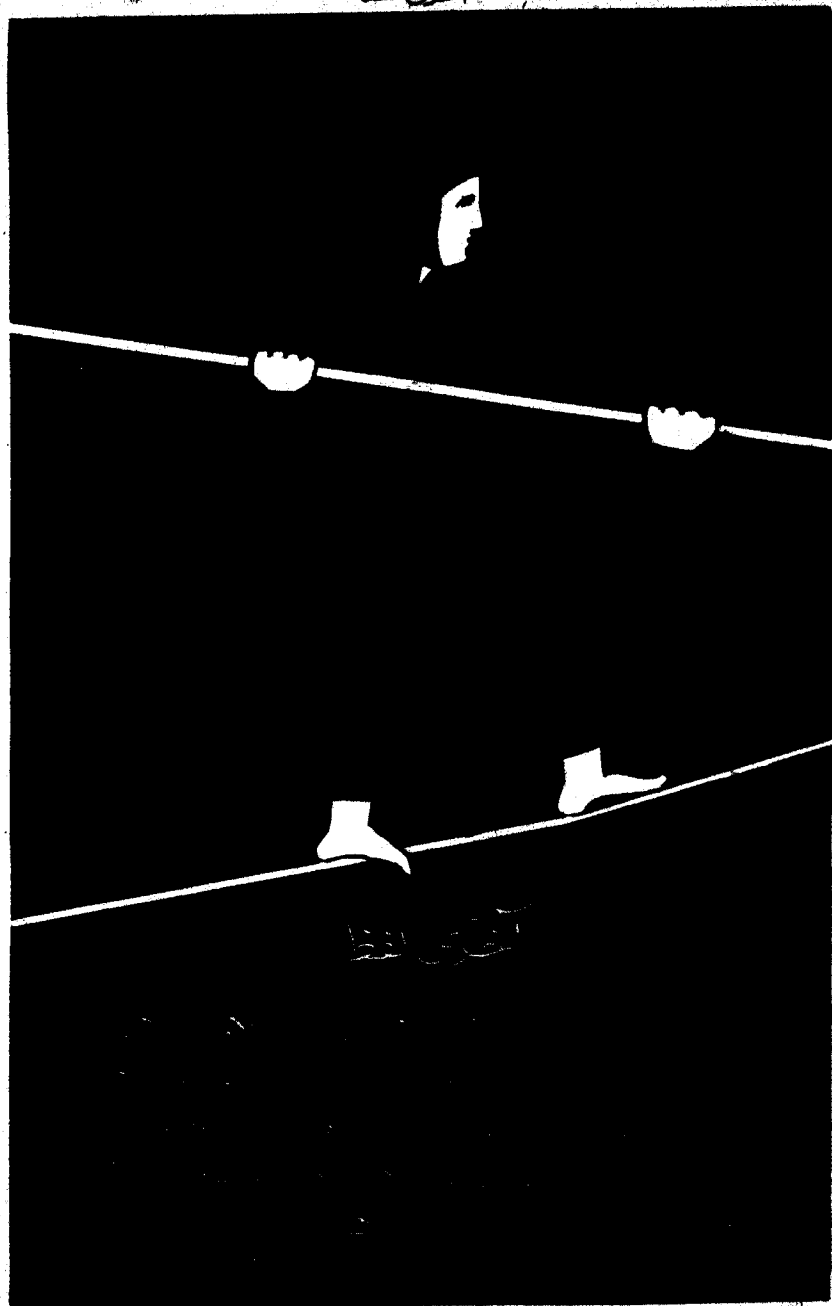
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
—— مجاز

نیک خواہشات کے ساتھ . . .

سلیم جاوید

. . . مجھے تونیں شوالک کے دامن میں ایک بستی کا علم ہے۔ اس میں بسنے والے کاندوں کی گلپوش عورتوں کا پتہ ہے۔ دشتِ وفا کی ان خوبصورت حزینوں کا علم ہے جو دلی میں بیٹھے وقت یوں دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں جیسے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی شئے بستی کے کسی گھر میں رہ گئی ہو اور جس کے ملنے کی کوئی امید باقی نہ ہو۔ نرگسیت اور محبوبیت کی ماری ہوئی اس شئے کا جب کبھی ان لڑکیوں سے سامنا ہوگا تو وہ اپنے عروسی لباس میں کالی بجنور اسی آنکھیں بند کر کے یا قوتی ہونٹوں کو ذرا سی جنبش دے کر بس اسی قدر پوچھ سکیں گی: "بے وفا! ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے سکھ کا خزانہ مل گیا؟" اور وہ تھا اپنی حرماں نصیبی کی داستان کہنے ان دوستوں کو پکارے گی جو چو کے دامن میں ذروں کے روپ میں پڑے ہیں یا جو برکھا کی رت میں باس بن کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتے ہیں ——— مجھے یہ بھی یاد ہے کہ علی الصباح ساڑھے تین چار بجے سب اٹھتے تھے۔ دالان اور صحن پراٹھوں کی خوشبو سے بھرے ہوتے۔ جھیوریاں اور ان کی لڑکیاں چولہے کے پاس پکوان پکانے میں مصروف ہوتیں۔ بڑے بزرگ منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر حقے بجانے میں مصروف ہو جاتے۔ بجلیاں دروازے پر آجاتیں تو بیلوں کی گھنٹیوں کا شور گلی میں پھیل جاتا۔ پھر پکوان اجلے اجلے دسترخوانوں میں باندھ کر قافلہ چلتا۔ گلی کی عورتیں اپنے دروازے پر آکر ایک دوسری کو آوازیں دینے لگتیں کہ بیبیاں جا رہی ہیں ——— سورج نکلنے سے پیشتر چو کا ریگ زار عبور کر لیا جاتا۔ ریت میں دور دور تک تربوز کے کھیت پھیلے ہوتے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں بیل اپنی جانی پہچانی راہوں پر چلتے رہتے اور ہوشیار پور کا سٹیشن آجاتا۔ سورج کی پہلی کرن نمایاں ہونے سے پہلے عطر بیز ریشمی ملبوس والی لڑکیاں جو رکابیوں پر حنائی رنگ کے رومال ڈال کر عزیزوں، رشتہ داروں کے گھر آیا جایا کرتی تھیں، ریل کے ڈبے میں بیٹھ چکی ہوتیں۔ سورج کی روشنی سٹیشن کے چھجوں پر نمودار ہوتی تو ریل کی سیٹی بجتی . . . . . .

——— اشفاق احمد

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

نیک خواہشات کے ساتھ . . .

اجیت سنگھ
سکھو فلمز، بمبئی۔

اِس بے سمت بھاگتی دوڑتی مخلوق کی قلبی
تسکین کے لیے ہماری فلموں نے کچھ تھوڑا
بہت کام تو یقیناً کیا ہے . . .

داغ، کبھی کبھی اور دوسرا آدمی کے بعد یش چوپڑہ کی ایک اور پیش کش:

کالا پتھر

معاون فنکار: سلیم جاوید، ساحر، راجیش روشن اور ششی کپور، امیتابھ بچن، شتروگھن سنہا، راکھی، پروین بابی، نیتو سنگھ۔

صدیوں کے طویل اور کٹھن سفر میں خون
کے رشتے ناطے تک اپنی پہچان کھو
بیٹھے ہیں ـــــ ہمارے اس دورِ
بلاخیز میں ان رشتوں کی شناخت
جان لیوا عمل ہے۔

سنگتراش انٹرنیشنل کی پہلی تصویر

خون کا رشتہ

فلمساز: سراج درپن، امر رائے

یا شیخ، زرد کتا کیا ہے؟

فرمایا: زرد کتا تیرا نفس ہے۔

میں نے پوچھا: یا شیخ، نفس کیا ہے؟

فرمایا: نفس طمع دنیا ہے۔

میں نے سوال کیا: یا شیخ، طمع دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمع دنیا پستی ہے۔

میں نے استفسار کیا: یا شیخ، پستی کیا ہے؟

فرمایا: پستی علم کا فقدان ہے۔

میں ملتجی ہوا: یا شیخ، علم کا فقدان کیا ہے؟

فرمایا: دانش مندوں کی بہتات۔

——— انتظار حسین

یا شیخ، عالم کی پہچان کیا ہے؟
فرمایا: جس میں طمع نہ ہو۔
عرض کیا: طمعِ دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟
فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔
عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟
فرمایا: جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے،
دیوانہ ہوش مند ہو جائے، عالم تاجر بن جائے،
دانش مند منافع کمائے۔

——— انتظار حسین

دعائیں اور محبتیں . . .

سورج سنیم

دُنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے۔ بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے۔ بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے — بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے، دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

——— سعادت حسن منٹو

چکّی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں ——— میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

——— سعادت حسن منٹو

یہ بستی اب اُن بستیوں میں سے ہے جہاں خاموشی ہو تو بولے
ہوئے لفظ کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ بھولا ہوا لفظ
جو ہر منہ میں زبان بن جاتا ہے۔ جو اسپارٹکس کو خطرناک باغی
بنا دیتا ہے تو آقا ان کے تنومند جسموں کو بودھی درخت
کے تنے کے ساتھ باندھ کر کوڑوں سے ان پر راجباہ کھودتے
ہیں۔ جسم جو پھر مجسّم زبانوں کا روپ ڈھال لیتے ہیں
انہیں کال کوٹھریوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جب یوں
ہو جاتا ہے کہ وہ ان دیکھا، ان سنا جذبہ لفظوں کے
اختیار سے نکل جاتا ہے تو ان خلاؤں کو خلق کرتا ہے جو ایسی
ہی حقیقت ہوتے ہیں جسے دیکھا جا سکتا ہے، سنا
جا سکتا ہے، چھوا جا سکتا ہے۔

—— انور سجاد

آواز کی آرزوئیں، وہ خواہش، وہ خیال، وہ لفظ جنھیں میں نے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا، آج ان کی نجات کا دن تھا اور میں ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔ ہم آزاد ہیں، غلام نہیں ——— میں یہاں ایک ہوں۔ اگر خواہشوں، خیالوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے تو باہر سارا ہجوم، سارا شہر، سارا ملک، ساری کائنات خطرناک ہے۔ انھوں نے اپنے مقدّر پر لگی جبر و استبداد کی مہریں توڑ ڈالی ہیں۔

——— انور سجّاد

صفحات : ۵۰۸

کائنات اور انسان، انسان اور انسان کے درمیان رشتوں
کی باریکیوں کی پہچان، سنجیدہ جریدے کی پہلی اور
آخری ذمہ داری ہے۔

لفظ کی جوت جلتی ہے تو دھند میں لپٹے ہوئے مناظر
آشکار ہوتے ہیں اور احساس کی تہیں، نامعلوم پرتیں،
مبہم نقوش اور موہوم گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔
——— وارث علوی

دلّی

شاہراہِ ترقّی پر گامزن

●

○ **صاف ستھرا انتظامیہ :**
عام لوگوں کو بنیادی شہری سہولتیں مہیا کرنے اور انسداد بدعنوانی کے لیے دلّی انتظامیہ کے مؤثّر اقدامات۔

○ **ہری جنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح وبہبود :**
۷۵ لاکھ روپے ہریجن بہبودی اسکیموں پر صرف ہو چکے ہیں۔ اس سال کے لیے ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ مخصوص۔ تیکنیکی تعلیمی اداروں میں تمام ہریجن طلبہ کے لیے وظائف خصوصی۔ نوآبادکالونیوں میں بسنے والے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے پر خصوصی توجہ۔

○ **سب کے لیے تعلیم :**
تعلیم کے قومی نشانے کو پورا کرنے میں دلّی سب سے آگے۔ تمام بچوں کو تعلیم دینے کے لیے مزید ۱۲ اسکول کھولے گئے اور اس سال مزید ۹، کھولے جائیں گے۔ برسرروزگار لوگوں کو بھی تعلیم کی سہولیات۔ دیہی طالبات کے لیے مُفت ٹرانسپورٹ۔ تمام غریب بچّوں کو مُفت کتابیں اور مُفت وردیاں۔

○ **طبّی سہولیات :**
گھر کے نزدیک غریبوں اور گاؤں والوں کو طبّی سہولتیں مہیا۔ دین دیال اپادھیائے اسپتال میں ۵۰۰ بستروں کا بندوبست۔ شاہدرہ میں اسپتال اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع۔ دیہات اور دُور دراز کالونیوں میں ۱۰۰ بستروں والے اسپتالوں کی تعمیر جلد شروع ہوگی۔ لوک نایک جے پرکاش نارائن اسپتال میں گرونانک آئی سینٹر کا قیام۔

○ **خوراک و رسد :**
دالیں، سبزیاں، چائے، صابن وغیرہ سستے داموں پر۔ راشن کارڈ ہولڈروں کو پہلے سے زیادہ گیہوں اور آٹا۔ بدعنوان بیوپاریوں کے خلاف سخت کارروائی۔

●

جاری کردہ :

محکمۂ اطلاعات واشاعت، دِلّی انتظامیہ دِلّی

تھیٹر، وہ تھیٹر جس کو ہم جانتے ہیں، یہ دکھاتا ہے کہ سماج کا ڈھانچہ (وہ جو اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے)، اس سماج سے (جس کی نمائندگی حال میں بیٹھے ہوئے تماشائی کرتے ہیں) متاثر نہیں ہو سکتا۔

ایڈی پس، جس نے سماج کی تہہ میں کام کرنے والے بعض اصولوں کو مجروح کیا، تہس نہس کر دیا جاتا ہے: خداؤں کی مرضی اٹل ہے اور تمام نکتہ چینیوں سے بالاتر۔

شیکسپیئر کے قد آور تنہا پیکر، جن کے سینوں پر ان کے مقدر کا ستارہ آویزاں ہے، ناقابلِ تسخیر قوت کے ساتھ اُمڈتے اور بپھرتے ہیں۔ ان کا اُبال، خواہ کتنا ہی حشر خیز ہو، بے کار ہے۔ وہ اپنے زوال کا خود ہی سامان کرتے ہیں۔ ان کی شکست و پسپائی میں موت نہیں، زندگی بے ننگ و نام ہوتی ہے۔ سب کچھ کتنا مبتذل ہو جاتا ہے! یہ حشر سامانی ہر طرح کی نکتہ چینی سے بلند و بالا ہے۔ ہر طرف انسانی قربانیوں کی فراوانی ہے۔ بہیمانہ نشاط کی جلوہ گری! ہمیں معلوم ہے کہ وحشیوں کا اپنا آرٹ ہوتا ہے۔ آئیے، ہم ایک اور آرٹ تخلیق کریں!

——— سرپرست

She saves with

Because she gets more...

Care

Confidence

Availability
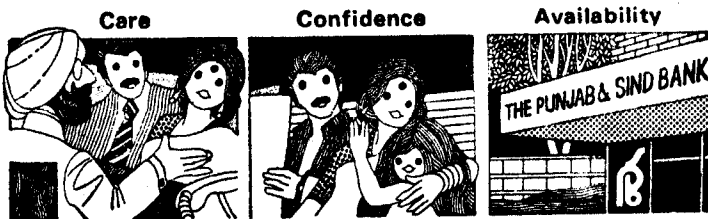
than just maximum security

The bank which honours the tradition of personalised service and care in its branches all over India.

ASP/PSB/1-78 A